معارف ترمذی

جلد اول

اردو شرح

جامع ترمذی

جلد ثانی

مفتی محمد طارق

استاذ حدیث جامعہ فریدیہ اسلام آباد

مکتبہ شیخ الہند

خان پلازہ کوہاٹی بازار نزد جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

0333-5375336

معارف ترمذی

اردو شرح

جامع ترمذی جلد ثانی

جلد اول

الاطعمة، الاشربة، البر و الصلة، الطب
الفرائض، الوصایا، الولاء و الهبة، القدر

مفتی محمد طارق

استاذ حدیث جامعہ فریدیہ اسلام آباد

مکتبہ شیخ الہند

خان پلازہ کوہاٹی بازار نزد جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

0333-5375336

نام کتاب : معارفِ ترمذی (جلد اول)

مصنف : مفتی محمد طارق

ناشر : مکتبہ شیخ الہند

تاریخ اشاعت : دسمبر 2007ء

قیمت : -/۴۰۰ روپے

ملنے کے پتے

- مکتبہ عثمانیہ اعظم مارکیٹ کمیٹی چوک راولپنڈی
- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ صفدریہ مصریال روڈ راولپنڈی
- مکتبہ بیت القلم بلیو ایریا اسلام آباد
- مکتبہ فریدیہ ای۔۷ اسلام آباد
- فاروقی کتب خانہ اکوڑہ خٹک
- اسلامی کتب خانہ اُردو بازار لاہور
- قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی
- مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی کراچی
- مکتبہ حقانیہ ملتان

1۔ مارچ 2007ء سے مکتبہ شیخ الہندؒ انتظامیہ نے خرید لیا ہے، لہٰذا نئی انتظامیہ اس سے پہلے کے معاملات واجبات اور قابل شکایت امور کی ذمہ دار نہیں۔

2۔ اب مفتی محمد طارق صاحب کی تالیفات (مثلاً اسلامی عبادات، تیسیر قطبی اور معارف ترمذی) اسی ادارے مکتبہ شیخ الہند سے شائع ہوں گی، لہٰذا آئندہ مذکورہ کتب اسی ادارے سے ہی طلب کی جائیں۔

کارکنان

مکتبہ شیخ الہند

خان پلازہ کوہاٹی بازار نزد جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

0333-5375336

فہرست مضامین معارف ترمذی جلد اوّل

ابواب الطب عن رسول الله ﷺ

ابواب الوصایا عن رسول اللہ ﷺ

ابواب الولاء والهبة

ابواب القدر

عرض مؤلف

اسلامی علوم میں حدیث کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، حدیث کے بغیر نہ تو قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل ممکن ہے، اس میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اسوۂ حسنہ موجود ہے، نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے، آپ کی انفرادی زندگی کیسے ہوتی، اجتماعی رہن سہن کا انداز کیا ہوتا، اقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ آپ کا طرز معاشرت، دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ آپ کا حسن عمل، ضلالت و گمراہی کے اندھیروں میں ڈگمگاتی ہوئی دکھی انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ کی شب وروز کی کاوشیں، دین کی سربلندی کے لئے آپ کا سربکف ہونا .... یہ سیرت نبوی کے وہ تابناک اور درخشاں باب ہیں، جن کی اتباع بلاشبہ دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کی ضامن ہے۔

سیرت کا ایک پہلو وہ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے کھانے پینے کے طریقے، آداب، صحت و مرض کے بارے میں ارشادات، وصیت و مرض اور تقدیر کے مسئلے میں ہدایات .... بیان کی گئی ہیں، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے جامع ترمذی جلد ثانی میں جو احادیث ذکر فرمائی ہیں ان میں سیرت نبوی کے اسی گوشے کو اجاگر کیا گیا ہے، یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں انہی احادیث کی شرح کی گئی ہے، تاکہ سیرت کے اس حصے سے بھی استفادہ کیا جا سکے

معارف ترمذی جلد اوّل میں ابواب الاطعمہ، الاشربہ، البر والصلۃ، الفرائض، الوصایا، الولاء والھبۃ اور ابواب القدر کی شرح ذکر کی گئی ہے، اس کی تالیف و ترتیب میں درج ذیل امور کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ حدیث کو بہتر سے بہتر انداز سے سمجھا جا سکے:

(۱)...... ہر حدیث پر اعراب اور اس کا با محاورہ اردو ترجمہ۔

(۲)...... مشکل الفاظ کے معنی۔

(۳)...... عنوان لگا کر احادیث کی تشریح۔

(۴)......فقہی مسائل کا ذکر دلائل کے ساتھ۔

(۵)......تشریح عام فہم انداز سے۔

(۶)......طویل مباحث کے ذکر سے اجتناب۔

(۷) ہر مسئلہ کا مستند حوالہ۔

اپنی وسعت کے بقدر ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ اس شرح کی ترتیب میں کسی بھی قسم کی غلطی سے بچا جا سکے، اس کے باوجود اگر کسی محترم قاری کے سامنے اس کی کوئی غلطی سامنے آجائے تو از راہِ کرم اس سے مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کی جا سکے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اس حقیر سی محنت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس شرح کی تکمیل کی بھی توفیق عطا فرمائے، اسے میرے لئے، میرے والدین اور اساتذہ کرام کے لئے صدقہ جاریہ، عفوودرگذر اور مغفرت کا باعث بنائے، اور ساری زندگی دین کی مخلصانہ خدمت کے لئے قبول فرمالے، آمین یارب العالمین۔

محمد طارق

استاذ الحدیث ومفتی جامعہ فریدیہ E-7 اسلام آباد

مدیر جامعہ مریم للبنات

F-10/3 اسلام آباد

۱۹/صفر ۱۴۲۸ھ ، ۹ مارچ ۲۰۰۷ء

0333-5375336

امام ترمذی رحمہ اللہ

نام ونسب

امام ترمذیؒ کا پورا نام محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ ہے، کنیت ابوعیسیٰ اور وطن کی نسبت ''بوغی'' اور ''ترمذی'' ہے۔

تاریخ پیدائش اور سن وفات

مشہور یہ ہے کہ امام ترمذی کی ولادت ۲۰۹ھ میں ''بوغ'' نامی قصبہ میں ہوئی، لیکن چونکہ ''بوغ'' ترمذ کے مضافات میں واقع ہے اس لئے ترمذی کی نسبت زیادہ مشہور ہوگئی۔

تِرمِذ (تا اور میم کی زیر کے ساتھ، اس کے تلفظ میں اور اقوال بھی ہیں یہ قول مشہور ہے) خراسان کا ایک قدیم شہر ہے جو دریائے جیحون کے ساحل پر آباد ہے، اس شہر سے بڑے بڑے علماء اور محدثین پیدا ہوئے اس لئے اس کو " مدینۃ الرجال " کہا جاتا تھا۔

آپ کی وفات بالاتفاق ۲۷۹ھ میں ہوئی۔

تحصیل علم اور شیوخ

امام ترمذیؒ نے پہلے اپنے وطن میں رہ کر علم حاصل کیا، پھر اس کے لئے حجاز، مصر، شام، کوفہ، بصرہ، خراسان اور بغداد وغیرہ کے سفر بھی کئے، اور اپنے وقت کے بڑے بڑے جبال علم سے فیض حاصل کیا، جن میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤد سجستانیؒ، احمد بن منیعؒ .... جیسے جلیل القدر محدثین شامل ہیں۔

امام ترمذی کو ہر استاذ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا، اور امام بخاری کو تو آپ سے بہت ہی تعلق تھا، ایک موقع پر امام بخاریؒ نے امام ترمذیؒ سے فرمایا: ما انتفعتُ بک اکثر مما انتفعت بی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اگر شاگرد ذہین اور ذی استعداد ہو تو استاذ اسے پڑھانے میں زیادہ محنت کرتا ہے، جس سے خود استاذ کو بہت فائدہ ہوتا ہے، اس کے مطالعہ میں وسعت اور

دقت پیدا ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ بعض احادیث میں اپنے استاذ امام بخاریؒ کے بھی استاذ ہیں، چند حدیثیں خود امام بخاریؒ نے ان سے سنی ہیں، ایک حدیث یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: **لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری وغیرک** (مناقب علیؓ، ترمذی)

اسی طرح کتاب التفسیر میں سورہ حشر کی تفسیر کے تحت ایک حدیث ہے، ان دونوں مقامات پر امام ترمذی نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیثیں امام بخاریؒ نے مجھ سے سنی ہیں۔

حافظہ

امام ترمذی کا حافظہ بہت تیز تھا، جو بات سن لیتے تو وہ ان کے ذہن میں نقش ہو جاتی تھی، اس بارے میں آپ کے کئی واقعات مشہور ہیں۔

کتب رجال میں ان کا ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ امام ترمذیؒ کو ایک محدث کے حدیث کے دو صحیفے پہونچے، ساتھ ہی شیخ نے انہیں روایت کرنے کی اجازت بھی دیدی، پھر ایک سفر میں امام ترمذیؒ کی اسی شیخ سے ملاقات ہوگئی تو آپ نے ان سے یہ گذارش کی کہ یہ حدیثیں میں آپ سے براہ راست سن کر ان صحیفوں کے ساتھ موازنہ کرنا چاہتا ہوں، شیخ نے رضامندی ظاہر کردی، لیکن اتفاق سے شیخ کے پاس وہ صحیفے اس وقت پاس نہیں تھے بلکہ گھر رہ گئے تھے، سادہ کاغذ اپنے سامنے رکھکر شیخ سے حدیثیں سننا شروع کردیں، شیخ نے انہیں یوں دیکھا تو ناراض سے ہوگئے، امام ترمذیؒ نے اپنا پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ یہ تمام حدیثیں مجھے یاد ہوگئی ہیں، اسی وقت وہ تمام سنادیں، شیخ نے سمجھا کہ ممکن ہے کہ یہ احادیث انہیں پہلے سے یاد ہوں، امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ آپ مجھے ان کے علاوہ کچھ اور احادیث سنائیں، چنانچہ شیخ نے مزید چالیس حدیثیں سنائیں، امام ترمذیؒ نے یہ بھی فوراً ساری کی ساری سنادیں، تب شیخ کو ان کے حافظے پر اعتماد آیا۔

رجوع الی اللہ

امام ترمذیؒ نہایت زاہدانہ زندگی گذارتے تھے، زہد وتقویٰ میں مشہور تھے، خوف خدا کی وجہ سے اکثر

گریہ وزاری میں رہتے تھے، یوں ان کی بینائی بھی جاتی رہی۔

ابوعیسیٰ کنیت رکھنے کا حکم

امام ترمذیؒ کی کنیت ''ابوعیسیٰ'' ہے، اور وہ اسی کنیت سے اپنے اقوال جامع ترمذی میں ذکر کرتے ہیں۔

اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ''ابوعیسیٰ'' کنیت رکھنے سے منع فرمایا، جس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی، کہ حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں تھا، اور اس کنیت سے فساد عقیدہ کا اندیشہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ پھر امام ترمذی نے یہ کنیت کیوں اختیار کی، جب حدیث میں اس پر ممانعت آئی ہے۔

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) ابتدائے اسلام کے وقت یہ کنیت رکھنا ممنوع تھا، بعد میں جب یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو پھر یہ ممانعت ختم ہو گئی۔

(۲) بعض کے نزدیک ممانعت سے حرمت مراد نہیں بلکہ خلاف اولیٰ مراد ہے کہ یہ کنیت رکھنا بہتر نہیں۔

جامع ترمذی اور اس کی خصوصیات

''جامع ترمذی'' حدیث کی ان کتابوں میں سے ہے جن کو پوری امت نے قبول کیا ہے، حافظ شمس الدین ذہبی نے لکھا ہے کہ امام ترمذی نے جامع ترمذی تالیف کرنے کے بعد اسے خراسان، حجاز، مصر اور شام کے علماء کے سامنے پیش کیا، جب ان تمام علماء نے اسے پسند کیا، تب اس کی عمومی اشاعت فرمائی، اس کتاب کی بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو اسے دوسری کتب حدیث سے ممتاز کرتی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)...... یہ کتاب بیک وقت ''جامع'' بھی ہے اور ''سنن'' بھی، جامع اس لحاظ سے ہے کہ اس میں آٹھ قسم کے مضامین یعنی سیر، آداب، تفسیر، عقائد، فتن، احکام، اشراط اور مناقب بیان کئے گئے ہیں اور چونکہ فقہی

احکام کی ترتیب پر اسے مرتب کیا گیا ہے اس لئے اسے ''سنن'' بھی کہا جاتا ہے۔

(۲)......اس کتاب میں احادیث کا تکرار نہیں۔

(۳)......تمام فقہاء کے مذاہب اور ان کے بنیادی استدلالات کو ذکر کیا ہے، اور ہر ایک کے لئے الگ باب قائم کیا ہے۔

(۴)......امام ترمذی ہر حدیث کی حیثیت کو واضح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حسن یا غریب ہے، اور اگر اس میں کوئی علت اور اضطراب ہو تو اسے بھی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

(۵)......ہر باب میں امام ترمذی ایک یا دو تین احادیث ذکر کرتے ہیں اور اس مضمون کی باقی احادیث کی طرف " وفي الباب عن فلان وفلان " کہہ کر اشارہ کر دیتے ہیں۔

(۶)......اگر حدیث طویل ہو تو امام ترمذی عموماً اس میں سے صرف وہ حصہ ذکر کرتے ہیں جو اس باب سے متعلق ہو، بعض دفعہ آخر میں فرماتے ہیں " وفيه قصّة طويلة، وفيه كلام اكثر من هٰذا "

(۷)......امام ترمذی کا معمول ہے کہ وہ مشتبہ راویوں کا تعارف بھی کراتے ہیں بالخصوص جو راوی نام سے مشہور ہیں ان کی کنیت اور جو کنیت سے مشہور ہیں ان کا نام بیان فرماتے ہیں تا کہ اشتباہ باقی نہ رہے۔

(۸)......جامع ترمذی کی ترتیب بہت آسان ہے اور اس سے حدیث کا تلاش کرنا مشکل نہیں۔

(۹)......اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تمام احادیث کسی نہ کسی فقیہہ کے ہاں معمول بہ ہیں۔

(۱۰)......بعض حضرات نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد جامع ترمذی کو سب سے اعلیٰ قرار دیا ہے۔

جامع ترمذی اور موضوع احادیث

شارحین حدیث کے نزدیک اس میں کلام ہے کہ جامع ترمذی میں کوئی حدیث موضوع بھی ہے یا نہیں؟ علامہ ابن الجوزی نے ''موضوعات کبریٰ'' میں ترمذی کی بعض احادیث کو موضوع قرار دیا ہے، لیکن چونکہ ابن جوزی اس معاملہ میں ضرورت سے زیادہ متشدد ہیں، اس لئے تحقیقی بات یہ ہے کہ جامع ترمذی کی کوئی حدیث موضوع نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی شروح

جامع ترمذی پر علماء کرام اور محدثین نے بہت کام کیا ہے، بہت سی شروح اور حواشی لکھے گئے ہیں، ذیل میں چند مشہور شروح کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱)...... عارضة الاحوذی بشرح جامع الترمذی، یہ قاضی ابوبکر بن عربی کی تصنیف ہے، جو مالکیہ کے جلیل القدر محدث ہیں، یہ شرح متقدمین کے طریقہ پر مختصر ہے، لیکن بہت سے علمی فوائد پر مشتمل ہے، مصنفین کے لئے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، حافظ ابن حجر بھی اس کا بکثرت حوالہ دیتے ہیں۔

(۲)...... شرح الحافظ ابن حجر، یہ شرح نایاب ہے۔

(۳)...... شرح البلقینی جس کا نام "العرف الشذی علی جامع الترمذی" ہے یہ علامہ عمر بن رسلان بلقینی شافعی کی تصنیف ہے، جو حافظ ابن حجر کے استاذ ہیں۔

(۴)...... شرح الحافظ ابن رجب البغدادی الحنبلی۔

(۵)...... قوت المغتذی، یہ علامہ جلال الدین سیوطی کی نہایت مختصر شرح ہے، اور ہندو پاک میں ترمذی کے حاشیہ پر درج ہے۔

(۶)...... شرح السندھی یہ علامہ ابوطیب سندھی کی تصنیف ہے، اور مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷)...... شرح العلامہ سراج الدین السرھندی، یہ شرح بھی مصر سے چھپ چکی ہے۔

(۸)...... تحفة الاحوذی، یہ قاضی عبدالرحمٰن مبارک پوری کی تصنیف ہے، جو اہل حدیث کے بلند پایہ عالم ہیں، اس شرح میں انہوں نے حنفیہ پر خوب تردید کی ہے، اور بسا اوقات تو حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں، اگر اس شرح میں سے حنفیہ کے خلاف تعصب کو نکال دیا جائے تو کتاب کو حل کرنے کے اعتبار سے بہت اچھی شرح ہے۔

(۹)...... الکوکب الدری علی جامع الترمذی، یہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی تقریر ترمذی ہے، جسے ان کے شاگرد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی نے ضبط کیا ہے، اور ان کے صاحبزادے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اس پر مفید حواشی لکھے ہیں، یہ ترمذی کی انتہائی بہترین اور

مختصر شرح ہے، بڑی تحقیقی اور طویل مباحث کا خلاصہ ہے۔

(۱۰)...... **الورد الشذی**، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی تقریر ترمذی ہے جو بہت مختصر ہے۔

(۱۱)...... **اللباب فی شرح قول الترمذی وفی الباب**، یہ حافظ ابن حجر کی تالیف ہے اور اس میں انہوں نے ان احادیث کی تخریج کی ہے جن کی طرف امام ترمذی وفی الباب کہکر اشارہ فرماتے ہیں۔

(۱۲)...... **العرف الشذی تقریر جامع الترمذی**، یہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر ترمذی ہے، جسے مولانا چراغ محمد صاحب نے درس میں ضبط کیا ہے اگر چہ یہ خاص جامع تقریر ہے، لیکن اس میں ضبط کی غلطیاں رہ گئی ہیں، کیوں کہ حضرت شاہ صاحب اس پر نظر نہ فرما سکے، اسی لئے اس میں حضرت شاہ کے علوم کا احاطہ نہیں ہو سکا۔

(۱۳)...... **معارف السنن**، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ کی تالیف ہے، یہ عربی میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع شرح ہے، چھ جلدوں میں صرف کتاب الحج تک پہونچ سکی ہے، تکمیل سے قبل ہی حضرت مؤلف اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ (درس ترمذی بتغییر ۱/۱۳۴)

(۱۴)...... **انتهاب المنن فی شرح السنن** جو حل ترمذی کے نام سے مشہور ہے، یہ حضرت مولانا رئیس الدین صاحب کی اردو تالیف ہے جو مظاہر العلوم سہارنپور میں استاذ الحدیث ہیں، یہ جدید شرح ہے جو ابھی تک نامکمل ہے، کراچی سے دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۱۵)...... **مجمع البحرین عن الاستاذین**، مفتی نظام الدین شامزئی صاحبؒ اور مولانا محمد زیب صاحب استاذان جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، یہ اردو میں نہایت مختصر اور اچھی شرح ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

أَبْوَابُ الْأَطْعِمَةِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

یہ باب ان تعلیمات کے بارے میں ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے کھانوں کے سلسلے میں منقول ہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ عَلٰى مَا كَانَ يَأْكُلُ النَّبِيُّ ﷺ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کس چیز پر کھانا تناول فرماتے تھے۔

عَنْ اَنَسٍ رضى الله عنه قَالَ: مَا أَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى خُوَانٍ وَلاَ سُكُرُّجَةٍ وَلا خُبِزَ لَهُ مُرَقَّقٌ . فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ : فَعَلٰى مَا كَانُوْا يَأْكُلُوْنَ؟ قَالَ: عَلٰى هٰذِهِ السُّفَرِ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے چوکی یا میز پر کھانا نہیں کھایا، اور نہ چھوٹی طشتری یا رکابی میں کھایا، اور نہ آپ کیلئے چپاتی (میدے کی روٹی) پکائی گئی، میں (یونس) نے حضرت قتادہ سے پوچھا آخر (حضور ﷺ اور صحابہ کرام) کس چیز پر کھانا تناول فرماتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: انہی دستر خوانوں پر۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ "خُـــوان": (خاء پر پیش اور زیر کے ساتھ)، اس سے مراد وہ چوکی اور میز ہے جو کھانے کیلئے استعمال ہوا کرتے تھے، لغات میں اسکا ترجمہ عموماً مطلق دستر خوان کیا جاتا ہے، اسکی جمع ہے :اَخْوِنَة، خُوْنٌ، اَخَاوِيْن. "سُكُرُّجَة": (سین، کاف، اور را پر پیش اور جیم پر زبر کے ساتھ) یہ فارسی زبان کا لفظ ہے، اسکے معنی ہیں: طشتری، چھوٹی رکابی، چٹنی وغیرہ کی طشتری، اسکی جمع ہے: سَكَارِج۔ خُبِزَ: روٹی پکائی گئی۔ مُرَقَّق: پتلی اور بڑی چپاتی یعنی میدے کی روٹی: جمع: مَرَاقِيق۔ سُفَر: (سین پر پیش اور فاء پر زبر کے ساتھ) یہ جمع ہے اسکا واحد سفرہ ہے، اور سفرہ دراصل اس کھانے کو کہتے ہیں جو مسافر اپنے ساتھ کسی چمڑے

میں لپیٹ کر لے جاتا تھا پھر اسکا استعمال مطلق دستر خوان یا چمڑے کے دستر خوان پر ہونے لگا۔تحفۃ الاحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ھذا، ۳۹۹/۵۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ "خوان" تانبے کا ایک بڑا طباق ہوتا تھا، اس کے نیچے تپائی کیطرح پائے ہوتے تھے، اسے کم از کم دو بندے اٹھاتے تھے، اسپر متکبر اور عیش وعشرت والے کھانا رکھ کر کھایا کرتے تھے۔عمدۃ القاری، کتاب الاطعمۃ، باب الخبز المرقق ۳۵/۲۱۔

حدیث کی تشریح

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے کھانے کی اور کھانے کے وقت جس کیفیت پر آپ بیٹھتے تھے، اسکا ذکر ہے، پہلی چیز یہ بیان فرمائی کہ آپ نے کبھی "خوان" پر کھانا تناول نہیں فرمایا، خوان کے معنی دستر خوان کے ہیں، لیکن حدیث میں خوان سے مراد وہ چوکی یا میز ہے جسپر کھانا رکھ کر کھایا جاتا ہے، تاکہ کھانے کے وقت جھکنا نہ پڑے، اسطرح بیٹھ کر عموماً وہ لوگ کھانا کھاتے ہیں جو مالدار، عیش پسند، متکبر اور غیر اسلامی تہذیب کے خوگر ہوں، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی اس طریقے سے کھانا تناول نہیں فرمایا۔

اور سکرجہ سے وہ چھوٹی پیالی یا طشتری مراد ہے، جس میں چٹنی، اچار اور مربہ وغیرہ ڈالکر دستر خوان پر رکھا جاتا ہے، اور کھانے کے ساتھ انہیں اسلئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ کھانا زیادہ کھایا جاسکے، اور جو کھایا جائے تو وہ آسانی سے ہضم ہو جائے، چنانچہ اس حدیث میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے دستر خوان پر اسطرح کی کوئی رکابی یا طشتری نہیں ہوتی تھی، حضور اکرم ﷺ چونکہ عموماً اجتماعی حالت میں کھانا تناول فرمایا کرتے تھے، اس لئے چھوٹے برتنوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بڑے برتن میں سب ایک ساتھ کھاتے تھے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ چھوٹی طشتریاں اور چھوٹے پیالے عموماً اچار وغیرہ کیلئے استعمال کیے جاتے ہیں، اور آپ ﷺ کے زمانے میں اول تو عسرت اور تنگی زیادہ تھی، اور ثانیاً وہاں خوراک کی کثرت کا اہتمام نہیں تھا اور اچار، چٹنی وغیرہ کا بندوبست وہ لوگ کرتے ہیں جو زیادہ کھانے کے شوقین اور عادی ہوتے ہیں تاکہ وہ کھانا جلدی سے ہضم ہو جائے۔فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب الخبز المرقق ۶۶۵/۹۔

''اور نہ آپ کیلئے چپاتی پکائی گئی'' اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کیلئے نہ تو کبھی خاص طور پر چپاتی پکائی گئی

اور نہ آپ نے کبھی کھائی ہے، خواہ آپ کیلئے پکائی گئی ہو یا دوسروں کیلئے بنائی گئی ہو، بلکہ صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میرے علم کے مطابق آپ ﷺ نے پوری زندگی میں کبھی چپاتی دیکھی بھی نہیں۔

''وہ کس چیز پر کھاتے تھے'' اس سے سائل کا مقصد صحابہ کرام کے بارے میں معلوم کرنا تھا، کیونکہ وہ حضرات حضور ﷺ کی سنتوں پر صحیح طریقے سے عمل پیرا تھے، اسلئے صحابہ کرام کے بارے میں سوال درحقیقت نبی کریم ﷺ کے بارے میں سوال کرنا تھا، اور یہ بھی درست ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''یأکلون'' کی ضمیر نبی کریم ﷺ اور صحابہ دونوں کی طرف راجع ہو۔ مرقاۃ کتاب الاطعمۃ ۸:۱۱

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کھانے میں نہایت سادگی اور بندگی کی شان ہوتی تھی، آپ نے نہ کبھی میز یا چوکی پر کھانا کھایا، نہ چھوٹی طشتری اور پیالیوں میں تناول فرمایا، نہ آپ کیلئے چپاتی، مرغن کھانے اور پر تکلف ڈشیں تیار کی گئیں، آپ نہایت عاجزی کے ساتھ زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھاتے تھے، یہی کھانیکا مسنون طریقہ ہے۔

موجودہ دور میں میز کرسی پر کھانے کا مسئلہ

سنت طریقہ یہ ہے کہ دسترخوان بچھا کر اسپر کھانا کھایا جائے، میز کرسی پر کھانا سنت کے خلاف ہے، کھانے کا یہ طریقہ یہود ونصاری اور انگریزوں کا ایجاد کردہ ہے، جسے اختیار کرنا مسلمان کیلئے ہرگز مناسب نہیں ہے، لہذا اگر کوئی شخص کافروں کے ساتھ مشابہت کے ارادے سے یا تکبر وغرور کی وجہ سے میز کرسی پر کھانا کھاتا ہے تو یہ ناجائز ہے اور قطعاً ممنوع ہے، اور اگر اسطرح کی نیت بالکل نہ بھی ہو تب بھی سنت پر عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن اگر کہیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی ضرورت پیش آجائے تو یہ جائز ہے، کوئی گناہ نہیں، اس معاملے میں زیادہ سختی کرنا ٹھیک نہیں، جیسا کہ بعض لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں، اور اسپر بہت زیادہ نکیر کرتے ہیں، یہ عمل بھی درست نہیں، لیکن اس کی عادت بنانا جیسا کہ موجودہ دور میں اکثر لوگ گھروں میں میز کرسی کو کھانے کیلئے استعمال کرتے ہیں، یہ طریقہ بہتر نہیں ہے، سنت کے خلاف ہے، البتہ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ کرسی پر بیٹھ کر کھاتے وقت پیچھے ٹیک لگا کر نہ کھایا جائے، بلکہ آگے کی طرف جھک کر کھایا

جائے، اسلئے کہ حضور اقدس ﷺ نے ٹیک لگا کر کھانے کو متکبرین کا طریقہ قرار دیا ہے۔

اسی طرح چار پائی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے بلکہ کرسی پر کھانے کے مقابلے میں چار پائی پر کھانا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس میں کھانے والے اور کھانے کی سطح برابر ہوتی ہے، جبکہ کرسی میں کھانا اوپر ہوتا ہے ،اور کھانے والا نیچے ہوتا ہے، تاہم افضل یہی ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھایا جائے۔ جدید فقہی مسائل ۱/۱۷۹

زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے

حضور اقدس ﷺ دو وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے، ایک تو اس وجہ سے کہ اس زمانے میں زندگی سادہ تھی، میز کرسی کا رواج ہی نہیں تھا، اسلئے نیچے بیٹھا کرتے تھے، دوسری وجہ یہ ہے کہ نیچے بیٹھ کر کھانے میں تواضع زیادہ ہے، اور کھانے کا ادب واحترام بھی اس میں زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوتی ہے اور زمین پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوتی ہے، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، چنانچہ زمین پر بیٹھ کر کھانیکی صورت میں تواضع، عاجزی اور مسکنت پیدا ہوتی ہے، اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں یہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں، اسلئے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

لیکن اگر کسی جگہ پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا گیا تو لوگ اس سنت کا مذاق اڑائیں گے، تو پھر ایسی جگہ پر زمین پر کھانے کا اصرار نہ کیا جائے، ایسی صورت میں میز کرسی پر ہی کھانا کھالیا جائے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اور میرے کچھ دوست دیوبند سے دہلی گئے، جب دہلی پہونچے تو وہاں کھانا کھانے کی ضرورت پیش آئی، چونکہ کوئی اور جگہ کھانے کی نہیں تھی، اسلئے ایک ہوٹل میں کھانے کیلئے چلے گئے، اس ہوٹل میں بھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا انتظام تھا، اسلئے میرے دوستوں نے کہا کہ ہم تو کرسی پر بیٹھ کر نہیں کھائیں گے، اسلئے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے، چنانچہ انہوں نے یہ چاہا کہ زمین پر اپنا رومال بچھا کر کھانا کھایا جائے، میں نے انہیں منع کیا کہ ایسا نہ کریں، بلکہ میز کرسی پر بیٹھ کر ہی کھانا کھالیں، انہوں نے کہا کہ ہم میز کرسی پر کیوں کھائیں؟ جب زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت کے زیادہ قریب ہے، تو پھر زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کیوں ڈریں اور کیوں شرمائیں، حضرت مفتی صاحب نے

فرمایا کہ شرمانے اور ڈرنے کی بات نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ جب تم لوگ یہاں اس طرح زمین پر اپنا رومال بچھا کر بیٹھو گے، تو لوگوں کے سامنے اس سنت کا تم مذاق بناؤ گے اور لوگ اس سنت کی توہین کے مرتکب ہونگے، اور سنت کی توہین کا ارتکاب کرنا صرف گناہ ہی نہیں، بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہونچا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی صاحب قدس اللہ سرہٗ کو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی ضرورت پیش آ گئی، تو حضرت نے اس وقت فرمایا کہ ویسے تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا ناجائز تو نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑا سا مشابہت کا شبہ ہے کہ چونکہ یہ انگریزوں کا چلایا ہوا طریقہ ہے، اس طرح کھانے میں ان کے ساتھ مشابہت نہ ہو جائے، اسلئے حضرت جب کرسی پر بیٹھے تو پاؤں اٹھا کر بیٹھے، پاؤں لٹکائے نہیں، اور پھر فرمایا کہ انگریزوں کے ساتھ جو مشابہت پیدا ہو جانے کا شبہہ تھا، وہ اس طرح بیٹھنے سے ختم ہو گیا، اس لئے کہ وہ پاؤں لٹکا کر کھاتے ہیں، اور میں نے پاؤں اوپر کر لیے ہیں۔

احسن الفتاوی (۸:۱۲۱)، اصلاحی خطبات (۵:۱۸۶-۱۹۰) الکوکب الدری (۳:۴)

کھڑے ہو کر کھانا بدتہذیبی ہے

عصر حاضر میں جب کہیں کوئی تقریب اور پروگرام ہوتا ہے تو فیشن اور رسم ورواج کی وجہ سے کھڑے ہو کر کھانا کھایا جاتا ہے، ٹیبل پر مختلف کھانے اور ڈشیں تیار کر کے رکھدی جاتی ہیں، لوگ خوب چھینا جھپٹی کر کے آتے ہیں، پلیٹیں پکڑ کر اپنی پسند کا کھانا ڈالکر کھڑے ہو کر کھاتے ہیں، اسے ''بفے سسٹم'' کہا جاتا ہے، اور اب تو یہ طریقہ بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔

یہ طریقہ سراسر غیر اسلامی ہے، کیونکہ کھڑے ہو کر کھانا سنت کے خلاف ہے، اور جب کوئی خلاف سنت عمل اجتماعی طور پر کیا جائے تو اسکی برائی اور قباحت مزید بڑھ جاتی ہے، درحقیقت یہ مغربی لوگوں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے، جسے مسلم معاشرہ اندھا دھند اختیار کرتا چلا جا رہا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ سے کسی حدیث میں بھی کھڑے ہو کر کھانا کھانا ثابت نہیں ہے، بلکہ کھڑے ہو کر کھانے پینے سے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا غیر اخلاقی عمل کے ساتھ ساتھ بڑی بدتہذیبی بھی ہے، اسلئے مسلمانوں کو اسکی

پیروی نہیں کرنی چاہیے، اور اگر کہیں کھڑے ہو کر کھانیکا ابتلاء ہو جائے تو آپ ہرگز کھڑے ہو کر نہ کھائیں، بلکہ پلیٹ میں کھانا ڈالکر زمین پر بیٹھ کر کھالیں، اگر زمین پر بیٹھنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو یا مشکل ہو، تو پھر کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھالیں، کھڑے ہو کر کھانے سے ہر ممکن اجتناب کریں، کیونکہ اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ جدید فقہی مسائل (۱:۱۸۰) اصلاحی خطبات (۵:۱۹۷)

هذا حديث حسن غريب کے معنی

امام ترمذی بکثرت حسن اور غریب کو جمع کرتے ہیں، جمہور کے نزدیک حسن اور غریب کی جو تعریفیں مشہور ہیں، ان کی رو سے اس میں کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ جمہور کے نزدیک دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حدیث کے حسن ہونیکا تعلق راوی کے حفظ اور عدالت سے ہے، اور غریب کا تعلق راوی کے منفرد ہونے سے، اس لحاظ سے حسن اور غریب دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

لیکن امام ترمذی کے قول میں اشکال اس لئے پیدا ہو گیا کہ انہوں نے حدیثِ حسن کی جو تعریف کتاب العلل میں ذکر کی ہے، وہ جمہور کی تعریف سے مختلف ہے، امام ترمذی نے حسن کی یہ تعریف کی ہے: ''ہر وہ حدیث جسکی سند میں کوئی متہم بالکذب راوی نہ ہو، نہ وہ شاذ ہو اور وہ حدیث متعدد طرق سے منقول ہو، تو وہ حدیث حسن ہے''

اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن ہونے کیلئے تعدد طرق ضروری ہے، دوسری طرف غریب کی تعریف انہوں نے اسطرح کی ہے: **كل حديث يروى و لا يروى الا من وجه واحد** (ہر وہ حدیث جو ایک ہی طریق سے منقول ہو وہ غریب ہے) اسکا تقاضا یہ ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک حسن اور غریب میں منافات ہے، اس لئے یہ اشکال پیدا ہوا کہ امام ترمذی ھذا حدیث حسن غریب کیوں کہتے ہیں؟ اس کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں:

(۱)...... بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ بعض مرتبہ پوری سند میں تفرد کسی ایک راوی کا ہوتا ہے، جسے ''مدار اسناد'' کہتے ہیں، مدار اسناد چونکہ ایک ہی راوی ہے اس لئے اس حدیث کو غریب کہد یا گیا، اور مدار اسناد سے پہلے چونکہ وہ متعدد طرق سے مروی ہے اس لئے اسے حسن کہد یا گیا، لیکن یہ جواب ضعیف ہے، اس لئے کہ اسطرح

تو ہر غریب حدیث حسن ہوسکتی ہے، کیونکہ کہیں نہ کہیں پہنچ کر تو طرق متعدد ہو ہی جاتے ہیں۔

(۲)...... حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ امام ترمذی نے کتاب العلل میں حسن کی جو تعریف کی ہے وہ صرف اسی حدیث حسن کی تعریف ہے جس کے ساتھ غریب کا لفظ نہ ہو، اور جہاں امام ترمذی حسن غریب کہتے ہیں وہاں جمہور کی اصطلاح کا حسن مراد لیتے ہیں، نہ کہ اپنی اصطلاح کا، اور جمہور کی اصطلاح میں حسن، غریب کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔

(۳)...... حافظ ابن صلاح نے اپنے مقدمہ میں ایک تیسرا جواب دیا ہے، اور وہ یہ کہ امام ترمذی نے کتاب العلل میں حسن لغیرہ کی تعریف کی ہے، اور جس جگہ وہ حسن کے ساتھ غریب کو جمع کرتے ہیں وہاں حسن سے حسن لذاتہ مراد ہوتا ہے۔

(۴)...... سب سے بہتر جواب حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے دیا، وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام ترمذی کی کتاب العلل والی عبارت کو غور سے پڑھا جائے تو اس اعتراض کا جواب خود بخود نکل آتا ہے، اسکا حاصل یہ ہے کہ حدیث کے غریب ہونیکی تین صورتیں ہیں:

(۱)...... ایک صورت یہ ہے کہ اسکا مدار واقعۃً ایک ہی راوی پر ہو، اور اس کے سوا کسی اور نے اسے روایت نہ کیا ہو، یہ قسم امام ترمذی کی اصطلاح کے مطابق حسن کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

(۲)...... دوسری صورت یہ ہے کہ حدیث مجموعی طور پر تو بہت سے راویوں سے اور متعدد طرق سے منقول ہو لیکن ان میں سے کسی طریق میں متن کے اندر کوئی ایسی زیادتی پائی جارہی ہو جو دوسرے کسی طریق میں نہ ہو، ایسی صورت میں اصل حدیث تو غریب نہیں ہوتی، لیکن جس طریق میں زیادتی پائی جارہی ہے اس کو زیادتی کیوجہ سے غریب کہہ دیتے ہیں۔

(۳)...... تیسری صورت یہ ہے کہ اصل حدیث متعدد طرق سے منقول ہو، لیکن کسی ایک طریق میں سند کے اندر کوئی زیادتی پائی جارہی ہو تو وہ طریق غریب ہوتا ہے، اور اسناد کی تبدیلی کی وجہ سے اس حدیث کو غریب کہدیتے ہیں۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ترمذی جہاں حسن کو غریب کے ساتھ جمع کرتے

ہیں، وہاں غریب سے آخری دوصورتیں مراد ہوتی ہیں، یعنی اصل حدیث متعدد طرق سے مروی ہونے کی بناء پر حسن ہوتی ہے، لیکن سند یا متن میں کوئی تفرد آجاتا ہے، جسکی بناء پر امام ترمذی اس کو ساتھ ساتھ غریب بھی کہہ دیتے ہیں، درس ترمذی، کتاب الطہارہ (۱۸۱:۱)

بَابُ مَاجَاءَ فِیْ أَکْلِ الأَرْنَبِ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں خرگوش کے کھانیکا ذکر ہے

عَنْ هِشَامِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ أَنَساً يَقُوْلُ: أَنْفَجْنَا أَرْنَباً بِمَرِّ الظَّهْرَانِ فَسَعَىٰ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ خَلْفَهَا، فَأَدْرَكْتُهَا فَأَخَذْتُهَا، فَأَتَيْتُ بِهَا أَبَا طَلْحَةَ فَذَبَحَهَا بِمَرْوَةٍ فَبَعَثَ مَعِيَ بِفَخِذِهَا أَوْ بِوَرِكِهَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَكَلَهُ، فَقُلْتُ أَكَلَهُ؟ قَالَ: قَبِلَهُ.

ہشام بن زید سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ایک دن ہم نے مرّ الظہران کے مقام پر (شکار کیلئے) ایک خرگوش کا پیچھا کیا، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام اسکے پیچھے دوڑے، میں نے اسے پالیا اور پکڑ لیا، پھر میں اسے ابوطلحہ کے پاس لایا، انہوں نے اسے پتھر سے ذبح کیا، پھر مجھے اسکی ران یا ران کا بالائی حصہ (سرین) دیکر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا، تو آپ نے اسے کھایا، میں (ہشام) نے کہا: کیا آپ ﷺ نے اسے کھایا تھا؟ فرمایا (حضرت انس نے): آپ ﷺ نے اسے قبول فرمالیا تھا۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔أَنْفَجَ الأَرْنَبَ: خرگوش کو اسکی پناہ گاہ سے بدکا کر باہر نکالنا، پیچھا کرنا، یہ لفظ باب افعال سے ہے۔ مَرُّ الظَّهْرَان: یہ مکہ مکرمہ کے شمالی جانب تقریباً سولہ میل کے فاصلے پر ایک نخلستانی علاقہ ہے، جہاں تھوڑی بہت آبادی بھی ہے، وہاں سے مکہ مکرمہ میں سبزیاں لائی جاتی ہیں، مکہ کے لوگ سیر وتفریح کیلئے وہاں جاتے ہیں، آجکل اس جگہ کو ''وادی فاطمہ'' کہا جاتا ہے۔ حیات الحیوان (۱۰۸:۱) اور عوام اسے 'بطن مرو' بھی کہتے ہیں۔ فتح الباری ۸۲۵/۹۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہ نسبت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کیطرف نہیں ہے، بلکہ ترکی عہد کی فاطمہ نامی ایک مالدار عورت کیطرف منسوب ہے۔ أَدْرَكَ الشَّيْئَ: پالینا۔ بَعَثَ بِهِ: بھیجنا، روانہ کرنا۔ مروة (میم پر زبر اور را کے سکون کے ساتھ) سفید پتھر جس کو

دھاردار چھری کی طرح بنالیا جاتا ہے۔ وَرِک: ران کا بالائی حصہ، کولہا، سرین۔

خرگوش حلال ہے

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خرگوش ایک حلال جانور ہے، یہی جمہور صحابہ کرام اور آئمہ کا موقف ہے، سوائے تین حضرات کے کہ انہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، چنانچہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، تابعین میں سے حضرت عکرمہ، اور فقہاء میں سے ابن ابی لیلیٰ ہیں۔

ان حضرات کی دلیل حضرت خزیمہ بن جزء کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خرگوش کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اسے نہ تو کھاتا ہوں اور نہ ہی اسے حرام قرار دیتا ہوں، میں (خزیمہ) نے عرض کیا: میں اس چیزون کو کھاؤں گا جسکو آپ حرام قرار نہیں دیں گے، اور اے اللہ کے رسول! آپ کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ اسے خون یعنی حیض آتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الذبائح والصید، باب الأرنب، ۸۲۵/۹

اس حدیث کی سند گو ضعیف ہے لیکن اسکی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابوداؤد میں اس مفہوم کی منقول ہے، مذکورہ احادیث میں ان حضرات کے نزدیک کراہت کا دارومدار " انها تحيض" ہے کہ خرگوش کو حیض آتا ہے، لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے "انها تحيض" سے صرف اسکی اس عجیب حالت کا ذکر فرمایا ہے، اس سے اسکی حرمت یا کراہت کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے، کیوں کہ اسطرح کا خون تو مزید نظافت اور طہارت کا ذریعہ ہوتا ہے، شرعاً یہ حرمت یا کراہت کی علت نہیں ہے، اسلئے اس مفہوم کی احادیث سے حرمت یا کراہت ثابت نہیں ہوتی۔

اور اگر یہ حدیثیں صحیح بھی ہوں، سند وغیرہ کے اعتبار سے ان پر کوئی کلام نہ ہو، تب بھی ان سے زیادہ سے زیادہ طبعی کراہت ثابت ہوتی ہے، کہ آپ ﷺ کی طبیعت مبارکہ نے خرگوش کا گوشت اسکی اس مخصوص حالت کی وجہ سے نہیں کھایا، ان سے شرعی کراہت یعنی مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ حدیث باب اور اس مفہوم کی دوسری احادیث سے خرگوش کا حلال ہونا بغیر کسی کراہت کے ثابت ہے۔

تکملة فتح الملهم، کتاب الصید والذبائح، باب اباحة الارنب ۵۳۷/۳

جمہور کے دلائل:

(۱)......حدیث باب جمہور کی دلیل ہے کہ خرگوش کا گوشت حلال ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ آپ نے اسے قبول فرمایا، اگر یہ حرام یا مکروہ ہوتا تو آپ ﷺ اسے ہرگز قبول نہ فرماتے، لہذا آپ کا قبول فرمانا اسکے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

(۲) امام بخاری نے باب الھبہ میں اس روایت میں مزید یہ بھی روایت کیا ہے: قلت: وأكله؟ قال: وأكل منه وقبله، آپ ﷺ نے اسے کھایا اور قبول فرمایا۔

(۳)......سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو خرگوش کھانیکا حکم دیا۔

(۴)......سنن دارقطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کو ایک خرگوش ہدیہ میں دیا گیا، اس وقت میں سو رہی تھی، آپ نے میرے لئے اسکی سرین رکھدی، پھر جب میں بیدار ہوئی تو آپ نے مجھے وہ کھلائی۔

(۵)......حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کے پاس خرگوش لایا، تو آپ نے اسے کھانے کا حکم دیدیا، اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے اس کا خون دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا: اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لہذا اسے کھالو، عرض کیا: میں روزے سے ہوں، آپ نے پوچھا: کونسا روزہ؟ اس نے کہا کہ میں ہر ماہ تین روزے رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا: کہ تم انہیں ایام بیض کے روزے کیوں نہیں بنالیتے (یعنی ہر مہینے میں ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کے روزے رکھ لیا کریں، یہ سنت ہیں، ان دنوں میں نفلی روزہ رکھنے سے سنت کا ثواب بھی حاصل ہو جائیگا)۔

یہ حدیث بالکل واضح ہے کہ خرگوش کا گوشت حلال ہے، اسے کھانے میں کوئی حرمت یا کراہت نہیں ہے، صرف شیعہ حضرات کے نزدیک خرگوش حرام ہے، باقی سب کے نزدیک حلال ہے۔

تحفة الاحوذی ابواب الاطعمة، باب ماجاء فی أکل الارنب، (۵:۴۰۰) تکملة فتح الملھم کتاب الصید والذبائح، باب إباحة الأرنب (۳:۵۳۶) بذل المجھود، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الأرنب (۱۶:۱۱۶)

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ أَكْلِ الضَّبِّ

یہ باب گوہ کے کھانے کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ عَنْ أَكْلِ الضَّبِّ، فَقَالَ: لاَ آكُلُهُ وَلاَ أُحَرِّمُهُ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے گوہ کے کھانے کے بارے میں سوال کیا گیا؟ تو آپ نے فرمایا: میں اسے نہ تو کھاتا ہوں اور نہ اسے حرام قرار دیتا ہوں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ قَالَ: أُكِلَ الضَّبُّ عَلٰى مَائِدَةِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَإِنَّمَا تَرَكَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَقَذُّراً۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی، اور رسول اللہ ﷺ نے نفرتِ طبعی کی وجہ سے اسے کھانا چھوڑ دیا۔

حل لغات: ۔ضب: (ضاد پر زبر اور باء کی تشدید کے ساتھ) اسکی جمع ہے ضِبَاب: گوہ، یہ ایک چالاک جنگلی جانور ہے، عموماً پتھریلی زمین میں بل بنا کر رہتا ہے، کہتے ہیں کہ گوہ پانی نہیں پیتی، اور اسکی عمر سات سو سال یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے، ہر چالیس دن کے بعد اسے ایک قطرہ پیشاب کا آتا ہے، اسکے دانت ایک قطعہ کی شکل میں ہوتے ہیں، جو کبھی نہیں گرتے، گوہ زمین میں گڑھا کھود کر انڈے دیتی ہے، جو تقریباً ستر ہوتے ہیں اور چالیس دن کے بعد اسکے بچے نکل آتے ہیں، گوہ ایذاء رسانی میں ضرب المثل ہے، کیونکہ یہ اپنے بچوں کو کھا جاتی ہے، اور صرف وہی بچے باقی بچتے ہیں، جو اس کے پاس سے بھاگ جاتے ہیں، حیات الحیوان (۲:۳۵۸)۔ **مائدة**: دسترخوان ج مَوَائِد۔ **تقذر**: گھن کرنا، ناپسند کرنا، طبعی طور پر نفرت کرنا۔

گوہ کا شرعی حکم

گوہ کا گوشت کھانا حلال ہے یا حرام؟ اس بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے، اور اس اختلاف کی وجہ احادیث کا تعارض ہے، بعض احادیث سے گوہ کا حلال ہونا معلوم ہوتا ہے، اور بعض سے اسکا

مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جمہور فقہاء کرام یعنی حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک گوہ کا گوشت حلال ہے، فقہاء احناف یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک گوہ کھانا مکروہ تحریمی ہے۔

جمہور کے دلائل

جمہور ان تمام روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں صراحۃً یا اشارۃً گوہ کھانے کا ذکر ہے، چند احادیث کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(۱)...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث باب، جس میں نبی کریم ﷺ سے گوہ کے بارے میں سوال کیا گیا؟ آپ نے فرمایا: میں اسے نہ کھاتا ہوں اور نہ اسے حرام قرار دیتا ہوں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوہ کھانا جائز ہے، کیونکہ اگر یہ حرام ہوتی تو حضور اکرم ﷺ ضرور منع فرما دیتے۔

(۲)...... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے گوہ کو حرام قرار نہیں دیا، اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ بہت سی مخلوق کو فائدہ پہونچاتا ہے، اور یہ عام چرواہوں کا کھانا ہے، اور اگر میرے پاس گوہ ہوتی تو میں اسے کھالیتا۔

(۳)...... حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت میمونہ کے گھر داخل ہوئے، جو آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں، اتنے میں ایک بھنی ہوئی گوہ لائی گئی، تو آپ ﷺ نے اسے کھانے کیلئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، تو وہاں موجود عورتوں نے آپس میں کہا کہ آپ ﷺ کو بتادو کہ یہ گوہ ہے، کیونکہ آپ تو اسے کھانے کا ارادہ فرمارہے ہیں، چنانچہ ان خواتین نے آپکو بتادیا کہ یہ بھنا ہوا گوشت گوہ کا ہے، یہ سنکر آپ نے اس گوہ کی طرف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، حضرت خالد نے (یہ دیکھا تو) پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا گوہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا: حرام تو نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ مکہ مکرمہ اور اسکے قرب وجوار میں نہیں پائی جاتی، اس لئے میں اس سے اپنے اندر (طبعی) کراہت محسوس کرتا ہوں، حضرت خالد فرماتے ہیں کہ (یہ سنکر) میں نے اس گوہ کو اپنی طرف کھینچ لیا، اور کھانے لگا، اور نبی کریم ﷺ مجھے دیکھتے رہے۔ موطأ امام

محمد، باب أكل الضب (ص:۲۸۵)

احناف کے دلائل

(۱)......عبدالرحمٰن بن شبل سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گوہ کھانے سے منع فرمایا ہے۔

(۲)......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کو ایک گوہ ہدیہ میں دی گئی پھر جب آپ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے آپ سے گوہ کھانے کے بارے میں پوچھا؟ آپ ﷺ نے انہیں گوہ کھانے سے منع فرمادیا، اتنے میں (دروازے پر) ایک سائلہ آگئی تو حضرت عائشہ نے یہ چاہا کہ وہ گوہ اسے دے دی جائے، تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ کیا اس سائلہ کو وہ چیز (گوہ) کھلانا چاہتی ہو جسے تم خود نہیں کھارہی۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے گوہ کھانے کو اپنے لئے اور دوسروں کیلئے پسند نہیں فرمایا۔

(۳)......حضرت ثابت بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، پھر ہم ایک جگہ اترے (جہاں بہت زیادہ گوہ تھیں) چنانچہ لوگوں نے بہت سی گوہ پکڑیں، میں نے بھی ایک گوہ پکڑی اور اسے بھون کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا، آپ نے ایک لکڑی لی اور اس سے اپنی انگلیاں شمار کرنے لگے (یہ عموماً اس وقت کیا جاتا ہے جب انسان کسی مسئلے میں خوب غور وفکر کررہا ہو) پھر آپ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی ایک امت کی شکلیں مختلف جانوروں میں مسخ ہوگئی تھیں، اور مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ جانور کونسے تھے (یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گوہ بھی انہی جانوروں میں سے ہو، اور حکم یہ ہے کہ انسانوں کی صورتیں جس جانور کی شکل میں مسخ ہوتی ہیں، تو وہ جانور حرام ہوجاتا ہے، اور نہ ہی اسکی نسل چلتی ہے) میں (حضرت ثابتؓ) نے عرض کیا! اے اللہ کے رسول: بہت سے لوگ گوہ کھاچکے ہیں (تو ان کا کیا ہوگا) راوی نے کہا: پھر آپ ﷺ نے نہ تو اسے کھانیکا حکم دیا اور نہ ہی اسکے کھانے سے منع فرمایا۔ سنن نسائی (۲:۱۹۷) کتاب الصید والذبائح، باب الضب۔

یہ دو طرح کی احادیث ہیں، جمہور ان روایات کو اختیار کرتے ہیں جن میں گوہ کے کھانیکا ذکر

ہے، اور حنفیہ ممانعت کی احادیث کو ترجیح دیتے ہیں۔

جمہور کی طرف سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہی کی احادیث اسلام کے ابتدائی زمانے سے متعلق ہیں، بعد میں اجازت کی احادیث نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اسلئے جمہور کے نزدیک گوہ کھانا حلال ہے۔

احناف کی طرف سے علامہ عینی رحمہ اللہ نے "بنایہ" میں یہ لکھا کہ معاملہ اسکے برعکس ہے یعنی ابتداء اسلام میں گوہ کھانے کی اجازت تھی، پھر جب اسکے کھانے سے حضور ﷺ نے منع فرمادیا تو ممانعت اور نہی کی احادیث نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تکملہ میں فرماتے ہیں کہ نسخ کا حکم لگانا ذرا مشکل ہے، کیونکہ کسی فریق کے پاس نسخ پر کوئی دلیل نہیں ہے، کہ کونسی احادیث ناسخ ہیں اور کونسی منسوخ، لیکن چونکہ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ طبعی طور پر گوہ کو پسند نہیں فرماتے تھے، اسی وجہ سے آپ نے کبھی کھائی بھی نہیں، تو اس سے کم از کم یہ حکم ضرور ثابت ہوتا ہے کہ گوہ کھانا مکروہ ہے، اور احناف کے نزدیک نہی کی احادیث اسی کراہت پر محمول ہیں۔

بالفاظ دیگر اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب حلت اور حرمت کی احادیث میں تعارض ہو جائے تو ترجیح احتیاطاً حرمت کو ہوتی ہے، اس اعتبار سے بھی نہی کی احادیث راجح ہونگی، اسلئے احناف کے نزدیک گوہ کھانا مکروہ ہوگا، پھر یہ کراہت کس درجے کی ہے، آیا کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی، احناف کے اس میں دونوں ہی قول ہیں، تاہم راجح یہی ہے کہ گوہ کھانا مکروہ تحریمی ہے۔

تکملة فتح الملهم (۵۲۷:۳) الکوکب الدری (۹:۳) تحفة الأحوذی (۴۰۲:۵) موطا امام محمد (ص:۲۸۴) هدایة (۴۴۱:۴) اعلاء السنن (۱۶۰:۱۷-۱۶۲) بذل المجهود (۱۲۰:۱۶)

مردہ گوہ کے ذریعہ حضور ﷺ کے ایک معجزے کا ظہور

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کی ایک محفل میں تشریف فرما تھے، کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک اعرابی آیا، یہ شخص گوہ کا شکار کر کے اسے اپنی آستین میں رکھ کر گھر لے جا رہا تھا تا کہ اسے بھون کر کھالے، جب اس نے صحابہ کی جماعت کو دیکھا تو پوچھا کہ یہ ہجوم کس کے پاس جمع ہے، لوگوں

نے بتایا کہ یہ اجتماع اس شخص کے آس پاس ہے جو نبوت کا دعویدار ہے، چنانچہ پھر وہ حضورﷺ کے قریب آ گیا، اور لوگوں کو مشقت میں ڈالدیا، کہنے لگا: قسم ہے لات وعزی کی: (اے محمد) نہیں جنا عورتوں نے ایسا کوئی انسان جو آپکے مقابلے میں میرے نزدیک زیادہ مبغوض اور قابل نفرت ہو، اور اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ اہل عرب مجھے جلد باز کہیں گے تو میں تجھے قتل کر کے سب لوگوں کو خوش کر دیتا، یہ بیہودہ گوئی سنکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرمﷺ سے اجازت چاہی کہ حضور مجھے اجازت دے دیجئیے تا کہ میں اسے قتل کردوں، نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! اے عمر: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بردبار شخص ہی نبوت کا مستحق ہوتا ہے۔

پھر وہ اعرابی نبی کریمﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ لات اور عُزّٰی کی قسم: میں آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لاؤں گا جب تک کہ یہ گوہ تم پر ایمان نہ لے آئے، یہ کہہ کر اس نے وہ گوہ اپنی آستین سے نکالکر حضورﷺ کے سامنے چھوڑ دی، اور کہا کہ اگر یہ گوہ تم پر ایمان لے آئے تو میں بھی تم پر ایمان لے آؤں گا۔

نبی کریمﷺ نے اسے آواز دی: یا ضب ! اے گوہ! آپکی آواز سن کر نہایت ہی واضح اور فصیح زبان میں اس نے جواب دیا، جس کو سب لوگ بھی سن رہے تھے، (اس گوہ نے یہ جواب دیا): لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ یَازَیْنَ مَنْ وَافَی الْقِیَامَۃَ (میں حاضر ہوں، آپ خوب خوشحال اور خوش نصیب ہوں، اے قیامت میں آنے والے تمام لوگوں کی زینت) پھر آپﷺ نے اس سے فرمایا: مَنْ تَعْبُدُ یَا ضَبّ؟ (اے گوہ! تم کس کی عبادت کرتی ہو)؟ گوہ نے جواب دیا:

"اَلَّذِیْ فِی السَّمَاءِ عَرْشُہُ، وَفِی الْأَرْضِ سُلْطَانُہُ، وَفِی الْبَحْرِ سَبِیْلُہُ، وَفِی الْجَنَّۃِ رَحْمَتُہُ، وَفِی النَّارِ عَذَابُہُ"

''میں اس ذات کی بندگی کرتی ہوں، جسکا عرش آسمانوں میں ہے، جسکی سلطنت زمینوں میں ہے، جس کے بنائے ہوئے راستے سمندر میں ہیں، جسکی رحمت جنت میں ہے اور جس کا عذاب جہنم میں ہے''

آپﷺ نے فرمایا: مَنْ اَنَا یاضب؟ میں کون ہوں اے گوہ؟

گوہ نے جواب دیا:

اَنْتَ رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَخَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ، وَقَدْ أَفْلَحَ مَنْ صَدَّقَکَ، وَقَدْ خَابَ مَنْ کَذَّبَکَ.

''آپ پروردگار عالم کے رسول اللہ خاتم الانبیاء ہیں، جس نے آپکی تصدیق کی وہ کامیاب رہا، اور جس نے آپکو جھٹلایا وہ ناکام ہوا''

اس اعرابی نے کہا: اپنی آنکھوں سے معجزے کا مشاہدہ کرنے کے بعد اب میں کسی اور چیز کی پیروی نہیں کروں گا، چنانچہ گوہ کا جواب سنکر اس نے اسلام قبول کرلیا، اور کہا: اللہ کی قسم: میں جس وقت آپکی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو میرے نزدیک روئے زمین پر کوئی بھی آپ سے زیادہ مبغوض نہیں تھا، اور اب آپ میرے نزدیک میری جان اور میری اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ میرے جسم کا رواں رواں ظاہر و باطن سے آپ کا دلدادہ ہو چکا ہے، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول برحق ہیں۔

حضورﷺ نے فرمایا: تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے تجھے اس دین کی ہدایت دی، جو دین کہ غالب ہے، مغلوب نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ اس دین کو نماز کے بغیر قبول نہیں فرماتے، اور نماز کو قرآن کے بغیر قبول نہیں فرماتے، اس اعرابی نے کہا کہ پھر مجھے قرآن سکھا دیجئے، حضورﷺ نے اسکو سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص سکھا دی، اعرابی نے کہا: اے اللہ کے رسول! اور بھی سکھا دیجئے، کیونکہ مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل کلاموں میں بھی میں نے ان سے بہتر کوئی کلام نہیں سنا، حضورﷺ نے فرمایا کہ یہ پروردگار عالم کا کلام ہے، کوئی شعر نہیں ہے، لہذا جب تو سورہ اخلاص ایک مرتبہ پڑھ لے گا تو گویا تو نے ایک تہائی قرآن پڑھ لیا، اور جب تو اسے دو مرتبہ پڑھ لے گا تو گویا تو نے دو تہائی قرآن پڑھ لیا، اور اگر تین مرتبہ اسے پڑھ لیا تو گویا پورا قرآن مجید پڑھ لیا۔

اعرابی نے کہا: ہمارا معبود کس قدر اچھا ہے کہ تھوڑا سا عمل قبول کر کے اسکا ڈھیروں ڈھیر ثواب دیتا ہے، پھر حضور اکرمﷺ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس مال و دولت ہے؟ اس نے بتایا کہ پورے قبیلہ بنو

سلیم میں مجھ سے زیادہ تنگدست کوئی نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کی مالی امداد کریں، چنانچہ حضرات صحابہ نے اسے مال دیا اور مال دینے میں خوب فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اسے اللہ کی رضا کی خاطر دس ماہ کی گابھن اونٹنی دیتا ہوں جو اس قدر تیز رفتار ہے کہ آگے والے کو پالیتی ہے اور پیچھے والا بھی کوئی اسکو نہیں پکڑ سکتا، یہ وہی اونٹنی ہے جو غزوہ تبوک کیلئے بھیجی تھی، اسپر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے جو کچھ دیا ہے اسے بیان کر دیا ہے، اور اسکے عوض اللہ تعالیٰ جو تم کو عطا فرمائے گا میں اسکو بیان کروں؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا! حضور بیان فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو اسکے بدلے میں ایک ایسی اونٹنی ملے گی جو شاندار اور کشادہ بڑے موتی کی طرح ہوگی جس کے پاؤں سبز زمرد کے اور گردن (یا آنکھیں) زرد زبرجد کی ہوگی، اسپر ایک کجاوہ ہوگا، جس پر باریک اور موٹا ریشم ہوگا، یہ اونٹنی تمہیں پل صراط پر سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی کی مانند لیکر گذر جائیگی، اس دن جو بھی تجھے دیکھے گا وہ رشک کریگا (کہ کاش یہ فضیلت مجھے بھی حاصل ہوتی)، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا (اے اللہ کے رسول) میں راضی ہوں۔

پھر وہ اعرابی حضور ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر نکلے تو ان کی ملاقات قبیلہ بنو سلیم کے ان ہزار گھوڑ سوار اعرابیوں سے ہوئی، جن کے پاس ایک ہزار تلوار اور ایک ہزار نیزے تھے، اس مومن اعرابی نے ان سے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس شخص (جھوٹے نبی) کو قتل کرنے جا رہے ہیں، جس نے ہمارے معبودوں کو غلط قرار دیا، مؤمن اعرابی نے کہا کہ تم ایسا (یعنی قتل) نہ کرو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، تو ان لوگوں نے کہا کہ اچھا تم بھی صابی ہو گئے (یعنی اپنے آباؤ واجداد کے دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لیا) تو پھر انہوں نے اپنا پورا قصہ ان لوگوں کو سنایا، قصہ سنکر سب لوگوں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور مشرف باسلام ہو گئے۔

اس حیرت انگیز واقعہ کا علم جب حضور ﷺ کو ہوا تو آپ نے ان سب کا چادر سے استقبال کیا پھر وہ اپنی سواریوں سے اتر آئے، اور ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا: **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**، عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ آپ لوگ حضرت خالد بن

ولید کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ، آپ کے زمانہ مبارک میں قبیلہ بن سلیم کے ان ہزار لوگوں کے علاوہ اتنی بڑی تعداد میں ایک ساتھ پھر کبھی نہ عرب میں لوگ ایمان لائے اور نہ عجم میں، (یہ فضیلت اسی قبیلے کے ان ہزار لوگوں کو حاصل ہوئی ہے)۔ کنز العمال ۱۲: ۳۵۵، مجمع الزوائد ۸: ۲۹۴

بَابُ مَاجَاءَ فِيُ اَكُلِ الضَّبُعِ

یہ باب کفتار کھانے کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ أَبِيُ عَمَّارٍ ، قَالَ : قُلْتُ لِجَابِرٍ : أَلضَّبُعُ أَصَيْدٌ هِيَ ؟ قَالَ : نَعَمْ ، قُلْتُ آكُلُهَا ؟ قَالَ نَعَمْ ، قُلْتُ : أَقَالَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ؟ قَالَ : نَعَمْ.

حضرت ابن ابی عمار سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے حضرت جابر سے دریافت کیا کہ کیا کفتار شکار رہے؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں، میں (ابن ابی عمار) نے پوچھا کہ میں اسکو کھالوں؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں، میں نے کہا: کیا حضور ﷺ نے یوں فرمایا ہے؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں۔

عَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ جَزْءٍ قَالَ : سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ أَكْلِ الضَّبُعِ قَالَ : أَوَيَأْكُلُ الضَّبُعَ أَحَدٌ ؟ وَسَأَلْتُهُ عَنْ أَكْلِ الذِّئْبِ فَقَالَ : وَيَأْكُلُ الذِّئْبَ أَحَدٌ فِيْهِ خَيْرٌ .

حضرت خزیمہ بن جزء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کفتار کھانے کے بارے میں پوچھا؟ (اسکو کھا سکتا ہوں یا نہیں) حضور ﷺ نے فرمایا: کفتار بھی کوئی کھاتا ہے؟ اور میں نے آپ سے بھیڑیئے کے کھانے کے بارے میں پوچھا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: بھیڑیے کو بھی کوئی کھاتا ہے جس میں تھوڑی سی خیر اور بھلائی ہو۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:۔ ضبع: (ضاد پر زبر اور باء پر پیش کے ساتھ) ایک درندہ ہے، جسے فارسی میں ''کفتار'' اور اردو میں ''ہنڈار'' یا ''بجو'' کہتے ہیں، اسکی جمع ضِباب ہے۔ صید: شکار۔ الذئب: (ذال کے نیچے زیر اور ہمزے کے سکون کے ساتھ) بھیڑیا جمع ذئاب۔

ضبع کی حلت وحرمت کا مسئلہ

کفتار حلال ہے یا حرام، اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک حلال ہے، جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ حرام ہے، شافعیہ اور حنابلہ اس باب کی پہلی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کفتار کھانیکی اجازت دی ہے، لہذا کفتار حلال ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ سے لوگ اسے کھاتے رہے ہیں، اور اسکی خرید و فروخت صفا مروہ کے قریب بغیر کسی روک ٹوک کے ہوتی رہی اور اہل عرب اسے اچھا سمجھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں، اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کفتار حلال ہے اور اسکا کھانا جائز ہے، الکوکب الدری ۳/۱۰۔

حنفیہ اور مالکیہ کے دلائل

(۱)......حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گوہ، کفتار، کتے، پچھنے لگانے کی کمائی، اور پیشہ ور زانیہ عورت کی کمائی کھانے سے منع فرمایا۔ کنز العمال ۲۰: ۲۲

(۲)......حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر "ذی ناب من السباع" یعنی درندوں میں جو جانور کچلی والا ہو (یعنی جو دانت سے اپنا شکار پکڑتا ہو جیسے شیر اور بھیڑیا وغیرہ) اسکو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ صحیح بخاری ۲: ۸۳

اس مفہوم کی جتنی احادیث منقول ہیں، ان سب سے حنفیہ اور مالکیہ استدلال کرتے ہیں، کیونکہ ضبع بھی ان درندوں میں سے ہے جو دانت سے اپنا شکار پکڑتے ہیں، تو جسطرح دوسرے درندے حرام ہیں، اسی طرح کفتار بھی حرام ہے۔

(۳)......اس باب کی دوسری حدیث جو حضرت خزیمہ بن جزء سے منقول ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أو یأکل الضبع أحد؟ کیا کفتار کو بھی کوئی کھاتا ہے، اسی طرح بھیڑیے کے بارے میں آپ نے فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ بجو بھی بھیڑیے کی طرح ایک درندہ ہے لہذا بھیڑیے کیطرح اسکا کھانا بھی جائز

نہیں ہے۔

یہ حدیث اگر چہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، کیونکہ اس میں اسماعیل بن مسلم نے عبدالکریم بن ابی المخارق سے روایت کیا ہے، اور یہ دونوں راوی ضعیف ہیں، ان پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے، بلکہ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ عبدالکرم بن ابی المخارق کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے، لیکن چونکہ "تحریم کل ذی ناب من السباع" والی احادیث اسکی تائید کررہی ہیں، اور یہ احادیث صحیح ہیں، اسلئے حضرت خزیمہ بن جزء کی روایت سے استدلال کرنا درست ہے، اسلئے ضبع کھانا جائز نہیں ہے۔

اس باب کی پہلی حدیث جس سے شافعیہ اور حنابلہ استدلال کرتے ہیں، اس کے بارے میں حنفیہ اور مالکیہ یہ کہتے ہیں، کہ اس میں نبی کریم ﷺ نے صرف یہ ذکر فرمایا کہ "کفتار ایک شکاری جانور ہے" اس کے کھانیکا حکم آپ نے نہیں دیا، بلکہ کھانے کے جواز کا فتوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دیا ہے، انہوں نے لفظ "صید" سے یہ سمجھا کہ یہ حلال ہے اور اسے کھایا جاسکتا ہے، جیسا کہ ہرن ایک شکاری جانور ہے، اور اسکا کھانا بھی جائز ہے۔

اسکی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہی سنن ابوداؤد میں منقول ہے، اس میں "أکــل" (کھانے) کا ذکر نہیں ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے "کفتار" کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: **"هُوَ صَيْدٌ، وَيُجْعَلُ فِيْهِ كَبْشٌ إِذَا صَادَهُ الْمُحْرِمُ"** وہ ایک شکار ہے، اگر کوئی شخص حالت احرام میں اسکا شکار کرلے تو اسپر ایک دم لازم ہوجائیگا"

لہذا شافعیہ اور حنابلہ کا باب کی پہلی حدیث سے استدلال تام نہیں ہے ناقص ہے، اسلئے کہ کسی جانور کے محض شکاری ہونے سے اسکا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، شکار تو ان جانوروں کا بھی ہوسکتا ہے جنکا گوشت نہیں کھایا جاسکتا۔

اور اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح بھی ہو، اس میں کوئی کلام نہ ہو، تب بھی یہ حدیث منفرد ہے، اور اسکے مقابلے میں "کــل ذی ناب من السباع" کی حرمت کی احادیث مشہور ہیں اور متعدد بھی ہیں، بلکہ امام طحاوی نے انہیں متواتر قرار دیا ہے، اسلئے حدیث جابر کے مقابلے میں حرمت والی احادیث راجح ہونگی۔

بعض حنفیہ اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ضبع کے حلال ہونے کا حکم ابتداء میں تھا، بعد میں جب قرآن مجید کی آیت "ویحرم علیھم الخبائث" نازل ہوئی تو پھر اجازت منسوخ ہوگئی، لہذا جن احادیث میں ضبع کے کھانیکا ذکر ہے وہ اس زمانے سے متعلق ہیں جس میں ابھی تک اسکی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

یا یوں کہیئے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حلت کا ذکر ہے، اور حضرت خزیمہ بن جزء، حضرت علی، اور حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہم کی احادیث میں حرمت کا ذکر ہے، حلت وحرمت میں جب تعارض ہو جائے تو ترجیح چونکہ حرمت کو ہوتی ہے، اس لئے نہی والی احادیث راجح ہونگی۔ تحفۃ الاحوذی ۵:۶ ۴۰، اعلاء السنن ۱۷:۱۶۳، درس ترمذی ۳:۱۱۲، بذل المجھود ۱۶:۱۲۸، فتح القدیر ۸:۴۱۸

نیز امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ استدلال کہ اہل عرب صفا مروہ کے قریب اسکی خرید وفروخت کرتے ہیں اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں، یہ اس لئے درست نہیں کہ یہ ان لوگوں کا اپنا اجتہاد ہے، جو دوسروں پر حجت نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کی محض خرید وفروخت سے اس کے کھانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، لہذا اہل عرب کا بجو کی تعریف کرنا بھی اس کے حلال ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا کیوں کہ وہ تو شیر، چیتے اور ہاتھی وغیرہ کی بھی تعریف کرتے ہیں، حالانکہ ان کا کھانا جائز نہیں ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْخَيْلِ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں گھوڑوں کا گوشت کھانیکا ذکر ہے

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : أَطْعَمَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لُحُوْمَ الْخَيْلِ وَنَهَانَا عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور ہمیں گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا ہے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔ اَطْعَمَنَا: ہم کو کھلایا، باب افعال۔ نَهَانَا: ہمیں منع کیا، صیغہ واحد مذکر غائب فعل ماضی معروف از باب فتح یفتح۔ لُحُوْم: لَحم کی جمع ہے، گوشت۔ اَلْحُمُرُ: حِمَار کی جمع ہے: گدھا۔

گھوڑے کے گوشت کا حکم

گھوڑے کا گوشت کھانے کے بارے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، شافعیہ، حنابلہ، حنفیہ میں سے امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت بغیر کسی کراہت کے حلال ہے ان حضرات کا استدلال حدیث باب سے ہے، جس میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو گھوڑوں کا گوشت کھلایا۔

امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے پہلے قول کے مطابق گھوڑے کا گوشت مکروہ تحریمی ہے، احناف کے ہاں اسپر عموماً دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)...... سنن ابوداؤد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے گھوڑے، خچر اور گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

(۲)...... صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بطور احسان جتلانے کے فرمایا: "والخیل والبغال والحمیر لترکبوها و زینة" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑے، خچر اور گدھوں کے صرف دو منافع ذکر فرمائے ہیں، ایک سواری اور دوسرا زینت، اگر ان کا کھانا حلال ہوتا تو ضرور اللہ تعالیٰ اسے بھی ذکر فرمادیتے کہ گھوڑا حلال ہے، اور جب ذکر نہیں فرمایا تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گھوڑا حلال نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ موقف ابتداء کا ہے، بعد میں امام صاحب نے اس قول سے رجوع فرمالیا ہے، چنانچہ "الدرالمختار" میں علامہ حصکفی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ امام صاحب نے اپنی وفات سے تین دن قبل حرمت کے اس قوت سے رجوع کرلیا ہے، اب حنفیہ کے ہاں فتوی اسپر ہے کہ گھوڑے کا گوشت صرف مکروہ تنزیہی ہے، اور یہ کراہت اسکے نجس ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اسکے اعزاز واکرام کی وجہ سے ہے، کیونکہ وہ جہاد کا ایک اہم آلہ شمار ہوتا ہے۔ تکملة فتح الملهم كتاب الصيد والذبائح، باب إباحة أكل لحم الخيل (۳:۵۲۴) الدرالمختار (۶:۳۰۵، ۳۴۰) المغنی لابن قدامة (۸:۵۹۱)

بَابُ مَاجَاءَ فِي لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ

یہ باب پالتو گدھوں کے گوشت کے (حکم) کے بارے میں ہے

عَنْ عَلِيّ رضی الله عنه قَالَ: نَهىٰ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ زَمَنَ خَيْبَرَ

وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ.

حضرت علی رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے (فتح کے) موقع پر عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کے گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی الله عنه اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ حَرَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ كُلَّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَالْمُجَثَّمَةَ وَالْحِمَارَ الإِنْسِيَّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے (فتح کے) موقع پر درندوں میں سے ہر کچلی والے جانور کو اور اس جانور یا پرندے کو جسے گھونٹ کر مارا گیا ہو، اور پالتو گدھے کو حرام قرار دیا۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔متعة: (میم پر پیش اور تا کے سکون کے ساتھ) فائدہ اٹھانا، اور "متعة النساء" کے ایک خاص معنی ہیں، جسکی تفصیل آگے تشریح میں آرہی ہے۔ السباع: سبع کی جمع ہے: درندہ۔ ذی ناب: کچلی والا جانور، اس سے وہ تمام جانور مراد ہیں جن کے تندو تیز شکاری دانت ہوتے ہیں، اور انہی دانتوں سے وہ چیر پھاڑ کرتے ہیں اور شکار کرتے ہیں جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا اور بلی وغیرہ۔ المجثمة: (میم پر پیش، جیم پر زبر اور تاء پر تشدید اور زبر) وہ جانور جسے گھونٹ کر ماردیا جائے، یا وہ جسے زمین میں گاڑ کر یا کسی چیز سے باندھ کر نشانہ بنا کر تیر یا گولی ماری جائے، اور ذبح کے بغیر ہی وہ مرجائے کہا جاتا ہے: جَثَّمَه: اتنا گھونٹنا کہ دم نکل جائے، گھونٹ کر ماردینا، کسی شئی کو نشانہ بنا کر تیر وغیرہ مارنا۔

متعہ اور موقت کے معنی

نکاح کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......نکاح متعہ: اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے کہے: اَتَمَتَّعُ بِكِ، كَذَامُدَّةً، بِكَذَا مِنَ الْمَالِ (میں آپ سے اتنی مدت کیلئے اتنے مال کے عوض تمتع کرتا ہوں) اور پھر وہ اسے قبول کرلے، اس میں نہ لفظ نکاح استعمال ہوتا ہے، اور نہ دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔

(۲)......نکاح موقت: کوئی شخص کسی عورت سے کہے: اَتَزَوَّجُ بِكِ، كَذَامُدَّةً، بِكَذَا مِنَ الْمَالِ (میں

آپ سے اتنے عرصہ کیلئے اتنے مال کے عوض نکاح کرتا ہوں) اس میں لفظ تزوج (نکاح) استعمال ہوتا ہے اور دو گواہ بھی ہوتے ہیں، اور مدت کی تحدید اس میں بھی ہوتی ہے۔

متعہ حرام ہے

متعہ کی حرمت پر پوری امت کا اتفاق ہے، سوائے روافض (شیعہ) کے کہ وہ اس کو حلال سمجھتے ہیں، البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسکا جواز منقول ہے، اور وہ بھی انتہائی مجبوری اور اضطراری حالت میں اسکے جواز کے قائل تھے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں سمجھایا اور حرمت متعہ کی احادیث سنائیں تو پھر اس قول سے بھی رجوع فرمالیا تھا، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب ما جاء فی نکاح المتعہ کے تحت اسکی تصریح فرمائی ہے، گویا پھر پوری امت کا اسکی حرمت پر اجماع ہوگیا، صرف شیعہ اسکے حلت اور جواز کے قائل ہیں۔

روافض (شیعہ) کے ہاں متعہ کا مقام

شیعہ کے نزدیک متعہ ایک عظیم عبادت ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی ایک مرتبہ متعہ کرتا ہے تو اسکا درجہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے برابر ہوجاتا ہے، اور اگر یہ سعادت اسکو دوسری بار بھی حاصل ہو جائے تو وہ حضرت حسن کے مرتبہ کے مساوی ہوجاتا ہے، اور جو تین مرتبہ متعہ کرلے تو اسکا درجہ حضرت علی کے برابر ہوجاتا ہے، اور جو چار مرتبہ کرلے اسکا درجہ (نعوذ باللہ) حضور اکرم ﷺ کے برابر ہوجاتا ہے۔

اور کہتے ہیں کہ متعہ کرنے والا جب متعہ کے بعد غسل کرتا ہے تو دوران غسل گرنے والے قطرات میں ہر ہر قطرہ سے فرشتہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ اس متعہ کرنے والے کے لئے مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کرتا رہتا ہے، متعہ کی یہ فضیلت خود ان کی کتابوں میں درج ہے۔

حلتِ متعہ پر روافض کا غلط استدلال

روافض متعہ کے حلال ہونے پر قرآن مجید کی سورۃ النساء کی اس آیت (نمبر ۲۴) سے استدلال کرتے ہیں: **فما استمتعتم به منهن فاٰتو هن أجورهن فريضة، ولا جناح عليكم فيما تراضيتم**

بـه من بعد الفريضة، ان الله كان عليما حكيما ۔(ترجمہ: اسلئے جن عورتوں سے تم فائدہ اٹھاؤ، انہیں ان کا مقرر کیا ہوا مہر دیدو، اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے جو طے کرلو، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے)

"استمتاع" کے لفظ سے شیعہ حضرات نکاح متعہ کا اور "اجورھن" سے اجرت کا اثبات کرتے ہیں، نیز حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن عباس کی قرأت میں "**إلىٰ أجل مسمّى**" (ایک معین مدت تک) کا اضافہ بھی ہے، ان کی قرأت یوں ہے: **فما استمتعتم به منهن إلى اجل مسمى**، گویا اس میں اجل (مدت)، متعہ اور اجرت تینوں چیزوں کا ذکر ہے، اسی کا نام "متعہ" ہے، لہذا متعہ کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے۔

لیکن روافض کا بیان کردہ مفہوم درست نہیں ہے، اسکا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جب تم ان حلال عورتوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلو اور اسکے بعد استمتاع یعنی نکاح کے بعد صحبت و مباشرت اور ازدواجی تعلقات قائم کرلو تو پھر اسکا پورا مہر ادا کرو، **فما استمتعتم** سے کسی نئی چیز کا حکم نہیں دیا جارہا بلکہ یہ سابقہ کلام سے متعلق ہے، اور اسی کا تتمہ ہے، لہذا اہل تشیع کا یہ کہنا کہ اس سے نکاح متعہ کا اثبات ہے، درست نہیں ہے۔

اور "**منهن**" کی ضمیر منکوحہ عورتوں کیطرف لوٹ رہی ہے، اور "**أجورهن**" سے مہر مراد ہے، کیونکہ "اجر" کا لفظ قرآن مجید کی دوسری آیت میں مہر کیلئے استعمال ہوا ہے، جیسے "**فانكحوهن بإذن أهلهن واتوهن أجورهن**" اس میں بالاتفاق اجر سے مہر مراد ہے، اسلئے زیر بحث آیت میں بھی اجر سے مہر ہی مراد ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی قرأت سے شیعہ کا استدلال اسلئے درست نہیں ہے کہ وہ قرأت شاذہ ہے، جس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

حرمت متعہ پر قرآنی آیات

حدیث کے علاوہ قرآن مجید کی بھی کئی آیات سے متعہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے، جن میں سے چند آیات کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)......سورہ معارج میں فرمایا: **والذين هم لفروجهم حافظون، إلا على**

أزواجهم أو ما ملكت أيمانهم فانهم غير ملومين،فمن ابتغى وراء ذالک فَاُولٰٓئِکَ هم العادون۔آیت نمبر۲۹،۳۰،۳۱۔

ترجمہ:''اور جولوگ اپنی شرمگاہوں کی (حرام سے) حفاظت کرتے ہیں،ہاں ان کی بیویوں اورلونڈیوں کے بارے میں،جنکے وہ مالک ہیں،انہیں کوئی ملامت نہیں،اب جوکوئی اسکے علاوہ (راہ) ڈھونڈے گاتوایسے لوگ حد سے گذرجانے والے ہونگے''

ان آیات میں صرف دوقسم کی عورتوں سے''مخصوص تعلقات'' قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے ایک بیویاں اوردوسری لونڈیاں،انکے علاوہ کسی اورعورت سے''جنسی تعلقات'' قائم کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اورجس عورت سے متعہ کیا جاتا ہے وہ چونکہ ان دوقسموں میں سے کسی میں داخل نہیں ہے،اسلئے متعہ کرنے والےلوگ **فمن ابتغى وراء ذالک فاولئک هم العادون** میں داخل ہیں،اس آیت سے متعہ کی حرمت بالکل صاف طور پر ثابت ہورہی ہے۔

(۲)......سورہ النساء میں فرمایا:**فان خفتم الا تعدلوا فواحدة او ماملکت ایمانکم** آیت نمبر۳۔

ترجمہ:لیکن اگر تمہیں برابری نہ کرسکنے کا خوف ہوتو ایک ہی (بیوی) کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی (کہ اس سے تعلقات قائم کرلو)

اس آیت میں بھی اجازت یا تو نکاح کی ہے یا اپنی لونڈی کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی،اورمتعہ نہ نکاح ہےاورنہ ہی اس میں باندی کی کوئی صورت پائی جاتی ہے،نیز اس سے پہلے آیت میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان زیادہ سے زیادہ بیک وقت چار عورتوں سے شادی کرسکتا ہے،چار سے زیادہ نہیں،جبکہ متعہ روافض کے ہاں بیک وقت دس عورتوں سے بھی کیا جاسکتا ہے،بلکہ ان کی کتابوں میں ہے کہ ہزار عورتوں سے بھی متعہ کیا جاسکتا ہے۔

(۳)......سورۃ النور میں فرمایا:**ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحاً حتی یغنیهم الله من فضله**،آیت ۳۳۔

ترجمہ :اور ان لوگوں کو پاکدامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں محض اپنے فضل سے مالدار بنادے(تب نکاح کرلیں)

اس آیت میں ہے کہ جب کوئی شخص فقر و فاقہ کی وجہ سے شادی نہ کرسکتا ہو، تو اسے اپنے نفس پر قابو رکھنا چاہیے، پھر جب اسکی مالی حالت صحیح ہو جائے تو پھر نکاح کرلے، دیکھیے اگر اسلام میں متعہ جائز ہوتا تو اسطرح کے بندے کو متعہ کی اجازت دیجاتی، اور اسے صبر کی تلقین نہ کی جاتی، اسلئے قرآن مجید کا یہ انداز صاف صاف بتارہا ہے کہ متعہ جائز نہیں ہے، حرام ہے۔

متعہ کب حرام ہوا

اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ متعہ منسوخ ہو چکا ہے، البتہ اس میں روایات مختلف ہیں کہ کب اور کس موقع پر یہ منسوخ ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیثِ باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعہ غزوہ خیبر کے موقع پر حرام ہوا، بعض سے غزوہ حنین اور اوطاس کے موقع پر، بعض سے غزوہ تبوک کے موقع پر اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حرام ہوا۔

اسکی تفصیل میں محدثین فرماتے ہیں کہ تبوک والی روایت ضعیف ہے، اس میں کسی راوی سے وہم ہوا ہے، اس لئے اسکا اعتبار نہیں ہے۔

اور جن روایات میں غزوہ حنین اور اوطاس کا ذکر ہے، ان میں کسی راوی سے غلط فہمی ہوگئی ہے، کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر متعہ کی اجازت دی گئی تھی، پھر اسے حرام کردیا گیا تھا، لیکن چونکہ فتح مکہ، غزوہ حنین واوطاس ایک ہی سفر میں پیش آئے تھے، اس لئے کسی نے اسکی نسبت فتح مکہ کیطرف کردی اور کسی نے غزوہ حنین اور اوطاس کا ذکر کردیا۔

اب دو قسم کی روایات رہ جاتی ہیں جن میں بعض سے غزوہ خیبر میں اسکی حرمت کا اعلان معلوم ہوتا ہے، اور بعض سے فتح مکہ کے موقع پر متعہ کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بارے میں امام شافعیؒ اور ان کے بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ متعہ کی حرمت سب سے

پہلے غزوہ خیبر کے موقع پر ہوئی، اس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر صرف تین دن کیلئے اس کی رخصت دی گئی تھی، اور پھر تین دن کے بعد ہمیشہ کیلئے اسکو حرام کر دیا گیا، امام نووی نے اسکو راجح اور پسندیدہ قرار دیا ہے، اس تفصیل کے اعتبار سے روایات میں تعارض ختم ہوجاتا ہے۔

درس ترمذی (۳:۴۰۱) کشف الباری، کتاب المغازی (ص:۴۳۴) تکملۃ فتح الملہم (۳:۵۱۷) معارف القرآن (۳:۳۶۶) روح المعانی (الجزء الخامس:ص:۵) ط: امدادیہ ملتان، صحیح مسلم (۱:۴۵۲)

پالتو گدھا حرام ہے

حدیث باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پالتو گدھا حرام ہے، اسکا گوشت کھانا ناجائز اور حرام ہے، البتہ جنگلی گدھا جسے گورخر کہا جاتا ہے، وہ حلال ہے، اسکا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِیْ الأَکْلِ فِیْ آنِیَةِ الْکُفَّارِ

یہ باب کفار کے برتنوں میں کھانے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ قَالَ : سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ قُدُوْرِ الْمَجُوْسِ قَالَ :أَنْقُوْهَا غَسْلاً وَاطْبَخُوْا فِیْهَا . وَنَهیٰ عَنْ کُلِّ سَبُعٍ ذِیْ نَابٍ.

حضرت ابوثعلبہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے آتش پرستوں کی ہانڈیوں (کے استعمال) کے بارے میں پوچھا گیا؟ آپ نے فرمایا: انہیں دھوکر صاف کرو، پھر ان میں پکاؤ، اور آپ نے ہر کچلی والے درندے (کو کھانے) سے منع فرمایا۔

عَنْ أَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ أَنَّهُ قَالَ : یَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّا بِأَرْضِ أَهْلِ الْکِتَابِ فَنَطْبَخُ فِیْ قُدُوْرِهِمْ وَنَشْرَبُ فِیْ آنِیَتِهِمْ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : إِنْ لَّمْ تَجِدُوْا غَیْرَهَا فَارْحَضُوْهَا بِالْمَاءِ ثُمَّ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللهِ : إِنَّا بِأَرْضِ صَیْدٍ فَکَیْفَ نَصْنَعُ؟ قَالَ إِذَا أَرْسَلْتَ کَلْبَکَ الْمُکَلَّبَ وَذَکَرْتَ اسْمَ اللهِ فَقَتَلَ فَکُلْ ، وَإِنْ کَانَ غَیْرَ مُکَلَّبٍ فَذُکِّیَ فَکُلْ ، وَاِذَا رَمَیْتَ بِسَهْمِکَ وَذَکَرْتَ اسْمَ اللهِ فَقَتَلَ فَکُلْ .

حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے

رسول: بیشک ہم اہل کتاب کی زمین میں رہتے ہیں، ان کی ہانڈیوں میں ہم پکاتے ہیں اوران کے برتنوں میں ہی پیتے ہیں (کیا یہ ہمارے لئے جائز ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اور کوئی برتن نہ پاؤ تو انہیں پانی سے دھولو (پھر انہیں استعمال کرو) پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول: بیشک ہم شکار کی زمین میں رہتے ہیں (یعنی وہاں شکاری جانور بہت زیادہ ہوتے ہیں) تو کیسے (شکار) کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سدھایا ہوا کتا (شکار کیلئے) چھوڑ دو، اور (چھوڑتے وقت اسپر) بسم اللہ پڑھ لو، پھر اس نے شکار کو مار دیا، تو اسکو کھالو، اور اگر کتا تعلیم یافتہ نہ ہو (اور شکار کرلے) اور اسے ذبح کیا گیا ہو تو اس کو کھالو، اور جب تم تیر چلاؤ اور اسپر بسم اللہ پڑھ لو، اور اس سے شکار مر گیا تو اسکو کھالو۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔قُدُور: قِدْر کی جمع ہے: ہانڈی، دیگچی، دیگ۔مجوس: وہ لوگ جو خدا کے علاوہ آگ کی پرستش کرتے ہیں، یہ کافر ہیں، انیہ: یہ إناء کی جمع ہے، اور پھر آنیة کی جمع "أوانی" ہے: برتن۔ارحضوها: رَحَضَ رحضاً: دھونا، تم ان کو دھولو۔المکلّب: یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے، کلب تکلیباً: کتے کو سدھانا، سکھانا، شکاری بنانا، پھر یہ لفظ ہر شکاری جانور باز وغیرہ کے سکھلانے اور شکار پر چھوڑنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔الکلب المکلب: سدھایا ہوا کتا۔فذکی: ذکّی تذکیة: ذبح کرنا۔

احادیث کی تشریح

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت دو حدیثیں ذکر کی ہیں، دونوں کے راوی حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ثعلبہ کے نام میں مختلف اقوال ہیں، جرثوم، جرہم، ناشب، غرنوق، ناشر، لاش اور لاشن، ان کے والد کے نام میں بھی اختلاف ہے: عمرو، ناشب، جلہم، جمیر۔

یہ صحابی چونکہ اہل کتاب کے ساتھ رہتے تھے، اس لئے نبی کریم ﷺ سے انہوں نے ان کے برتنوں کے استعمال کے بارے میں سوال کیا، کہ ہم انہیں استعمال کر سکتے ہیں، یا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہارے پاس اور کوئی برتن نہ ہو تو انہیں دھو کر استعمال کر سکتے ہو، دھوئے بغیر انہیں استعمال نہ کیا جائے، اور

پھر دوسرا سوال یہ کیا کہ ہم جس زمین میں آباد ہیں، وہاں شکار بہت دستیاب ہوتا ہے، اور بسا اوقات ہمارے پاس انہیں ذبح کرنے کی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی تو ایسے موقع پر ہم کیا کریں، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم ایسے کتے کے ذریعہ شکار کررہے ہو کہ جسے سدھایا گیا ہو، تو جب تم اسے شکار کیلئے بھیجو تو اسپر بسم اللہ پڑھ لو، ایسے میں اگر وہ حلال جانور شکار کرکے لائے، تو وہ تمہارے لئے حلال ہوگا، اسے پھر چھری وغیرہ سے ذبح کرنیکی ضرورت نہیں، لیکن اگر وہ عام کتا ہو، سدھایا ہوا نہ ہو، تو پھر وہ جو جانور پکڑے تو اسکا ذبح کرنا ضروری ہوگا، ذبح کے بغیر وہ حلال نہیں ہوگا، اور آپ ﷺ نے فرمایا: اور اگر تم شکاری جانور کی طرف تیر چلاؤ تو اسپر بسم اللہ پڑھ لو، پھر وہ جانور اس سے مرگیا تو وہ ذبح کے بغیر ہی حلال ہوگا اور اسکا کھانا بالکل درست ہوگا۔

صحابی کے قول: إنا بأرض أهل الكتاب سے ملک شام کی سرزمین مراد ہے، عرب کے کئی قبائل ملک شام میں رہ کر نصرانی بن گئے تھے، ان میں سے ایک قبیلہ حضرت ابوثعلبہ کا بھی تھا۔ فتح الباری، کتاب الصید والذبائح، باب ۹:۵۶۷

"نهى عن كل سبع ذی ناب" آپ ﷺ نے ہر اس جانور کو کھانے سے منع فرمایا جو کچلی والا ہے، جیسے شیر، چیتا اور لومڑی وغیرہ۔

"ناب" اسکی جمع انیاب ہے ان خاص دانتوں کو کہا جاتا ہے جو سامنے کے چار دانتوں سے پیچھے ہوں، ان دانتوں کی کتے کے دانتوں کیطرح نوک ہوتی ہے، اسلئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ جانور جو درندہ صفت ہو، اور کچلی سے چیر پھاڑ کر کھاتا ہو وہ حرام ہے جیسے لومڑ، کتا، چیتا اور ہاتھی وغیرہ، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ "سبع" اس جانور کو کہا جاتا ہے جو صرف انسان پر حملہ آور ہوتا ہو، اسلئے اس حکم سے وہ گوہ، لومڑ اور بجو کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں کہ ان کا کھانا جائز ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۵/۴۱۹۔

کفار کے برتنوں کو استعمال کرنیکا شرعی حکم

مشرکین اور کفار کے برتنوں کے استعمال کا حکم یہ ہے کہ اگر ان میں نجاست کے ہونے کا یقین ہو، تو ایسی صورت میں دھوئے بغیر ان کا استعمال جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، ہاں اگر دھو لئے گئے تو پھر ان کا استعمال جائز ہے، اور اگر ان میں نجاست نہیں ہے تو پھر دھوئے بغیر ان کا استعمال مکروہ ہے، حرام نہیں، اور دھونے کے

بعدان کا استعمال بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، چاہے اور برتن ہوں یا نہ ہوں، چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ نے اسکی تصریح فرمائی ہے۔

حدیث باب کے الفاظ "إن لم تجد غيرها فارحضوها بالماء" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دوسرے برتن میسر ہوں تو اہل کتاب کے برتن استعمال نہیں کرنے چاہیں، جبکہ فقہاء نے اسکی اجازت دی ہے، بظاہر حدیث کے الفاظ اور فقہاء کے قول کے درمیان تعارض ہے:

اس تعارض کے حل کیلئے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)...... حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ کا مذکورہ سوال ان برتنوں کے متعلق تھا، جن میں نجاست ہوتی تھی، چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں تصریح ہے، وہ صحابی فرماتے ہیں: "ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں، وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے ہیں اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں" چونکہ خنزیر اور شراب دونوں ناپاک ہیں، اسلئے ایسے برتنوں کا استعمال دھوئے بغیر ناجائز اور حرام ہے، اور اگر دوسرے برتن موجود ہوں، تو ان کا استعمال دھونے کے باوجود مکروہ ہے، اور فقہاء کا قول ان برتنوں سے متعلق ہے جو ناپاک نہ ہوں۔

(۲)...... حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ دوسرے برتنوں کی موجودگی کے وقت مشرکین کے برتنوں کو استعمال کرنا کوئی ناجائز اور حرام نہیں ہے، صرف مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے، کیونکہ اگر وہ برتن واقعۃً ناپاک ہوں تو دھونے کے بعد وہ پاک ہوجاتے ہیں، اور جب غالب گمان ہو کہ ان برتنوں میں کوئی نجاست نہیں ہے تو پھر دھوئے بغیر بھی ان کا استعمال درست ہے، لہذا فقہاء کے قول اور حدیث کے مفہوم میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس جواب کو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔

اسکی تائید ابوداؤد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہین کہ: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کیلئے جاتے تھے، اور جب ہمیں مشرکین کے برتن اور ان کی مشکیں حاصل ہوجاتیں تو ہم انہیں استعمال کرتے تھے، اور آپ ﷺ ہمیں اس سے منع نہیں فرماتے تھے"

تکملة فتح الملهم کتاب الصيد والذبائح، مسألة الأكل في انية المشركين ۳:۴۹۶ فتح الباری ۹:۷۵۶ کشف الباری کتاب الصید والذبائح ۲۲۸ فتاوی عالمگیری ۵:۳۴۷ سنن ابوداؤد ۲:۵۳۶ کتاب

الأطعمة باب فی استعمال آنية أهل الكتاب۔

لنڈے بازار کے کپڑوں کا حکم

لنڈے بازار میں عموماً استعمال شدہ کپڑے فروخت ہوتے ہیں، جو بیرون ملک سے آتے ہیں، اسطرح کے کپڑوں کا حکم یہ ہے کہ اگران پرواضح طور پرنجاست لگی ہوئی ہو، یاان کی ناپاکی کا غالب گمان ہوتو پھرانہیں دھونا ضروری ہوگا،لیکن اگر بظاہر صاف ستھرے ہوں اور ناپاکی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتو ایسی صورت میں دھونااگرچہ ضروری نہیں ہے، تاہم احتیاط یہی ہے کہ انہیں دھوکر استعمال کیا جائے، تاکہ کسی طرح کا کوئی شک اور وہم باقی نہ رہے۔

کتے کے ذریعہ شکار کے حلال ہونیکی شرائط

وہ کتا یا باز جسے شکار کی تعلیم دی گئی ہو، وہ اگر کوئی جانور شکار کر کے لائے تو کیا وہ حلال ہوگا یا حرام، اس کے لئے مندرجہ ذیل پانچ شرائط ہیں:

(۱)......کتایاباز سکھایااور سدھایا ہواہو۔

(۲)......آدمی نے اپنے ارادے سے شکاری کتے یاباز کوشکار پکڑنے کیلئے چھوڑا ہو، یہ نہ ہو کہ وہ خود بخود شکار کے پیچھے دوڑ کر اسے پکڑ لیں۔

(۳)......شکاری جانورشکار سے خود نہ کھائے، بلکہ اسے پکڑ کر آدمی کے پاس لے آئے۔

(۴)......شکاری کتے یاباز کو جب شکار پر بھیجا جائے توبسم اللہ پڑھ کر انہیں چھوڑا جائے۔

(۵)......شکاری جانوراس شکار کوزخمی بھی کردے، یہ شرط صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔

یہ ذہن میں رہے کہ یہ حکم صرف ان وحشی جانوروں سے متعلق ہے، جوانسان کے قبضہ میں نہ ہوں، لیکن اگر کوئی وحشی جانورانسان کے قابو میں آجائے تو پھر وہ ذبح کے بغیر حلال نہیں ہوگا۔ معارف القرآن ۳:۴۰

کتا کب مُعَلَّم اور سدھایا ہوا ہوگا

حنفیہ نے کتے کے سدھانے اور سکھلانے کی علامت یہ قرار دی ہے کہ جب اسے تین بار شکار کیلئے

چھوڑا جائے اور تینوں بار وہ شکار پکڑ کر مالک کے پاس لائے اور خود اس سے نہ کھائے، تو ایسا کتا تعلیم یافتہ اور سدھایا ہوا شمار ہوگا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ اس میں اسطرح کی کوئی تحدید نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ مبتلی بہ کی رائے پر موقوف ہے، جب شکاری کو اس بات کا غالب گمان ہو جائے کہ اب کتا شکار کرنے کا طریقہ اور اسکے تمام آداب سیکھ گیا ہے تو اس وقت یہ فیصلہ کردیا جائیگا کہ یہ کتا تعلیم یافتہ ہو چکا ہے۔

اور باز کیلئے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جب اسے واپس بلایا جائے تو فوراً واپس آجائے اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جارہا ہو۔

جب شکاری جانور مذکورہ شرائط اور آداب کے مطابق کسی جانور کا شکار کرے تو پھر وہ شکار حلال ہوگا، لیکن اگر شکاری جانور ان مذکورہ چیزوں کا لحاظ نہ کرے، اسکے بغیر ہی شکار کرلے تو پھر اس شکار کو ذبح کرنا ضروری ہوگا، بغیر ذبح کے وہ اس صورت میں حلال نہیں ہوگا۔

تکملۃ فتح الملہم کتاب الصید الذبائح، وجہ مشروعیۃ الصید ۳: ۴۸۲

تیر سے شکار کرنے کی شرائط

تیر سے شکار کرنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ اس شکار کے حلال ہونے کیلئے تین شرطیں ہیں:

(۱)...... تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھی گئی ہو، قصداً اسے ترک نہ کیا گیا ہو۔

(۲)...... اس بات کا یقین یا ظن غالب ہو کہ شکار تیر لگنے سے ہی مرا ہے، کسی اور چیز سے اسکی موت واقع نہیں ہوئی، اگر شک ہو جائے کہ اسکی موت کسی اور چیز سے واقع ہوئی ہے تو اس شکار کا استعمال درست نہیں ہے۔

(۳)...... تیر پھینکنے کے بعد شکار کے غائب ہونے کی صورت میں اسکی تلاش مسلسل جاری رکھی گئی ہو۔

ردالمحتار ۶: ۴۶۸

غلیل سے شکار کا حکم

غلیل سے اگر شکار کیا جائے تو اسے ذبح کرنا ضروری ہے، ذبح کے بغیر اسکا استعمال جائز نہیں ہے۔

بندوق کے شکار کا جدید حکم

آجکل جدید بندوق کے ذریعہ جو جانور یا پرندہ شکار کیا جاتا ہے، وہ حلال ہے یا حرام، اس میں شریعت کا حکم کیا ہے:

اس میں تفصیل یہ ہے کہ گولیاں دوطرح کی ہیں: ایک وہ جو دھاری دار اور نوک دار نہ ہو جیسے پستول کی گولی یا گول چھرہ والا کارتوس، اس سے شکار کیئے ہوئے جانور کو بعض علماء حلال کہتے ہیں، لیکن جمہور فقہاء احناف کا قول یہ ہے کہ اس سے شکار کیا ہوا جانور حلال نہیں، لہذا ایسے شکار کو اگر شرعی طریقے کے مطابق ذبح نہ کیا جا سکے، اور شکاری کے اس تک پہونچنے سے پہلے ہی وہ مر جائے تو اسے کھانا درست نہیں ہے۔

دوسری قسم کی گولی وہ ہے جو دھاری دار اور نوک دار ہو جیسے بعض صورتوں میں کلاشنکوف، جی تھری اور تھری ناٹ تھری وغیرہ کی گولی یا نوک دار چھرہ والا کارتوس ہوتا ہے، اس میں چونکہ شکار کے زخم کھولنے اور اسے چھید کر پار ہونے کی صلاحیت مکمل طور پر موجود ہوتی ہے، اسلئے ایسی گولی اور کارتوس کا آلات جارحہ یعنی زخمی کرنے والے اوزار میں شمار ہوگا، اس لئے اسکا حکم بھی تیر ہی کا ہوگا، اور اس سے کیا ہوا شکار بالاتفاق حلال ہوگا یعنی اگر بسم اللہ پڑھ کر گولی چلائی جائے، اور شکاری کے پہونچنے سے پہلے وہ شکار اسکے زخم کی وجہ سے مر جائے تو وہ شکار حلال ہوگا، اور اسکا کھانا درست ہوگا۔

اس میں ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز خود زخمی کرنے والی نہ ہو بلکہ وہ زور اور پریشر سے شکار کو زخمی کر کے مار دے تو وہ حلال نہیں ہے، بندوق کی عام گولی اور غلیل کا پتھر بھی چونکہ خود زخمی کرنے والا نہیں ہوتا، اسلئے اسکا شکار اگر ذبح سے پہلے مر جائے تو وہ حرام ہے، لہذا اسکا استعمال جائز نہیں۔

کشف الباری، کتاب الذبائح ص: ۲۳۱ تکملۃ فتح الملہم ۳: ۴۸۹

ذبح یا شکار کے وقت بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

جانور کو ذبح کرتے وقت یا شکار کیلئے شکاری جانور کو چھوڑتے وقت یا شکار کیطرف مخصوص بندوق کی گولی چلاتے وقت "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھنا ضروری ہے، جان بوجھکر بسم اللہ نہ پڑھنے سے وہ ذبیحہ اور شکار

حلال نہیں ہوگا، ہاں اگر بھولے سے رہ جائے تو کوئی حرج نہیں، ایسی صورت وہ ذبیحہ اور شکار حلال ہوگا۔

ردالمحتار ۶:۲۹۹ فتاوی ھندیہ ۵:۲۷۵

بَابُ مَاجَاءَ فِي الْفَأْرَةِ تَمُوْتُ فِي السَّمْنِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ چوہا گھی میں گر کر مر جائے۔

عَنْ مَيْمُوْنَةَ رضى الله عنها أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِيْ سَمْنٍ فَمَاتَتْ ، فَسُئِلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ : أَلْقُوْهَا وَمَاحَوْلَهَا فَكُلُوْهُ .

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ایک چوہا گھی میں گر کر مر گیا، تو رسول اللہ ﷺ سے اسکے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: چوہے اور اسکے اردگرد کے گھی کو ڈالدو پھر باقی کو کھالو۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔فأرة: چوہا، ج فِئران ۔سمن: گھی۔ألقو: پھینک دو، ڈالدو، گرادو۔

گھی میں چوہا گر کر مر جائے اس کا حکم

اگر چوہا گھی میں گر جائے تو اگر وہ جما ہوا نہیں ہے، مائع یعنی پگھلا ہوا ہے تو پھر وہ گھی اکثر علماء کے نزدیک ناپاک ہو جاتا ہے، اسکا کھانا درست نہیں، اور اگر جما ہوا ہے تو چوہے کو نکالنے کے بعد اسکے اردگرد گھی کو نکالدیا جائے تو باقیماندہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے، حدیثِ باب میں صرف ''جمے ہوئے گھی'' کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن العربی رحمہ اللہ نے ''وما حولھا'' سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے ''سمن جامد'' یعنی جما ہوا گھی مراد ہے، کیونکہ ''ماحول'' سمن جامد ہی میں متعین کیا جا سکتا ہے، پگھلے ہوئے گھی میں ماحول کی تعیین نہیں کی جا سکتی اور پگھلے ہوئے گھی کا حکم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جو سنن ابی داؤد میں منقول ہے، اس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''وان کان مائعاً فلاتقربوہ'' اگر وہ گھی جس میں چوہا گر کر مر جائے، پگھلا ہوا ہو، تو اس کے قریب بھی نہ جاؤ، یعنی اس کا کھانا جائز نہیں۔ بذل المجھود ۱۶:۱۶۳

کیا ناپاک گھی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

پگھلے ہوئے گھی میں اگر چوہا گر جائے تو وہ جمہور علماء کے نزدیک ناپاک ہوجاتا ہے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس گھی سے اور کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں:

(۱)......امام احمد کے نزدیک ایسے گھی سے مطلقاً کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں صراحت ہے "وان کان مائعاً فلا تقربوہ"

لیکن جمہور یہ کہتے ہیں کہ اس جملے میں اسے کھانے کی ممانعت کا ذکر ہے، کھانے کے علاوہ دوسرے فائدے اس سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(۲)......امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک صابن وغیرہ میں تو اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن اسے بیچنا درست نہیں ہے۔

(۳)......احناف کے نزدیک کھانے کے علاوہ اس قسم کے گھی سے ہر طرح کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: وان کان السمن مائعاً انتفعوا به ولا تأکلوہ (اگر گھی پگھلا ہوا ہو، تو اس سے فائدہ ضرور اٹھاؤ لیکن اسے کھاؤ نہیں) اس سے معلوم ہوا کہ اسطرح کے گھی سے کھانے کے علاوہ ہر قسم کا فائدہ حاصل کرنا درست ہے، چنانچہ اس گھی یا تیل سے چراغ چلانا اور کشتی وغیرہ کو تیل دینا جائز ہے۔ عمدة القاری کتاب الذبائح والصید، باب اذا وقعت الفارة فی السمن (۲۱:۱۳۸) تحفة الاحوذی ۵/۴۲۱۔

ناپاک گھی کو پاک کرنیکا طریقہ

فقہاء کرام نے پگھلے ہوئے ناپاک گھی کو پاک کرنیکا طریقہ یہ لکھا ہے کہ اس گھی کے برابر پانی ڈالا جائے اور پھر اسے آگ پر ابالا جائے، یہاں تک کہ پانی خشک ہوکر، صرف گھی باقی رہ جائے، تین بار اسی طرح کیا جائے تو وہ ناپاک گھی پاک ہوجائیگا، مثلاً پانچ کلو گھی کے ڈبے میں چوہا گر کر مر جائے تو پانچ کلو پانی اس گھی کے ساتھ شامل کر کے آگ پر ابالا جائے تا کہ وہ پانی خشک ہوجائے تین مرتبہ ایسا کرنے سے وہ گھی پاک ہو جائیگا اور پھر اسکا استعمال درست ہوگا۔ فتاوی ھندیہ، الباب السابع، ۱/۴۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ النَّهْيِ عَنِ الأَكْلِ وَالشُّرْبِ بِالشِّمَالِ

یہ باب بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: لَا يَأْكُلُ أَحَدُكُمْ بِشِمَالِهِ وَلَا يَشْرَبْ بِشِمَالِهِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی نہ تو بائیں ہاتھ سے کھانا کھائے اور نہ پانی پیئے، کیونکہ شیطان بھی اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت کا حکم

نبی کریم ﷺ نے مذکورہ حدیث میں بائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں شیطان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، وہ بھی بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے، آجکل بہت سے مسلمان بھی مغربی طرز زندگی کو اختیار کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کھاتے اور پیتے ہیں، یہ ایک فیشن بنتا چلا جا رہا ہے یہ طریقہ خلاف سنت اور غیر اسلامی ہے، جسے چھوڑنا ضروری ہے، ہر محترم کام کو دائیں ہاتھ سے سرانجام دینا چاہیے، یہی سنت طریقہ ہے۔

دائیں ہاتھ سے کھانے پینے کا حکم

سنت یہ ہے کہ کھانے، پینے اور ہر محترم کام میں دائیں ہاتھ کو استعمال کیا جائے، اور کھانے پینے میں آپ ﷺ نے خاص طور پر اسکی تاکید فرمائی ہے، اور صیغہ امر کے ساتھ دائیں ہاتھ سے کھانے پینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں بچپن میں حضور ﷺ کی پرورش میں تھا، اور میرا ہاتھ (کھانے کے وقت) پیالے کے چاروں طرف پھر رہا تھا، تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: ''اے لڑکے: کھانے کے آغاز میں بسم اللہ پڑھو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھایا کرو''

اور آپ ﷺ نے دیگر بہت سی احادیث میں بڑی سختی کے ساتھ بائیں ہاتھ سے کھانے پینے سے منع

فرمایا ہے، امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے، تو آپ نے اسے فرمایا کہ: کُلْ بیمینک دائیں ہاتھ سے کھاؤ، وہ محض تکبر کی وجہ سے کہنے لگا: میں ایسا نہیں کر سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا: تو کبھی بھی ایسا نہیں کر سکے گا، چنانچہ وہ شخص اسکے بعد ساری زندگی اپنا دایاں ہاتھ منہ کیطرف نہ اٹھا سکا''

کتاب الأطعمة، باب آداب الطعام والشراب ۱۷۲:۲

اسی طرح کی احادیث کی وجہ سے بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا واجب ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا کھانا مستحب ہے، واجب نہیں، اور جن روایات میں بائیں ہاتھ سے کھانے پر وعیدیں آئی ہیں وہ جمہور کے نزدیک زجر و تنبیہ اور دائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی مزید تاکید پر محمول ہیں، ان سے وجوب کا حکم ثابت کرنا درست نہیں۔

دائیں ہاتھ سے کھانا اس وقت مستحب ہے جب کوئی عذر نہ ہو، لیکن اگر کوئی عذر ہو، دایاں ہاتھ زخمی ہے، یا شل ہے.........تو پھر بغیر کسی کراہت کے بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ فتح الباری کتاب الأطعمة باب التسمية على الطعام ۶۵۳:۹

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ لَعْقِ الْأَصَابِعِ بَعْدَ الْأَكْلِ

یہ باب کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَلْعَقْ أَصَابِعَهُ فَإِنَّهُ لَا يَدْرِيْ فِيْ أَيَّتِهِنَّ الْبَرَكَةُ.

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو اسے اپنی انگلیاں چاٹ لینی چاہئیں، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت ان (انگلیوں) میں سے کس (انگلی کے ساتھ لگے ہوئے کھانے کے ذرے) میں ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: لعق: چاٹنا، لیلعق: چاہیے کہ وہ چاٹ لے۔ اصابع: إصبع کی جمع ہے: انگلی۔ ایۃ: کونسا، کونسے، کس میں۔

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا سنت ہے

حدیث باب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب انسان کھانا کھالے تو اسکے بعد انگلیاں چاٹ لیا کرے، تاکہ کھانے کے تمام اجزاء اور ذرات پیٹ کے اندر چلے جائیں، اور نبی کریم ﷺ نے اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کس جز اور کونسے ذرے میں برکت ہے، اس لئے کسی چھوٹے سے ذرے کو بھی معمولی اور حقیر سمجھ کر ضائع نہ کیا جائے، بلکہ اسے کھالیا جائے، ممکن ہے کہ اسکی وجہ سے اسے برکت حاصل ہو جائے۔

یہ سنتِ رسول ہے، جو بلا شبہہ ہر مسلمان کیلئے باعث اجر و خیر ہے، اسی جذبے سے سرشار ہوکر اسپر عمل پیرا ہونا چاہیے، کسی بھی موقع پر نبی کریم ﷺ کی کسی بھی سنت کو حقیر اور ہلکا نہ سمجھا جائے، بلکہ مسلمان کو تو زندگی کے تمام گوشوں میں بڑے فخر کے ساتھ سنتوں کی پیروی کرنی چاہیے، لیکن آج بہت سے نام نہاد مسلمان مغربی تہذیب سے متأثر ہوکر کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کو خلاف تہذیب اور معیوب کام شمار کرتے ہیں، یہ انتہائی گندی ذہنیت اور گمراہ کن فکر ہے، جو کبھی کفر تک بھی پہونچا سکتی ہے، اس لئے اس طرح کی فکر سے تہ دل سے توبہ کرنی چاہیے، اور نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر اہتمام سے عمل کرنا چاہیے۔

کھانے میں نبی کریم ﷺ عموماً تین انگلیاں استعمال فرماتے تھے، انگوٹھا، شہادت کی انگلی اور درمیان کی بڑی انگلی، اور جب کھانے سے فارغ ہوجاتے تو سب سے پہلے درمیان کی بڑی انگلی، پھر شہادت کی انگلی اور آخر میں انگوٹھے کو چاٹتے تھے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تین انگلیوں سے کھانا مستحب ہے اگرچہ پانچ انگلیوں سے بھی کھانا جائز ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کھانے میں تین سے زیادہ انگلیاں استعمال کرنے میں ایک گونہ حرص وہوس کا شائبہ پایا جاتا ہے، کیونکہ ضرورت تو تین انگلیوں سے بھی پوری ہوجاتی ہے، ہاں اگر کہیں اس قسم کا کھانا ہو کہ تین انگلیوں سے لقمہ صحیح نہ بنتا ہو، تب چوتھی اور پانچویں انگلی کو بھی بغیر کسی کراہت کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تکملۃ فتح الملھم کتاب الاطعمۃ باب استحباب لعق الاصابع (۲۲:۴)

انگلیاں چاٹنے کی حکمتیں

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کی تین مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱)......انگلیاں چاٹنے کے بعد رومال وغیرہ سے ہاتھ پونچھے جائیں تو زیادہ آلودگی اور داغ دھبے نہیں ہونگے۔

(۲)......تا کہ کھانے کے تمام اجزاء اور ذرات پیٹ کے اندر پہونچ جائیں، اور برکت حاصل ہو جائے، کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کھانے کے کونسے ذرے میں برکت ہے، اسلئے کھانے کے بعد انگلیوں کو ضرور چاٹ لیا جائے۔

(۳)......انگلیاں چاٹنے کا حکم اسلئے دیا گیا ہے تا کہ طعام اور غذا کی تھوڑی سی مقدار کو بھی معمولی، ہلکا اور حقیر نہ سمجھا جائے بلکہ اسکی بھی قدر کی جائے البتہ انگلیاں دوسروں کو چٹانے میں اس بات کا اہتمام رہے کہ جس کو انگلیاں چٹائی جارہی ہیں وہ کراہت اور گھن محسوس نہ کرتا ہو جیسے بیوی، خادم اور بچہ وغیرہ۔

کشف الباری کتاب الاطعمۃ ص:۱۵۸

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ اللُّقْمَةِ تَسْقُطُ

یہ باب اس لقمہ کے حکم کے بارے میں ہے جو دوران طعام گر جائے

عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَسَقَطَتْ لُقْمَتُهُ فَلْيُمِطْ مَا رَابَهُ مِنْهَا ثُمَّ لِيَطْعَمْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کھانا کھارہا ہو اور اس سے لقمہ گر جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس چیز (مٹی وغیرہ) کو دور کردے، جس نے اسے لقمہ (کھانے کے) بارے میں شک میں ڈالا ہے پھر (صاف کرنے کے بعد) وہ لقمہ کھالے اور شیطان کیلئے اسے نہ چھوڑے۔

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَكَلَ طَعَامًا لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلَاثَ وَقَالَ: إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيُمِطْ عَنْهَا الْأَذَى وَلْيَأْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا

لِلشَّيْطَانِ، وَأَمَرَنَا أَنْ نَسْلُتَ الصَّحْفَةَ وَقَالَ: إِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِيْ أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کھانا تناول فرما لیتے تو اپنی تینوں انگلیاں چاٹتے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر پڑے تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے تکلیف دہ چیز دور کردے اور اسے کھالے، اور شیطان کیلئے اسے نہ چھوڑے، اور آپ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم پلیٹ کو انگلیوں سے صاف کریں، اور فرمایا: بیشک تم نہیں جانتے کہ تمہارے کھانے کے کونسے (حصے میں) برکت ہے۔

حَدَّثَنَا الْمُعَلَّى بْنُ رَاشِدٍ أَبُو الْيَمَانِ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ جَدَّتِيْ أُمُّ عَاصِمٍ، وَكَانَتْ أُمَّ وَلَدٍ لِسِنَانِ بْنِ سَلَمَةَ قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا نُبَيْشَةُ الْخَيْرِ وَنَحْنُ نَأْكُلُ فِيْ قَصْعَةٍ فَحَدَّثَنَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ ثُمَّ لَحِسَهَا اسْتَغْفَرَتْ لَهُ الْقَصْعَةُ.

معلّٰی بن راشد ابوالیمان فرماتے ہیں کہ مجھے میری دادی ام عاصم نے حدیث بیان کی، اور وہ سنان بن سلمہ کی ام ولد ہیں، فرماتی ہیں کہ حضرت نبیشہ الخیر ہمارے پاس تشریف لائے، (اس وقت) ہم سب ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے، تو انہوں نے ہم سے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی پیالے میں کھائے اور پھر اسے چاٹ لے، تو وہ پیالہ اس کیلئے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔تسقط: لقمہ گر جائے، فلیمط: اسے چاہیے کہ وہ دور کرے، ہٹادے، زائل کرے، صاف کرے۔ رابہ: راب ریباً: شک میں ڈالنا، حدیث میں شک اور تردد میں مبتلا ہونے سے وہ تنکے اور مٹی وغیرہ مراد ہے جو اس لقمہ کے ساتھ لگ جائے۔ لا یدعھا: اسے نہ چھوڑے۔ وَدَعَ یدع: چھوڑنا الأذی: تکلیف دہ چیز، خس وخاشاک۔ نَسْلُت: ہم پیالے یا پلیٹ کو انگلیوں سے صاف کریں، سلت سلتاً: القصعة او الصحفة: پیالے یا پلیٹ کو انگلیوں سے صاف کرنا۔ الصَّحْفَة: (صاد پر زبر اور حاء کے

سکون کے ساتھ) پلیٹ، رکابی ج صِحَاف۔ قَصْعَة: بادیہ، بڑا پیالہ ج قِصَعٌ، قِصَاعٌ، قَصَعَات.

امام کسائی فرماتے ہیں کہ سب سے بڑے پیالے کو عربی میں "جَفْنَة" کہتے ہیں، پھر اس سے قریب "قَصْعَة" ہے، جس سے تقریباً دس بندے سیراب ہو کر کھا سکتے ہیں، پھر "صَحْفَة" ہے، یہ وہ پیالہ ہے جس سے پانچ افراد سیر ہو کر کھا سکتے ہیں، پھر "مِیْکَلَة" ہے، جس سے دو تین آدمی سیراب ہو کر کھا سکتے ہیں، پھر "صُحَیْفَة" ہے، جس سے صرف ایک بندہ سیراب ہو کر کھا سکتا ہے۔ لحس: برتن کو انگلی یا زبان سے چاٹنا، باب سمع۔ البرکة: چیز کا زیادہ ہونا، خیر کا ثبوت، اس چیز سے فائدہ اٹھانا، یہاں حدیث میں اس سے مراد یہ ہے کہ اس سنت پر عمل کرنے سے اسے اصل قوت غذائی حاصل ہوگی، برے انجام سے حفاظت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر اسے ہمت اور توفیق حاصل ہوگی۔

دورانِ طعام گرنے والے لقمہ کو اٹھانے کا حکم

نبی کریم ﷺ کی سنت ہے کہ دورانِ طعام اگر کبھی کوئی لقمہ گر جائے تو اسے اٹھا کر صاف کرلیا جائے اس کے ساتھ تنکا، خس وخاشاک یا مٹی وغیرہ لگی ہو تو لقمہ کو ان تمام چیزوں سے صاف کر کے کھالیا جائے، بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کا اگر لقمہ گر جائے تو اسے چھوڑ دیتے ہیں، اٹھاتے نہیں، بلکہ کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیتے ہیں، اور اسے اٹھا کر دوبارہ کھانے کو نہایت گھٹیا حرکت اور بودا کام شمار کیا جاتا ہے، یہ سب دین سے دوری اور مغربی تہذیب وتمدن کی اندھا دھند تقلید کی وجہ سے ہے، جو مسلم معاشرہ کو دیمک کی طرح چاٹتی چلی جارہی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گرے ہوئے لقمہ کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد کھالینا مستحب اور سنت عمل ہے، یہ اس وقت ہے کہ جب وہ کسی ناپاک جگہ پر نہ گرا ہو، کیونکہ لقمہ اگر ناپاک جگہ پر گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے، پھر اسے دھونا ضروری ہو جاتا ہے، دھونے کے بعد اگر وہ کھانے کے قابل ہے اور طبیعت کھانے پر آمادہ بھی ہے تو اسے کھالیا جائے ورنہ کسی جانور کو کھلا دیا جائے، اسے ضائع کرنا بہر حال درست نہیں ہے۔ شرح مسلم للنووی ۲: ۱۷۵

اتباع سنت کا عجیب واقعہ

یہ حقیقت ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی ایک ایک سنت پر بڑے اہتمام سے عمل کرتے تھے، دینا کی کوئی طاقت انہیں سنت رسول پر عمل پیرا ہونے سے نہیں روک سکتی تھی، لیجئے اتباع سنت کا عجیب واقعہ جسے پڑھکر انسان دنگ رہ جاتا ہے:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو فاتح ایران ہیں، جب ایران میں کسری پر حملہ کیا گیا تو کسریٰ نے مذاکرات کیلئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اپنے دربار میں بلایا، آپ وہاں تشریف لے گئے، تواضع کے طور پر سب سے پہلے ان کیلئے کھانا لایا گیا، دسترخوان بچھ گیا، جسپر کسری، اسکے وزراء، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ربعی بن خلف رضی اللہ عنہما نے بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا، اتفاقاً دوران طعام حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک لقمہ گر گیا، فوراً آپ کو نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث یاد آ گئی کہ جب تم سے اس موقع پر لقمہ گر جائے تو اسے صاف کر کے کھالیا جائے، چنانچہ آپ نے وہ نوالہ اٹھانے کیلئے جیسے ہی ہاتھ نیچے بڑھایا تو آپ کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہنی مار کر اشارہ کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو، یہ تو دنیا کی سپر طاقت کسریٰ کا دربار ہے، اگر تم اس دربار میں زمین پر گرا ہوا نوالہ اٹھا کر کھاؤ گے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں تمہاری کوئی وقعت نہیں رہے گی، اور یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑے ندیدہ قسم کے لوگ ہیں، اسلئے یہ نوالہ اٹھا کر کھانے کا موقع نہیں ہے، آج اسے چھوڑ ہی دو۔ اس کے جواب میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بڑا حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا کہ:

"أَأَتْرُکُ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰه علیه وسَلَّمَ لِهٰؤُلَاءِ الْحَمْقیٰ"

کیا ان بیوقوفوں کی وجہ سے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت چھوڑ دوں؟

چاہے یہ لوگ اچھا سمجھیں یا برا، عزت کریں یا ذلت کا معاملہ کریں، یا مذاق اڑائیں، لیکن میں سرکار دو عالم ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا، یہی وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے دنیا کے اس بڑے دربار میں بھی نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کر لیا، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اتباع سنت کا ایسا ہی جذبہ عطا فرمائے۔ اصلاحی خطبات ۲: ۱۶۵

نوالہ کو شیطان کیلئے نہ چھوڑا جائے

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ولا یدعھا للشیطان، اس گرے ہوئے لقمہ کو شیطان کیلئے نہ چھوڑے۔

اس میں "للشیطان" پر جو "لام" ہے، یا تو یہ شی کی علت اور وجہ بیان کر رہا ہے، اسے اصطلاح نحو میں "لام تعلیل" کہا جاتا ہے، اور یا یہ لام تملیک اور نفع اٹھانے کے معنی میں ہے، جسے گرائمر میں "لام تملیک اور لام انتفاع" کہا جاتا ہے، محدثین نے "لام" کے مذکورہ دونوں معنی کو سامنے رکھ کر حدیث کے اس جملے کے دو مطلب بیان کئے ہیں، اور وہ دونوں ہی درست ہیں، ان میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے:

(۱)...... جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ اسطرح کی تمام احادیث جن میں شیطان کے کھانے کا ذکر ہے، ان سے ظاہری معنی یعنی "معنی حقیقی" مراد ہیں، کہ شیطان اگرچہ غیر محسوس جسم کا حامل ہے، تاہم وہ کھانا کھاتا ہے کسطرح کھاتا ہے اور اسکی کیا کیفیت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، حدیث کے اس جملے سے اسکے ظاہری معنی کے علاوہ دوسرے معنی یعنی "معنی مجازی" مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ معنی حقیقی مراد لیا جا سکتا ہے، اس میں شرعاً اور عرفاً کسی بھی لحاظ سے کوئی قباحت اور ممانعت نہیں ہے۔

یہ مفہوم اس بناء پر ہے کہ "للشیطان" کا لام، "لام تملیک و انتفاع: قرار دیا جائے، اب حدیث کے اس جملے کا حاصل یہ ہوگا کہ گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا لیا جائے، اسے شیطان کیلئے نہ چھوڑا جائے، کیونکہ اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو شیطان اسکا مالک بن جائیگا اور اسے کھا کر وہ لطف اندوز اور نفع اٹھائے گا، چونکہ شیطان ہر ناجائز اور خلاف سنت کام سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسلئے گرے ہوئے لقمہ کو بجائے اس کے کہ شیطان کیلئے چھوڑا جائے، اسے صاف کر کے کھا لینا چاہیے تاکہ شیطان اس سے استفادہ نہ کر سکے شرح مسلم للنووی ۲:۱۷۲

(۲)...... جب نوالہ گر جائے تو شیطان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے اسے اٹھا کر کھانا ترک نہ کرے، یہ لقمہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کا ادب واحترام اور قدر کرنا نہایت ضروری ہے، اسے حقیر اور معمولی سمجھ کر نہ

اٹھانا اور ضائع کر دینا متکبر لوگوں کا طریقہ ہے، اور تکبر ایک شیطانی عمل ہے، کیونکہ تکبر کا سبب شیطان ہوتا ہے تو حدیث کے اس جملے سے دراصل یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ جب لقمہ گر جائے تو اسے کھالینا چاہیے، یوں ہی اسے ضائع کرنا خلاف سنت، تکبر اور شیطانی عمل ہے، جس سے احتراز ہی کرنا چاہیے۔

یہ مفہوم اس اعتبار سے ہے کہ "للشیطان" کا لام، "لام تعلیل" مانا جائے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ شیطان کے گمراہ کرنے اور پھسلانے کی وجہ سے اس نوالہ کو ضائع نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا اس کیلئے ہرگز مناسب نہیں ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۸: ۱۰ تکملۃ فتح الملہم، کتاب الاطعمۃ ۴/ ۲۶، شرح الطیبی ۸: ۱۳۹

دعوتوں میں کھانے کا ضیاع

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ کھانے کے بعد اس پلیٹ یا پیالے کو انگلیوں سے صاف کرلو، کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کس جزء میں برکت ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ برکت اس جزء میں ہو جسے وہ کھا چکا ہے، یا اس حصے میں ہو جو اسکی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پلیٹ میں بچے ہوئے کسی ذرے میں برکت ہو، اسلئے حصولِ برکت کی خاطر کھانے کے بعد انگلیوں کو پلیٹ اور پیالے کو صاف کرلینا چاہیے، نبی کریم ﷺ کے اس حکم سے کھانے کا ایک ادب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب انسان کھانا یا کوئی بھی چیز کھانا چاہے، الگ الگ برتنوں میں کھا رہے ہوں یا سب مل کر ایک ہی برتن میں، تو اس چیز کا اہتمام ضروری ہے کہ پلیٹ اور برتن میں اپنی ضرورت کے بقدر اتنی ہی چیز ڈالے، جتنی آسانی سے کھا سکتا ہے، تاکہ پلیٹ کو صاف کیا جاسکے، اور اس سنت پر عمل ہو جائے۔

اور اگر دسترخوان پر مختلف کھانے اور ڈشیں ہوں تو ہر کھانے کو جھوٹا نہ کرے، بلکہ وہی چیز اپنی پلیٹ میں بقدر ضرورت ڈالے، جسے وہ کھانا چاہتا ہے، ہمارے معاشرے میں بڑی تقریبات اور دعوتوں میں بہت سا کھانا صرف اس وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے کہ وہ پلیٹوں میں بچ گیا ہوتا ہے، اور دوسرے لوگ بچے ہوئے کھانے کو تناول کرنا مکروہ اور اپنی عار محسوس کرتے ہیں، اور یہ ایک بیہودہ رسم بن چکی ہے کہ پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا ضرور بچایا جاتا ہے، خواہ کہیں دعوت ہو یا کسی کے ہاں آدمی مہمان ہو، اور یہ اسلئے کیا جاتا ہے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ تو بہت بھوکا اور لالچی قسم کا آدمی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کھانے کی ایک کثیر مقدار کوڑے میں پھینک دی جاتی ہے

یہ سراسر فضول خرچی اور اسراف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ضائع کرنا ہے، اسلئے یہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو پلیٹ میں صرف اسی قدر کھانے کی چیز ڈالنی چاہیے جسکو وہ آسانی سے ختم کر سکے، تا کہ پلیٹ صاف کرنے کی سنت پر عمل کر کے وہ تمام خیر و برکات حاصل کی جاسکیں جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔

پلیٹ کی صفائی مغفرت کا ذریعہ ہے

کھانے کی پلیٹ صاف کرنے پر بہت سی فضیلتیں منقول ہیں چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱)......اس باب کی تیسری حدیث جس میں حضرت نبیشہ الخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کھانے کے بعد اس پلیٹ اور پیالے کو چاٹ لے جس میں وہ کھا رہا تھا، تو وہ پیالہ اپنے صاف کرنے والے کیلئے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

(۲)......طبرانی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص پلیٹ اور اپنی انگلیاں کھانے کے بعد چاٹ لے، اللہ اس کو دنیا اور آخرت میں سیراب کرے۔ عمدۃ القاری ۲۱: ۷۷

(۳)......حضرت نبیشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص پیالے (یا طشتری وغیرہ) میں کھائے، اور پھر اسے (اپنی انگلیوں سے) چاٹ لے، تو وہ پیالہ اس شخص سے کہتا ہے کہ جس طرح تو نے شیطان (کے کھا لینے یا اس کے خوش ہونے) سے مجھے نجات دی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھے جہنم کی آگ سے نجات دے۔ مرقاۃ ۸: ۶۸

پلیٹ اور پیالہ اس آدمی کیلئے استغفار کرتے ہیں..........اس سے کیا مراد ہے، وہ مغفرت اور دوزخ سے خلاصی کی دعا کیسے کرتے ہیں، جبکہ بظاہر ان میں کوئی شعور اور احساس نہیں ہے، اسلئے اسکی تشریح میں شارحین حدیث کے دو نقطہ نظر ہیں:

(۱)......علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تمیز اور قوت گویائی عطا فرما دیتے ہوں، جس سے وہ اپنی زبان سے اس بندے کے حق میں استغفار کرتے ہوں، جو انہیں کھانے کے بعد صاف کر لیتا ہے، جیسا کہ اوپر حدیث نمبر تین میں پلیٹ اور پیالے کی دعا کا ذکر ہے، لہٰذا استغفرت له القصعة اور اس

مفہوم کی جتنی روایات ہیں، ان سب کا یہی حقیقی اور ظاہری معنیٰ مراد ہے کہ وہ اپنی زبان سے استغفار کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اشیاء کی تسبیح کا ذکر ہے: **وان من شيئ الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم** ''ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اسکی تسبیح سمجھ نہیں سکتے'' اس سے معلوم ہوا کہ جمادات ونباتات کے اندر بھی ایک مخصوص قسم کا شعور موجود ہے جسے گو ہم نہ سمجھ سکیں، مگر وہ اس شعور کی بنا پر اللہ کی تسبیح وثناء کرتے ہیں، اسی شعور کی وجہ سے ہی پلیٹ اور پیالہ بھی اپنے صاف کرنے والے کیلئے اپنی زبان سے استغفار اور دعا کرتے ہیں چونکہ مذکورہ احادیث میں ان کے حقیقی اور ظاہری معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، اس لئے ان میں مجازی معنیٰ مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے۔الکوکب الدری ۳:۱۴، عمدۃ القاری ۲۱:۷۷

(۲)......بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اسطرح کی احادیث سے ظاہری اور حقیقی معنی مراد نہیں ہے، بلکہ ان سے ''مجازی معنیٰ'' مراد ہے، اور وہ یہ کہ پلیٹ اور پیالے کو چاٹنا تواضع، انکساری اور عاجزی کی وجہ سے ہوتا ہے، گویا عملاً یہ تکبر وغرور سے براءت کا اظہار ہے، اور یہی چیز گناہوں سے مغفرت اور بخشش کا ذریعہ ہے لیکن چونکہ اس معافی اور درگذر کا ذریعہ ظاہری طور پر وہ پلیٹ اور پیالہ بنے ہیں، جنہیں انگلیوں سے چاٹا گیا ہے، اس لئے سبب کی حیثیت سے استغفار اور دعا کی نسبت اس پلیٹ اور پیالے کی طرف کردگئی ہے۔شرح الطیبی ۸:۱۶۱، مرقاۃ المفاتیح ۸:۴۹

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْأَكْلِ مِنْ وَسَطِ الطَّعَامِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ کھانے (یعنی پلیٹ اور پیالے) کے درمیان سے کھانا مکروہ ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ وَسَطَ الطَّعَامِ فَكُلُوْا مِنْ حَافَتَيْهِ وَلَا تَأْكُلُوْا مِنْ وَسَطِهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ برکت کھانے کے درمیان والے حصے میں اترتی ہے، اسلئے کھانے (یعنی برتن) کے کناروں سے کھاؤ، اور اسکے درمیان میں سے نہ کھاؤ۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ وَسَط: (واؤاور سین پر زبر کے ساتھ): کسی چیز کا مرکز، وسطی حصہ، دو کناروں کے اندر کا حصہ، خواہ بالکل بیچ نہ ہو،............ج: اَوْسَاط۔ حَافَّۃ: کنارہ، طرف، جانب، اسکا تثنیہ حافتین اور جمع حَافَّات ہے۔

کھانے اور پلیٹ کے درمیان سے کھانے کا حکم

حدیث باب سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب انسان کھانا کھائے تو پلیٹ اور کھانے کے درمیان سے نہ کھائے، بلکہ اپنے سامنے کے کنارے سے کھائے، کیونکہ کھانے اور پلیٹ کے وسطی حصے میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے برکت کا نزول ہوتا ہے، جسے حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس حصے کو آخر تک باقی رکھا جائے، تاکہ ہر کنارے پر برکت نازل ہوتی رہے، اور وسطی حصے کو بالکل آخر میں تناول کیا جائے، اسے ابتداء میں ہی کھالینا آدمی کے حریص اور غیر مہذب ہونے کی علامت ہے اور چونکہ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے، اسلئے اسے اختیار کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔ شرح الطیبی ۸: ۱۵۸

اسی مفہوم کی روایت سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا "غـرّاء" نامی ایک بڑا پیالہ تھا، جسے چار آدمی اٹھاتے تھے، دوپہر کے وقت جب عیدالاضحیٰ کی نماز سے فارغ ہوگئے، تو اس پیالے میں ثرید بنا کر لائی گئی، بہت سے صحابہ کرام اسکے کھانے کیلئے آس پاس بیٹھ گئے، آپ ﷺ بھی گھٹنوں کے بل عاجزانہ انداز سے تشریف فرما ہوگئے، آپکی نشست دیکھ کر ایک بدو نے کہا کہ یہ کیسی نشست ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے مہربان اور عاجز بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا، (اسلئے میں عاجزانہ انداز سے بیٹھا ہوں) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس پیالے کے اطراف سے کھاؤ، اور اسکی چوٹی یعنی وسطی حصہ کو چھوڑ دو، کیونکہ اس میں برکت نازل ہوتی ہے" بدل المجہود ۱۶: ۱۰۱

اس حدیث سے اس بات کی مزید تاکید ہوتی ہے کہ کھانے، پلیٹ اور پیالے کے وسطی حصے کو آخر میں کھایا جائے، تاکہ اس میں برکت اترتی رہے۔

حدیثِ باب میں "حافتیه" کا لفظ گو تثنیہ ہے، لیکن اس سے خاص طور پر تثنیہ ہی مراد نہیں ہے کیونکہ دوسری بعض احادیث میں جمع اور مفرد کے لفظ بھی منقول ہیں، چنانچہ مشکاۃ (۳۶۶:۲) میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ثرید کا ایک پیالہ لایا گیا، تو آپ نے فرمایا: "كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا، وَلَا تَأْكُلُوا مِنْ وَسَطِهَا، فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِي وَسَطِهَا" "پیالے کے اطراف سے کھاؤ، بیچ سے نہ کھاؤ، کیونکہ اسکے بیچ میں برکت نازل ہوتی ہے"

اس حدیث میں "جوانب" جمع کا لفظ ہے۔

اور سنن ابن ماجہ (ص: ۲۳۵) میں مفرد کا لفظ منقول ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ، آپ ﷺ نے فرمایا: "إِذَا وُضِعَ الطَّعَامُ فَخُذُوا مِنْ حَافَتِهِ، وَذَرُوا وَسَطَهُ فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِي وَسَطِهِ" "جب کھانا لگایا جائے تو اسکے کنارے سے کھاؤ، اور وسطی حصہ کو چھوڑ دو، کیونکہ اس میں برکت اترتی ہے"

اس حدیث میں "حافۃ" کا لفظ مفرد ہے، لہذا لفظ "حافة" یا "جانب" خواہ مفرد ہو یا تثنیہ اور جمع، ان کے ذریعہ یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ نزول برکت کے لئے ہر شخص اپنے سامنے کے کنارے سے کھائے، براہ راست وسطی اور مرکزی حصے سے نہ کھائے، ہاں جب سب کنارے ختم ہو جائیں تو اس وقت وسطی حصے کو کھایا جائے تو اس میں کوئی کراہت اور قباحت نہیں ہے، یہ اس وقت ہے جب ایک سے زیادہ لوگ ایک ہی پلیٹ وغیرہ میں اکٹھے کھا رہے ہوں، لیکن جب کوئی انسان علیحدہ پلیٹ اور پیالے وغیرہ میں کھا رہا ہو تو وہ اپنے سامنے کے کنارے سے ہی کھائے، وسطی حصے یا دوسرے کناروں سے نہ کھائے، وہ اپنے کنارے سے جیسے جیسے کھاتا جائیگا تو درمیان سے مزید کھانا اسکے سامنے کیطرف آجائیگا، اسطرح وہ اپنے آگے سے کھانے کی سنت پر بھی عمل کر سکے گا اور وسطی حصے میں برکت بھی نازل ہوتی رہے گی۔

امام غزالی رحمہ اللہ اسی حدیث کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ روٹی کے نوالے کو بھی پہلے کنارے کنارے سے لیا جائے اور جب روٹی تھوڑی رہ جائے تو پھر اسے توڑ کر کھالے، اور ایسا اس لئے کرے تاکہ روٹی ختم ہونے تک اسکے درمیانی حصے میں برکت نازل ہوتی رہے۔ تحفۃ الاحوذی ۴۲۷:۵

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ أَكْلِ الثُّوْمِ وَالْبَصَلِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ لہسن اور پیاز کھانا ناپسندیدہ ہے

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهٖ قَالَ أَوَّلَ مَرَّةٍ، الثُّوْمِ ثُمَّ قَالَ الثُّومِ وَالبَصَلِ وَالْكُرَّاثِ، فَلَا يَقْرَبْنَا فِيْ مَسَاجِدِنَا.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اسے کھایا، راوی نے پہلی مرتبہ صرف لہسن کہا، اور پھر لہسن پیاز اور گندنا کہا، تو وہ ہماری مسجدوں میں ہمارے قریب نہ آئے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ۔الثُّوم: لہسن۔اَلْبَصَل: پیاز۔اَلْکُرَّاث: گندنا، ایک تیز بو والی سبزی جسکی بعض قسمیں پیاز اور لہسن کے مشابہ ہوتی ہیں۔لَایَقْرَبْنَا: وہ ہمارے قریب نہ آئے، قَرِب ۔قُرْباً وقُرْبَاناً: کسی چیز سے قریب اور نزدیک ہونا۔

کچے پیاز اور لہسن کھانے کا حکم

پیاز، لہسن اور بعض دوسری سبزیاں جیسے گندنا وغیرہ جب وہ کچی ہوں تو ان کے کھانے سے منہ میں بدبو سی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آنا درست نہیں ہے کیونکہ ان کی بدبو سے فرشتوں اور دیگر نمازیوں کو سخت تکلیف پہونچتی ہے، یہ حکم صرف مساجد کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس میں ہر وہ جگہ داخل ہے جہاں فرشتوں اور انسانوں کو یا صرف انسانوں کو اذیت ہوتی ہو، لہذا عید گاہ، جنازہ گاہ، دینی محفلیں، درس و تدریس کے حلقے، وعظ ونصیحت کے اجتماع، بازار، مارکیٹ، اور تمام دینی اور دنیاوی تقریبات میں کچے پیاز اور لہسن وغیرہ کھا کر جانا مناسب نہیں ہے، یہ دوسروں کی اذیت کا ذریعہ ہیں، البتہ اگر ان کی بدبو کسی طریقے سے ختم کردی جائے تو پھر ان کا استعمال بغیر کسی کراہت کے درست ہے۔

مذکورہ سبزیوں کا استعمال مکروہ ہے، حرام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اگلے باب میں بعض ان روایات کو ذکر کیا ہے جن سے عام لوگوں کے حق میں ان سبزیوں کے استعمال کی اجازت معلوم

ہوتی ہے، لیکن یہ اجازت اس شرط کے ساتھ ہے کہ جب انہیں کھانے سے دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ نے محض بدبو کی وجہ سے ان سبزیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ ان میں طبی لحاظ سے دوسرے فوائد اور منافع بھی ہیں، اسلئے انہیں پکا کر یا کسی دوسرے طریقے سے ان کی بدبو دور کردی جائے تو پھر ان کا کھانا بہرحال فائدے سے خالی نہیں ہے۔

ان سبزیوں کا استعمال حضور اکرم ﷺ نہیں کرتے تھے، کیونکہ آپ کی اکثر ملاقات حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ہوتی تھی، اور فرشتے بدبو سے انتہائی نفرت کرتے ہیں، اور خود نبی کریم ﷺ بھی بدبو سے انتہائی نفرت فرماتے تھے، تاہم ان چیزوں کا استعمال آپ کیلئے کس درجے کا تھا، اس میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک آپ ﷺ کیلئے ان کا استعمال حرام تھا، اور بعض کے نزدیک مکروہ تھا، امام نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آپکے لئے ان کا استعمال مکروہ تنزیہی تھا۔

بذل المجہود ۱۶: ۱۵۱، فتح الباری ۹: ۳۱۸

حدیثِ باب میں ہے کہ جو آدمی لہسن یا پیاز یا گندنا کھالے تو وہ ہمارے پاس ہماری مسجدوں میں نہ آئے، اس میں ''مساجدنا'' سے مطلقاً تمام مساجد مراد ہیں، مسجد نبوی کی تخصیص نہیں ہے، چنانچہ بعض روایات میں '' فَلَا یَقْرَبَنَّ الْمَسَاجِدَ'' (وہ ہرگز مساجد کے قریب نہ آئے) کے الفاظ بھی آئے ہیں، اس میں لا یقربن اور المساجد کے ساتھ ''نا'' ضمیر نہیں ہے، جس سے بعض لوگوں کو تخصیص کا شبہہ ہوا ہے، اس لئے یہ حکم تمام مساجد کو شامل ہے، اور ممانعت کا حکم صرف پیاز .... کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس حکم میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں، جن کے کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے مثلاً دوا وغیرہ ۔

بذل المجہود کتاب الاطعمۃ، باب فی الثوم ۱۶: ۱۵۰/۱۵۳

حدیث باب کے بعض الفاظ کا مفہوم

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''قال اول مرۃ: الثوم، ثم قال، یہ ابن جریج کا قول ہے، اور ''ھو'' ضمیر دونوں ''قال'' میں ابن جریج کے استاد حضرت عطاء کیطرف راجع ہے، معنی یہ ہیں کہ ابن جریج کہتے ہیں کہ حضرت عطاء نے پہلی بار صرف ''الثوم'' کا لفظ ذکر کیا، پھر دوسری بار تینوں چیزوں کا ذکر کیا۔

اور مَنْ أَكَلَ من هٰذِهٖ ''میں'' هذه'' سے جب ثوم، بصل اور کراث تینوں کیطرف اشارہ ہوتو پھر ''هذه'' کا مؤنث لانا نحوی قواعد کی رو سے درست ہوگا، لیکن اگر اسکا اشارہ صرف ''الشوم'' کیطرف ہوجیسا کہ حضرت عطاء نے پہلی بار صرف ''الشـــوم'' ذکر کیا ہے، تو پھر نحوی اعتبار سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ھذہ اسم اشارہ مؤنث ہے لہذا اسکا مشار الیہ مؤنث ہونا چاہیے، جبکہ اسکا مشار الیہ بظاہر یہاں پر ''الثوم'' ہے جو مذکر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''ھذہ'' کا مشار الیہ الفاظ میں موجود نہیں ہے، بلکہ محذوف ہے اور وہ لفظ ''الشجرة'' یا ''البقلة'' (سبزی) ہے، اور ''الثوم'' اس مشار الیہ کا بیان ہے، خود مشار الیہ نہیں ہے، اس تفصیل کی رو سے نحوی اشکال ختم ہوجاتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الاذان، باب ماجاء فی الثوم النئ والبصل ۲/۴۴۳۔

تمباکو، پان، حقہ اور سگریٹ کا حکم

حقہ، سگریٹ اور تمباکو استعمال کرنا جائز ہے، لیکن چونکہ ان چیزوں کی وجہ سے منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اسلئے اس بدبو کو دور کرنا ضروری ہے، خصوصاً تلاوتِ قرآن، نماز کے وقت اور مسجد میں جانے کیلئے وہ بدبو دور کرنا انتہائی ضروری ہے، تاکہ انسانوں اور فرشتوں کو اس سے اذیت نہ پہونچے، البتہ پان میں چونکہ بدبو نہیں ہوتی، اسلئے اسکا استعمال درست ہے، یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ چیزیں صحت کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں، اور جو ان کا عادی ہوجاتا ہے تو وہ ان کے استعمال میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اور پھر مال بھی اس میں بہت خرچ کیا جاتا ہے، اسلئے ان کا استعمال بہرحال پسندیدہ اور مناسب نہیں ہے۔

نسوار کھانے کا حکم

نسوار کھانا شرعاً جائز ہے، البتہ منہ سے اسکی بدبو صاف کرلینا چاہیے، خصوصاً تلاوت قرآن مجید، نماز کے وقت اور مسجد میں جانے کیلئے منہ سے بدبو دور کرنا ضروری ہے۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷: ۱۸۲

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرُّخْصَةِ فِيْ أَكْلِ الثُّوْمِ مَطْبُوْخاً

یہ باب اس بیان میں ہے کہ پکا ہوا لہسن کھانا جائز ہے۔

عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ سَمُرَةَ يَقُوْلُ: نَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

عَلٰی أَبِیْ أَیُّوْبَ،وَکَانَ إِذَا أَکَلَ طَعَامًا بَعَثَ إِلَیْهِ بِفَضْلِهٖ،فَبَعَثَ إِلَیْهِ یَوْمًا بِطَعَامٍ وَلَمْ یَأْکُلْ مِنْهُ النَّبِیُّ ﷺ،فَلَمَّا أَتٰی أَبُوْ أَیُّوْبَ النَّبِیَّ ﷺ فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَهٗ،فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: فِیْهِ الثُّوْمُ،فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَحَرَامٌ هُوَ؟قَالَ:لَا وَلٰکِنِّیْ أَکْرَهُهٗ مِنْ أَجْلِ رِیْحِهٖ.

سماک بن حرب سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت جابر بن سمرہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب انصاری کے ہاں مہماں ٹھہرے (اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ آپ کیلئے کھانا بھیجتے تھے) اور جب آپ کھانا تناول فرما لیتے تو اپنا بچا ہوا کھانا حضرت ابوایوب (کے گھر) واپس بھیج دیتے، ایک دن نبی کریم ﷺ نے پورا کھانا واپس بھیج دیا اور اس میں سے خود تناول نہیں فرمایا، جب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے اس کا ذکر (دریافت) کیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کھانے میں لہسن تھا (اس لئے میں نے کچھ بھی نہیں کھایا) پھر انہوں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا یہ حرام ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: حرام نہیں، لیکن اسکی بدبو کی وجہ سے میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔

عَنْ عَلِیٍّ أَنَّهٗ قَالَ:نُهِیَ عَنْ أَکْلِ الثُّوْمِ إِلَّا مَطْبُوْخًا.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: (کچا) لہسن کھانے سے منع کیا گیا ہے، مگر یہ کہ وہ پکا ہوا ہو (تو پھر کوئی حرج نہیں)

عَنْ عَلِیٍّ أَنَّهٗ کَرِهَ أَکْلَ الثُّوْمِ إِلَّا مَطْبُوْخًا.

شریک بن حنبل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کچے لہسن کے کھانے کو ناپسند کرتے تھے۔

عَنْ أُمِّ أَیُّوْبَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَزَلَ عَلَیْهِمْ،فَتَکَلَّفُوْا لَهٗ طَعَامًا، فِیْهِ مِنْ بَعْضِ هٰذِهِ الْبُقُوْلِ،فَکَرِهَ أَکْلَهٗ،فَقَالَ لِأَصْحَابِهٖ: کُلُوْهُ فَإِنِّیْ لَسْتُ کَأَحَدِکُمْ إِنِّیْ أَخَافُ أَنْ أُوْذِیَ صَاحِبِیْ.

حضرت ام ایوب (اہلیہ حضرت ابو ایوب انصاری) نے ابو یزید کو خبر دی (بتلایا) کہ نبی کریم ﷺ (ہجرت کے وقت جب مدینہ منورہ تشریف لائے ،تو) ان کے ہاں (مکان پر) اترے، پھر انہوں نے آپ ﷺ کیلئے پر تکلف کھانا تیار کیا، جس میں ان سبزیوں (گندنا وغیرہ) میں سے کچھ چیزیں (پکی ہوئی) تھیں، اسلئے آپ ﷺ نے اس کھانے کو پسند نہیں فرمایا، اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا: تم کھاؤ، کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں، بیشک میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اپنے دوست (فرشتے) کو تکلیف پہونچاؤں (اس وجہ سے میں یہ کھانا نہیں کھا رہا)

عَنْ أَبِيْ العَالِيَةِ قَالَ: الثُّوْمُ مِنْ طَيِّبَاتِ الرِّزْقِ.

ابو العالیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ،فرماتے ہیں کہ لہسن پاکیزہ رزق (یا پاکیزہ کھانوں) میں سے ہے (یعنی وہ حلال ہے)

مشکل الفاظ کے معنی: ۔**فَضْل**: بقیہ، کھانے کا بقیہ حصہ ج فُضُوْلٌ ۔**مطبوخاً**: آگ پر پکائی ہوئی چیز ۔**نزل علیھم**: نزل کے بعد جب ''علی'' آئے تو اسکے معنی: کسی کا مہمان بننے کے ہوتے ہیں ۔**تکلفوا**: انہوں نے اس کام میں تکلیف اور مشقت اٹھائی، پر تکلف کام کرنا ۔**بُقُوْل**: بَقْل کی جمع ہے: سبزی، ترکاری ۔**اوذی**: (واحد متکلم کا صیغہ ہے) میں اذیت پہونچاؤں ۔**طیبات الرزق**: پاکیزہ اور خوشگوار کھانے، عمدہ رزق۔

پکا ہوا لہسن کھانا جائز ہے

پیاز، لہسن، گندنا، مولی اور ہر وہ سبزی جس کے کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، انہیں جب پکالیا جائے تو ان کا استعمال بغیر کسی کراہت کے درست ہے، لیکن اگر کسی سبزی کی بدبو پکانے کے باوجود ختم نہ ہو تو ایسی صورت میں اسکا استعمال مکروہ ہوگا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت پانچ احادیث ذکر کی ہیں، جن سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ لہسن، پیاز، مولی ....اور اسطرح کی سبزیوں کا استعمال حرام نہیں ہے، جائز ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کی بدبو پکانے سے یا اور کسی طریقے سے دور کر دی جائے۔

چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے پہلی حدیث یہ ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مہمان نوازی کا شرف حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ کو حاصل ہوا، کھانا تیار کر کے آپ ﷺ کو دیا جاتا، اس میں سے آپ اپنی منشا کے مطابق تناول فرمالیتے اور باقی ماندہ حضرت ابوایوب انصاری کے گھر بھیج دیتے تھے، ایک دن کھانا آیا، آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہیں فرمایا، جوں کا توں واپس بھیجوادیا، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو حضور ﷺ کے پاس آئے، معاملہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس میں لہسن تھا، اسلئے میں نے نہیں کھایا، پھر انہوں نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا لہسن حرام ہے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حرام نہیں ہے، لیکن میں اسے اسکی بدبو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔

آپ ﷺ نے بدبو کی وجہ سے اسے پسند نہیں فرمایا، یہ کھانے میں عیب نکالنا نہیں ہے، کیونکہ آپ ﷺ کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے، پسند آتا تو کھالیتے ورنہ چھوڑ دیتے، اور مذکورہ سبزیوں میں چونکہ بدبو تھی، اسلئے آپ نے انہیں پسند نہیں فرمایا، یہ حدیث اس چیز میں بالکل صریح اور واضح ہے کہ لہسن کا استعمال حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تین روایتیں یہاں ذکر فرمائی ہیں، ان میں صرف پہلی حدیث، حدیث مرفوع ہے، جس میں انہوں نے فرمایا: **نُهِيَ عَنْ أَكْلِ الثُّوْمِ إِلَّا مَطْبُوْخاً**

پھر **وقد روی هذا عن علی.........قوله**، سے امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہی روایت انہی الفاظ کے ساتھ "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنے قول کے طور پر بھی منقول ہے، گویا یہ حدیث، موقوف بھی ہے۔

اور تیسری حدیث: "**انه كره أكل الثوم إلا مطبوخاً**" حدیث موقوف ہے۔

چوتھی حدیث میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے بتایا کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کے بعد ان کے ہاں مہمان ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ کیلئے پر تکلف کھانا تیار کیا، جس میں کچھ سبزیاں بھی پکی تھیں، جب اسے آپکے قریب کیا گیا تو آپ نے اسے پسند نہیں کیا، اور صحابہ سے فرمایا کہ تم کھالو، کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میرے پاس میرے دوست یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی

وقت وحی لیکر آسکتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ وہ آئیں اور میں ان کو تکلیف پہونچاؤں، کیونکہ ان سبزیوں کی بدبو سے فرشتے انتہائی نفرت کرتے ہیں، اسلئے میں یہ نہیں کھارہا۔

پانچویں حدیث: حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ لہسن پاکیزہ کھانا ہے، یعنی وہ حلال ہے، حرام نہیں ہاں کھانے کے بعد اسکی بدبو ضرور دور کی جائے۔ تحفۃ الاحوذی ۵/۴۳۰۔

کھانے کا ایک ادب

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر سے نبی کریم ﷺ کیلئے کھانا لایا جاتا، اس سے بقدر ضرورت آپ کھالیتے، اور باقی ماندہ اگر زیادہ ہوتا تو اسے واپس بھیج دیتے، اس سے کھانے کا ایک ادب یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہمان کیلئے جب گھر سے کھانا لایا جائے تو اس میں سے اگر کچھ بچا ہو تو اسے واپس کر دیا جائے، تاکہ گھر والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مہمان نے خوب سیر ہو کر کھانا کھالیا ہے، اور بسا اوقات میزبان گھر کا سارا کھانا مہمان کیطرف بھیج دیتے ہیں، پھر جو بچ جائے اسے گھر کے افراد کھاتے ہیں، اگر ایسی صورت ہو تو مہمان کو ضرور کھانا بچانا چاہیے تاکہ گھر کے افراد بھی کھاسکیں، لیکن اگر یہ اندیشہ ہو کہ باقی ماندہ کھانا ضائع کر دیا جائیگا، اسے گھر کا کوئی فرد نہیں کھائیگا جیسا کہ اس وقت یہی عرف چل رہا ہے کہ مہمان کا باقی ماندہ کھانا پھینک دیا جاتا ہے، اسے کھانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تو پھر بہتر یہ ہے کہ سارا کھانا کھالیا جائے، اور برتن میں کچھ بھی نہ چھوڑا جائے، اور برتنوں کو خوب صاف کرلیا جائے تاکہ پلیٹ چاٹنے اور صاف کرنے کی سنت پر عمل ہو سکے۔ تکملۃ فتح الملھم کتاب الاطعمۃ باب اباحۃ اکل الثوم ۴:۶۲

بزرگوں اور اولیاء کرام سے تبرک کا جواز

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام، بزرگوں اور اولیاء اللہ سے تبرک کے طور پر کوئی چیز لینا جائز ہے، چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کا باقی ماندہ کھانا تبرکاً کھاتے تھے، لہذا اگر کوئی شخص صحیح سنت کا پیروکار ہو، ولی اللہ ہو تو اس سے تبرک کے طور پر کوئی چیز لینا یا اسکا بچا ہوا کھانا تناول کرنا اور پانی وغیرہ پینا شرعاً جائز ہے۔ شرح مسلم للنووی ۲:۱۸۳، تکملۃ فتح الملھم ۴:۶۳

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اعزاز

حضور اکرم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر صحابی کی یہ کوشش تھی کہ آپ ﷺ میرے ہاں قیام فرمائیں، جیسے جیسے آپکی اونٹنی آگے چلتی تو ہر ایک آپکو اپنے ہاں مہمانی کی درخواست کرتا، حضور اکرم ﷺ فرماتے: خَلُّوا سَبِيْلَهَا فَإِنَّهَا مَأْمُوْرَةٌ "اونٹنی کو راستہ دو، کیونکہ اسے اللہ کیطرف سے حکم ہو چکا ہے، یہ وہیں جا کر بیٹھے گی جہاں کا اسے حکم دیا گیا ہے، چنانچہ وہ اونٹنی برابر چلتی رہی، پھر مسجد نبوی کے قریب باب جبرئیل کے پاس بیٹھ گئی، اور مہمان نوازی کا شرف حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا، وہ حضور اکرم ﷺ کے آرام وراحت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، زاد المعاد۲: ۴۵۱ ط: بیروت

آپ نے حضور اکرم ﷺ کے قیام کیلئے پہلے اپنے مکان کی نچلی منزل خالی کرائی، اور اپنے لئے اوپر کی منزل رکھی، لیکن آپکے دل ودماغ پر ہر وقت یہ فکر سوار تھی کہ یہ بے ادبی ہے کہ میں اوپر رہوں اور حضور ﷺ کی رہائش نیچے ہو، ایک رات انہیں یوں محسوس ہوا کہ چلتے وقت ہمارے قدم حضور اکرم ﷺ کے سر مبارک کے اوپر ہیں، تو ایک طرف بیٹھ گئے اور ادب کی وجہ سے پوری رات یوں ہی گذار دی، نیز ایک دفعہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے کسی بچے سے پانی گر گیا، وہ اسقدر زیادہ تھا کہ انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ پانی ٹپک کر نچلی منزل میں حضور اکرم ﷺ پر نہ گر جائے، تو اپنے عمامے سے اسے خشک کیا، اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے لحاف سے اسے فوراً خشک کیا، تاکہ اسکے قطرے نیچے ٹپک کر نہ جائیں، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کمال ادب تھا، جسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سربلندیاں عطا فرمائیں۔

اسی کشمکش میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ہمت کر کے حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ میں اس چھت پر رہوں جسکے نیچے آپکا قیام ہو، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا، اسلئے میں چاہتا ہوں کہ آپ اوپر کی منزل پر رہائش اختیار کر لیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے لئے اور میرے پاس آنے والوں کیلئے نچلی منزل میں زیادہ آسانی ہے، تاہم ان کے مخلصانہ اصرار کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمالی، اور پھر آپ کی رہائش اوپر کی منزل پر منتقل کر دی گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ میزبان کو چاہیے کہ جس قدر ہو سکے مہمان کے آرام وراحت کا خیال

رکھے، یہاں جب حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی دل کی دنیا عشق نبی سے لبریز ہے، اور عشق و محبت کا ولولہ قلب و جگر میں اس قدر جاگزیں ہو چکا ہے کہ اوپر کی منزل میں ان کیلئے رہنا انتہائی مشکل اور باعث مشقت ہوگا، اس لئے آپ ﷺ نے اپنی راحت کے مقابلے میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے آرام و راحت کو ترجیح دی، اور اپنی رہائش اوپر منتقل کرادی، البتہ میزبان کیلئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مہمان پر بلا وجہ اس قدر بوجھ ڈالے جسے برداشت کرنا اسکے بس میں نہ ہو، اور اسے مشقت کا سامنا کرنا پڑجائے۔ تکملۃ فتح الملہم ۴: ۶۴

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَخمِيْرِ الإِنَاءِ وَإِطْفَاءِ السِّرَاجِ وَالنَّارِ عِنْدَ الْمَنَامِ

یہ باب سوتے وقت برتن ڈھانپنے، چراغ اور آگ بجھانے کی احادیث کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَغْلِقُوْا البَابَ وَأَوْكُوْا السِّقَاءَ وَأَكْفِئُوا الإِنَاءَ أَوْ خَمِّرُوا الإِنَاءَ، وَأَطْفِئُوا الْمِصْبَاحَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ غُلُقًا، وَلَا يَحُلُّ وِكَاءً، وَلَا يَكْشِفُ آنِيَةً، فَإِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تَضْرِمُ عَلَى النَّاسِ بَيْتَهُمْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دروازہ بند رکھا کرو، مشکیزہ ڈوری سے باندھ لو، برتن کو اوندھا کردو یا (فرمایا کہ) برتن کو ڈھانپ دو، اور چراغ بجھا دیا کرو (کہ کہیں وہ رات کے وقت گھر میں آگ لگنے کا سبب نہ بن جائے)، کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھول سکتا، اور نہ (مشکیزے وغیرہ کی) باندھی ہوئی رسی کو کھول سکتا ہے، اور نہ برتن کا ڈھکن کھول سکتا ہے، (اور چراغ اسلئے بجھا دیا کرو) کیونکہ چھوٹا فاسق یعنی چوہا لوگوں کے گھروں کو جلا دیتا ہے۔

عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَا تَتْرُكُوْا النَّارَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ حِيْنَ تَنَامُوْنَ.

حضرت سالم اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوتے وقت تم اپنے گھروں میں آگ مت چھوڑو۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ تخمیر: ڈھانکنا، ڈھانپنا، خمّروا: تم ڈھانکو۔ إطفاء: بجھانا، بند کرنا، أطفئوا: تم بجھاؤ۔ المنام: سوتے وقت۔ أغلقوا: تم دروازہ بند کرو، لاک کرو۔ اوکوا السّقاء: مشکیزے کو ڈوری سے باندھ دو۔ السِقاء: پانی کی مشک، دودھ کا مشکیزہ، پانی وغیرہ رکھنے کا برتن ج اَسْقِیَۃ۔ اکفئوا الإناء: برتن کو اوندھا کر دو، پلٹ دو، الٹا کر دو، غُلُقاً: بند کی ہوئی چیز۔ الوِکَاء: ڈوری یا رسی وغیرہ جس سے تھیلی وغیرہ کا منہ باندھا جائے۔ لا یحل: وہ نہیں کھول سکتا۔ لا یکشف: وہ نہیں کھول سکتا، پردہ نہیں ہٹا سکتا۔ الفویسقة: چوہا۔ تضرم: وہ آگ جلاتا ہے، سلگاتا ہے۔

سوتے وقت برتنوں کو ڈھانپنے، چراغ اور آگ بجھانے کا حکم

اس باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے چند ایسی احادیث ذکر کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے سوتے وقت رہن سہن کے کچھ آداب اور طریقے بیان فرمائے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... دروازہ بند کرلیا کرو۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کے ساتھ "وَاذْکُرُوْا اسْمَ اللّٰہِ" (اللہ کا نام لیا کرو) بھی نقل کیا ہے، جسکے معنی یہ ہیں کہ دروازہ بند کرتے وقت اللہ کا نام یعنی بسم اللہ پڑھ لیا کرو، اسطرح کرنے سے شیطان گھر میں داخل نہیں ہو سکے گا، کیونکہ شیطان کو یہ قدرت اور اجازت نہیں ہے کہ اس گھر کا دروازہ کھولے یا کسی اور طریقے سے اس میں داخل ہو جسکا دروازہ بسم اللہ پڑھ کر بند کیا گیا ہو۔

حدیث میں لفظ "باب" سے اسطرف اشارہ ہے کہ بسم اللہ کی برکت سے شیطان جب دروازے کی طرف سے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا جو کہ گھر میں داخل ہونے کا ایک آسان ذریعہ ہے، تو گھر کی دوسری اطراف سے بدرجہ اولیٰ وہ داخل نہیں ہو سکے گا، اس بات کی تائید حضرت ابو اسامہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مسند احمد میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے دروازوں کو بند کیا کرو، برتنوں کو الٹا کر کے رکھا کرو، مشکیزوں کا دہانہ ڈوری سے باندھ دیا کرو، کیونکہ شیطان کو دیوار پھلانگ کر گھر میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۴۳۲/۵۔

(۲)...... مشکیزہ ڈوری سے باندھ لو۔

(۳)...... برتن کو اوندھا کردو یا فرمایا کہ برتن کو ڈھانپ دو۔ ان دونوں کے ساتھ بھی امام مسلم رحمہ اللہ نے "وَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ" ذکر کیا ہے کہ بسم اللہ پڑھکر یہ کام کیے جائیں، پھر شیطان ان میں اپنا تصرف نہیں کر سکے گا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احادیث کی روشنی میں علماء کرام نے مشکیزے کو باندھنے اور برتن کو ڈھانپنے کے چار فائدے ذکر کیے ہیں.

(۱)...... وہ مشکیزہ اور برتن شیطان سے محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ شیطان نہ برتن کے ڈھکن کو ہٹا سکتا ہے اور نہ بند مشکیزے کو کھول سکتا ہے۔

(۲)...... اسی طرح یہ اس وباء سے بھی محفوظ رہتے ہیں جو سال کی کسی رات میں نازل ہوتی ہے، صحیح مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "برتن کو ڈھانپا کرو اور مشکیزے کا دہانہ بند کیا کرو، کیونکہ سال میں ایک ایسی رات آتی ہے جس میں ایک وباء اترتی ہے جو ہر اس برتن میں نازل ہوتی ہے جو ڈھکا ہوا نہ ہو اور ہر اس مشکیزے میں داخل ہو جاتی ہے جسکا منہ رسی سے بند نہ ہو"۔

(۳)...... وہ برتن اور مشکیزہ، نجاست، گندگی اور خس وخاشاک سے حفاظت میں رہتے ہیں۔

(۴)...... حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ بسا اوقات کھلے برتن یا مشکیزے میں کوئی موذی کیڑا چلا جاتا ہے؛ جو رات کے وقت اس برتن کو استعمال کرتے وقت یا بےفکری سے اس برتن یا مشکیزے سے پانی پیتے وقت وہ کیڑا نقصان پہنچا سکتا ہے، لیکن اگر برتن کو ڈھانپ کر رکھا جائے اور مشکیزے کا منہ بند کردیا جائے تو پھر ان چیزوں سے وہ محفوظ رہتے ہیں، صحیح مسلم ۲: ۱۷۰، ۱۷۱

(۴)...... حدیث میں آپ ﷺ نے چوتھا حکم یہ دیا کہ: چراغ بجھادیا کرو اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ فان الفويسقة .... کیونکہ چوہا، رات کے وقت اس چراغ کو آگے پیچھے کرکے پورے گھر کے جلانے کا سبب بن جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک چوہے نے لالٹین کی بتی کھینچنی شروع کی، اسے لاتے لاتے حضور ﷺ کی اس چادر پر ڈال دیا، جسپر آپ تشریف فرما تھے، اس سے وہ چادر ایک درہم کی

بقدر جل گئی، اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تم سونے لگو تو اپنے چراغ بجھا دیا کرو، کیونکہ شیطان چوہے جیسے جانوروں کو اسی طرح گمراہ کرتا ہے، یوں وہ چراغ تمہیں یا تمہارے ساز وسامان کے جلانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں" اسلئے سوتے وقت چراغ، ٹیوب لائٹ وغیرہ کو بجھا دینا چاہیے۔ سنن ابی داؤد ۲: ۱۲۷

لیکن اگر ٹیوب لائٹ کا رات کے وقت جلانا ضروری ہو، اور اسکے جلانے میں کوئی خطرہ بھی نہ ہو تو پھر اسے جلانے میں کوئی حرج نہیں، ایسے ہی وہ چراغ جسکا رات کے وقت جلانا ناگزیر ہو، اور اسے ایسی جگہ پر طریقے سے رکھا جائے کہ چوہے وغیرہ کی شرارت سے وہ محفوظ ہو، اسکا جلانا جائز ہے، اور یہ اس حدیث کے خلاف نہیں، کیونکہ اس میں ممانعت کی وجہ نہیں پائی جا رہی، اسلئے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ تکملۃ فتح الملہم ۶۵۸/۳۔ عمدۃ القاری ۲۱: ۱۹۸

حدیث باب میں **فان الفویسقة**...... **أطفئوا المصباح** کی دلیل اور علت ہے، اور **فان الشیطان لا یفتح غلقا و لا یحل وکاء و لا یکشف انیة** اس سے پہلے تین احکام یعنی **اغلقوا**.......... کی دلیل ہے، اسپر شبہہ یہ ہوتا ہے کہ **اطفئوا المصباح** اور اسکی دلیل **فان الفویسقة** میں فاصلہ لازم آرہا ہے، جو مناسب نہیں ہے۔

اسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بعض روایات میں **فان الفویسقة** میں "إنّ" پر فاء کے بجائے "واوٌ" ہے، اب مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے چار احکام بیان فرمائے، پھر بالترتیب پہلے تین حکموں کی **فان الشیطان** سے **و لا یکشف انیة** تک علت اور دلیل بیان فرمائی اور پھر **فان الفویسقة** سے **اطفئوا المصباح** کی وجہ بیان فرمائی ہے، یہ جواب اس بناء پر ہے کہ "واوٌ" والی روایت ثابت ہو، اور اگر واؤ والی روایت ثابت نہ بھی ہو تب بھی مذکورہ جواب درست ہوگا کیونکہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں "فاء" کا استعمال "واوٌ" کے معنیٰ میں ہوتا رہتا ہے، مرقاۃ المفاتیح ۸: ۱۱۷

غروب آفتاب کے وقت بچوں کو گھر سے باہر نہ نکالا جائے

صحیح مسلم کی روایت میں اسقدر اضافہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب رات کی تاریکی آجائے اور شام ہو جائے (یعنی غروب آفتاب ہو جائے) تو اپنے بچوں کو (باہر نکلنے سے) روکو، اس لئے کہ اس وقت

شیاطین پھیل رہے ہوتے ہیں، پھر جب رات کا ایک حصہ گذر جائے تو ان کو چھوڑ سکتے ہو.................

علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ چونکہ بچے عموماً نجاست اور گندگی سے آلودہ رہتے ہیں، اور اس گندے پن کو جنات اور شیاطین پسند کرتے ہیں، اب اگر غروب آفتاب کے وقت بچے گھر سے باہر ہوں تو جنات اور شیاطین بچوں کو نقصان پہونچا سکتے ہیں، اس خطرے کے پیش نظر آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ تکملة فتح الملهم كتاب الاشربة، باب الأمر بتغطية الإناء ۳:۶۵۹

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْقِرَانِ بَيْنَ التَّمْرَتَيْنِ

یہ باب دو کھجوروں کو ملا کر کھانے کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: نَهَى رَسُوْلُ صلى الله عليه وسلم اللّٰهِ أَنْ يَقْرِنَ بَيْنَ التَّمْرَتَيْنِ حَتّٰى يَسْتَأْذِنَ صَاحِبَهُ.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (اکٹھا کھانا کھاتے وقت) دو کھجوروں کو ملا کر کھانے سے منع کیا ہے، یہاں تک کہ اپنے (ساتھ کھانے والے) ساتھی سے اجازت لے۔ (جب اجازت دیدے تو پھر دو یا اس سے زیادہ کھجوریں ایک ساتھ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے)

مشکل الفاظ کے معنی:۔ القِرَان: ملانا۔ یَقْرِنُ: وہ ملاتا ہے۔ یستأذن: وہ اجازت حاصل کر لے۔

اجتماعی کھانے میں دو کھجوریں ملا کر کھانے کا حکم

حدیث باب میں کھانے کا ایک ادب بیان کیا گیا ہے کہ جب اجتماعی کھانا کھایا جائے تو ہر ساتھی کو دوسرے کا لحاظ کرنا چاہیے، جلدی جلدی کھانا اور زیادہ سے زیادہ چیزیں کھانے کی کوشش کرنا نامناسب اور مروت کے خلاف ہے، کھجوریں ہوں یا اور کوئی چیز اس طریقے سے اسے تناول کیا جائے کہ آداب سنت کے مطابق ہوں، دو دو یا تین تین اکٹھی کھجوریں کھانا شرعاً ناپسندیدہ ہے، اور عرف ورواج میں بھی اس چیز کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ایسا آدمی کھاؤ اور حریص شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر کھجوریں کئی آدمیوں کے درمیان مشترک ہوں اور ایک ساتھ دسترخوان پر کھا رہے ہوں تو کسی کیلئے دوسروں کی اجازت کے بغیر دو.......... کھجوریں ایک ساتھ کھانا جائز نہیں ہے، ہاں اگر صراحت کے ساتھ یا کسی اور طریقے سے دوسرے ساتھیوں کی طرف سے اجازت ہو جائے تو پھر ایک سے زیادہ کھجوریں ایک ساتھ کھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر مشترک کھجوریں نہ ہوں، ذاتی ہوں تو انہیں اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین کھجوریں ملا کر بھی کھا سکتے ہیں، کیونکہ اس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے۔

امام خطابی کی رائے

امام سیوطی اور علامہ خطابی کی رائے یہ ہے کہ دو کھجوریں ملا کر کھانے کی ممانعت کا تعلق اس وقت سے تھا جبکہ مسلمان فقر و افلاس اور تنگدستی سے دوچار تھے، پھر جب حالات میں بہتری اور خوشحالی آگئی تو یہ ممانعت منسوخ ہوگئی، چنانچہ مسند بزار میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
میں نے تمہیں دو کھجوریں ملا کر کھانے سے منع کیا تھا، اسلئے کہ وہ زمانہ معاشی تنگدستی اور مال کی کمی کا زمانہ تھا، اب جب اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمادی ہے، اسلئے اب اس میں کوئی حرج نہیں۔
لیکن اس روایت سے استدلال تام نہیں ہے، کیونکہ اسکی سند میں یزید بن بزیع ایک راوی ہے، جسے یحیی بن معین اور دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خطابی وغیرہ کی بات درست نہیں ہے، کیونکہ اعتبار الفاظ کا ہوتا ہے، نہ کہ خاص سبب کا اور یہاں تو سبب ثابت بھی نہیں ہے اور حدیث کے الفاظ چونکہ عام ہیں، ان میں کسی زمانے کی کوئی قید نہیں ہے، اسلئے ممانعت کا حکم منسوخ نہیں ہے، بلکہ اس میں تفصیل ہے جسکی وضاحت اوپر گذر چکی ہے۔

تکملة فتح الملهم ۴: ۵۰، مرقاة المفاتیح ۸: ۲۶، شرح نووی ۲: ۱۸۱، تحفة الاحوذی ۵: ۴۳۵

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ إِسْتِحْبَابِ التَّمْرِ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں کھجور کے پسندیدہ ہونے کا ذکر ہے

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: بَيْتٌ لَا تَمْرَ فِيْهِ جِيَاعٌ أَهْلُهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: جس گھر

میں کھجور نہ ہواس گھر کے رہنے والے بھوکے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **استحباب التمر:** کھجور کا پسندیدہ خوراک ہونا۔ **جیاع:** جائع کی جمع ہے بھوکے۔

کھجور کی فضیلت اور اسکی ذخیرہ اندوزی

قاضی ابوبکر بن عربی فرماتے ہیں کہ "اھلہ" سے اہل مدینہ اور وہ لوگ مراد ہیں جنکی خوراک کھجور ہو کہ اگر ان کے گھر میں تھوڑی بھی کھجور ہو تو وہ بھوکے نہیں ہونگے، اور اگر بالکل کھجور نہ ہو تو وہ بھوک کا شکار ہو سکتے ہیں، کیونکہ عموماً ان کے گھروں میں دوسری غذائی اشیاء نہیں ہوتیں، اب اگر وہاں کھجور بھی نہ ہو تو لامحالہ وہ بھوک سے ضرور دوچار ہونگے۔

یہ حکم صرف کھجور کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ ہر علاقے کی جو بھی خوراک اور غذاء ہو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر ان کے گھر میں وہ خوراک موجود ہوگی تو وہ بھوک سے دوچار نہیں ہونگے، ورنہ ہو سکتے ہیں۔ بذل المجھود ۱۶:۱۵۷، تحفۃ الاحوذی ۵:۴۳۶

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱)...... کھجور کی فضیلت و شرف۔ (۲)...... اور یہ کہ کھجور کی ذخیرہ اندوزی شرعاً جائز ہے، حدیث میں گویا اسکی ترغیب دی جارہی ہے کہ کچھ نہ کچھ کھجور گھر میں ضرور موجود رہنی چاہیے۔ شرح مسلم للنووی ۲:۱۸۱

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس حدیث سے ان لوگوں کو قناعت کی ترغیب دی جارہی ہو، جہاں کھجور کی پیداوار کثرت سے ہو، اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ وہ گھر جس میں کھجور ہو اور وہ اسے قناعت اور کفایت شعاری سے استعمال کریں تو کبھی وہ بھوکے نہیں ہونگے، اور وہ لوگ غذائی پریشانی میں مبتلا ہونگے جنکے پاس کھجور نہ ہو، اسکی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات ہم پر مہینہ یوں گذر جاتا تھا کہ ہم اس میں آگ نہیں جلاتے تھے، اور اس عرصے میں ہماری غذاء کا دارومدار صرف کھجور اور پانی پر ہوتا تھا الا یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجاتا (تو ہم آگ جلا کر اسے پکاتے تھے)۔ شرح الطیبی ۸:۱۴۸، مرقاۃ المفاتیح ۸:۲۶

بَابٌ فِيْ الْحَمْدِ عَلَى الطَّعَامِ إِذَا فَرَغَ مِنْهُ

یہ باب اس بارے میں ہے کہ کھانے سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَّأْكُلَ الْأَكْلَةَ أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات سے راضی اور خوش ہوتا ہے کہ (جب) وہ ایک لقمہ کھائے (یا جب وہ سیر ہو کر کھالے) یا ایک گھونٹ پانی پیئے پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:۔ الأُکلة: (ہمزے کے پیش اور کاف کے سکون کے ساتھ) اسکا معنی ہے :لقمہ اور ہمزے کی زبر کے ساتھ اسکا معنٰی ہے :ایک دفعہ سیراب ہو کر کھانا، اس حدیث میں فتح کے ساتھ پڑھنا زیادہ بہتر ہے تاکہ الشربة کے ساتھ اعراب کے اعتبار سے موافق ہو جائے، کیونکہ الشربة صرف فتح کے ساتھ اس معنی مین استعمال ہے، پیش کے ساتھ اسکا استعمال اس معنی میں نہیں ہے۔اَلشَّرْبَة: (شین پر زبر اور را کے سکون کے ساتھ) ایک گھونٹ، ایک دفعہ پیا جانے والا پانی، ایک دفعہ کا پینا۔مختار الصحاح ص:۲۰، ۳۳۳ مرقاۃ المفاتیح ۸:۳۵

کھانے کے بعد اللہ کی حمد وثناء کی جائے

کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا مستحب اور مسنون عمل ہے، یہ درحقیقت اس چیز کی یاد دہانی ہے کہ ایک انسان جب کھانا کھا چکے تو یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اس طعام کا انتظام کس عجیب وغریب طریقے سے کیا ہے، اس گندم، چاول اور سبزیوں .... کی فصل نہ جانے کس علاقے میں ہوئی، اسے کس نے کاشت کیا، کس نے اسے کاٹا، صاف کیا، اور مارکیٹ میں کن کن ہاتھوں نے اسے پہونچایا پھر کہاں کہاں کا سفر کر کے میرے گھر میں پہونچی، اسے کس طریقے سے پکایا گیا، ایک لقمہ جو منہ کیطرف اٹھایا جاتا ہے تو بظاہر تو وہ ایک چھوٹا سا لقمہ ہے لیکن اسکو تیار کرنے میں نہ جانے کتنے انسانوں نے اسپر محنت ومشقت اٹھائی، یوں وہ

کئی ہاتھوں سے ہو کر اس انسان کی غذائی تسکین کا ذریعہ بنا، یہ سب کچھ اللہ جل شانہ کی قدرت کے کرشمے ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد کی چند مسنون دعائیں

احادیث میں کھانے کے بعد مختلف دعائیں منقول ہیں، یہاں ان میں سے چند دعاؤں کو ترجمہ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے: جب دسترخوان اٹھنے لگے تو یہ دعا پڑھے:

(۱)...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْداً كَثِيراً طَيِّباً مُّبَارَكاً فِيهِ، غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنىً عَنْهُ رَبَّنَا.

تمام تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، ایسی تعریف جو بہت ہو، پاکیزہ ہو اور بابرکت ہو جو کفایت نہیں کی جائیگی (یعنی شکر کا حق ہم ادا نہیں کر سکتے) اور نہ اس حمد (یا طعام) کو چھوڑا جا سکتا ہے، اور نہ اس سے استغناء اور بے نیازی اختیار کی جا سکتی ہے، اے ہمارے رب۔ الصحیح للبخاری ۲:۸۲۰

(۲)...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ.

تمام حمد وثناء اس اللہ کیلئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔

(۳)...... اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِىْ أَطْعَمَنِى هٰذَا وَرَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّى وَلَا قُوَّةٍ.

تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور مجھے یہ کھانا میری قوت اور کوشش کے بغیر عطا فرمایا۔

اس دعا کو کھانے کے بعد پڑھا جائے تو اسکے پچھلے تمام چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر کھانے کے بعد صرف "الحمد لله" پڑھ لیا جائے تو اس سے بھی دعا کی سنت ادا ہو جاتی ہے۔

ابواب الدعوات، جامع الترمذی (۲:۱۸۴) تحفۃ الاحوذی (۵:۴۳۷)

بَابُ مَا جَاءَ فِىْ الْأَكْلِ مَعَ الْمَجْذُوْمِ

یہ باب جذامی کے ساتھ کھانا کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَخَذَ بِيَدِ مَجْذُوْمٍ، فَأَدْخَلَهُ مَعَهُ فِىْ الْقَصْعَةِ، ثُمَّ قَالَ: كُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَتَوَكُّلًا عَلَيْهِ.

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جذامی کا ہاتھ پکڑا، اور اسے اپنے ساتھ

پیالے میں داخل کیا، اور پھر فرمایا: اللہ کا نام لے کر (میرے ساتھ) کھاؤ، میرا اللہ پر خوب بھروسہ ہے اور میں اسی کی ذات پر کامل توکل کرتا ہوں۔

مشکل کلمات کے معنی اور تشریح: مَــجــذُوم: اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جذام کی بیماری میں مبتلا ہو، اور جـــذام: کوڑھ کی بیماری ہے جس میں جسم کے اعضاء گل سڑ کر الگ الگ ہونے لگتے ہیں۔ اس حدیث میں مجذوم سے مراد حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی رضی اللہ عنہ ہیں۔ **فـأدخـلـه معه:** حضورﷺ نے اس کے ہاتھ کو اپنے ساتھ پلیٹ میں داخل کیا، اس میں ادخلہ کی "ہ" ضمیر "یــد" کیطرف لوٹ رہی ہے، عربی گرائمر کے اعتبار سے "ھــا" ضمیر مؤنث ہونی چاہیے تھی کیونکہ "یـد" عربی زبان میں مؤنث سماعی ہے، چنانچہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں **فادخلها معه** ہے، جو عربی قانون کے اعتبار سے درست عبارت ہے، اسلئے ترمذی کی روایت میں "ہ" ضمیر "عــضــو" کیطرف لوٹ رہی ہے جس سے مراد ہاتھ ہے، اس تاویل کے اعتبار سے ترمذی کی عبارت بھی عربی گرائمر کے مطابق ہو جاتی ہے۔

ثقة بالله وتوكلا عليه کی ترکیب

اس میں ثقۃ اور توکلاً دونوں مصدر ہیں اور مفعول مطلق ہیں، اصل عبارت یوں ہے: **كُـلْ بِسْمِ الـلـهِ مَعِي، أَثِقُ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَاَتَوَكَّلُ تَوَكُّلاً عَلَيْهِ** (اللہ کا نام لیکر میرے ساتھ کھاؤ، میرا اللہ پر خوب بھروسہ اور اسپر کامل توکل ہے) یہ دونوں جملے (اثق اور اتوکل) "معی" کی "ی" ضمیر سے حال ہیں، اور دوسرا جملہ پہلے جملے کی مزید تاکید ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک **أثـق ثـقـة بـالـلـه و اتوكل توكلا عليه** مستقل جملہ ہے، شرح الطیبی ۸: ۳۲۰، مرقاۃ ۸: ۳۵۱، تحفۃ الاحوذی ۵: ۴۳۸

جذامی کے ساتھ کھانا کھانے کا حکم

حدیث باب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جذامی کے ساتھ کھانا کھانا جائز ہے، حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی رضی اللہ عنہ چونکہ مرض جذام میں مبتلا تھے، اسلئے وہ اس خطرے سے حضور اکرمﷺ کیساتھ کھانا نہیں چاہتے تھے کہ کہیں میری وجہ سے حضور اکرمﷺ کو بھی یہ مرض نہ لگ جائے کیونکہ یہ بیماری ایک سے

دوسرے کو اللہ کے حکم سے عموماً لگ جاتی ہے، لیکن آپ ﷺ نے بیانِ جواز کیلئے اس صحابی کے ساتھ کھانا تناول فرمایا، اور وہ بھی اسطرح کہ اس صحابی کا ہاتھ پکڑ کر پلیٹ میں داخل کیا، اور اس سے فرمایا کہ اللہ کا نام لیکر کھاؤ، میرے بارے میں کوئی خطرہ محسوس نہ کرو، میرا اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہے، دکھ، سکھ اور بیماریاں اللہ کی مشیت اور ارادے سے آتی ہیں، اس میں کسی مریض کا کوئی دخل نہیں ہے، ہاں اگر ظاہری سبب کی حدتک اس سے پرہیز کیا جائے تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے۔

بیماری کا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کا مسئلہ

بیماری ایک سے دوسرے کیطرف منتقل ہوتی ہے یا نہیں، اس بارے میں دونوں طرح کی احادیث منقول ہیں، بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بیماری متعدی ہے، لہذا اس مریض سے دور رہنا چاہیے، اور بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری ایک سے دوسرے کیطرف منتقل نہیں ہوتی، یہ بظاہر احادیث میں تعارض سا ہے، جسے دور کرنے کیلئے علماء کرام نے مختلف جوابات دیئے ہیں، لیکن پہلے دونوں طرح کی احادیث لکھی جاتی ہیں، وہ احادیث جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیماری دوسرے کیطرف منتقل ہو جاتی ہے، ان کی تفصیل:

(۱)..... حضرت جابر فرماتے ہیں کہ قبیلہ ثقیف کے وفد میں ایک جذامی آدمی تھا (جو بیعت کیلئے آرہا تھا) آپ ﷺ نے جذامی کیطرف پیغام بھیجا کہ: اِرْجِعْ فَقَدْ بَايَعْنَاكَ (یہ بیعت آپ نے مصافحہ کے بغیر کی تھی، اور اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا) سنن ابن ماجۃ ۲۵۳

(۲)..... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْاَسَدِ، جذامی سے یوں بھاگو جیسے تم شیر سے بھاگتے ہو۔ صحیح بخاری ۲: ۸۵۰

(۳)..... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لَا تُدِيمُوا النَّظَرَ إِلَى الْمَجْذُومِينَ، جزامی لوگوں پر نظر نہ ٹھہراؤ، سنن ابن ماجۃ ۲۵۳

(۴)..... آپ ﷺ نے فرمایا: كَلِّمِ الْمَجْذُومَ، وَبَيْنَكَ وَبَيْنَهُ قِيدُ رُمْحٍ أَوْ رُمْحَيْنِ.

جذامی سے یوں بات کرو کہ اس کے اور تمہارے درمیان ایک نیزے یا دو نیزے کے بقدر فاصلہ ہو۔ زاد

المعاد۳:۸۳۵

(۵)......طاعون کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ۔ صحیح مسلم۲:۲۲۸

جب تم یہ سن لو کہ فلاں علاقے میں طاعون کی وباء پھیل چکی ہے تو تم اسکا رخ نہ کرو۔

(۶)......حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لَا يُوْرِدُ مُمْرِضٌ عَلٰى مُصِحٍ۔ صحیح مسلم۲:۲۳۰

بیمار اونٹ کا مالک اپنے اونٹ کو صحیح اونٹ والے کے پاس نہ لائے (کہیں اس اختلاط سے صحیح اونٹ بھی بیمار نہ ہو جائے)۔

مذکورہ تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بعض بیماریاں ایک سے دوسرے کو لگ سکتی ہیں، اسلئے نبی کریم ﷺ نے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا اور ان مریضوں سے دور رہنے کا حکم دیا جو ان بیماریوں میں مبتلا ہوں، گویا ان احادیث میں مذکورہ بعض بیماریوں کو ظاہری سبب کی حد تک تسلیم کیا گیا ہے کہ ان مریضوں کے ساتھ زیادہ اٹھنے بیٹھنے اور میل جول سے یہ بیماریاں دوسروں کو بھی لگ سکتی ہیں جب ہی تو ان سے محتاط رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

دوسری قسم کی وہ احادیث جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، ان کی تفصیل:

(۱)......حدیث باب جس میں حضور اکرم ﷺ نے جذامی کے ساتھ کھانا کھایا اور اس سے فرمایا: کل بسم الله ثقة بالله وتوكلا عليه۔

(۲)......حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ۔ صحیح بخاری۲:۸۵۰ بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا اور بدشگونی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیماری ایک سے دوسرے کیطرف منتقل نہیں ہوتی۔

احادیث کے اس ظاہری تعارض کو ختم کرنے کیلئے مختلف جوابات دیے گئے ہیں، سب سے بہتر

جواب یہ ہے کہ جن احادیث میں ایک سے دوسرے کیطرف بیماری منتقل نہ ہونے کا ذکر ہے، اس سے درحقیقت سبب حقیقی کی نفی کرنا مقصود ہے کہ ایک مرض ذاتی طور پر یہ تاثیر نہیں رکھتی کہ وہ خود بخود دوسرے کو لگ جائے، ہاں بسا اوقات مریض کے ساتھ ملاقات کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ بیماری دوسرے کو بھی لگ جاتی ہے، وہ اس مریض کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے نہیں لگی بلکہ اللہ ہی کے حکم اور مشیت وارادے سے لگی ہے لیکن چونکہ بعض کمزور ایمان والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مریض سے ہی اسکو بیماری لگی ہے، عقیدے کے اس فساد سے بچانے کیلئے آپ ﷺ نے طاعون اور جذام جیسی بیماریوں کے مریضوں سے دور رہنے اور احتیاط کرنے کا حکم دیا ہے، اور فرمایا کہ جذامی سے یوں بھاگو جیسے شیر سے تم بھاگتے ہو،.........، اس فاسد عقیدے کی وجہ سے ''عدوی'' کی نفی کی گئی ہے، ورنہ ظاہری سبب کے درجے میں اسے ماننا درست ہے، ممنوع نہیں ہے، یہی جمہور علماء کا موقف ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ ''لا عدوی'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی بھی مرض اپنے اصل کے اعتبار سے ایک سے دوسرے کیطرف منتقل نہیں ہوتی، اور اس جملے سے دراصل جاہلیت کے ایک غلط عقیدے کی تردید کرنا مقصود ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بیماریاں اپنی ذات میں یہ تاثیر رکھتی ہیں کہ وہ ایک سے دوسرے کیطرف منتقل ہو جاتی ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کا عمل دخل نہیں ہے، اس عقیدے کی تردید کیلئے نبی کریم ﷺ نے جذامی کو اپنے ساتھ بٹھا کر ایک ہی پلیٹ میں اس کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تاکہ ان کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ کسی مرض میں یہ تاثیر نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر خود ہی کسی دوسرے کو لگ جائے، وہ اللہ ہی بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے۔

لیکن اگر طبی طور پر یا تجربے سے یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں فلاں بیماریاں ایک جسم سے دوسرے جسم کیطرف منتقل ہو جاتی ہیں، مثلاً طاعون، جذام، چیچک، نزلہ.........تو یہ ''لا عدوی'' والی حدیث کے منافی نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں اس بیماری کے مؤثر حقیقی ہونے کی نفی ہے، کہ ایک بیماری ذاتی طور پر دوسرے کو نہیں لگ سکتی، اسلیئے کہ تاثیر حقیقی کا عقیدہ شرک اور کفر ہے، اور یہ عقیدہ کہ بعض بیماریوں کے جراثیم منتقل ہو کر بسا اوقات مرض کا سبب بن جاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت، ارادے اور تقدیر سے ہوتا ہے، وہ

چاہے تو جراثیم منتقل ہی نہ کرے یا منتقل کرے لیکن وہ بیماری کا سبب نہ بنیں، یہ نظریہ درست ہے، اور اسلامی تعلیمات کے موافق ہے، اور یہ توکل کے خلاف بھی نہیں ہے جب تک کہ انسان کا یہ عقیدہ ہو کہ صحت و مرض صرف اللہ کے اختیار میں ہے، وہی مؤثر حقیقی ہے، کسی بیماری میں ذاتی تاثیر نہیں ہے، اور حدیث باب میں اس چیز پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ مرض جذام گو کہ متعدی امراض میں سے ہے، لیکن اسکا آگے کسی اور کیطرف منتقل ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے اور اسکے حکم پر موقوف ہوتا ہے، اس مرض میں ذاتی کوئی تاثیر نہیں کہ وہ خود ہی دوسرے کو لگ جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا۔ تکملة فتح الملهم کتاب الطب، مسئلة تعدية الأمراض ۴: ۳۷۰، زاد المعاد فصل فی حدیثہ ﷺ فی التحرز من الادواء ۴: ۸۳۳

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْكُلُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْكَافِرُ يَأْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ وَالْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَافَهُ ضَيْفٌ كَافِرٌ فَأَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ ثُمَّ أُخْرٰى فَحُلِبَتْ فَشَرِبَهُ، ثُمَّ أُخْرٰى فَشَرِبَهُ حَتّٰى شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِيَاهٍ، ثُمَّ أَصْبَحَ مِنَ الْغَدِ فَأَسْلَمَ فَأَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا، ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِأُخْرٰى فَلَمْ يَسْتَتِمَّهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ، وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا جو کافر تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کیلئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری

دوہی گئی، اور اس کافر نے اس دودھ کو پی لیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے دوسری بکری دوہی گئی، وہ اس دودھ کو بھی پی گیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے تیسری بکری دوہی گئی، وہ کافر اس دودھ کو بھی پی گیا، یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا، پھر جب صبح ہوئی تو وہ مسلمان ہوگیا، رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بھی اس کیلئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری دوہی گئی، اور اس نے اسکا دودھ بھی پی لیا، پھر آپ ﷺ نے دوسری بکری دوہنے کا حکم دیا (بکری دوہی گئی) لیکن (اب) وہ اسکا پورا دودھ نہ پی سکا، تب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن ایک آنت میں پیتا ہے، اور کافر سات آنتوں میں۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔مِعیً: آنت ج أمعاء۔ ضافه: اس کے ہاں مہمان آیا۔ حُلِبَتْ: وہ بکری دوہی گئی یعنی اس کا دودھ تھنوں سے نکالا گیا۔ ثم أخری: اصل عبارت یوں ہے: ثم حُلِبَتْ شاۃٌ أخریٰ پھر دوسری بکری دوہی گئی۔ حِلَاب: دودھ، دودھ نکالنے کا برتن ج حُلُبٌ، حدیث میں حلاب سے دودھ کے معنی مراد ہیں۔ فلم یستتمها: وہ اس دوسری بکری کا دودھ پورا نہ پی سکا۔

مومن کا ایک آنت اور کافر کا سات آنتوں میں کھانے کا مطلب

''مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے'' اس ارشاد کے معنی اور مفہوم کے بارے میں محدثین سے مختلف اقوال منقول ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱)......اس حدیث سے حقیقتاً آنتیں اور کھانا مراد نہیں، بلکہ دنیا اور اسکی لذتوں کی قلت و کثرت مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ مؤمن دنیوی لذتوں اور اسکی خواہشات کا زیادہ شوقین نہیں ہوتا جبکہ کافر دنیوی لذتوں کا خوگر اور دلدادہ ہوتا ہے، گویا اس حدیث میں دنیا کو ''اُکل'' اور اسکے اسباب کو ''اُمعاء'' سے تعبیر کیا ہے۔

(۲)......مؤمن رزق حلال کھاتا ہے جو حرام کے مقابلے میں کم ہوتا ہے اور کافر حرام کھاتا ہے، جس کے ذرائع بہت زیادہ ہوتے ہیں، تو حدیث میں حلال کی قلت کو ''معی واحد'' سے اور حرام کی کثرت کو ''سبعة أمعاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳)......اس جملے سے کسی قانون اور حکم کلی کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مؤمن کم اور

کافر زیادہ کھاتا ہے، اور در حقیقت آپ ﷺ نے یہ جملہ اس خاص شخص کے بارے میں ذکر فرمایا ہے جسکا ذکر اس باب کی دوسری حدیث میں ہے، کہ جب وہ شخص کافر تھا تو سات بکریوں کا دودھ پی گیا، اور جب اسلام قبول کرلیا تو ایک بکری کا دودھ بھی اس کی سیرابی کیلئے کافی ہوگیا، اس مطلب کے اعتبار سے ''المؤمن'' اور ''الکافر'' سے ایک مخصوص اور متعین شخص مراد ہے، جسے علم نحو میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ ان کلمات کا الف لام عہد خارجی ہے۔

(۴)......اس حدیث میں ایک عمومی اور غالب حالت کا ذکر ہے، اور ''سبعۃ'' کے لفظ سے کوئی مخصوص تعداد مراد نہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: والبحر یمده من بعده سبعة أبحر بلکہ اس سے کثرت وفراوانی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے، مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی شان اور عمومی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کھانے پینے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا، اسکی فکر ونظر کا محور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور آخرت کی تیاری ہوتی ہے، کم کھاتا ہے، زیادہ کھانا اور مستقل اسکی فکر میں لگے رہنا مؤمن کا نہیں، کافر کا شیوہ ہوتا ہے، اور مؤمن کا کھانا کافر کے کھانے کے مقابلے میں عموماً ایک اور سات کی نسبت سے ہے، کافر کی حالت اکثر یہی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ اور مؤمن اسکے مقابلے میں کم کھاتا ہے صحابہ کرام بھی پیٹ بھر کر کھانے کو انتہائی برا سمجھتے تھے، ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مسکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا، اس نے خوب سیر ہوکر جب کھایا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بندہ میرے ہاں بالکل نہ آیا کرے، کیونکہ خوب سیر ہوکر کھانا کافروں کا طریقہ ہے، لہذا جو مسلمان بغیر کسی حاجت اور ضرورت کے کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو اسکے ساتھ نشست و برخاست مکروہ ہے، اس حدیث میں اسی عمومی حالت کا ذکر ہے، ورنہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ ایماندار بھی طبعی طور پر یا کسی مرض وغیرہ کی وجہ سے زیادہ کھاتے ہوں، اور بعض کافر عادتاً یا کسی اور عارض کی وجہ سے کم کھاتے ہوں، یہ اس حدیث کے منافی نہیں۔

(۵)......اس حدیث میں مؤمن کے کھانے میں برکت اور کافر کے کھانے میں بے برکتی کو بیان کرنا مقصود ہے، کہ مؤمن کھانے پینے کے وقت اللہ کا نام لیکر کھاتا ہے، جسکی برکت سے شیطان اسکے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتا، لہذا قلیل کھانا بھی اس کیلئے کافی ہوجاتا ہے، اسی کو حدیث میں ''معی واحد'' سے تعبیر

کیا ہے، جبکہ کافر اللہ کا نام لیے بغیر ہی کھاتا ہے، تو شیطان کی شرکت کی وجہ سے کم کھانا اس کیلئے کافی نہیں ہوتا، اس وجہ سے وہ زیادہ کھاتا ہے، حدیث میں اسے "سبعة أمعاء" سے بیان کیا ہے۔

(۶) ......علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا: کھانے کی خواہشات اور چاہتیں سات ہیں: طبعی خواہش، نفسانی خواہش، نظر کی خواہش، منہ کی خواہش، کان کی خواہش، ناک کی خواہش اور بھوک کا تقاضا، یہ آخری بھوک کی خواہش انسانی زندگی کیلئے ضرورت ہے، مؤمن اسی ایک خواہش کے تحت کھاتا ہے جبکہ کافر باقی خواہشات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے، حدیث میں "معی واحد" اور "سبعة أمعاء" سے یہی خواہشات اور چاہتیں مراد ہیں۔

اکثر محدثین کرام نے مذکورہ اقوال میں سے چوتھے قول کو راجح اور پسندیدہ قرار دیا ہے۔ تکملة فتح الملہم ۴: ۸۰، تحفۃ الاحوذی ۵: ۴۴۰، شرح الطیبی ۸: ۱۴۳

حدیث میں مہمان سے کون مراد ہے

حدیث میں اس مہمان سے کون مراد ہے؟ بعض محدثین کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ابوغزوان ہیں، کیونکہ طبرانی میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سات آدمی آئے، صحابہ نے ان میں سے چھ کو ضیافت کیلئے لے لیا، اور ساتویں کو آپ ﷺ نے اپنے لئے رکھ لیا، پھر اس سے فرمایا: تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے بتایا: ابوغزوان، اس کیلئے سات بکریوں کا دودھ دوہا گیا، وہ سارا پی گیا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: اے ابوغزوان کیا آپ اسلام قبول کرنا پسند کرتے ہیں؟ ابوغزوان نے کہا: جی ہاں چنانچہ اس نے اسلام قبول کرلیا، پھر آپ ﷺ نے اسکے سینے پر ہاتھ پھیرا، جب صبح ہوئی تو اسکے لئے ایک بکری کا دودھ دوہا گیا، لیکن اسے بھی وہ ختم نہ کرسکا، اسپر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابوغزوان کیا بات ہے (کہ آپ نے ایک بکری کا دودھ بھی پورا نہیں پیا) اس نے جواب میں عرض کیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپکو نبی بنا کر بھیجا ہے: میں سیراب ہو چکا ہوں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ کل گذشتہ آپکی سات آنتیں تھیں (کیونکہ آپ کافر تھے) اور آج آپکی (اسلام قبول کرنے کی وجہ سے) صرف ایک ہی آنت ہے"۔

مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں تقریباً اسی طرح کا واقعہ جھجاہ غفاری کے بارے میں بھی آتا ہے......... ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ایک ہی شخص کے بارے میں ہوں کہ اصل نام تو اسکا جھجاہ غفاری ہو

اور اسکی کنیت ابوغزوان ہو، تکملة فتح الملهم ۴: ۸۳

امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کے نزدیک اس مہمان سے ثمامہ بن اثال اور بعض کے نزدیک نصرہ بن ابی نضرہ غفاری مراد ہیں۔ شرح مسلم للنووی ۲: ۱۸۷

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ طَعَامِ الْوَاحِدِ يَكْفِي الإِثْنَيْنِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو کیلئے کافی ہو جاتا ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: طَعَامُ الإِثْنَيْنِ كَافِي الثَّلاثَةِ، وَطَعَامُ الثَّلاثَةِ كَافِي الأَرْبَعَةِ.

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کیلئے اور تین آدمیوں کا کھانا چار کیلئے کافی ہوتا ہے۔

وَرَوَى الْجَابِرُ وَابْنُ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الإِثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاِثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ.

حضرت جابر وابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی کا کھانا دو کیلئے کافی ہوتا ہے، اور دو کا کھانا چار کیلئے، اور چار کا کھانا آٹھ کیلئے کافی ہوتا ہے۔

کھانے میں ایثار اور قناعت کی ترغیب و تعلیم

ان احادیث میں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ آدمی کے پاس کھانے کی کوئی بھی چیز ہو، اس سے صرف اپنا پیٹ ہی نہ بھرا جائے بلکہ اس میں غرباء اور مساکین کے حق کا بھی ضرور خیال رکھا جائے، کیونکہ طعام قلیل کثیر آدمیوں کی بھوک کی شدت کو ختم کر دیتا ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کھانا دو آدمیوں کو سیر کر دیتا ہے وہ تین آدمیوں کیلئے بطورِ قناعت کافی ہو جاتا ہے، کہ تینوں کی بھوک ختم کر دیتا ہے، اور ان کی بنیادی غذائی ضرورت پوری ہو جاتی ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کھانا دو آدمیوں کو سیر کر سکتا ہے، وہ تین آدمیوں کو بھی سیر کر سکتا ہے۔ اس باب کی پہلی حدیث میں یہ فرمایا کہ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا تین آدمیوں کو کافی ہو جاتا ہے، گویا ایک کے ساتھ ایک کے اضافے کا ہی ذکر ہے، جبکہ باب کی دوسری حدیث میں دوگنے کے حساب سے فرمایا

گیا ہے کہ ایک کا کھانا دو کو، دو کا کھانا چار کو اور چار آدمیوں کا کھانا آٹھ کیلئے کافی ہو جاتا ہے۔

اس سے مقصود تحدید نہیں ہے بلکہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حالات اور افراد کے اعتبار سے جذبہ ایثار و قناعت میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس جذبے سے دو آدمیوں کا کھانا تین کیلئے کافی ہو جاتا ہے، اسی جذبے کو بڑھا کر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں دو کا کھانا چار کیلئے اور چار کا آٹھ کیلئے کافی ہو جائے،......... کیونکہ دسترخوان پر جس قدر اجتماعیت کی فضا میں اضافہ ہوتا ہے، اسی قدر کھانے میں بھی برکت اور زیادہ نازل ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زمانہ قحط میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ہر گھر والوں کے پاس ان کی تعداد کی بقدر غلہ بھیج دوں، تا کہ یہ لوگ بھی اہل خانہ کی طرح کھانا کھا سکیں، کیونکہ اگر آدمی آدھا پیٹ بھی کھالے تو اس سے ہلاک نہیں ہوتا بلکہ اس سے اسکی غذائی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جب یہ بات ہے تو پھر معاشرے کے تنگدست اور لاچار لوگوں کا ہر طریقے سے تعاون کرنا چاہیے، کیونکہ اس طرح کی احادیث کا اصل مقصد ایثار، غمخواری اور قناعت کی ترغیب دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اس میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک کر لیا کرو۔ مرقاۃ المفاتیح ۸:۱۵

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الْجَرَادِ

یہ باب ٹڈی کھانے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنْ اَبِیْ یَعْفُوْرَ الْعَبْدِیِّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِیْ أَوْفٰی أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْجَرَادِ فَقَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سِتَّ غَزَوَاتٍ نَأْكُلُ الْجَرَادَ.

ابو یعفور عبدی عبد اللہ بن ابی اوفی سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے (یعنی ابن ابی اوفی سے) ٹڈی کے (حکم کے) بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ حلال ہے یا حرام) تو انہوں نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چھ جہاد کئے ہیں، ہم (ان غزوات میں) ٹڈی کھاتے تھے۔

عَنِ ابْنِ أَبِیْ أَوْفٰی قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ نَأْكُلُ

الْجَرَادَ.

عبداللہ بن ابی اوفی فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات جہاد کئے، ہم ٹڈی کھاتے تھے، (غزوات چھ ہیں یا سات، اس میں شعبہ راوی کو شک ہے)

وَرَوٰی شُعْبَةُ هٰذَا الْحَدِيْثَ عَنْ أَبِيْ يَعْفُوْرَ عَنِ ابْنِ أَبِيْ أَوْفٰى قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غَزَوَاتٍ ، نَأْكُلُ الْجَرَادَ.

اور شعبہ نے اس حدیث کو ابو یعفور سے روایت کیا ہے، اور انہوں نے ابن ابی اوفی سے، فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئی جہاد کئے، ہم ٹڈی کھاتے تھے۔

ٹڈی کا شرعی حکم

جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ ٹڈی علی الاطلاق حلال ہے، خواہ طبعی موت مری ہو یا کسی حادثے اور سبب کی وجہ سے، البتہ امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر ٹڈی طبعی موت مری ہو، تب تو حرام ہے، لیکن اگر کسی حادثے اور سبب کی وجہ سے مری ہو مثلاً اسے زندہ آگ میں ڈالدیا گیا یا اسے بھون دیا یا اسکا کچھ حصہ کاٹ دیا گیا یا اسے ابال دیا جائے تو پھر حلال ہوگی، بذل المجھود ۱۶:۱۳۸

جمہور کا استدلال بہت سی روایات سے ہے، ان کی تفصیل:

(۱)......عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لئے دو مردار (یعنی مچھلی اور ٹڈی) اور دو خون (یعنی جگر اور تلی) حلال کر دیے گئے۔ سنن ابن ماجۃ ص: ۲۳۸

اس روایت میں بغیر کسی قید کے آپ ﷺ نے ٹڈی کو حلال قرار دیا ہے، یہ حدیث جمہور کی ایک واضح اور صریح دلیل ہے۔

(۲)......حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پلیٹوں میں رکھ کر ٹڈیاں پیش کرتی تھیں۔ سنن ابن ماجۃ ص: ۲۳۲

(۳)......حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ٹڈی کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرے پاس ٹڈیوں کا ایک ٹوکرا ہو، اور میں اس میں سے کھاؤں۔ موطا امام محمد ص: ۲۸۷

امام نووی رحمہ اللہ نے ٹڈی کے حلال ہونے پر اجماع نقل کیا ہے، البتہ ابن العربی نے شرح ترمذی میں حجاز کی ٹڈیوں اور اندلس کی ٹڈیوں کے درمیان فرق کیا ہے، اور کہا ہے کہ اندلس کی ٹڈیاں سراپا ضرر ہیں، ان میں زہریلے جراثیم ہیں، لہٰذا اگر کسی علاقے کی ٹڈیوں کے بارے میں تحقیق سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ صحت کیلئے نقصان دہ ہیں، تو پھر ان کا استعمال درست نہیں ہوگا۔ فتح الباری کتاب الذبائح والصید، باب أکل الجراد ۹:۷۷۵، شرح مسلم للنووی ۲:۱۵۲ کتاب الصید والذبائح باب إباحۃ الجراد۔ تکملۃ فتح الملهم ۳/۵۳۵۔ عارضة الأحوذی لابن العربی، کتاب الأطعمة باب أکل الجراد ۸/۱۶

کیا حضور ﷺ نے ٹڈی کھائی ہے

بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ٹڈی کھائی ہے، کیونکہ اس حدیث میں انہوں نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے......... کنا نأکل معه الجراد، (ہم آپکے ساتھ ٹڈی کھاتے تھے)، جبکہ صحیح مسلم اور سنن ترمذی میں لفظ ''معه'' نہیں ہے، اس ''معیت'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱)......صرف غزوہ اور جہاد میں معیت اور شرکت مراد ہے، کھانے میں نہیں، اور معنی یہ ہونگے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی موجودگی میں ٹڈی کھائی، لیکن آپ نے ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

یہ احتمال حدیث کے ظاہری لفظ سے ثابت نہیں ہوتا اسلئے اسے مراد لینا بہت بعید ہے، نیز یہ احتمال مراد لینے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، کیونکہ جہاد میں معیت اور شرکت کا مفہوم حدیث کے بالکل ابتدائی الفاظ: غزونا مع النبی ﷺ...... سے ثابت ہو رہا ہے، پھر اسی معنیٰ کو کنا نأکل معه الجراد میں دوبارہ مراد لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۲)......یا اس سے کھانے میں شرکت مراد ہے کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے جہاد میں ضرورت کی وجہ سے ٹڈی تناول فرمائی ہے، یہ معنی اس جملے سے صراحت سے ثابت ہو رہے ہیں، اس احتمال کی تائید ابونعیم کی روایت سے ہوتی ہے، جس میں ''ویأکل معنا'' (آپ ﷺ ہمارے ساتھ ٹڈی کھاتے تھے) کے الفاظ ہیں۔ فتح الباری ۹:۷۷۵

چونکہ یہ احتمال حدیث کے الفاظ سے ثابت ہو رہا ہے، اسلئے یہی راجح ہے، ہاں یہ درست ہے کہ

آپ ﷺ ٹڈی کھانا نہ تو پسند کرتے تھے اور نہ ہی اسے کھانا آپ کا عام معمول تھا، اسی چیز کا اظہار آپ نے یوں فرمایا: لا اکله و لا أحرّمه اور آپ اس وجہ سے بھی اسے کھانا پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں، بعض علاقوں میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے عذاب بن کر اترتی ہیں، لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے کبھی بھی ٹڈی نہیں کھائی، بلکہ اس میں صرف آپکی طبعی کراہت کا ذکر ہے کہ میں اسے کھانا پسند نہیں کرتا اور حرام بھی قرار نہیں دیتا، لہذا ایسا ہوسکتا ہے کہ عام حالات میں تو آپ نے ٹڈی کبھی نہ کھائی ہو لیکن کسی سفرِ جہاد میں آپ ﷺ نے صحابہ کے ساتھ ٹڈی کھائی ہو، کیونکہ سفر اور غزوہ میں آدمی کو عموماً اپنی پسند کی چیز دستیاب نہیں ہوتی، چنانچہ سفر جہاد کا واقعہ صحابی نے کنا ناکل معه الجراد سے بیان کیا، اگر حضور ﷺ نے صحابہ کے ساتھ ٹڈی نہ کھائی ہوتی تو صحابی رسول ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہما کھانے میں معیت کا یہ جملہ نقل نہ کرتے، یا یوں بیان کرتے کہ ہم نے ٹڈی کھائی اور آپ ﷺ نے ٹڈی نہیں کھائی، یہ بات اسلئے ہے کہ صحابہ کرام خلاف واقعہ کبھی کوئی چیز بیان نہیں کرتے، کیونکہ عدالتِ صحابہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے۔

لفظ جراد کی تحقیق

جراد: جرادة کی جمع ہے: ٹڈی کو کہتے ہیں، یہ جَرْدٌ سے مشتق ہے، اسکے معنی ہیں: خالی کرنا اور صفایا کرنا، اور ٹڈی کو بھی جراد اسلئے کہتے ہیں کہ وہ جہاں اترتی ہے، اس جگہ کا صفایا کر دیتی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْجَلَّالَةِ وَأَلْبَانِهَا

یہ باب جلالہ کا گوشت کھانے اور اسکا دودھ پینے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْجَلَّالَةِ وَأَلْبَانِهَا.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جلالہ کا گوشت کھانے اور اسکا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: نَهَى عَنِ الْمُجَثَّمَةِ وَعَنْ لَبَنِ الْجَلَّالَةِ وَ عَنِ الشُّرْبِ مِنْ فِي السِّقَاءِ.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس جانور سے جسکو باندھ کر تیر مارا جائے اور جلالہ یعنی مینگنی گوبر وغیرہ نجاست کھانے والے جانور کے دودھ پینے اور مشک سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ اَلْجَلَّالَة: یہ جَلَّة سے مشتق ہے، اسکے معنی ہیں: مینگنی اور لید، اور جلالہ اس جانور کو کہتے ہیں جو زیادہ تر مینگنی، لید، نجاست اور گندگی کھاتا ہو خواہ وہ مرغ اور بطخ ہو، بکری، گائے یا اونٹ ہو۔ البانها: یہ لَبَن کی جمع ہے: دودھ، حدیث میں جمع کا لفظ بطور مبالغہ کے ذکر کیا گیا ہے۔ المجثمة: وہ جانور جسے گھونٹ کر مار دیا جائے یا وہ جسے زمین میں گاڑ کر یا کسی چیز سے باندھکر نشانہ بنا کر تیر یا گولی ماری جائے، اور بغیر ذبح کے ہی وہ مرجائے۔ فی السقاء: ای فم السقاء مشک کا منہ۔

جلالہ کے گوشت اور دودھ کا شرعی حکم

"جلالہ" درحقیقت اسی جانور کو کہا جاتا ہے جسکا گوشت شرعاً حلال ہو، لیکن اسے نجاست اور گندگی کھانے کی عادت ہو جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اسکے گوشت اور دودھ کا شرعی حکم کیا ہے، وہ حلال ہے یا حرام؟ اسکا حکم یہ ہے کہ اگر وہ جانور کبھی کبھار نجاست اور گندگی کھاتا ہو، اکثر اسکی غذاء پاکیزہ اور صاف ستھری ہو تو وہ جلالہ کے حکم میں نہیں ہوگا، جیسے مرغ، اس کے گوشت کا استعمال دوسرے حلال جانوروں کیطرح درست ہے، اس میں کوئی قباحت اور کراہت نہیں ہے، لیکن اگر اس جانور کی غذاء کا دارو مدار ہی غلاظت اور گندگی ہو، اور وہ بھی اس قدر کہ اسکے گوشت، دودھ اور پسینے تک میں بھی بدبو آنے لگے تو پھر اسکا گوشت اور دودھ استعمال کرنا درست نہیں ہے، مکروہ ہے۔

ایسے میں اس جانور کو نجاست اور گندگی کے بدبودار اثرات سے پاک کرنے کیلئے چند دن بند کر کے رکھا جائے، اس دوران اسے پاک چارہ اور صاف ستھرا پانی دیا جائے، جب یہ اثرات ختم ہو جائیں تو اسکے کھانے میں کوئی کراہت نہیں ہے، اسے اچھی طرح دھو کر استعمال کرنا درست ہے۔

کتنے دن تک اسے بند رکھا جائے؟ اس میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کوئی مدت مخصوص اور متعین

نہیں ہے، اس وقت تک اسے بند رکھا جائے جب تک کہ متعلقہ شخص کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ اب اسکے گوشت وغیرہ میں بدبو کے اثرات ختم ہو گئے ہیں، جبکہ بعض فقہاء نے کچھ آثار کی روشنی میں مختلف جانوروں کے اعتبار سے ایام کی تعیین کی ہے کہ اگر وہ جانور گائے یا اونٹ ہو تو اسے چالیس یوم تک، بکری ہو تو سات یا دس دن اور آزاد مرغی ہو تو تین یوم تک بند کر کے رکھا جائے، ان میں سے کسی بھی قول پر عمل کیا جاسکتا ہے، البتہ دوسرے قول میں نسبتاً آسانی ہے۔

موجودہ دور میں اگر اس جانور کے بدبودار جراثیم ختم کرنے کیلئے کوئی نیا میڈیکل طریقہ اختیار کیا جائے، گولیاں کھلائی جائیں، انجکشن لگائے جائیں.......... جن سے معدہ کی صفائی جلد ہی ہو جائے، تو یہ جائز ہے، اسطرح کرنے سے جب اسکے گندے اور بدبودار جراثیم ختم ہو جائیں تو پھر اسکے گوشت میں کوئی کراہت باقی نہیں رہے گی۔ مرقاۃ ۷: ۲۰۷، تحفۃ الاحوذی ۵: ۴۴۵

باب کی دوسری حدیث کی تشریح

اس حدیث میں آپ ﷺ نے تین چیزوں سے منع فرمایا ہے:

(۱)......مجثمہ سے یعنی اس بات سے کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر تیر کے ذریعہ مارا جائے، اور پھر اسی میں وہ مر جائے، اور اسے ذبح نہ کیا جائے ایسا جانور حرام ہوتا ہے اس سے درحقیقت زمانہ جاہلیت کے ایک طریقے پر رد کرنا مقصود ہے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ تیر اندازی کے وقت کسی حیوان کو ہدف مقرر کرتے، جب وہ تیر نشانے پر لگتا تو وہ جانور چیختا، پھڑ پھڑاتا تو ان کو یقین ہو جاتا کہ تیر واقعی اپنے نشانے پر لگ گیا ہے، اسی ہدف کو مجثمہ کہا جاتا ہے، اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں حیوان کو سخت اذیت پہونچتی ہے۔

(۲)......حیوان جلالہ کا دودھ پینے سے منع فرمایا، اس بدبو کی وجہ سے جو اسکے دودھ میں بھی سرایت کر چکی ہوتی ہے، البتہ جب یہ اثرات ختم ہو جائیں تو پھر دودھ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

(۳)......مشک کو منہ لگا کر اسکے دہانے سے پانی پینے سے منع فرمایا، اس طرح پینے سے پانی بھی ضائع ہو سکتا ہے، مشک کے دہانے پہ بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسکے اندر کوئی موذی جانور ہو، جو اسکے دہانے سے براہ راست پانی پینے سے اسے ضرر پہونچا دے.......... اس وجہ سے آپ ﷺ نے اس سے منع

فرمایا ہے۔فتح الباری ۹:۸۰۲،تحفۃ الاحوذی ۱۱/۵

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الدَّجَاجِ

یہ باب مرغی کا گوشت کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ زَهْدَمٍ الْجَرْمِيِّ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى أَبِيْ مُوْسَى وَهُوَ يَأْكُلُ دَجَاجَةً فَقَالَ: اُدْنُ فَكُلْ فَإِنِّيْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَأْكُلُهُ.

زہدم الجرمی سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس گیا،وہ اس وقت مرغی کا گوشت کھا رہے تھے،انہوں نے فرمایا: قریب ہوجاؤ اور کھاؤ، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مرغی کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

عَنْ أَبِيْ مُوْسَى قَالَ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَأْكُلُ لَحْمَ دَجَاجٍ. وَفِي الْحَدِيْثِ كَلَامٌ اَكْثَرُ مِنْ هٰذا .

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مرغ کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔اور حدیث میں اس سے زیادہ کلام ہے(یعنی طویل قصہ ہے)

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دَجَــاج: یہ لفظ جمع ہے،اسکا مفرد: دَجَــاجَة ہے،مذکر ومؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے،دال پر زبر، زیر اور پیش تینوں اعراب درست ہیں مگر زبر پڑھنا فصیح ہے،"دجاجة" میں جو "تاء" ہے یہ تانیث کیلئے نہیں ہے بلکہ وحدت اور مفرد کیلئے ہے،یہی وجہ ہے کہ حدیث باب کے لفظ "یأکله" میں "ہ" ضمیر دجاجہ کیطرف لوٹ رہی ہے۔اُدْن: دنا یدنو سے صیغہ امر ہے: قریب ہوجاؤ

مرغ کا گوشت حلال ہے

مذکورہ احادیث سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ مرغ خواہ گھریلو ہو یا فارمی، حلال ہے،اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے،البتہ اگر کوئی مرغ کثرت کے ساتھ گندگی کھانے کا عادی ہو تو وہ جلالہ کے حکم میں ہے،جسکا حکم گذشتہ باب میں گذر چکا ہے۔

وفی الحدیث کلام اکثر سے کیا مراد ہے

اس سے مراد حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا وہ طویل واقعہ ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے:

''زہدم بن مضرب جرمی فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابوموسیٰ کے پاس بیٹھے تھے، چونکہ ہمارے درمیان اور جرم کے اس قبیلہ کے درمیان بھائی چارہ تھا، اسلئے کھانا لایا گیا، جس میں مرغی کا گوشت تھا، (سب لوگ کھانے کیلئے کھانے کے قریب آ گئے، لیکن) لوگوں میں ایک سرخ رنگ کا آدمی بیٹھا تھا، وہ کھانے کے قریب نہیں آیا، ابوموسی نے ان سے کہا کہ قریب آ جاؤ، کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے دیکھا ہے، اس آدمی نے کہا کہ ''میں نے مرغی کو ایسی چیز کھاتے دیکھا ہے جس سے مجھے گھن آتی ہے، تو میں نے قسم کھائی کہ میں (آئندہ) مرغی نہیں کھاؤں گا۔

ابوموسی نے فرمایا کہ: نزدیک آئیں، آپ کو بتلا دوں کہ میں قبیلہ اشعر کے چند لوگوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا، اور اس وقت پہونچا کہ آپ غصے کی حالت میں تھے اور صدقہ کے جانور تقسیم فرما رہے تھے، ہم نے آپ سے سواری کیلئے جانور مانگا تو آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ہمیں سواری نہیں دیں گے، اور فرمایا کہ میرے پاس تمہیں سواری دینے کیلئے کوئی جانور نہیں ہے۔

اسکے بعد حضور اکرم ﷺ کے پاس غنیمت کے اونٹ آئے تو آپ نے فرمایا: اشعری کہاں ہیں؟ اشعری کہاں ہیں؟ پھر ہمیں اونچی کوہان والے پانچ سفید اونٹ دیئے، کچھ دیر ہم ٹھہرے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ اپنی قسم بھول گئے ہیں، اگر ہم نے حضور ﷺ کو ان کی قسم سے غافل رکھا تو بخدا ہم کبھی فلاح نہیں پائیں گے، چنانچہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں لوٹ آئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے آپ سے سواری مانگی تو آپ نے قسم کھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ آپ ہمیں سواری نہیں دیں گے، (اور پھر آپ نے ہمیں دیدی) ہمیں اندیشہ ہوا کہ شاید آپ اپنی قسم بھول گئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں اللہ نے سواری دی ہے، اور میں تو بخدا جب بھی کسی بات پر قسم کھاتا ہوں اور پھر بھلائی اسکے غیر میں دیکھوں، تو وہی کام کرتا ہوں، جس میں بھلائی ہوتی ہے، اور کفارہ دیکر قسم توڑ دیتا ہوں'' صحیح بخاری کتاب الذبائح والصید باب لحم الدجاج ۲:۸۲۹

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الْحُبَارَى

یہ باب سرخاب کھانے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عُمَرَ بْنِ سَفِيْنَةَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: أَكَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَحْمَ حُبَارَى.

ابراہیم اپنے باپ عمر بن سفینہ سے، اور یہ ابراہیم کے دادا سفینہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سفینہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سرخاب کا گوشت کھایا ہے۔

سرخاب کا گوشت حلال ہے

''حباری'' سرخاب کو کہتے ہیں، یہ ایک جنگلی پرندہ ہے، اسکا رنگ مٹیالہ، گردن بڑی، چونچ قدرے طویل اور پاؤں لمبے ہوتے ہیں، اسکی اڑان بہت تیز ہوتی ہے اور اسکا گوشت انتہائی لذیذ ہوتا ہے۔

حدیث باب سے معلوم ہوا کہ سرخاب کا گوشت حلال ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الشِّوَاءِ

یہ باب بھنے ہوئے گوشت کھانے کے حکم کے بارے میں ہے

قَالَ ابْنُ جُرَيْجٍ أَخْبَرَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ أَخْبَرَتْهُ: أَنَّهَا قَرَّبَتْ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ جَنْبًا مَشْوِيًّا فَأَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ وَمَاتَوَضَّأَ.

ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھے محمد بن یوسف نے خبر دی کہ انہیں عطاء بن یسار نے خبر دی کہ ام سلمہ نے انہیں بتایا کہ انہوں نے (یعنی میں نے) بھنا ہوا پہلو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس میں سے کھایا، پھر نماز کیلئے اٹھے اور وضو نہیں کیا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ۔قربت: ام سلمہ نے قریب کیا، پیش کیا۔ جنبا: پہلو، جانب، جہت، کنارہ۔ مشویا: بھنا ہوا، روسٹ کیا ہوا۔

بھنا ہوا گوشت کھانا جائز ہے

حدیث باب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ روسٹ کیا ہوا گوشت خواہ بکری کا ہو یا کسی بھی حلال جانور اور پرندے کا، اسکا کھانا جائز ہے، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص وضو کے بعد آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالے تو اس سے اسکا وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ آپ ﷺ نے بھنا ہوا گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کیا، اور آپ نماز کیلئے تشریف لے گئے، یہی جمہور علماء کا موقف ہے البتہ کھانے کے بعد کلی کر لینی چاہیے، یہ سنت ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْأَكْلِ مُتَّكِئًا

یہ باب تکیہ لگا کر کھانے کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَمَّا أَنَا فَلَا آكُلُ مُتَّكِئًا.

ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تو ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔

آپ ﷺ ٹیک لگا کر نہیں کھاتے تھے

حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تکیہ لگا کر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے، اس حدیث کا سبب دراصل اعرابی کا وہ واقعہ ہے جو سنن ابن ماجہ میں عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہ آپ ﷺ کو ایک بکری ہدیہ دی گئی، اسے کھانے کیلئے آپ دوزانو بیٹھے تو ایک اعرابی نے عرض کیا: یہ کیسی (عاجزانہ) نشست ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے مہربان بندہ بنایا ہے، اس نے مجھے مغرور ومتکبر اور سرکش آدمی نہیں بنایا، (اس لئے میں اسطرح بیٹھا ہوں) سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۵۔

ابن بطال فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ نشست تواضع اور عاجزی کی وجہ سے اختیار فرمائی تھی۔

اور ابن بطال ہی نے امام زہری سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ کے پاس جبرئیل امین کے ساتھ ایک ایسا فرشتہ آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا، آکر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے آپکو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ آپ

عبد (بندہ) ہوکر نبی ہوں یا فرشتہ ہوکر، آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل کیطرف مشورہ کی غرض سے دیکھا، انہوں نے اشارہ کیا کہ آپ تواضع اختیار کریں، پھر آپ ﷺ نے اس فرشتے سے فرمایا کہ: میں عبد ہوکر نبی بننا پسند کرتا ہوں، راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھایا۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کو ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، لیکن ان کا یہ قول انکے اپنے علم کی حد تک ہے، ورنہ مصنف ابن ابی شیبہ میں مجاہد کا اثر ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ تکیہ لگا کر کھانا کھایا اور پھر اسے یہ کہ کر چھوڑ دیا: **اللھم انی عبدک ورسولک** اے اللہ! میں آپکا بندہ اور رسول ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ کو ٹیک لگا کر کھانا کھاتے دیکھا تو آپ ﷺ کو منع کر دیا، اسکے بعد پھر کبھی آپ نے ٹیک لگا کر کھانا تناول نہیں فرمایا۔

فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب الاکل متکئا: ۹/۶۷۵۔

"إتکاء" کے معنیٰ اور ٹیک لگا کر کھانے کا حکم

"إتّــکـــاء" کے کیا معنیٰ ہیں، اسکے معنیٰ اور کیفیت کے بارے میں شارحین حدیث کی مختلف آراء ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......مشہور یہ ہے کہ کھانے کے وقت کسی بھی چیز سے ٹیک لگائی جائے تو یہ "اتکاء" ہے، خواہ وہ تکیہ، دیوار اور کرسی ہو یا اسکے علاوہ اور کوئی چیز۔

(۲)......ایک جانب پہلو کی طرف جھک کر کھانا کھانا۔

(۳)......بائیں ہاتھ پر ٹیک لگا کر کھانا کھانا۔

(۴)......بغیر کسی عذر کے چارزانو ہوکر یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھنا۔

(۵)......علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ "اتکاء" سے مراد یہ ہے کہ جس گدے یا نرم بستر پر بیٹھا ہے، اسپر ٹیک لگا کر سیدھا اور پھیل کر بیٹھنا تاکہ زیادہ کھایا جاسکے، اسکی کیفیت خواہ کوئی بھی ہو۔

ان تمام صورتوں کو اہل علم نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے، کیونکہ تکیہ لگا کر کھانا عموماً مغرور و متکبر اور غافل

لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے، اور ان لوگوں کا جو زیادہ کھانے کے خوگر ہوں، اور کراہت اس وجہ سے بھی ہے کہ ٹیک لگا کر کھانا کھانے سے پیٹ بڑھ جاتا ہے، اور نظام ہضم بھی خراب اور کمزور ہو جاتا ہے۔

لیکن چونکہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے تکیہ لگا کر کھانیکا مطلقا جواز منقول ہے ، چنانچہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' نے حضرت ابن عباس، خالد بن ولید، عبیدہ سلمانی، محمد بن سیرین، عطاء بن یسار اور امام زہری سے مطلقاً جواز نقل کیا ہے، اس لئے اگر کوئی عذر اور مجبوری ہو کہ ٹیک لگائے بغیر کھانا مشکل ہو، تو ایسی صورت میں ٹیک لگا کر کھانے میں کوئی حرج نہیں، بغیر کسی کراہت کے درست ہے، اور اگر تکیہ لگا کر کھانے کا منشا فخر وغرور ہو تو یہ ناجائز اور حرام ہے اور اگر ٹیک لگا کر کھانا آرام وراحت اور کثرت طعام کی غرض سے ہو تو شرعا یہ خلاف اولی اور ناپسندیدہ ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''باب ما جاء فی کراھیة الأکل متکئاً'' کا عنوان قائم کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ٹیک لگا کر کھانا بہر حال خلاف اولی اور ناپسندیدہ ہے، جس سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے۔

بعض حضرات نے حدیث باب کے الفاظ ''أما أنا فلا آکل متکئا'' سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت کا حکم صرف آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، چنانچہ شوافع میں سے ابو العباس بن القاص کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ اسکو بغیر کسی دلیل کے آپکی خصوصیت قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ٹیک لگا کر کھانا کھانے کی ممانعت کا حکم سب کیلئے ہے، اس حکم کے عام ہونے پر علامہ عینی نے طبرانی کے حوالے سے حضرت ابو الدرداء کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: لَا تَأْكُلْ مُتَكِئاً ٹیک لگا کر نہ کھاؤ، آپکا یہ ارشاد ایک عام حکم بیان کر رہا ہے، جو سب کو شامل ہے، اسلئے تمام لوگوں کیلئے ٹیک لگا کر کھانا ممنوع ہے، البتہ عذر اور ضرورت کی صورتیں ممانعت کے حکم سے بہر حال مستثنیٰ ہیں۔

عمدۃ القاری ۲۱/۴۳، فتح الباری ۹/۶۷۵، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ ۸/۱۱، رقم الحدیث: ۴۱۶۸۔

کھانے کیلئے بیٹھنے کی مستحب صورتیں

کھانے کے وقت بیٹھنے کے مستحب اور مسنون طریقے یہ ہیں:

(۱)......مسنون یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت کھانے کی طرف قدرے جھک کر عاجزانہ انداز سے مکمل توجہ کے ساتھ بیٹھا جائے۔　　بذل المجھود، کتاب الأطعمة، باب فی الأکل متکئا:۱۶/۹۹۔

(۲)......دوزانو ہو کر بیٹھنا یعنی گھٹنے کے بل بیٹھنا جسطرح تشہد میں بیٹھا جاتا ہے۔عمدة القاری، کتاب الاطعمة، باب الاکل متکئا:۲۱/۴۴، رقم الحدیث:۲۵۔

(۳)......"إقعاء" کیطرح بیٹھنا یعنی پنڈلی اور ران ملا کر دونوں زانو کھڑے کر لینا اور کولھوں (سرین) پر بیٹھ جانا۔

حضرت انس کی ایک روایت میں حضور اکرم ﷺ سے کھانے کے وقت بیٹھنے کی یہ کیفیت منقول ہے۔تکملة فتح الملھم، کتاب الاطعمة، باب استحباب تواضع الأکل وصفة قعوده:۴/۴۷،

(۴)......دونوں پاؤں پر اسطرح بیٹھے کہ سرین زمین پر نہ لگے، اسے اکڑوں بیٹھنا کہا جاتا ہے۔

(۵)......دایاں گھٹنا کھڑا کرلے اور بائیں گھٹنے پر بیٹھ جائے۔اشعة اللمعات فارسی، کتاب الاطعمة، الفصل الاول:۳/۴۸۷۔

بیٹھنے کے مذکورہ طریقوں میں کھانے کا ادب واحترام اور عجز وانکساری کا اظہار ہے، اور ان میں کھانا بھی کم کھایا جاتا ہے، جو صحت کیلئے فائدے مند ہے، اسلئے کھانے کیلئے ان نشستوں میں سے کوئی نشست اختیار کرنی چاہیے، ٹیک لگا کر کھانے سے ہر ممکن احتراز کرنا چاہیے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ حُبِّ النَّبِيِّ ﷺ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ آپ ﷺ میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کو میٹھی چیز اور شہد بہت پسند تھا

"حلواء" مد کے ساتھ اور مد کے بغیر دونوں طرح یہ لفظ پڑھا جاسکتا ہے، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو

میٹھی ہو، اس سے سوجی کا بنا ہوا حلوا مراد نہیں ہے جو ہمارے معاشرے میں معروف ہے۔

"حلواء" کے بعد "عسل" کا ذکر کیا، جبکہ شہد بھی مٹھاس کی وجہ سے "حلواء" میں داخل ہے، اس طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ شہد کو دوسری تمام شیریں اشیاء پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، کیونکہ احادیث میں اسکی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا میٹھی چیز کو پسند کرنا طبعی خواہش کی وجہ سے نہیں تھا کہ آپ اکثر وبیشتر میٹھی چیز کھانا پسند فرماتے ہوں بلکہ "یحب الحلواء" کا مطلب یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کے سامنے دسترخوان پر میٹھی چیز آجاتی تو آپ ﷺ اسے بھی بڑے شوق ورغبت سے یوں تناول فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ بھی آپکو بہت پسند ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مختلف قسم کے عمدہ، لذیذ اور شیریں کھانے بنانا اور انہیں کھانا جائز ہے، اور شرعاً یہ زہد وتقویٰ اور پرہیز گاری کے منافی نہیں ہے۔

علامہ ابو منصور ثعالبی نے "فقہ اللغۃ" میں لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جس حلوے کو پسند کرتے تھے، وہ کھجور کو دودھ میں گوندھ کر بنایا جاتا تھا۔ عمدۃ القاری، کتاب الاطعمۃ، باب الحلواء والعسل ۲۱/۶۱۔ تکملۃ فتح الملهم، کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارۃ علی من حرم امرأتہ ولم ینو الطلاق، ۱/۱۶۴، رقم الحدیث: ۳۶۵۸۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ حدیث اختصار کے ساتھ ذکر کی ہے، اسکی تفصیل صحیح مسلم میں موجود ہے جس میں وہ واقعہ ہے کہ جسکی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے لئے شہد کا استعمال حرام کردیا تھا، پھر جس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ تحریم نازل فرمائی۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارۃ علی من حرم امرأتہ......۱/۴۷۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ إِكْثَارِ الْمَرَقَةِ

یہ باب سالن میں شوربہ زیادہ کرنے کے بارے میں ہے

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْمُزَنِيِّ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ. قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِذَا اشْتَرَى أَحَدُكُمْ لَحْمًا فَلْيُكْثِرْ مَرَقَتَهُ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ لَحْمًا أَصَابَ مَرَقَةً وَهُوَ أَحَدُ اللَّحْمَيْنِ.

علقمہ بن عبداللہ مزنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب

تم میں سے کوئی گوشت خریدے (اور پھر پکائے) تو اسے اسکا شوربہ زیادہ رکھنا چاہیے، اب اگر کسی کو گوشت (کی بوٹی) نہ ملے تو اسکا شوربہ لے لیگا (یعنی کھالیگا) اور شوربہ (بھی) دوگوشتوں میں ایک گوشت ہے۔

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَايَحْقِرَنَّ أَحَدُكُمْ شَيْئًا مِنَ الْمَعْرُوْفِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَلْقَ أَخَاهُ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ، وَإِذَا اشْتَرَيْتَ لَحْمًا أَوْ طَبَخْتَ قِدْراً فَأَكْثِرْ مَرَقَتَهُ وَاغْرِفْ لِجَارِكَ مِنْهُ.

ابوذرغفاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نیکی کے کسی کام کو (یا نیکی کے کسی حصے اور جزء کو) ہرگز حقیر نہ سمجھے اور اگر اور کچھ (نیکی کا کام) نہ پائے تو اتنا کرے کہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملاقات کرے، اور جب تم گوشت خریدو یا ہانڈی پکاؤ تو اسکا شوربہ زیادہ (پکایا) کرو، اور اس میں سے اپنے پڑوسی کو بھی چلّو بھر دیدو۔

مشکل کلمات کے معنی: ۔اِکْثَار: زیادہ کرنا۔ المرقة: (میم اور راء پر زبر کے ساتھ) شوربا۔ لا یحقرن: ہرگز حقیر اور کمتر نہ سمجھے۔ المعروف: بھلائی، احسان، حسن سلوک، عطیہ، نیکی۔ وجه طلیق: خندہ پیشانی، خندہ مسکراتا چہرہ، کھِلا ہوا ہشاش چہرہ۔ قِدْر: (قاف کے نیچے زیر اور دال کے سکون کے ساتھ) ہانڈی، دیگچی ج قُدُور۔ اغرف: تم چلّو بھر نکال لو یعنی اس کے بقدر چمچ یا اور کسی چیز سے سالن نکال کر اپنے پڑوسی کو دیدو۔

شوربہ زیادہ پکانے کی ترغیب

باب کی پہلی حدیث میں آپ ﷺ نے معاشرت سے متعلق ایک ترغیبی حکم دیا کہ جب تم گوشت خرید کر پکاؤ تو اس میں شوربہ زیادہ کرو تا کہ گھر کے جس فرد کو گوشت نہ مل سکے تو اسے شوربہ ضرور مل جائے، اور شوربہ بھی ایک طرح کا گوشت ہی ہے کہ اسکی تاثیر اور چکنائی سب شوربہ میں منتقل ہو جاتی ہے، گویا طاقت اور غذائیت کے اعتبار سے شوربہ گوشت کے قائم مقام ہے۔

باب کی دوسری روایت میں ہے: "واذا اشتریت لحما أو طبخت قِدرا" اس میں "او" کے

کیا معنیٰ ہیں، شارحین حدیث کی دو رائیں ہیں:

(۱)...... بظاہر یہ "او" شک کے معنیٰ میں ہے کہ راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے پہلا جملہ ارشاد فرمایا یا دوسرا۔

(۲)...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ "تنویع" کیلئے ہو، یعنی یہ الگ قسم اور نئی بات بیان کرنے کیلئے ہو، اس صورت میں دو جملے الگ الگ معنیٰ کیلئے ہونگے، پہلے جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تم گوشت خریدو (یعنی پکاؤ) تو اسکا شوربہ زیادہ کرلیا کرو، اور دوسرے جملے میں گوشت کے علاوہ دوسری ہانڈیوں کا ذکر ہے کہ جب سبزی وغیرہ بنائیں تو اسکا شوربہ زیادہ کرلیا کرو۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ماجاء فی إکثار المرقۃ ۵/۴۵۷

شوربہ زیادہ کرنے کی اسلئے ترغیب دی جارہی ہے تاکہ اپنے پڑوسیوں کو اس میں سے کچھ دیا جاسکے، حدیث کے آخری جملے "واغرف لجارک منہ" میں اسی کو بیان کیا گیا ہے، اس جملے کا اصل منشا یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھنا چاہیے، حدیث میں گو کہ خاص طور پر سالن اور شوربے کا ذکر ہے لیکن یہ حکم صرف شوربے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جسے پڑوسی لینا پسند کرتے ہوں، اور جس چیز کا دینا عرف کے لحاظ سے مناسب ہو، اسے برا نہ سمجھا جاتا ہو۔

کسی بھی نیکی کو معمولی نہ سمجھا جائے

آپ ﷺ نے فرمایا کہ نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی اور کمتر نہ سمجھا جائے، اور کمتر سمجھ کر اسے چھوڑ نہ دیا جائے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل قبول ہوجائے اور بخشش کا ذریعہ بن جائے، اور اگر اور کچھ نہ ہوسکے تو اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے مسکرا کر ملاقات کرلو، اس سے اسکا دل خوش ہوجائیگا اور مسلمان کا دل خوش کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اور کسی گناہ کو معمولی، حقیر اور چھوٹا سمجھ کر کیا نہ جائے، کیونکہ گناہ خواہ کتنا ہی بظاہر چھوٹا نظر آئے، وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے، افسوس کہ ہمارے معاشرے میں کتنی ہی نیکیوں کو معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے، اور بڑے سے بڑے گناہ کو چھوٹا سمجھ کر بڑی ڈھٹائی اور دلیری سے کیا جاتا ہے، یہ طرز عمل اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، اسلئے کسی بھی نیکی کو معمولی سمجھ کر چھوڑا نہ جائے اور کسی بھی گناہ کو چھوٹا خیال کرکے کیا نہ جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ فَضْلِ الثَّرِيْدِ

یہ باب ثرید کی فضیلت کے بیان میں ہے

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ، وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مردوں میں بہت سارے لوگ کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں صرف مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کامل ہوئی ہیں، اور عائشہ کی فضیلت سب خواتین پر ایسی ہے جیسا ثرید کی فضیلت دوسرے تمام کھانوں پر۔

مقامِ نبوت کسی عورت کو نہیں ملا

اس حدیث کی روشنی میں بعض حضرات اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ عورتیں نبی بن سکتی ہیں، ان کے نزدیک حضرت مریم اور آسیہ نبی تھیں، ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ دنیا کی چھ خواتین کو نبوت کا شرف حاصل ہوا، حضرت حواء، سارہ، ھاجرہ، ام موسیٰ، آسیہ اور حضرت مریم علیہن السلام۔

علامہ قرطبی کے نزدیک حضرت مریم نبی تھیں۔

لیکن جمہور کے نزدیک راجح یہ ہے کہ عورتوں میں سے کسی کو بھی نبوت کا مقام نہیں ملا، یہ اعزاز صرف مردوں کو حاصل رہا ہے، اسکی دلیل سورہ یوسف کی وہ آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا:

"وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم من اھل القری"

"آپ سے پہلے ہم نے بستی والوں میں جتنے رسول بھیجے ہیں، سب مرد ہی تھے، جنکی طرف ہم وحی نازل فرماتے گئے" سورہ یوسف آیت ۱۰۹

یہ آیت اس بات پر نص ہے کہ تمام نبی مرد ہی ہوئے ہیں، کوئی عورت نبی نہیں تھی۔

حدیثِ باب کے بارے میں جمہور کا کہنا یہ ہے کہ اس سے حضرت مریم اور حضرت آسیہ کا صدیقہ، مومنہ اور ولیہ ہونا ثابت ہوتا ہے، نبوت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ ''کَمُلَ'' سے ''کمال نبوت'' مراد نہیں ہے، بلکہ ''کمال نیکی اور تقوی'' مراد ہے کہ یہ خواتین فضائل و مناقب، نیکی اور تقوی کے اعتبار سے بہت با کمال اور نہایت اونچے مقام پر فائز تھیں۔تکملۃ فتح الملہم ،کتاب فضائل الصحابۃ ،باب فضیلۃ خدیجۃ ۱۴۰/۵، فتح الباری کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ ضرب اللہ مثلاً ...... ۵۵۲/۶، ۵۸۲، معارف القرآن ۲۰۸/۳ تفسیر عثمانی، سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۵

کیا نبی ورسول کے علاوہ کسی اور کو بھی وحی آسکتی ہے

جو حضرات خواتین کی نبوت کے قائل ہیں، ان کا بنیادی استدلال اس بات سے ہے کہ مذکورہ خواتین میں سے بعض سے فرشتوں نے آکر براہ راست گفتگو کی، اور حضرت ام موسیٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے وحی کی، یہ گفتگو اور وحی نبوت کی دلیل ہے۔

لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ دلیل اس درجہ مضبوط نہیں جو قرآن کی نص صریح کا مقابلہ کر سکے، قرآن نے صراحت کی ہے کہ ہم نے جتنے رسول بھی بھیجے، وہ صرف مرد ہی تھے، ان میں کوئی بھی عورت نہیں تھی۔

اسکی مزید تفصیل یہ ہے کہ وحی دو طرح کی ہوتی ہے:

(۱)......وحی اصطلاحی: یہ وہ وحی ہے جو لوگوں کی رشد و ہدایت اور امر و نہی کی تعلیم دینے کیلئے نازل ہوتی ہے، اس کے ذریعہ مخلوق کی اصلاح کیلئے کسی کو منتخب کرنا اور دعوت و تبلیغ کیلئے کسی کو مامور کرنا ہوتا ہے، اس نبی کے ذمے لازم ہوتا ہے کہ اس وحی پر خود بھی ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اپنی نبوت اور وحی کے ماننے کا پابند بنائے، جو اسکو نہ مانے اسے کافر قرار دے، اسطرح کی وحی بالاتفاق مردوں کے ساتھ خاص ہے، کسی عورت پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی، اس وحی کا نزول نبی کریم ﷺ پر ختم ہوگیا، آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کسی پر اس قسم کی وحی نہیں اتر سکتی، اس وحی کو ''نبوت مع الرسالہ'' ''وحی تشریعی'' اور ''وحی نبوت'' کہا جاتا ہے۔

(۲)......وَحیِ لُغوِی: لفظ ''وحی'' کے لغوی معنی ایسے خفیہ کلام کے ہیں، جو صرف مخاطب کو معلوم ہو، دوسرا کوئی اسپر مطلع نہ ہو،

اس لغوی معنیٰ کے اعتبار سے وحی نہ تو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی مردوں کے ساتھ خاص ہے، اسکا کوئی وقت بھی متعین نہیں، کسی بھی وقت ہوسکتی ہے یہ وحی ایک عام بندے کو بھی ہوسکتی ہے، بلکہ جانور تک اس میں شامل ہوسکتے ہیں جیسے شہد کی مکھی کے بارے میں وحی کا ذکر ہے، یہ وحی خواہ الہامی شکل میں ہو، یا خواب کی صورت میں یا فرشتوں سے گفتگو کے ذریعہ، یہ سب وحی لغوی کی صورتیں ہیں، چنانچہ حضرت مریم، حضرت سارہ، اور حضرت ام موسیٰ وغیرہ پر اسی لغوی معنیٰ کے اعتبار سے وحی نازل ہوئی تھی، اس سے ان کا نبی ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس وحی کا مقصد صرف کسی کو آنے والے واقع کی اطلاع یا کسی کو بشارت دینا ہوتا ہے، یا اس شخص کی ذات سے متعلق کوئی مخصوص حکم یا نہی نازل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

البتہ اس طرح کی لغوی وحی عموماً الہامی شکل میں ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ایک مضمون ڈالدیں، اور اسے اسپر مطمئن کردیں کہ یہ اللہ کیطرف سے ہے، جیسے عموماً اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہام ہوتے رہتے ہیں، بلکہ ابوحیان اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اسطرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہوسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقع میں تصریح ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے انسانی شکل میں آکر انہیں سمجھایا، مگر اس وحی کا تعلق صرف اس شخص کی ذات تک محدود ہوتا ہے، جیسے الہام ہوتا ہے، اصلاح خلق اور دعوت و تبلیغ سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تفسیر مظہری، سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۳۸، معارف القرآن، سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۳۸، ۸۲/۶۔

حضور اکرم ﷺ نے اس طرح کی وحی کو ''تحدیث'' فرمایا ہے، صحیح بخاری میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے گذشتہ امتوں میں کچھ ''محدث'' لوگ گذرے ہیں، میری امت میں اگر کوئی محدث ہوسکتا ہے تو وہ عمر ہوگا۔

دوسرے طریق میں حضرت ابوھریرہؓ ہی سے یوں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے بنی اسرائیل میں کچھ ایسے لوگ گذرے ہیں کہ ان سے (اللہ تعالیٰ کیطرف سے فرشتوں کے ذریعہ) کلام کیا

جاتا تھا، جبکہ وہ انبیاء نہیں تھے، میری امت میں اگر ایسا آدمی کوئی ہوا تو وہ عمر ہوگا، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتا۔

محدث سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے درست بات ڈالی جاتی ہے، اور بعض نے کہا کہ اس سے نبی اور رسول کے علاوہ وہ لوگ مراد ہیں جن سے فرشتے گفتگو کرتے ہیں۔ فتح الباری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر ۶۲/۷

اس حدیث میں تصریح آگئی کہ وحی لغوی غیر نبی کیطرف بھی ہوسکتی ہے، اور ہر زمانے میں اسکا وقوع ہوتا رہا، لہذا وحی کے اس معنیٰ کے اعتبار سے کسی کو اصطلاحاً نبی نہیں کہا جاسکتا، اسی وجہ سے جمہور اہلسنت فرماتے ہیں کہ وحی نبوت کا سلسلہ صرف مردوں کے ساتھ خاص رہا ہے، کسی عورت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔

حضرت عائشہ کی فضیلت

حدیث کے دوسرے جزء میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت بیان کی گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ کو دوسری خواتین پر یوں فضیلت حاصل ہے، جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر، کہ ثرید کا کھانا آسان ہے اور زود ہضم بھی ہے۔

"**فضل عائشه على اللنساء**" میں نساء سے یا تو نساء الدنیا مراد ہے کہ پوری دنیا کی خواتین پر افضل ہیں، یا اس سے **نساء اهل الجنة** مراد ہے کہ اہل جنت کی عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں، یا اس سے **نساء زمانها** مراد ہے کہ حضرت عائشہ اپنے زمانے کی خواتین پر فائق ہیں، یا اس سے **نساء هذه الامة** مراد ہے کہ اس امت کی عورتوں سے افضل ہیں۔

حدیث باب اور دیگر بعض روایات سے حضرت عائشہ کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت عائشہ اور حضرت خدیجہ میں افضل کون ہے، اس میں اختلاف ہے، کیونکہ بعض روایات سے حضرت خدیجہ کا افضل ہونا معلوم ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: **خير نساء ها مريم بنت عمران، وخير نسائها خديجة بنت خويلد**، عورتوں میں سب سے بہتر حضرت مریم ہیں، اور عورتوں میں سب سے بہتر حضرت خدیجہ ہیں،

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **أفضل نساء أهل الجنة خديجة، وفاطمة ومريم وآسية۔**

اور ابن عبدالبر نے دوسرے طریق سے حضرت عبداللہ بن عباس سے ان الفاظ سے روایت نقل کی ہے: **سيدة نساء العالمين مريم، ثم فاطمة، ثم خديجة، ثم آسية** ، تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار حضرت مریم ہیں پھر حضرت فاطمہ پھر حضرت خدیجہ پھر حضرت آسیہ ہیں، ان روایات سے حضرت خدیجہ کا افضل ہونا معلوم ہو رہا ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ خواتین ان چند عورتوں میں سے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے دیگر عورتوں پر فضیلت اور بزرگی عطا فرمائی ،لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ پانچ خواتین حضرت عائشہ، حضرت مریم، حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ اور حضرت آسیہ میں سے کس کو زیادہ فضیلت حاصل ہے، کیونکہ ان تمام کے بارے میں مختلف روایات میں کچھ نہ کچھ خاص فضیلت بیان کی گئی ہے؟

اس بارے میں دو نقطہ نظر ہیں:

(۱)...... مذکورہ خواتین میں سے ہر ایک کا شرف وفضل ان کے اپنے زمانے کے اعتبار سے ہے، پوری دنیا کی عورتوں کے اعتبار سے نہیں ہے،

لیکن یہ نقطہ نظر ان روایات پر صادق نہیں آتا، جن میں **خير نساء اهل الجنة** کہا گیا ہے کہ اہل جنت کی عورتوں سے بہتر ہیں، کیونکہ یہ فضیلت عام ہے، اس میں کسی خاص زمانے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲)...... سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ خواتین میں سے ہر ایک کسی خاص شرف وفضل کے اعتبار سے دیگر تمام عورتوں سے ممتاز ہے: چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خصوصی شرف علمی کمال اور دینی بصیرت ہے، جو علمی کمال ان کو حاصل تھا وہ نہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حاصل تھا اور نہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا، بیسیوں روایات ان سے منقول ہیں، بڑے بڑے صحابہ کرام مشکل اور پیچیدہ مسائل میں ان کیطرف رجوع کرتے، آپکو محبوبیت کا مقام حاصل تھا، کئی بار ایسا ہوا کہ حضور اکرم ﷺ پر اس وقت وحی نازل ہوئی جب آپ حضرت عائشہ کے بستر پر تشریف فرما تھے............

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس اعتبار سے دیگر تمام عورتوں پر فائق ہیں کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی پہلی بیوی اور آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں، مشکل اور انتہائی دشوار حالات میں آپکو حوصلہ اور سہارا دیا، جان و مال اور ہر ممکن طریقے سے آپکا تعاون اور دفاع کیا اور آپکو خوش رکھنے کی کوشش کی.........

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی بیٹی ہیں، جنتی عورتوں کی سردار ہیں، اگرچہ بعض روایات میں حضرت مریم اور دیگر عورتوں کا بھی ذکر ہے کہ وہ بھی جنتی عورتوں کی سردار ہونگی، لیکن زیادہ تر روایات میں صرف حضرت فاطمہ کا ہی ذکر ہے، آپکی صاحبزادیوں میں سب سے افضل ہیں، ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے، جس نے اسے ناراض کیا، اس نے گویا مجھے ناراض کیا.........یہ ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور خاتون کو حاصل نہیں ہیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کا یہ خاص اعزاز ہے کہ انکے بطن سے اللہ تعالیٰ نے خلاف عادت کسی انسان کے چھوئے بغیر حضرت عیسی علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر پیدا کیا، انہیں مسجد کی خدمت کیلئے قبول کیا، ان کے کمرے میں غیر موسمی پھل ان کی کرامت کی وجہ سے موجود ہوتے، سردی کے پھل گرمی کے موسم میں اور گرمی کے پھل سردی کے موسم میں.........صحیح حدیث میں ہے کہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسکو مس (چھوتا) کرتا ہے، جس سے وہ چیختا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مس سے حضرت مریم علیہا السلام اور انکے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محفوظ رکھا.........

حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) کا یہ شرف ہے کہ انہوں نے فرعون جیسے ظالم شخص کی بیوی ہونے کے باوجود حق کا راستہ اختیار کیا، اور پھر اس پر ثابت قدم رہیں، ناز و نعمت اور خوشحال زندگی کے مقابلے میں حق کی خاطر طرح طرح کی مشقتیں برداشت کیں یہاں تک کہ بڑے اطمینان کے ساتھ شہداء کے زمرے میں داخل ہوگئیں، حضرت آسیہ نے حضرت موسی علیہ السلام کے بارے میں فرعون کو رائے دی کہ یہ بچہ جو صندوق سے نکلا ہے، اسے ہلاک نہ کریں، بلکہ اپنے پاس رکھ کر اسکی پرورش کرتے ہیں، اور کہا کہ "قرة عين لي ولك" کہ یہ میری اور آپکی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا، فرعون نے کہا: "لک، لا، لی" یہ آنکھوں کی ٹھنڈک تیرے لئے ہوگا، میرے لئے نہیں" یہ بات حضرت آسیہ کی فہم و فراست کی دلیل ہے۔ تفسیر عثمانی، سورہ ال عمران، آیت

۳۵......، سورہ قصص آیت نمبر ۹، فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالی، وضرب الله مثلا الـلـذين امنوا امرأة فرعون ...... سورہ التحریم، ۵۵۲/۶، ۵۵۳، وکتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب فاطمۃ رضی اللہ عنہا ۱۳۱/۷، ۱۳۲، باب مناقب عائشۃ، ۱۳۳/۷-۱۳۷، تکملۃ فتح الملہم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل خدیجۃ ۱۴۰/۵، ۱۴۱۔

بَابُ مَاجَاءَ انْهَشُوا اللَّحْمَ نَهْشًا

یہ باب اس بیان میں ہے کہ تم گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا کرو

عَـنْ عَبْـدِ الـلّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ: زَوَّجَنِيْ أَبِيْ فَدَعَا أُنَاسًا، فِيْهِمْ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ ، فَـقَـالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: انْهَسُوْا اللَّحْمَ نَهْسًا (انْهَشُوْا اللَّحْمَ نَهْشًا) فَإِنَّهُ أَهْنَأُ وَأَمْرَأُ.

عبد اللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میرے باپ نے میری شادی کے موقع پر بہت سے لوگوں کو کھانے پر بلایا، ان میں صفوان بن امیہ بھی شامل تھے، انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا کرو، کیونکہ اس طرح کھانے سے یہ زیادہ مزے دار اور زیادہ خوشگوار ہو جاتا ہے (روایت میں خواہ انھسو کا لفظ ہو یا انھشو کا، معنی ایک ہی ہیں)

مشکل الفاظ کے معنی: ۔نھش: (شین کے ساتھ) اور نھس: (سین کے ساتھ) امام اصمعی کے نزدیک دونوں کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے: گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانا۔ بعض نے دونوں کے معنیٰ میں یہ فرق کیا ہے کہ نھس (سین کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: دانتوں کے کناروں سے نوچنا، اور نھش (شین کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: ڈاڑھوں سے نوچنا یا سارے دانتوں سے پکڑ کر کسی شی کو نوچنا۔ أھنأ: زیادہ مزے دار اور پسندیدہ۔ أمرأُ: زیادہ خوشگوار جسکا کھانا آسان ہو، طبیعت پر بوجھل نہ ہو اور جلدی ہضم بھی ہو جاتا ہو۔

گوشت نوچ کر کھانا سنت ہے

اس حدیث میں آپ ﷺ نے کھانیکا ایک ادب بیان فرمایا کہ جب انسان گوشت کھائے تو اس کی ہڈی وغیرہ کو دانتوں سے نوچ نوچ کر کھائے ،اسطرح کھانے سے اسکا مزہ دو بالا اور ذائقہ انتہائی خوشگوار ہوجاتا ہے، یہی سنت طریقہ ہے، چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانا یا ہاتھوں سے توڑ توڑ کر تناول کرنا حضور ﷺ کی عام سنت نہیں بلکہ عجمی لوگوں کا طریقہ ہے جو وہ فخر وغرور کی وجہ سے ایسا کیا کرتے ہیں، اسلئے گوشت کو نوچ کر کھانے کی سنت پر ہی عمل کرنا چاہیے تاکہ تکبر کرنے والوں کے ساتھ مشابہت لازم نہ آئے تاہم اگر ضرورت کی وجہ سے ایسے موقع پر چھری استعمال کر لی جائے تو یہ بھی شرعاً جائز ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اگلے باب میں اسی رخصت کا ذکر کیا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الرُّخْصَةِ فِيْ قَطْعِ اللَّحْمِ بِالسِّكِّيْنِ

یہ باب نبی کریم ﷺ سے چھری سے گوشت کاٹ کر کھانیکی اجازت کے بارے میں ہے

عَنْ جَعْفَرَ بْنِ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ الضَّمْرِيِّ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ احْتَزَّ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ فَأَكَلَ مِنْهَا ثُمَّ مَضَى إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

حضرت جعفر بن عمرو اپنے والد عمرو بن امیہ ضمری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے بکری کے شانے سے چھری کے ساتھ گوشت کاٹا اور اسے تناول فرمایا، پھر آپ ﷺ نماز کیلئے تشریف لے گئے اور وضو نہیں کیا۔

کھانے کے وقت چھری سے گوشت کاٹ سکتے ہیں

حدیث باب سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)......ایک یہ کہ کھانے کے وقت اگر گوشت سخت معلوم ہو، اسے کسی وجہ سے نوچ کر نہ کھایا جا سکتا ہو تو ضرورت کی وجہ سے اسے چھری سے کاٹنا یا ہاتھ سے توڑنا جائز ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بکری کے بازو سے چھری کے ذریعے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے تناول فرمایا۔

سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''گوشت چھری سے کاٹ کاٹ کر نہ کھایا کرو، یہ عجمی لوگوں کا طریقہ ہے، اسے دانتوں سے نوچ کر کھایا کرو، کیونکہ اسطرح کھانا زیادہ لذیذ اور زیادہ خوشگوار ہوتا ہے۔ بذل المجھود، کتاب الاطعمۃ، باب فی الأکل من أعلیٰ الصفحۃ: ۱۶/۱۰۲۔

اس حدیث میں گوشت کو چھری کے ساتھ کھانے کو عجمیوں کا طریقہ بتایا گیا ہے، یوں تو عرب کے لوگ اپنے علاوہ دنیا کے سارے لوگوں کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے، لیکن اس حدیث میں عجمیوں سے خاص طور پر اہل فارس (ایران) مراد ہیں، وہ لوگ تکبر وغرور کی وجہ سے گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھاتے تھے، اور دانتوں سے نوچ کر کھانے کو خلاف تہذیب اور برا سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ مشابہت سے بچنے کی خاطر ایسے موقع پر چھری استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

یہاں بظاہر حدیث باب اور سنن ابی داؤد کی مذکورہ روایت میں تعارض ہو رہا ہے، حدیث باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے وقت چھری سے گوشت کاٹا جاسکتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے کاٹا ہے جبکہ ابوداؤد کی روایت میں آپ ﷺ نے پوری وضاحت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

دونوں طرح کی روایات کو سامنے رکھکر علماء کرام نے ان میں یوں تطبیق دی ہے کہ اگر گوشت نرم اور گلا ہوا ہو تو اسکو چھری کے بجائے دانتوں سے نوچ کر ہی کھانا چاہیے، اور اگر گوشت پکانے کے باوجود سخت ہو، دانتوں سے نوچ کر اسے کھانا ممکن نہ ہو تو پھر چھری کا استعمال بغیر کسی کراہت کے درست ہے، تاہم اسے روزانہ کی عادت اور عام معمول نہیں بنانا چاہیے۔

یہ ذہن میں رہے کہ سنن ابی داؤد کی روایت میں ممانعت کا حکم نہی تنزیہی پر محمول ہے، لہذا چھری کا استعمال ایسے موقع پر گو کہ حرام نہیں، جائز ہے، لیکن چونکہ ان کا استعمال یہود ونصاری، دنیادار اور مغربی دنیا کا شعار بن چکا ہے، اسلئے مشابہت سے بچنے کیلئے ہر ممکن احتراز ضروری ہے، '' احتز'' کے معنی ہیں: چھری سے کاٹنا۔ شرح الطیبی: ۱۵۹/۸۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی: ۴۶/۸۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ما جاء انھشو اللحم نھشا، ۲۶۰/۵۔

(۲)..... دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وضو کے بعد اگر آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالی جائے تو اس سے

طہارت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ بکری کا بازو کھانے کے بعد وضو کے بغیر نماز کیلئے تشریف لے گئے۔

جن روایات میں ایسے موقع پر وضو کا ذکر آیا ہے، اس سے یا تو لغوی وضو یعنی کلی کرنا مراد ہے یا آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کا حکم ابتداء میں تھا، بعد میں منسوخ ہو گیا۔ مرقاۃ المفاتیح کتاب الطھارۃ ۲/۳۳

چھری کانٹے اور چمچ سے کھانے کا حکم

چھری کانٹے اور چمچ سے کھانا سنت نہیں البتہ جائز ہے، لیکن چونکہ اسطرح کھانے میں کفار و فجار کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، اس لحاظ سے ان کا استعمال مکروہ بھی ہے، آپ ﷺ ہاتھ سے کھانا تناول فرمایا کرتے تھے، اور آخر میں انگلیاں چاٹ لیتے تھے، البتہ اگر کوئی کھانا اس قسم کا ہو کہ اسے چمچ کے بغیر نہ کھایا جاسکتا ہو، تو پھر چمچ کا استعمال بغیر کسی کراہت کے درست ہے، لیکن چونکہ چھری کانٹے میں اس قسم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے استعمال کے بغیر بھی کھانا کھایا جاسکتا ہے، اور حدیث میں بھی چھری کے ذریعے گوشت کاٹنے کا تو ذکر ہے، چھری سے کھانے کا نہیں، اسلئے چھری کانٹے کا استعمال بہر حال پسندیدہ نہیں، البتہ ضرورت شدیدہ کے موقع پر انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جدید فقہی مسائل، خوراک و پوشاک: ۱/۱۸۰۔ کھانے پینے کی حلال اور حرام چیزیں (ص: ۸۸)

بَابُ مَا جَاءَ أَيُّ اللَّحْمِ كَانَ أَحَبَّ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ آپ ﷺ کو کونسا گوشت پسند تھا

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِلَحْمٍ فَدُفِعَ إِلَيْهِ الذِّرَاعُ، وَكَانَ يُعْجِبُهُ، فَنَهَسَ مِنْهَا.

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا، تو آپکو دستی کا گوشت دیا گیا، کیونکہ آپ ﷺ اسے پسند کرتے تھے، پھر آپ نے اسے دانتوں سے نوچ کر کھایا۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: مَا كَانَ الذِّرَاعُ أَحَبَّ اللَّحْمِ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَلٰكِنْ كَانَ لَا يَجِدُ اللَّحْمَ إِلَّا غِبًّا، فَكَانَ يُعَجَّلُ إِلَيْهِ لِأَنَّهُ أَعْجَلُهَا نُضْجًا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو دستی کا گوشت پسند نہیں تھا بلکہ بات یہ تھی کہ گوشت کبھی کبھار ملا کرتا تھا، چنانچہ وہ گوشت جلدی سے پکا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا تھا، کیونکہ دستی کا گوشت (اپنی لطافت ونزاکت کی وجہ سے) بہت جلد پک جاتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ۔الذراع: (ذال کے نیچے زیر) ہر جانور کا ہاتھ، گائے اور بکری کا ذراع پنڈلی سے اوپر کا حصہ ہوتا ہے، اونٹ کا اور دوسرے کھر والے جانوروں کا ذراع پنڈلی کے پتلے حصے کے اوپر سے شروع ہو جاتا ہے۔یعجبہ: آپ ﷺ دستی کے گوشت کو پسند فرماتے۔غِباً: (غین کے نیچے زیر اور با کی تشدید کے ساتھ) کبھی کبھار۔یعجّل الیہ: یہ تعجیل سے ہے، کہا جاتا ہے عجّل اللحم: گوشت جلدی میں پکانا، اور ''الیہ'' کی ضمیر آپ ﷺ کیطرف لوٹ رہی ہے، ترجمہ یہ ہوگا: دستی کا گوشت جلدی سے پکا کر آپکی خدمت میں پیش کیا جاتا۔تحفۃ الاحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ھذا، ۴۶۴/۵۔أعجلھا نضجاً: تمام گوشتوں سے دستی کا گوشت جلدی پک جاتا ہے۔نضجاً (نون پر زبر اور پیش دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں) کے معنیٰ ہیں: پکنا، تیار ہو جانا۔

حضور کریم ﷺ کو دستی کا گوشت پسند تھا

اسکی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں:

(۱)......جلدی پک جاتا ہے۔

(۲)......زیادہ لذیذ اور خوشگوار ہوتا ہے۔

(۳)......معدہ پر بوجھ نہیں ہوتا بلکہ جلدی ہضم ہو جاتا ہے۔

(۴)......دستی کا گوشت نجاست کی جگہوں مثلاً آنت وغیرہ سے دور ہوتا ہے۔شرح الطیبی، کتاب

الاطعمۃ ،الفصل الثانی ۸/۱۵۹۔

باب کی دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وہم کو دور کررہی ہیں کہ آپکا دستی کے گوشت کو پسند فرمانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپ ﷺ دنیا کی لذتوں میں رغبت رکھتے تھے، اور آپکا دل ہروقت گویا اسی طرف متوجہ رہتا، کیونکہ یہ تو نبی کی شان کے مناسب نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گوشت کبھی کبھار آتا تھا، جسکی وجہ سے اسے کھانے کا طبیعت میں شوق پیدا ہوتا تھا، پسندیدہ ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ لذیذ ہوتا بلکہ دستی کا گوشت اس وجہ سے بھی پسند تھا کہ وہ جلدی پک جاتا ہے، جسے کھا کر آدمی جلدی سے فارغ ہوکر ذکر وفکر اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوجاتا ہے۔ الکوکب الدری، ابواب الاطعمۃ ، باب ما جاء ای اللحم کان احب الی رسول اللہ ﷺ: ۲۲/۳۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: پیٹھ کا گوشت بہترین گوشت ہے''۔

سنن ابن ماجۃ ، ابواب الأطعمۃ ، باب أطائب اللحم :ص:۲۳۷۔

یہ حدیث دستی گوشت والی حدیث کے معارض نہیں ہے، کیونکہ دونوں کی پسندیدہ ہونگی وجہیں مختلف ہیں، چنانچہ پیٹھ کا گوشت طاقتور، صاف ستھرا، اور چکنا ہوتا ہے.......... اور دستی گوشت کی پسندیدہ ہونے کی وجہیں اوپر گذر چکی ہیں، لہذا ایسا ہوسکتا ہے کہ دو چیزیں مختلف وجوہات کی بناء پر پسندیدہ اور عمدہ ہوں، اس میں کوئی منافات نہیں ہے۔ شمائل ترمذی مع خصائل نبوی، باب ما جاء فی صفۃ ادام رسول اللہ ﷺ، شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب ص:۱۶۸، ط: مکتبہ رحمانیہ لاہور۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْخَلِّ

یہ باب سرکہ کے (فضائل کے) بارے میں ہے

عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: نِعْمَ الإِدَامُ الْخَلُّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سرکہ بہترین سالن ہے۔

عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: نِعْمَ الإِدَامُ الْخَلُّ.

دوسری روایت کا بھی یہی معنیٰ ہے، صرف سند کا فرق ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: نِعْمَ الإِدَامُ الْخَلُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سرکہ بہترین سالن ہے۔

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بِلَالٍ بِهٰذَا الإِسْنَادِ نَحْوَهُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: نِعْمَ الإِدَامُ أَوِ الْأُدْمُ الْخَلُّ.

حضرت سلیمان بن بلال نے اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سرکہ بہترین سالن ہے، لیکن اس میں راوی کو "ادام" یا "ادم" کے لفظ میں شک ہے، البتہ ترجمہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

عَنْ أُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ أَبِيْ طَالِبٍ قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ فَقُلْتُ: لَا، إِلَّا كِسَرٌ يَابِسَةٌ وَخَلٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: قَرِّبِيْهِ، فَمَا أَقْفَرَ بَيْتٌ مِنْ أُدْمٍ فِيْهِ خَلٌّ.

حضرت ام ھانی بنت ابی طالب سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے ہاں تشریف لائے، اور پوچھا کہ: کیا کھانے پینے کی کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کیا: اور تو کچھ نہیں، مگر سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے اور سرکہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اسے میرے قریب کیجئے، کیونکہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ سالن سے خالی نہیں ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ۔إدَام: (ہمزے کے نیچے زیر) سالن، ہر وہ چیز جس کے ساتھ روٹی کھائی جائے، اسکی جمع: أُدُمٌ ہے، اور کبھی "أُدُمٌ" کا لفظ مفرد بھی استعمال ہوتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الاطعمة، باب الادم ۹/۶۹۴۔ کِسَرٌ: یہ کِسْرَةٌ کی جمع ہے، روٹی کے ٹکڑے۔ یابسة: خشک۔ قَرِّبیه: اسے یعنی خشک روٹی اور سرکہ کو میرے پاس لائیے، قریب کیجئے۔ ما اقفر: خالی نہیں۔

ما اقفر بیت............کی ترکیب

"ما اقفر بيت، من أدم، فيه خلٌّ" "ما" نافیہ، "أقفر" فعل، "بیت" موصوف، "من

ادم" جار مجرور متعلق ہے مــا اقفر کے، اور "فیـه" خبر مقدم، "خل" مبتدا موخر، جملہ اسمیہ ہوکر "بیـت" کی صفت، موصوف صفت ملکر "اقـفـر" کا فاعل، فعل اپنے فاعل وغیرہ سے ملکر جملہ فعلیہ ہوا۔ اس ترکیب پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ موصوف یعنی "بیت" اور صفت یعنی فیہ خل کے درمیان اجنبی یعنی "من ادم" کا فصل ہے، جو نحوی قواعد کے اعتبار سے درست نہیں ہے؟

اسکے تین جواب دیے گئے ہیں:

(۱)...... بعض نے یہ کہا کہ "بیـت" موصوف ہے، مـن البیـوت محذوف ہے جو "بیـت" کی صفت ہے، پھر یہ موصوف صفت ملکر ذوالحال ہوا، اور "فیه خل" اس سے حال ہے، اور ذوالحال حال کے درمیان فصل جائز ہے۔

(۲)...... شرح المفتاح میں ہے کہ موصوف صفت کے درمیان فصل جائز ہے۔

(۳)...... حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موصوف صفت کی ترکیب درست ہے، اور "مــن ادم" گوکہ بظاہر موصوف صفت کے درمیان فاصل ہے، لیکن یہ مکمل طریقے سے اجنبی فاصل اسلئے نہیں ہے کہ "اقـفـر" ان تمام پر عمل کررہا ہے، اس لحاظ سے ان میں قرب پایا جاتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی: ۵۳/۸۔ شرح الطیبی، کتاب الأطعمۃ، الفصل الثانی: ۱۶۲/۸۔

سرکہ کی فضیلت

مذکورہ احادیث سے چار چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱)...... سرکہ کی فضیلت:- حضور اکرم ﷺ نے سرکہ کو بہترین سالن قرار دیا ہے، اور فرمایا کہ: اے اللہ سرکہ میں برکت ڈالدیجئے، یہ سرکہ مجھ سے پہلے انبیاء کا بھی سالن رہا ہے۔ سنن ابن ماجۃ، ابواب الاطعمۃ، باب الایتدام بالخل ۲۳۸۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ میرے گھر تشریف لائے، اور فرمایا کہ کھانیکا کچھ ہے؟ میں نے عرض کیا: اور تو کچھ نہیں، لیکن خشک روٹی کے ٹکڑے اور سرکہ ہے، آپ نے فرمایا: یہی لے آؤ، چنانچہ روٹی کے خشک ٹکڑے سرکہ کے ساتھ بھگو کر تناول فرمائے، اور فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو، وہ سالن سے خالی نہیں، کیونکہ سرکہ ایک بہترین سالن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ام ہانی نے اس انداز سے کیوں جواب دیا، انہیں اس موقع پر یوں جواب دینا چاہیے تھا، :بَلٰى، عِنْدِي خُبْزٌ وَخَلٌّ، (ہاں کیوں نہیں: میرے پاس روٹی اور سرکہ ہے) اس انداز سے جواب نہ دینے کی کیا وجہ ہے؟

محدثین نے اسکا جواب یہ دیا کہ ام ھانی نے آپ ﷺ کی عظمتِ شان کی وجہ سے یہ جواب دینا مناسب نہ سمجھا، انہیں یہ اچھا نہ لگا کہ اسقدر محترم اور معزز مہمان کی خدمت میں روٹی کے خشک ٹکڑے اور سرکہ پیش کیا جائے، لیکن چونکہ آپ سمجھ گئے کہ محض ادب کی وجہ سے حضرت ام ہانی اس انداز سے جواب نہیں دے رہیں، اور ان چیزوں کو گویا معمولی سمجھ رہی ہیں، اسلئے آپ نے انہیں فرمایا: انہیں میرے قریب کریں، چنانچہ آپ نے وہ ٹکڑے سرکہ کے ساتھ تناول فرمائے، اور فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ سالن سے خالی نہیں۔

اس سے اندازہ لگایئے کہ حضور اکرم ﷺ کی کسقدر سادہ زندگی تھی، آپکی نگاہ میں کھانا پینا صرف مجبوری اور اضطرار کا درجہ رکھتا تھا، ضرورت کے وقت جو چیز جیسے میسر آئی، اسے تناول فرمالیا، کیونکہ کھانا زندگی کا مقصد نہیں تھا، ایک ضرورت کے درجے میں تھا، زندگی کا مقصد دین کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو اللہ کے احکام سے روشناس کرانا تھا، اسلئے آپ روکھی سوکھی پر گذارہ کر کے اپنے مشن میں مشغول رہا کرتے تھے، یہ آپ کی عجز وانکساری اور تواضع کا عظیم شاہکار ہے۔

(۲)......سرکہ ہو یا کھانے کی اور کوئی چیز، اسے معمولی اور حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔

(۳)......ضرورت کے وقت بے تکلف دوست یا رشتہ دار سے کھانے کی چیز طلب کی جا سکتی ہے، یہ گناہ نہیں، جائز ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی: ۵۲/۸، ۵۳۔

(۴)......امام خطابی فرماتے ہیں کہ سرکہ سے متعلق مذکورہ احادیث سے درحقیقت امت کو دنیا سے بے رغبتی اور قناعت کی ترغیب دی جا رہی ہے، کہ جب حالات اور وسائل میں گنجائش نہ ہو، تو اس دوران کھانے کی جو چیز بھی میسر آجائے تو اسپر صبر اور قناعت اختیار کرنی چاہیے، اپنے نفس کو لذیذ اور عمدہ کھانوں کا عادی نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ ہر وقت لذیذ اور عمدہ کھانوں کے درپے رہنا بسا اوقات دینی زندگی کو تباہ و برباد اور بدن کو طرح طرح کی بیماریوں سے دوچار کر دیتا ہے، اسلئے ہر موقع پر اور خاص طور پر کھانے پینے میں میانہ روی اور اعتدال

کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، اسی میں عافیت اور سکون ہے، اور یہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، الکوکب الدری، أبواب الأطعمة، باب ماجاء فی الخل، ۲۲/۳، ۲۳۔

ام ھانی سے امام شعبی کی ملاقات

امام ترمذی نے فرمایا: "وام هانی ماتت بعد علی بن ابی طالب بزمان"

''حضرت ام ھانی کی وفات حضرت علی کی وفات کے ایک عرصہ بعد ہوئی''

اس سے امام ترمذی یہ بتانا چاہیے ہیں کہ یہ روایت مرسل اور منقطع نہیں ہے، بلکہ متصل ہے، کیونکہ امام شعبی کی ملاقات اگرچہ حضرت علی سے نہیں ہوئی، لیکن ام ہانی سے ہوئی ہے، حضرت ام ہانی حضرت علی کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہیں، ہوسکتا ہے کہ اس دوران امام شعبی کی ملاقات حضرت ام ھانی سے ہوئی ہو، لہذا یہ کہنا کہ امام شعبی کی ملاقات جب حضرت علی سے نہیں ہوئی تو حضرت ام ہانی سے کیسے ہوسکتی ہے، درست نہیں ہے۔ الکوکب الدری، أبواب الأطعمة، باب ماجاء فی الخل، ۲۳/۳۔

کچھ حضرت ام ہانی کے بارے میں

حضرت ''ام ہانی'' ابوطالب کی بیٹی، حضرت علی کی بہن اور نبی کریم ﷺ کی چچازاد بہن ہیں، ان کا نام: فاختہ یا فاطمہ یا ھند ہے، ان میں پہلا نام زیادہ مشہور ہے، حضور اکرم ﷺ نے نبوت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں انہیں پیغام نکاح دیا تھا، اتفاقاً انہی دنوں میں ھبیرہ بن وھب نے بھی پیغام نکاح دیدیا، ابوطالب نے ان کا نکاح ھبیرہ سے کردیا، اسپر آپ ﷺ اپنے چچا سے ناراض سے ہوگئے، اس ناگواری کو دیکھ کر ابو طالب نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اے بھتیجے ان لوگوں نے ہمیں رشتہ دے رکھا ہے، ہم انکے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتے ہیں، اسلئے میں نے انہیں رشتہ دیا، پھر جب ام ھانی نے اسلام قبول کرلیا اور ھبیرہ نے نہیں کیا تو ان کے درمیان جدائی ہوگئی۔

حضور اکرم ﷺ نے ام ہانی کو دوبارہ پیغام نکاح دیا، تو ام ہانی نے کہا کہ: خدا کی قسم میں تو زمانہ جاہلیت میں بھی آپکو پسند کرتی تھی، اور اب تو میں مسلمان ہوچکی ہوں، اب آپکو کیسے پسند نہیں کرونگی، لیکن بات یہ ہے کہ میری اولاد ہے، اور میں اس چیز کو ناپسند کرتی ہوں کہ وہ آپکو تکلیف پہنچائیں، آپ ﷺ نے

فرمایا: ''قریشی عورتیں بہترین عورتیں ہیں، جو اونٹ پر سوار ہوتی ہیں، اور اپنے بچوں پر شفقت کرتی ہیں اور اپنے شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء، ۵۸۳/۶۔

ام ہانی رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں، ان سے انکے بیٹے جعدة، یحیی .... حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے روایات حاصل کی ہیں، اور پھر انہیں روایت کیا، یہ روایات صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ الإصابة فی تمییز الصحابة، حرف الھاء، القسم الاول، ۴۸۵/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الْبِطِّيْخِ بِالرُّطَبِ

یہ باب خربوزہ کو تازہ کھجور سے ملا کر کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْكُلُ الْبِطِّيْخَ بِالرُّطَبِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ خربوزہ یا تربوز کو تازہ کھجور کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ البطیخ: (باء کے نیچے زیر) تربوز، خربوزہ۔ رُطَب: پکی ہوئی تازہ کھجور، درخت پر لگی ہوئی پختہ کھجوریں۔ ج اَرْطَاب۔

خربوزہ اور تازہ پکی ہوئی کھجور ملا کر کھانیکا ذکر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ خربوزہ کو تازہ پکی ہوئی کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے، اسطرح ملا کر کھانا اعتدال پیدا کرنے کیلئے ہوتا تھا، کیونکہ کھجور کا ذائقہ گرم ہے اور خربوزہ کا اثر نسبتاً ٹھنڈا ہے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اثر کو ختم کر دیتا ہے، جس سے طبیعت میں اعتدال اور مزاج میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے، طبی لحاظ سے گرم و سرد چیز کو ملا کر کھانا صحت کیلئے بہت مفید ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ اسے یوں کھاتے کہ دائیں ہاتھ میں تازہ کھجور ہوتی اور بائیں ہاتھ میں خربوزہ، پھر انہیں ملا کر تناول فرماتے، پہلے ایک کھجور منہ میں رکھ لیتے، پھر دائیں ہاتھ سے

خربوزہ کا ایک ٹکڑا کھاتے۔ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب جمع اللونین بمرۃ ۱۵/۹ ۷۔ اور یہ آپ کا محبوب پھل تھا، ملا کر کھانے کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ ایک ساتھ منہ میں رکھ کر کھالیا جائے۔

اشعۃ اللمعات، کتاب الأطعمۃ، الفصل الاول، ۴۹۲/۳۔

حدیث میں لفظ "بطیخ" سے کیا مراد ہے

حدیث میں لفظ "بطیخ" سے کیا مراد ہے، خربوزہ یا تربوز، اس بارے میں تین قول قابل ذکر ہیں:

(۱)...... حافظ ابن حجر، مولانا رشید احمد گنگوہی اور دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ حدیث میں بطیخ سے خربوزہ مراد ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ نسائی میں حضرت انس سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: رأیتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یَجْمَعُ بَیْنَ الرُّطَبِ وَالْخِرْبِز، (میں نے رسول اللہ ﷺ کو تازہ پختہ کھجور اور خربوزہ جمع کر کے کھاتے ہوئے دیکھا) دوسرا اس وجہ سے کہ سرزمین عرب اور حجاز میں تربوز کی بنسبت خربوزہ بکثرت پایا جاتا تھا۔ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب جمع اللونین بمرّۃ، ۱۵/۹ ۷، ۱۶ ۷۔

(۲)...... ملا علی قاری کے نزدیک اس سے مراد "تربوز" ہے، جو اندر سے سرخ اور باہر سے سبز ہوتا ہے، یہ چونکہ ٹھنڈا ہوتا ہے، اسلئے کھجور کی حرارت کو ختم کر کے اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح کتاب الاطعمۃ، الفصل الاول، ۲۳/۸۔

(۳)...... شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھانے کا واقعہ مستقل ہے، اور اسکی مصلحت دونوں کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنا ہے کہ تربوز ٹھنڈا ہوتا ہے، اور خربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھانیکا واقعہ الگ اور مستقل ہے، اور اسکی مصلحت خربوزہ کا پھیکا ہونا ہے، اسکے پھیکا پن کو ختم کرنے کیلئے کھجور ساتھ ملائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات خربوزہ کے پھیکا ہونے کی وجہ سے اس میں چینی ڈالی جاتی ہے، اسلئے دونوں حدیثوں کو ایک ہی واقعے اور ایک ہی مصلحت پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ فاکھۃ رسول اللہ ﷺ (ص: ۱۹۰)

سنت کی نیت سے کبھی تربوز کو تازہ کھجور کے ساتھ اور کبھی خربوزہ کو کھجور کے ساتھ کھالیا جائے تو یہ بہتر ہے، کیونکہ لغوی معنیٰ کے لحاظ سے لفظ بطیخ تربوز اور خربوزہ دونوں کو شامل ہے، اسطرح دونوں طرح کی

حدیثوں پرعمل ہوجائیگا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الْقِثَّاءِ بِالرُّطَبِ

یہ باب کھیرے یا ککڑی کو کھجور کے ساتھ ملاکر کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَأْكُلُ الْقِثَّاءَ بِالرُّطَبِ.

عبداللہ بن جعفر سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھیرے یا ککڑی کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔

ککڑی یا کھیرے کو کھجور کے ساتھ کھانیکا ذکر

''قثاء'' (قاف کے نیچے زیر) کے معنیٰ کھیرے اور ککڑی کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی یا کھجور کو تازہ پختہ کھجور کے ساتھ تناول فرماتے تھے، اسطرح کا کھانا صحت کیلئے انتہائی مفید ہوتا ہے طبیعت میں اعتدال پیدا کرتا ہے اور کمزور جسم کو موٹا کر دیتا ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ کی روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میری ماں نے چاہا کہ مجھے ایسی چیز کھلائیں جس سے میں موٹی ہوجاؤں تاکہ میری رخصتی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کر دیں، چنانچہ اس مقصد کیلئے میں نے ککڑی کو پختہ کھجور کے ساتھ کھایا تو میں موٹی ہوگئی، اور بالکل صحیح صحت مند ہوگئی۔

اسکے کھانے کی کیفیت یہ ہوتی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دائیں ہاتھ سے ککڑی پکڑتے اور بائیں ہاتھ میں تازہ کھجور ہوتی، پہلے دائیں ہاتھ سے ککڑی کھاتے پھر بائیں ہاتھ سے کھجور دائیں ہاتھ میں لے لیتے اور اس سے پکڑ کر کھاتے، لہذا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے کھجور کھائی ہے، درست نہیں ہے۔

فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب جمع اللونین بمرّۃ، ۱۵/۹، ۱۶۷۔ عمدۃ القاری، ۶۶/۲۱۔

کئی طرح کے پھل اور کھانوں کا جواز

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک وقت میں دو یا اس سے زیادہ پھل یا کھانے کھانا، مختلف قسم کی ڈشیں تیار کرنا، اور کھانے پینے میں وسعت وفراخی اختیار کرنا جائز ہے، اس

میں سب علماء کا اتفاق ہے، البتہ جن حضرات نے منع کیا ہے اس سے ان کا مقصد یہ نہیں کہ شرعاً اسطرح کے کھانے کھانا ممنوع ہیں بلکہ اس سے یا تو وہ صورت مراد ہے کہ جب مختلف قسم کے کھانوں اور ڈشوں کا روزانہ معمول بنایا جائے، اور عمدہ اور لذیذ کھانوں کی غرض دینی مصلحت نہ ہو بلکہ محض عیش وعشرت اور نام ونمود مقصود ہو، اور یا انہوں نے بطور علاج کے منع کیا تا کہ نفس کو مشقت اور مجاہدے کا عادی بنایا جاسکے، جیسا کہ بزرگان دین کا یہ معمول رہا ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الأطعمة، باب اکل القثاء بالرطب ۱۸۰/۲۔ تکملہ فتح الملہم ۴۶/۴۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے کی اشیاء کی تاثیر اور ان کی خاصیت کے اعتبار سے انہیں استعمال کرنا جائز ہے، جسطرح کہ حدیث میں ککڑی اور کھجور کی تاثیر کو سامنے رکھکر ملا کر کھانیکا ذکر آیا ہے، لہذا طبی اصول کے مطابق اشیاء کی تاثیر کو سامنے رکھ کر انہیں استعمال کرنا درست ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۴۶۹/۵۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ شُرْبِ أَبْوَالِ الإِبِلِ

یہ باب اونٹوں کے پیشاب کے پینے کے بیان میں ہے

عَنْ أَنَسٍ: أَنَّ نَاسًا مِنْ عُرَيْنَةَ قَدِمُوْا الْمَدِيْنَةَ فَاجْتَوَوْهَا، فَبَعَثَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ وَقَالَ اشْرَبُوْا مِنْ أَلْبَانِهَا وَأَبْوَالِهَا.

حضرت انس فرماتے ہیں کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے، لیکن ان لوگوں نے مدینہ طیبہ کی آب وہوا کو اپنی صحت کیلئے موافق نہ پایا، (اور بیمار پڑ گئے اس لئے مدینہ میں رہنا انہوں نے پسند نہ کیا) تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو (مدینہ سے ذرا باہر) صدقہ کے اونٹوں میں بھیج دیا، اور فرمایا کہ ان کے دودھ اور پیشاب پیو۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔ اَبْوال: بول کی جمع ہے: پیشاب۔ عرینة: عرب کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اجتووھا: انہوں نے مدینہ کا قیام راس نہ آنے کی وجہ سے پسند نہ کیا۔ البان: لبن کی جمع ہے: دودھ۔

قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگوں کی مدینہ آمد

قبیلہ عرینہ مکہ مکرمہ کے قریب عرفات کے راستے پر آباد تھا، ان کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرنے کیلئے مدینہ منورہ کا سفر شروع کیا، آٹھ افراد کا یہ قافلہ تھا، ان میں سے چار کا تعلق قبیلہ عرینہ سے اور تین کا تعلق قبیلہ عکل سے تھا، اور ایک آدمی کسی اور قبیلے کا ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

سفر کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کر کے جب یہ لوگ مدینہ منورہ پہونچے تو شدید بھوک اور تھکاوٹ کے آثار ان پر نمایاں تھے، آپ ﷺ کے پاس جا کر منافقانہ انداز سے اسلام قبول کیا، اتفاقاً مدینہ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی، جسم بیمار، رنگ زرد اور پیٹ بڑے بڑے ہو گئے، آپکو اس صورتحال سے جب آگاہ کیا گیا تو ان سے آپ نے فرمایا کہ مدینہ سے باہر میرے اور صدقہ کے اونٹ ہیں، تم لوگ وہاں چلے جاؤ، ان کا پیشاب اور دودھ پیو تو ٹھیک ہو جاؤ گے، ان کی آسانی کیلئے آپ نے اپنا چرواہا بھی ان کے ساتھ بھیج دیا، یہ لوگ وہاں رہے، اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیا تو بالکل صحیح ہو گئے۔

صحت مند ہونے کے بعد بجائے اسکے کہ وہ اسلام اور حضور اکرم ﷺ کے اور گرویدہ ہوتے، ان کی نیت خراب ہوگئی، حرص و ہوس کا ناسور ان پر غالب آ گیا، ان لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے ''یسار'' نامی چرواہے کو مثلہ کر کے قتل کر دیا، اور ایک روایت کے مطابق دیگر بعض چرواہوں کو بھی یوں قتل کیا کہ ان کی آنکھیں نکالیں، کان اور ہاتھ بھی کاٹ ڈالے، اور مرتد ہو گئے، اور پھر اونٹوں کو بھگا کر لے گئے۔

یہ اونٹ کافی تعداد میں تھے، ان میں پندرہ دودھ والی اونٹنیاں حضور اکرم ﷺ کی ذاتی تھیں جو آپ کو مال غنیمت سے حاصل ہوئی تھیں، ان میں سے ایک اونٹنی بھی انہوں نے مار ڈالی، حضور اکرم ﷺ اور آپکے اہل و عیال ان اونٹنیوں کا دودھ رات کے وقت پیا کرتے تھے، ان کی اس حرکت کی وجہ سے رات کے وقت آل محمد کو دودھ میسر نہ ہو سکا تو آپ ﷺ نے ان ڈاکوؤں کیلئے ان الفاظ سے بددعا کی:

اَللّٰهُمَّ عَطِّشْ مَنْ عَطَّشَ اٰلَ مُحَمَّدٍ

اے اللہ! تو اسے پیاسا کر جس نے آل محمد کو پیاسا کیا ہے،

یہ چرواہا جس کو انہوں نے قتل کر دیا تھا کیا صرف اسی کو قتل کیا تھا یا اسکے ساتھ اور چرواہوں کو بھی مارا گیا تھا؟

صحیح بخاری کی تمام روایات اسپر متفق ہیں کہ جس چرواہے کو انہوں نے مار دیا تھا وہ حضور اکرم ﷺ کا چرواہا تھا، اور اسے مفرد لفظ سے ہی ذکر کیا گیا ہے، البتہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت انس سے جمع کا لفظ بھی منقول ہے، وہ فرماتے ہیں: ثُمَّ مَالُوا عَلَى الرُّعَاةِ فَقَتَلُوهُم پھر وہ چرواہوں کیطرف متوجہ ہوئے اور ان کو قتل کر دیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس بارے میں دو احتمال ذکر کیے ہیں:

(۱)...... ممکن ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے چرواہے کے ساتھ صدقہ کے اونٹوں کے بعض چرواہوں کو بھی انہوں نے قتل کر دیا ہو، اسے جب بیان کیا گیا تو بعض راویوں نے صرف حضور اکرم ﷺ کے چرواہے کے قتل کے ذکر پر اکتفاء کر دیا، اور بعض نے لفظ جمع کے ساتھ ذکر کر دیا۔

(۲)...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض راویوں نے روایت بالمعنیٰ کی ہو، یعنی اس واقعہ کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو، جس میں مجازاً لفظ جمع استعمال کر دیا ہو، جبکہ مقتول صرف حضور ﷺ کے چرواہے تھے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس احتمال کو راجح قرار دیا ہے، کیونکہ اکثر روایات میں صرف حضرت یسار کے قتل کا ذکر ہے جو حضور اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور آپکے چرواہے تھے۔

ایک چرواہا جو انکے ظلم سے بچ گیا تھا اس نے آکر حضور اکرم ﷺ کو سارا قصہ بتایا، آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں چند افراد روانہ کیے، وہ انہیں پکڑ کر لے آئے، ان لوگوں نے کئی سارے جرم کیے تھے، مثلہ کر کے قتل کیا، ڈاکہ ڈالا، چوری کی اور مرتد ہو گئے تھے، ان سنگین جرائم کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے ان کے بارے میں سخت فیصلہ فرمایا کہ انہیں بھی اس انداز سے قتل کیا جائے جسطرح انہوں نے کیا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور آنکھیں بھی گرم سلائی سے پھوڑ ڈالیں، اور سخت دھوپ میں مدینہ کی پتھریلی زمین پر پھینک دیا جائے، چنانچہ اسی فیصلے کی روشنی میں انہیں سزا دی گئی، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ دھوپ میں مدینہ کی پتھریلی زمین پر تڑپ رہے تھے اور میں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ وہ زمین کو دانتوں سے کاٹ رہے تھے، یہاں تک وہ اسی حالت میں مر گئے۔

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ وہ پانی طلب کرتے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا گیا، اسی کشمکش

میں ان کو موت آ گئی،

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ انہیں اس جرم کی وجہ سے پانی نہیں دیا گیا کہ وہ مرتد ہو گئے تھے جسکی وجہ سے وہ قابل احترام نہ رہے، بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ انہوں نے جب آل محمد کو پیاسا کیا تھا، تو حضور اکرم ﷺ نے ان کیلئے بددعا کی تھی، اس وجہ سے انہیں بھی پیاسا کیا گیا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اس ناشکری کی سزا ہو جو انہوں نے اونٹوں کا دودھ پی کر کی تھی، یہ تمام اسباب جمع ہو سکتے ہیں، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ پانی نہ دینے کا واقعہ انہی کے ساتھ خاص تھا، ورنہ حکم یہ ہے کہ کوئی مجرم خواہ وہ کتنی ہی شدید سزا کا مستحق ہو، اگر وہ پانی طلب کرے تو اسے پانی دیا جائیگا۔ فتح الباری، کتاب الوضوء، باب ابوال الابل والدواب ۴۴۲/۱، ۴۵۱۔ عمدۃ القاری، کتاب الوضوء، باب ابوال الابل والدواب، ۱۵۶/۳۔

وقال: اشربوا من البانها وابوالها، اس جملے سے تین فقہی مسئلے متعلق ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کا پیشاب پاک ہے یا ناپاک، اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی حرام چیز کو دواء کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں تیسرا مسئلہ ضمناً حد اور قصاص کا ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

بول ما یوکل لحمہ کا حکم

جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا پیشاب پاک ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام مالک، امام احمد، امام محمد اور امام زفر کے نزدیک ان کا پیشاب پاک ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور جمہور کے نزدیک **ما یوکل لحمہ** کا پیشاب اور ان کی لید وغیرہ ناپاک ہے، البتہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک بول ما یوکل لحمہ نجاست خفیفہ ہے، کیونکہ اختلاف فقہاء کی وجہ سے ان کے نزدیک احکام میں آسانی اور تخفیف ہو جاتی ہے۔ فتح الباری، کتاب الوضوء، باب ابوال الابل والدواب (۴۴۶/۱)۔ درس ترمذی، ابواب الطھارۃ، باب بول ما یوکل لحمہ ۲۸۹/۱

امام مالکؒ وغیرہ کے دلائل

(۱)......حدیث باب کا مذکورہ جملہ ہے جس میں آپ ﷺ نے انہیں اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا، اگر یہ

پیشاب ناپاک ہوتا تو آپ اسکے پینے کا حکم نہ دیتے، حدیث سے براہ راست اونٹ کے پیشاب کا پاک ہونا معلوم ہوتا ہے، اور دوسرے حلال جانوروں کے پیشاب کی طہارت اسی پر قیاس کے ذریعہ ثابت کی ہے۔

(۲)......دوسرا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: صَلُّوْا فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ بکریوں کی باڑ میں نماز پڑھ لیا کرو، اور یہ ظاہر بات ہے کہ بکریوں کے باڑ میں جگہ جگہ مینگنیاں اور ان کا پیشاب ہوتا ہے، اسکے باوجود آپ نے وہاں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کا پیشاب پاک ہے، کیونکہ اگر ان کا پیشاب ناپاک ہوتا تو آپ بکریوں کے باڑ میں نماز پڑھنے کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ حضرات حلال جانوروں کے پیشاب کے علاوہ لید، گوبر اور مینگنیوں کی طہارت پر استدلال کرتے ہیں۔

جمہور کے دلائل

(۱)......حضرت ابوھریرۃ کی حدیث ہے: اِسْتَنْزِهُوْا مِنَ الْبَوْلِ فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ، پیشاب سے بچکر رہا کرو کیونکہ عذاب قبر عموماً پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس حدیث میں لفظ "بول" عام ہے خواہ وہ انسان کا ہو یا حلال اور حرام جانوروں کا، ان تمام قسم کے ابوال سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب علی الاطلاق ناپاک ہے۔ تحفۃ الاحوذی، أبواب الطھارۃ، باب ماجاء فی بول ما یؤکل لحمہ (۱:۲۰۴، ۲۰۶)

(۲)......حضرت ابن عمر کی حدیث ہے: نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْجَلَّالَةِ وَأَلْبَانِهَا۔ رسول اللہ ﷺ نے "جلالہ" کا گوشت اور ان کا دودھ پینے سے منع کیا ہے۔

"جلالہ" اس جانور کو کہا جاتا ہے جو لید، گوبر وغیرہ کھاتا ہو، مسلسل نجاست کھانے کی وجہ سے اسکے اثرات اسکے گوشت اور دودھ تک پہونچ جاتے ہیں، اسی وجہ سے آپ نے اسکے گوشت اور دودھ پینے سے منع کیا ہے، اس سے "دلالۃ النص" کے طور پر حلال جانوروں کے پیشاب، لید، اور گوبر وغیرہ کی نجاست معلوم ہوتی ہے۔

(۳)......سنن ابی داؤد میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اِذَاجَاءَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَاِنْ رَآى فِي نَعْلَيْهِ قَذْرًا اَوْ أَذىً فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيْهَا.

''جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو اسے خوب غور سے دیکھ لینا چاہیے، اگر اپنے جوتوں میں کوئی خس وخاشاک یا گندگی دیکھے تو پہلے اسے صاف کرے اور پھر اسکے ساتھ نماز پڑھے''

اس حدیث میں لفظ ''قــذر'' اور ''اذی'' عام ہیں جو ہر طرح کی گندگی کو شامل ہیں خواہ وہ انسان کا پیشاب پائخانہ ہو یا کسی حلال جانور کا پیشاب وغیرہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب علی الاطلاق ناپاک ہے۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، باب بول مایوکل لحمہ ۱/۲۷۵، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ' باب الصلاۃ فی النعل ۱/۱۰۲۔

(۴)......جمہور کا استدلال حضرت سعد بن معاذ کی وفات کے واقعہ سے ہے، جس میں ہے کہ دفن کے بعد قبر نے انہیں زور سے بھینچا اور دبایا، اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خبر دینے کے بعد فرمایا کہ ان پر قبر کی تنگی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ پیشاب سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ درس ترمذی، ابواب الطھارۃ، باب بول مایوکل لحمہ ۱/۲۹۰، مشکوۃ (۱/۲۶) بحوالہ مسند احمد

نورالانوار میں اس واقعہ کی مزید تفصیل یوں ہے: ''حضور اکرم ﷺ جب ایک نیک صحابی کے دفن سے فارغ ہو گئے جو عذاب قبر میں مبتلا ہو گئے تھے، تو اسکی بیوی سے آپ ﷺ نے اس صحابی کے اعمال کے بارے میں پوچھا، انکی اہلیہ نے بتایا کہ وہ بھیڑ بکریوں کو چرایا کرتے تھے لیکن انکے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتے تھے، اس وقت حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''استنزھوا من البول فان عامة عذاب القبر منه''

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نورالانوار کی اس تفصیل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حدیث کی کتابوں میں مجھے یہ تفصیل نہیں ملی تاہم اگر یہ واقعہ ایسا ہی ہو تو یہ جمہور کے موقف کی واضح دلیل ہے۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، باب بول مایؤکل لحمہ ۱/۲۷۸۔

(۵)......مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حلال جانوروں کے پیشاب، گوبر اور لید کی

نجاست سورہ نحل کی اس آیت نمبر ٦٦ سے ثابت ہوتی ہے:

"وان لكم في الانعام لعبرة،نسقيكم ما في بطونه من بين فرث و دم لبنا خالصا سائغا للشاربين"

(اور تمہارے لئے تو چوپاؤں میں بھی بڑی عبرت ہے، کہ ہم تمہیں ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے، اسکے درمیان میں سے صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ پلاتے ہیں)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بطور احسان کے یہ فرمارہے ہیں کہ ہم نے دو ناپاک چیزوں کے درمیان سے ایک پاک اور صاف چیز کو نکالا، اس سے معلوم ہوا کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور گوبر وغیرہ نجس ہیں، کیوں کہ چوپائے جو کچھ کھاتے ہیں وہ معدے میں جاتا ہے، اسی خوراک سے دودھ، خون، گوبر اور پیشاب بنتا ہے، خون رگوں میں اور دودھ تھنوں میں، اسی طرح گوبر اور پیشاب اپنی اپنی جگہ منتقل ہوجاتے ہیں، اور دودھ میں نہ خون کی رنگت شامل ہوتی ہے، نہ گوبر اور پیشاب کی بدبو، بلکہ سفید اور شفاف دودھ باہر آتا ہے، جو نہایت آسانی کے ساتھ حلق کے نیچے اتر جاتا ہے۔ التعلیق الصبیح علی مشکاۃ المصابیح، کتاب الطھارۃ، باب تطھیر النجاسات، الفصل الثالث: ۱/۲۴۳۔ ط: مکتبہ عثمانیہ لاہور۔

جمہور کی طرف سے حدیث باب کی توجیہات

جمہور کے نزدیک حدیث باب کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

(۱)......اہل عرینہ کو پیشاب پینے کا حکم علاج کے طور پر محض ضرورت کی وجہ سے تھا، کیونکہ ان کی بیماری کیلئے کوئی حلال دواء مفید نہیں تھی، لہذا ضرورت شدیدہ کے بغیر پیشاب پینے کا جواز اور اسکی طہارت اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ عام حالات میں وہ حرام ہیں لیکن ضرورت کے موقع پر انکے استعمال کی شریعت نے اجازت دی ہے، چنانچہ ریشم کا استعمال دنیا میں مردوں کیلئے حرام ہے، لیکن اسکے باوجود جنگ میں، یا خارش کی وجہ سے یا شدید سردی میں جبکہ اور کوئی کپڑا نہ ہو، مردوں کو بھی ریشم استعمال کرنے کی اجازت ہے، لہذا جس چیز کے استعمال کی اجازت ضرورت کی حد تک ہو اس سے کوئی عمومی حکم

ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عمدۃ القاری، کتاب الوضوء، باب ابوال الابل والدواب.....۳/۱۵۴۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، حکم ابوال ما یوکل لحمہ ۱/۲۷۳۔

(۲)..... حضور اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان لوگوں کے اس مرض کی شفاء یقینی طور پر اونٹوں کے پیشاب پینے سے ہوگی، اور اس سے ان کی بیماری ختم ہو جائیگی، اور حکم یہ ہے کہ جب کسی حرام چیز سے شفا کا حصول یقینی ہو تو اسکا استعمال جائز ہو جاتا ہے، اسطرح یہ ایک اضطراری صورت بن جاتی ہے، جس میں مردار اور حرام چیز کا کھانا پینا بھی جائز ہوتا ہے، لہذا اس سے حلال جانوروں کی طہارت پر استدلال کرنا درست نہیں۔ عمدۃ القاری، ۳/۱۵۵

(۳)..... اہل عرینہ کا یہ واقعہ نسخ سے پہلے زمانہ کا ہے، بعد میں اس حکم کو ان تمام احادیث نے منسوخ کر دیا جن سے پیشاب کی نجاست ثابت ہوتی ہے۔

(۴)..... بعض یہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اس حدیث میں صرف انہیں دودھ پینے کا حکم دیا تھا، پیشاب پینے کا حکم نہیں دیا اسکو اصطلاح میں "تضمین" کہا جاتا ہے، عبارت میں قرب کی وجہ سے لفظ "ابوالھا" کا عطف "البانھا" پر کر دیا گیا ہے، ورنہ یہاں ایک فعل محذوف ہے اور وہ، "اِضمِدُوا" ہے، جس کے معنیٰ ہیں: زخم پر لیپ کرنا، دوا ملنا، یا "اِستَنشِقُوا" ہے جس کے معنیٰ ہیں ناک میں چڑھانا، لہذا حدیث کے جملے کے معنی یہ ہونگے: ان کے دودھ پیو اور انکے پیشاب لیپ کرو، یا ناک میں چڑھاؤ، گویا پیشاب کا حکم خارجی استعمال سے متعلق ہے، اسکی تائید سنن نسائی کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں صرف "لیشربوا من البانھا" (چاہیے کہ وہ اونٹنیوں کا دودھ پئیں) کے الفاظ ہیں، اس میں "ابوالھا" کا لفظ نہیں ہے۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، حکم ابوال ما یؤکل لحمہ ۱/۲۷۴۔

امام مالکؒ کی دوسری دلیل کے جواب

امام مالک رحمہ اللہ نے دوسرا استدلال "مرابض الغنم" والی روایت سے کیا ہے، جمہور نے اسکی دو توجیہات کی ہیں:

(۱)..... حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے "کتاب الأم" میں اسکی وجہ یہ بیان کی ہے، کہ مدینہ منورہ کی سرزمین

عام طور پر سنگریزہ اور چھوٹے نوکیلے پتھروں پر مشتمل تھی، اسپر آدمی نماز تک نہیں پڑھ سکتا تھا، البتہ مرابض غنم یعنی بکریوں کے باڑ کی جگہیں اہتمام کے ساتھ برابر اور ہموار کی جاتی تھیں، اور انہیں صاف ستھرا بھی رکھا جاتا تھا، اسلئے آپ ﷺ نے جائے نماز بچھا کر وہاں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اور خود بھی وہاں نماز پڑھی ہے۔ اور اونٹوں کے باڑ کی جگہ پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ عرف الشذی علی جامع الترمذی، ابواب الطھارۃ، باب ماجاء فی الصلاۃ فی مرابض الغنم ۱/۸۴۔

(۲)......ابن حزم فرماتے ہیں کہ مرابض غنم میں نماز پڑھنے والی حدیث منسوخ ہے، یہ حکم اس زمانے سے متعلق تھا جب مسجدیں نہیں بنی تھیں، پھر جب مسجدیں بن گئیں تو پھر یہ حکم باقی نہیں رہا، اسکی تائید بخاری کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ مرابض غنم میں نماز پڑھا کرتے تھے قَبْلَ اَنْ يُّبْنَى الْمَسْجِدَ، مسجد کی تعمیر سے پہلے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بکریوں کے باڑ میں نماز پڑھنے کی اجازت اور اونٹوں کے باڑ میں نماز پڑھنے کی ممانعت کا حکم نہ تو کسی چیز کی طہارت سے متعلق ہے اور نہ نجاست سے بلکہ اس فرق سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بکریاں جنتی جانوروں میں سے ہیں اسلئے انکے باڑ میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، اور اونٹ شیاطین اور جنات سے پیدا کئے گئے ہیں، اسلئے انکے باڑ میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

فتح الباری، کتاب الوضوء باب ابوال الإبل والدواب، ۱/۴۵۱۔ عمدۃ القاری، ۳/۱۵۷۔

حرام چیز سے علاج کا حکم

اس حدیث کے تحت تداوی بالحرام کا مسئلہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ کتاب الطب سے متعلق ہے، اسلئے ہم ان شاء اللہ ابواب الطب، باب ماجاء فی شرب ابوال الابل میں اس مسئلہ کو تفصیل سے ذکر کریں گے۔

قصاص بالمثل کا مسئلہ

بعض حضرات کے نزدیک اہل عرینہ کے ہاتھ پاؤں کاٹنا اور ان کی آنکھوں کو گرم سلاخوں سے داغنا

یعنی مثلہ کرنا بطور قصاص کے تھا، اسلئے کہ انہوں نے بھی چرواہوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔

اس سے استدلال کر کے شوافع اور حنابلہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ قاتل سے قصاص بالمثل لیا جائیگا، یعنی قاتل نے جس طریقے سے قتل کیا ہے، اسے بھی قصاصاً اسی طرح قتل کیا جائیگا، کیونکہ قصاص میں مساوات اور برابری ضروری ہوتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ قاتل نے کسی ''فعل مشروع'' کے ذریعہ قتل کیا ہو، مثلاً اس نے کسی کا ہاتھ قصداً کاٹ دیا، جس سے وہ شخص مرگیا، شوافع کے نزدیک اس صورت میں پہلے اسکا ہاتھ قصاصاً کاٹا جائیگا، اسی سے اگر وہ مرجاتا ہے تو ٹھیک ورنہ اسکی گردن کاٹ دی جائیگی، لیکن اگر قاتل نے کسی ''فعل غیر مشروع''، یعنی کسی ناجائز عمل کے ذریعہ کسی کو قتل کیا ہو، مثلاً کسی مرد سے لواطت کر کے اسے ماردیا، یا کسی عورت سے زنا کر کے اسے قتل کردیا، یا کسی کو جلا کر ماردیا، یا کسی کو شراب پلا کر قتل کردیا، ان تمام صورتوں میں شوافع کے نزدیک صرف قصاص لیا جائیگا، قصاص بالمثل نہیں ہوگا یعنی قاتل کو قصاصاً اسطرح نہیں قتل کیا جائیگا جس طرح قاتل نے مقتول کو قتل کیا ہے۔

جبکہ احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قصاص صرف تلوار سے لیا جاسکتا ہے، قصاص بالمثل سے نہیں، اسکی دلیل سنن ابن ماجہ کی صریح حدیث ہے: لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ، سنن ابن ماجۃ، ابواب الدیات، باب لاقود الا بالسیف) ص:۱۹۱۔ کہ قصاص صرف تلوار سے مشروع ہے، تلوار کے بغیر قصاص نہیں ہے، اور اگر ایک شخص دوسرے کو زخمی کردے تو یہ دیکھا جائیگا کہ اس کا قصاص لیا جاسکتا ہے یا نہیں، اگر قصاص ممکن ہو تو قصاص ہوگا ورنہ دیت یا ارش یعنی زخم کا تاوان لازم ہوگا۔ ھدایۃ، کتاب الجنایات، باب مایوجب القصاص ومالا یوجبہ، ۵۶۳/۴تا۵۷۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، باب ماجاء فی بول مایؤکل لحمہ ۲۷۸/۱و۲۷۹۔

سوال یہ ہے کہ اہل عرینہ کا مثلہ کیا گیا اور گرم سلاخوں سے ان کی آنکھیں نکالی گئیں، حالانکہ شریعت میں مُثلہ سے منع کیا گیا ہے، اگر یہ چیز حد اور قصاص کے طور پر نہیں تھی تو پھر ایسا کیوں کیا گیا؟

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ یہ مخصوص برتاؤ سیاست اور انتظامی لحاظ سے کیا تھا، حد اور قصاص کے طور پر نہیں کیا تھا، اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ان کا مثلہ اور گرم سلاخوں سے داغنا حد کے طور پر تھا تو بھی یہ منسوخ ہوچکا ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں

کہ اہل عرینہ کا یہ واقعہ حدود کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اس کے بعد حدود کے احکام اور مثلہ کی حرمت نازل ہوئی، اور حضور اکرم ﷺ نے آگ سے جلا کر مارنے، اور سورہ مائدہ کی آیت محاربہ کی وجہ سے مثلہ کرنے سے منع فرمادیا۔

- صحیح بخاری، کتاب الجھاد، باب لا یعذب بعذاب اللہ ۱/۴۲۳، فتح الباری، کتاب الوضوء، باب ابوال الإبل والدواب...... ۱/۴۴۹ و ۴۵۰۔ معارف السنن، ابواب الطھارۃ، باب بول ما یؤکل لحمہ ۱/۲۷۸ و ۲۷۹۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۳۳، ۳۴۔

بَابُ الْوُضُوءِ قَبْلَ الطَّعَامِ وَبَعْدَهُ

یہ باب کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد وضو یعنی ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بیان میں ہے۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ: قَرَأْتُ فِيْ التَّوْرَاةِ أَنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ بَعْدَهُ، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ وَأَخْبَرْتُهُ بِمَا قَرَأْتُ فِيْ التَّوْرَاةِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَهُ، وَالْوُضُوْءُ بَعْدَهُ.

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے (اسلام قبول کرنے سے پہلے) تورات میں پڑھا ہے کہ وہ کھانا بابرکت ہوتا ہے جس کے بعد وضو کیا جائے، پھر (اسلام قبول کرنے کے بعد) میں نے (ایک دن) حضور اکرم ﷺ کے سامنے اسکا ذکر کیا، اور جو کچھ میں نے تورات میں پڑھا تھا وہ آپکو بتایا، اسپر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کھانے سے پہلے اور بعد دونوں میں وضو ہو، وہ کھانا بابرکت ہوتا ہے۔

کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا اور کلی کرنا باعث برکت ہے

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد حضور اکرم ﷺ کے سامنے ایک دن عرض کیا کہ میں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے میں برکت کا ذریعہ اسکے

بعد ہاتھ منہ دھونا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے سے پہلے اور بعد دونوں میں وضو کرنا کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے جواب میں دو احتمال ہیں:

(۱)...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپکا جواب تورات میں تحریف کیطرف اشارہ ہو کہ اصل حکم تورات میں بھی یہی تھا کہ کھانے سے پہلے اور بعد دونوں موقع پر وضو کرنا چاہیے، لیکن بعد میں لوگوں نے اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی اور تحریف کرڈالی اور اس میں صرف کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کو برقرار رکھا۔

(۲)......اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے تورات کے حکم کو برقرار رکھ کر اس میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا اضافہ کیا ہو، کھانے کے احترام اور تعظیم کی وجہ سے، گویا آپکے اس جواب سے سابقہ حکم کی تکمیل کیطرف اشارہ ہے۔

اس حدیث میں ''وضو'' سے وہ وضو مراد نہیں جو نماز سے پہلے کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے صرف ہاتھ دھونا اور کلی کرنا مراد ہے، جسے اصطلاح میں ''لغوی وضو'' کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ اسکے بعد کھانا زیادہ خوشگوار اور پرلطف ہوتا ہے، کیونکہ ہاتھوں میں کام وغیرہ کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گرد وغبار اور میل کچیل ضرور جمع ہوجاتی ہے، اور منہ میں بھی معدہ خالی ہونیکی وجہ سے تعفن اور بدبو سی پیدا ہوجاتی ہے، جو کلی کرنے سے زائل ہوجاتی ہے، اس لئے کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا اور کلی کرنا بہرحال باعثِ نظافت ہے۔

اور کھانے کے بعد اسلئے ہاتھ دھونے چاہیں کہ عموماً ہاتھوں میں کچھ چکنائی رہ جاتی ہے، جس سے بسا اوقات بدبو پیدا ہوجاتی ہے، اور بعض دفعہ اسپر کیڑے...... آجاتے ہیں، جو ایذاء رسانی کا سبب بنتے ہیں۔

امام ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوھریرۃ سے روایت نقل کی ہے: **مَنْ نَامَ وَفِي يَدِهِ غَمَرٌ وَلَمْ يَغْسِلْهُ فَأَصَابَهُ شَيْئٌ فَلا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ.**

جو شخص رات کو اس حالت میں سوجائے کہ اسکے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی اور بو ہو، اور پھر اسکی وجہ سے اسے کوئی تکلیف پہونچ جائے، (مثلاً کسی کیڑے نے کاٹ دیا) تو وہ بس اپنے ہی کو ملامت

کرے (اور اسے اپنی ہی غفلت اور غلطی کا نتیجہ سمجھے) سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی غسل الید من الطعام ۲/۵۳۸۔

برکة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده : کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کلی کرنے سے کھانے میں برکت کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس کھانے میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے اضافہ اور زیادتی ہو جاتی ہے، کہ تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کیلئے کافی ہو جاتا ہے یا اس سے آدمی جلدی سیراب ہو جاتا ہے، اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے برکت حاصل ہونے سے یہ مراد ہے کہ اسکے فوائد اور ثمرات بڑھ جاتے ہیں کہ اس سے طبیعت میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اور عبادات، اخلاق حسنہ اور نیک اعمال میں تقویت کا ذریعہ بنتا ہے۔

فذكرت ذلك......واخبرته..........

ان دو جملوں سے یا تو ایک ہی مفہوم مراد ہے، اس صورت میں ان کے درمیان عطف تفسیری ہوگا، اور یا ان دونوں کا مفہوم الگ الگ ہوگا لہذا اس تشریح کی رو سے ذکرت کے معنیٰ ہونگے :سَألتُ، اور "واخبرته" میں "واؤ" حالیہ ہے، اور یہ جملہ حالیہ ہوگا، معنی یہ ہونگے : میں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کیا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اور کلی کرنا کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے اس حال میں کہ میں نے آپکو بتایا کہ میں نے (اسلام سے پہلے) تورات میں ایسا ہی پڑھا تھا (کیا یہ صحیح ہے؟) تو پھر آپ نے فرمایا............مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی، شرح الطیبی، ۸/۱۵۷۔

کھانے کے بعد ہاتھ تولیہ سے صاف کرنا

سنت طریقہ یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں اور انہیں تولیے یا رومال وغیرہ سے پونچھا نہ جائے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پہلے انگلیوں کو چاٹا جائے، اور پھر انہیں دھو کر تولیہ وغیرہ سے صاف کرلیا جائے، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اپنے ہاتھ (تولیہ وغیرہ سے) صاف نہ کرے، یہاں تک انہیں چاٹ لے (پھر

انہیں صاف کرلے)۔فتح الباری، کتاب الاطعمة، باب لعق الاصابع ومصها قبل ان تمسح بالمندیل ۹/۷۲۰۔

بَابٌ فِيْ تَرْكِ الْوُضُوْءِ قَبْلَ الطَّعَامِ

یہ باب کھانے سے پہلے ترکِ وضو کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ فَقُرِّبَ إِلَيْهِ طَعَامٌ، فَقَالُوْا: أَلَا نَأْتِيْكَ بِوَضُوْءٍ؟ قَالَ: إِنَّمَا أُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ إِذَا قُمْتُ إِلَى الصَّلَاةِ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء سے نکلے تو آپکو کھانا پیش کیا گیا، تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپکے لئے وضو کا پانی نہ لائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے تو وضو کرنے کا حکم (وجوبی طور پر) اس وقت دیا گیا ہے جبکہ میں نماز (پڑھنے) کیلئے کھڑے ہونیکا ارادہ کروں۔

قَالَ يَحْيَى ابْنُ سَعِيْدٍ: كَانَ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ يَكْرَهُ غَسْلَ الْيَدِ قَبْلَ الطَّعَامِ وَكَانَ يَكْرَهُ اَنْ يُوْضَعَ الرَّغِيْفُ تَحْتَ الْقَصْعَةِ.

یحیی بن سعید کہتے ہیں: سفیان ثوری کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کو ناپسند سمجھتے تھے، اور آپ سالن کے برتن کو روٹی کے اوپر رکھنے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

مشکل کلمات کے معنیٰ:۔الوَضوء: "واؤ" کے فتح کے ساتھ، وضو کا پانی۔الوُضوء: "واؤ" کے پیش کے ساتھ، اس سے مراد وہ وضو ہے جو نماز سے پہلے کیا جاتا ہے۔جسے اصطلاح میں "شرعی وضو" کہا جاتا ہے۔الرغیف: روٹی۔القصعة: بڑا پیالہ، یہاں سالن کا برتن مراد ہے۔

کھانے سے پہلے وضو کرنا یا ہاتھ منہ (دھونا) ضروری نہیں

حضور اکرم ﷺ ایک دفعہ قضاء حاجت سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے تو آپکو کھانا دیا گیا، بعض

صحابہ نے عرض کیا کہ آپ کیلئے وضو کا پانی ہم لائیں؟ ان کے سوال کے انداز سے آپ سمجھ گئے کہ ان کی نظر میں کھانے سے پہلے شرعی وضو کرنا گویا ضروری ہے چنانچہ ایک روایت میں منقول ہے کہ وہ اسے ضروری سمجھتے تھے، ان کے اس اعتقاد کو ختم کرنے کیلئے آپ ﷺ نے بڑی تاکیدی الفاظ کے ساتھ انہیں جواب دیا کہ شرعی وضو تو اس وقت لازم ہوتا ہے جب انسان نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، حدیث میں نماز کے ذکر پر اکتفاء فرمایا ہے کیونکہ اسکا وقوع زیادہ ہے، ورنہ دیگر کئی موقعوں پر بھی شرعی وضو کرنا واجب ہوتا ہے، مثلاً طواف بیت اللہ، سجدہ تلاوت............

اس جواب سے کھانے سے پہلے وضو کے وجوب کی نفی مقصود ہے، ورنہ اگر کوئی شخص کھانے سے پہلے ثواب کی خاطر پورا وضو کر لے یا صرف ہاتھ منہ دھو لے تو یہ اس حدیث کے منافی نہیں، بلکہ یہ بہتر اور مستحب ہے جیسا کہ پچھلے باب میں گذر چکا ہے۔

حدیث میں وضو سے مراد نماز والا وضو ہے، جسے شرعی وضو کہا جاتا ہے۔ مرقاۃ المصابیح، ۴۲/۸، ۴۳۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کے سوال کا مقصد وضو شرعی نہ ہو بلکہ اس سے صرف ہاتھ دھونا اور کلی کرنا مراد ہو، اور چونکہ کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا سنن اور آداب میں سے ہے، فرض یا واجب نہیں ہے، اسلئے آپ ﷺ نے بیان جواز کے پیش نظر اسکو ترک کیا، اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ کھانے سے پہلے کا وضو جسکا تم مجھ سے سوال کر رہے ہو یہ شرعاً ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر میں اسے ترک کر دوں تو کوئی حرج نہیں البتہ وہ وضو لازم اور ضروری ہوتا ہے جب انسان نماز پڑھنے کا یا ایسا کام کرنیکا ارادہ کرے جو وضو کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ الکوکب الدری، ابواب الاطعمۃ، باب فی ترک الوضوء قبل الطعام ۲۵/۳۔

سفیان ثوری کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کو ناپسند کرتے تھے، امام ابوداؤد نے ان کی اس بات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب غسل الید قبل الطعام، ۵۲۸/۲

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الدُّبَّاءِ

یہ باب کدو کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ طَالُوْتَ قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰى أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ وَهُوَ يَأْكُلُ الْقَرْعَ وَهُوَ

يَقُوْلُ: يَا لَكِ شَجَرَةً مَا أَحَبَّكِ إِلَيَّ لِحُبِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ إِيَّاكِ.

ابو طالوت فرماتے ہیں کہ میں حضرت انس کے پاس داخل ہوا تو وہ کدو کھا رہے تھے، اور (کدو سے مخاطب ہوکر) فرما رہے تھے کہ اے وہ سبزی تم مجھے کتنی محبوب ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تجھ سے محبت کرتے تھے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتَتَبَّعُ فِي الصَّحْفَةِ، يَعْنِي الدُّبَّاءَ، فَلا أَزَالُ أُحِبُّهُ.

انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ پلیٹ میں کدو تلاش کر رہے تھے، تو میں (بھی اس دن سے) کدو کو پسند کرتا ہوں۔

مشکل کلمات کی تشریح: ۔اَلـدُّبَّـاء: (دال پر ضمہ اور باء پر تشدید کے ساتھ) کدو، لوکی، خواہ گول ہو یا لمبا، یہ جمع ہے اسکا واحد دُبَّـاءة ہے۔ مختار الصحاح، باب الدال، مادة: دب ی، ص:۱۹۸۔اَلْقَرْع: کدو، لوکی، اسکا واحد قَرْعة ہے۔شجرة: درخت، یہاں سبزی مراد ہے۔مَا اَحَبَّکِ: یہ تعجب کا صیغہ ہے: کس چیز نے تجھے محبوب بنایا، تو کتنی محبوب ہے۔يَتَتَبَّعُ: وہ تلاش کر رہے تھے۔اَلصَّحْفَة: وہ پلیٹ جس میں پانچ آدمی سیراب ہوکر کھا سکیں۔

یالکِ شجرة ما احبک الی............کی ترکیب نحوی

"یالک شجرة ما احبک إلیّ لحب رسول الله ﷺ ایاکِ"

"یـا" حرف نداء بمعنی ادعـو ، ادعـو فعل، "انـا" ضمیر فاعل، "لک" لام جار، "ک" ضمیر ممیّز، "شجرة" تمیز، ممیّز تمیز ملکر لام کا مجرور، جار مجرور متعلق ادعو فعل کے، جملہ ہوکر ندا ہوا۔

"ما مبتداء، أحبک، "أحب" فعل، ھو ضمیر فاعل، "ک" ضمیر مفعول بہ، "الیّ" جار مجرور متعلق اول ہوا احب فعل کے، "لـحـبّ رسـول الله ......" لام جار، حب مصدر مضاف "رسول" مضاف الیہ ومضاف، لفظ "اللہ" مضاف الیہ، رسول مضاف اپنے مضاف الیہ سے مل کر مضاف الیہ فاعل ہوا "حـــب"

مصدر کیلئے، "ایاک" مصدر کیلئے مفعول بہ ہے، "حب" مصدر اپنے مضاف الیہ فاعل اور مفعول بہ سے ملکر مجرور ہوا لام جار کے لیے، جار مجرور متعلق ثانی ہوا، احب فعل کے، جملہ ہوکر خبر ہوئی "ما" مبتدا کی، جملہ اسمیہ ہوکر جواب نداء، نداء اپنے منادی سے ملکر جملہ ندائیہ انشائیہ ہوا۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" یہ جملہ معترضہ ہے، "صلی" فعل ہے، لفظ "اللہ" فاعل، "علیہ" جار مجرور فعل سے متعلق، جملہ ہوکر معطوف علیہ، "وسلّم" فعل فاعل ملکر جملہ ہوکر معطوف، جملہ معطوفہ معترضہ ہوا۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ما جاء فی أکل الدباء ۵/۳۷۴۔

کدو کی فضیلت

باب کی مذکورہ دونوں احادیث سے کدو کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کو یہ زیادہ پسند تھا، آپ اسے بڑے شوق اور رغبت سے تناول فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اسکی بیل نے میرے بھائی حضرت یونس پر اس وقت سایہ کیا تھا جب انہیں مچھلی نے سمندر کے کنارے پر تنہا تپتی ہوئی دھوپ میں چھوڑ دیا تھا، چونکہ یہ سبزی نبی کریم ﷺ کو پسند تھی، اسلئے صحابہ کرام بھی اسے بہت پسند کرتے تھے، حضرت انس کدو کو خطاب کر کے کہا کرتے کہ اے سبزی تجھ سے مجھے بہت محبت ہے، کیونکہ میرے نبی ﷺ تجھے پسند فرماتے تھے، اسکا سالن جب آپکے سامنے آتا تو اس میں سے کدو تلاش کر کے بڑی چاہت سے آپ کھاتے تھے، اسلئے اہل اسلام کو بھی اس سبزی کے ساتھ محبت رکھنی چاہیے، یہی کمال ایمان کا تقاضا ہے۔

آپ ﷺ اسے کس وجہ سے پسند فرماتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ اسے اس وجہ سے پسند فرماتے تھے کہ اسکی تاثیر طبعاً ٹھنڈی ہے، جبکہ عرب کی آب وہوا اور اہل عرب کے مزاج عموماً گرم ہوتے ہیں، اسکے کھانے سے طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، یا اس وجہ سے آپکو پسند تھا کہ یہ جلدی پک جاتا ہے اور اسکا کھانا بھی آسان ہے، اسکا ذائقہ مزیدار اور پر لطف ہوتا ہے، اور اعضاء کو توانائی فراہم کرتا ہے۔ الکوکب الدری، ابواب الاطعمۃ، باب ما جاء فی أکل الدباء، ۲۶/۳

باب کی دوسری حدیث میں حضرت انس فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ پلیٹ میں سے کدو تلاش کر کے تناول فرما رہے تھے، آپکی اس رغبت کو دیکھ کر مجھے بھی کدو سے محبت ہوگئی۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کدو تلاش کرنے کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)......ایک صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ پلیٹ کی اپنی جانب سے کدو تلاش کرتے تھے، دوسروں کے سامنے سے نہیں، کیونکہ آپ نے فرمایا: کُلْ ممایلیک کہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(۲)......دوسری صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ پلیٹ کے تمام کونوں سے کدو تلاش کرتے تھے، اسکی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں حوالی القصعۃ یا جوانب کے الفاظ منقول ہیں، شرح نووی علی صحیح مسلم، کتاب الاطعمۃ باب جواز أکل المرق واستحباب الیقطین ۲/۱۸۰۔

دوحدیثوں میں تعارض اوران میں تطبیق

پلیٹ سے کدو تلاش کرنے کے اگر دوسرے معنیٰ مراد لئے جائیں تو دوحدیثوں میں تعارض سا ہو جاتا ہے، وہ اسطرح کہ "کُلْ مِمَّا یَلِیْکَ" (اپنے قریب سے کھاؤ) والی روایت کا تقاضایہ ہے کہ آدمی کو اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، ادھر ادھر سے نہیں، اور باب کی دوسری روایت میں ہے کہ آپ پلیٹ سے کدو تلاش کررہے تھے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے سامنے کے علاوہ دوسری اطراف سے بھی کھاسکتا ہے۔محدثین نے اس تعارض کے ازالے کیلئے دوطرح کی تطبیق ذکر کی ہے:

(۱)......امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پلیٹ میں ہاتھ گھمانے کی ممانعت اس وقت ہے جب ساتھ کھانے والوں کو آدمی کا ادھر ادھر ہاتھ گھمانا ناگوار ہو اور اسے وہ اچھا نہ سمجھتے ہوں، ایسی صورت میں آدمی کو اپنے سامنے سے ہی کھانا چاہیے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں گھمانا چاہیے۔

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھانے والے حضرات صحابہ کرام چونکہ آپ ﷺ کے ہاتھ گھمانے کو ناگوار نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ تو اسکو اپنے لئے بجاطور پر برکت اور سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے، یہ تو ان کی نظر میں انتہائی معمولی بات تھی، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ انکے عشق ومحبت کا یہ عالم تھا کہ آپکے تھوک اور ناک کی رینٹ سے وہ برکت حاصل کرتے کہ انہیں اپنے چہروں پر مل لیتے، بعض نے اپنے عشق کو یوں تسکین دی کہ سرکار دو عالم ﷺ کا پیشاب پی گئے، اور بعضوں کی محبت اس انتہاء کو پہونچ گئی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کا خون تک پی لیا......جن لوگوں کے آپ ﷺ کے ساتھ عشق ومحبت کے یہ کرشمے ہوں وہ آپ ﷺ کے پلیٹ میں

ہاتھ ادھر ادھر گھمانے کو کیسے ناگوار سمجھ سکتے ہیں۔ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب من تتبع حوالی القصعة مع صاحبه اذا لم یعرف منه کراهیة، ۶۵۵/۹، شرح نووی علی صحیح مسلم، کتاب الاطعمۃ، باب جواز اکل المرق واستحباب الیقطین، ۱۸۰/۲

۲- بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس تعارض کا جواب نبی کریم ﷺ نے ایک اور حدیث میں بیان فرمایا دیا ہے جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے چار ابواب کے بعد باب ماجاء فی التسمیۃ علی الطعام میں عکراش بن ذویب سے روایت کیا ہے، جس میں ہے کہ حضرت عکراش حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، اور پلیٹ میں ہاتھ ادھر ادھر گھما رہے تھے، تو آپ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ: اے عکراش: ایک جگہ سے کھاؤ، کیوں کہ یہ ایک ہی قسم کا کھانا ہے' اسی دوران ایک بڑی ٹرے لائی گئی' جس میں مختلف قسم کی کھجوریں تھیں، تو حضرت عکراش سابقہ ہدایت کے مطابق صرف اپنے سامنے سے کھانے لگے، جبکہ حضور اکرم ﷺ اس ٹرے میں ہاتھ گھما کر کھانا تناول فرما رہے تھے یہ منظر دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عکراش: اب تم جس طرف سے چاہو کھا سکتے ہو' صرف اپنے سامنے سے ہی کھانا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ یہ کھجوریں مختلف قسم کی ہیں، ایسے میں ہاتھ ادھر ادھر سے گھما کر کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیالے یا پلیٹ میں ہاتھ گھمانے کی ممانعت اس وقت ہے جب ایک قسم کا کھانا ہو، لیکن اگر کھانے مختلف قسم کے ہوں تو پھر ہاتھ ادھر ادھر گھمانے میں کوئی حرج نہیں، اس باب کی دوسری روایت گو یہاں مختصر ہے، مگر اس سے یہی دوسری صورت مراد ہے کہ پیالے میں شوربہ، کدو اور گوشت تین مختلف چیزیں تھیں، آپ گوشت چھوڑ کر اپنی پسند کے مطابق لو کی تلاش کر کے تناول فرماتے رہے۔ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب من تتبع حوالی القصعة ۶۵۵/۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الزَّيْتِ

یہ باب روغن زیتون کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُوْا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهِ فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ.

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زیتون کا تیل (روٹی کے ساتھ سالن کے طور پر) کھاؤ (بھی) اور (بدن پر) اسکی مالش (بھی) کرو، کیونکہ زیتون کا تیل ایک با برکت درخت (یعنی زیتون) سے حاصل ہوتا ہے۔

عَنْ أَبِیْ أَسِیْدٍ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: کُلُوْا مِنَ الزَّیْتِ وَادَّھِنُوْا بِہٖ فَإِنَّہٗ شَجَرَۃٌ مُّبَارَکَۃٌ.

ابواسید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زیتون کا تیل (روٹی کے ساتھ سالن کے طور پر) کھایا کرو اور اسکے تیل سے بدن پر مالش کیا کرو کیونکہ (جس درخت سے تیل حاصل ہوتا ہے) وہ ایک مبارک درخت ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: الـزیـت: زیتون کا تیل، دیگر تیلوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے لیکن اضافت کے ساتھ عموماً جیسے زیـت الـغاز: مٹی کا تیل۔ ادّھـنـوابـہ: زیتون کے تیل سے بدن پر مالش کرو۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی ۵۱/۸۔

روغن زیتون کی برکات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر زیتون کا ذکر کیا، سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شَجَرَۃٍ مُبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ، اس سے بھی زیتون اور اسکے درخت کا مبارک اور نافع و مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔

باب کی مذکورہ احادیث میں زیتون کے تیل کی برکات کا ذکر ہے، آپ ﷺ نے اسے کھانے اور بدن پر مالش کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے، کیونکہ یہ مبارک درخت یعنی زیتون سے حاصل ہوتا ہے، اس تیل میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے فوائد اور خصوصیات رکھی ہیں، اس کو چراغوں میں روشنی کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور اسکی روشنی نہایت نفیس اور صاف شفاف ہوتی ہے، اسکو روٹی کے ساتھ سالن کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے، زیتون کا پھل بھی کھایا جاتا ہے، اور روغن زیتون ایسا تیل ہے جس کے نکالنے کیلئے کسی مشین وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص اسکے پھل سے بڑی آسانی سے خود ہی تیل نکال سکتا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ زیتون کے درخت کو "مبارک" اس وجہ سے کہا ہے کہ اسکی اکثر پیداوار ملک شام میں ہوتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کیلئے بڑی برکتیں رکھی ہیں، یہ علاقہ قدرتی نہروں اور پھلوں کی کثرت اور انبیاء کی قرار گاہ اور مدفن ہونے کے لحاظ سے ممتاز ہے، اسلئے اسے بابرکت قرار دیا گیا ہے، درخت زیتون کے بابرکت ہونے کی وجہ سے اسکے پھل اور تیل کو بھی مبارک بنا دیا گیا ہے، یہ تیل کئی بیماریوں کیلئے مفید ہوتا ہے، طبرانی نے عقبہ بن عامر سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس مبارک درخت یعنی اسکے تیل کو لازم پکڑو، اسکے ذریعہ علاج کرو کیونکہ یہ بواسیر کو (بھی) صحیح کر دیتا ہے۔

ابونعیم نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ روغن زیتون کھاؤ بھی اور اسکی مالش بھی کیا کرو، کیونکہ اس میں ستر بیماریوں کی شفا ہے، ان میں سے ایک جذام کی بیماری ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی، ۵۳/۸، ۵۴۔

هٰذَا حَدِيْثٌ لاَ نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ وَكَانَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ يَضْطَرِبُ فِيْ رِوَايَةِ هٰذَا الْحَدِيْثِ ، فَرُبَمَا ذَكَرَ فِيْهِ عَنْ عُمَرَ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، وَرُبَمَا رَوَاهُ عَلَى الشَّكِّ فَقَالَ اَحْسِبُهُ عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، وَرُبَمَا قَالَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مُرْسَلاً .

اس حدیث کو ہم عبد الرزاق سے جانتے ہیں جسے وہ معمر سے روایت کرتے ہیں، لیکن عبد الرزاق اس حدیث کی روایت میں مضطرب ہیں، کبھی حضرت عمر کے واسطے سے آپ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں، اور کبھی اسے شک کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، یوں کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت عمر نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے اور بسا اوقات کہتے ہیں کہ یہ روایت زید بن اسلم سے ہے، جیسے وہ مرسلا (یعنی واسطہ کے بغیر) آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، یعنی اس روایت میں حضرت عمر کا ذکر نہیں کرتے۔

باب کی پہلی حدیث میں اضطراب کی بحث

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اضطراب فی السند ہے، کیونکہ عبد الرزاق اس روایت کو کبھی مرفوعاً ذکر کرتے ہیں اور کبھی مرسلا روایت کرتے ہیں۔ اور کبھی شک اور گمان کے ساتھ کہ میرا

گمان ہے کہ حضرت عمر نے حضور ﷺ سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

''علم اصول حدیث'' کی اصطلاح میں اسے ''اضطراب فی السند'' (سند میں اضطراب) کہا جاتا ہے، یہ عموماً حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے، اسکی وجہ سے حدیث نا قابل استدلال ہو جاتی ہے، لیکن اگر اضطراب کی وجہ اور علت ختم ہو جائے تو پھر وہ حدیث قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

تیسیر مصطلح الحدیث، بحث: المضطرب، ص:۱۱۱۔

منذری امام ترمذی کا یہ کلام نقل کر کے فرماتے ہیں کہ حاکم نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ روایت امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس روایت سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔　　تحفۃ الأحوذی، ابواب الاطعمۃ، باب ماجاء فی أکل الزیت ۵/۴۷۵۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْأَكْلِ مَعَ الْمَمْلُوْكِ

یہ باب غلام (اور خادم) کے ساتھ کھانے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ يُخْبِرُهُمْ بِذٰلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا كَفَى أَحَدَكُمْ خَادِمُهُ طَعَامَهُ، حَرَّهُ وَدُخَانَهُ، فَلْيَأْخُذْ بِيَدِهِ فَلْيُقْعِدْهُ مَعَهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيَأْخُذْ لُقْمَةً فَلْيُطْعِمْهُ إِيَّاهَا.

حضرت ابوھریرۃ حضور اکرم ﷺ سے روایت کر کے اپنے شاگردوں کو بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو اسکا خادم اسکا کھانا تیار کرنے کیلئے کافی ہو جائے، اسکو تیار کرتے وقت اسکی گرمی اور دھواں برداشت کر کے، تو اسے چاہیے کہ خادم کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے اپنے ساتھ کھانے کیلئے بٹھادے، اور اگر وہ انکار کرے تو لقمہ لیکر اسے کھلا دے۔

مشکل کلمات کے معنیٰ: - **مملوک:** غلام، خادم، ملازم ج ممالیک۔ **کفی: فلانا الأمر:** کسی معاملے میں کسی کی نیابت کرنا، یعنی اسکا کام خود انجام دینا، اور اسے بے نیاز کر دینا۔ **حرّۃ:** کھانے تیار کرتے وقت کی گرمی۔ **دخانہ:** اسکا دھواں، یہ دونوں لفظ ''طعامہ'' سے بدل ہیں اس وجہ سے منصوب ہیں، اور ''طعامه'' ''کفی'' کا مفعول ثانی ہے، اسلئے وہ منصوب ہے، **فلیقعدہ:** چاہیے کہ اسے اپنے ساتھ

بٹھائے۔ **فلیطعمه**: چاہیے کہ اسے کھلائے۔

اپنے غلام اور خادم کو ساتھ کھلانے کا حکم

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے معاشرت سے متعلق ایک حکم دیا ہے کہ جب کسی کا خادم اسکا کھانا تیار کرے، تو مالک کو چاہیے کہ اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا کر کھانے میں شریک کرے، کیونکہ اس نے کھانا پکاتے وقت اسکی گرمی، دھواں اور ہر قسم کی مشقت اور تھکاوٹ برداشت کی ہے، تو یہ مناسب نہیں کہ انسان اسے نظر انداز کردے، اسلئے خادم کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرنا چاہیئے، لیکن اگر اسے ساتھ کھلانا کسی مصلحت کے خلاف ہو یا کھانا ہی کم ہے تو کم ازکم اسے ایک دو لقمے ہی دیدیے جائیں تاکہ اسکی کچھ نہ کچھ تو دلجوئی ہوجائے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اخلاق حسنہ کی ترغیب ہے اور اس خادم کے ساتھ کھانے میں برابری اور مواساۃ کا حکم ہے جس نے اسے تیار کرنے اور اٹھا کر لانے کی مشقت برداشت کی ہے۔ شرح مسلم للنواوی، کتاب الأیمان، باب صحبۃ الممالیک ۵۲/۲۔

یہ حدیث ان لوگوں کیلئے درس عبرت ہے جو اپنے ملازمین کے ساتھ انتہائی برا سلوک کرتے ہیں، ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ اور سختی کا برتاؤ کرتے ہیں، ان کے کھانے پینے اور ضروریات کا انہیں دھیان نہیں ہوتا، بلکہ بعض حضرات تو ان کے ساتھ کھانا کھانے کو اپنی ہتک اور توہین سمجھتے ہیں، جیسے بعض لوگ سفر میں ڈرائیور سے صرف ڈرائیونگ کا کام لیتے ہیں، اس کے قیام طعام کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی، یہ سب غیر اسلامی طریقے ہیں، سنت یہ ہے کہ اپنے ملازمین کیلئے وہی کچھ پسند کیا جائے جو اپنے لئے انسان پسند کرتا ہے، اسلئے بے رخی کا انداز کسی بھی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

"**فان أبی**" یہ فعل ہے، اسکا فاعل کیا ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ابی" کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(۱)...... یا تو اس ضمیر کا مرجع مالک ہے، معنی یہ ہونگے کہ اگر مالک خادم کو اپنے ساتھ کھلانا نہ چاہے، ناگواری محسوس کرے تو کم ازکم اسے کھانے کے ایک دو لقمے دیدے، اسکی تائید حضرت جابر کی اس روایت سے ہوتی ہے جسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

’’ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم اپنے خادموں کو کھانے پر بلائیں اور اگر ہم میں سے کوئی ان کے ساتھ کھانا پسند نہ کرے تو پھر اسے ایک دو لقمے ہاتھ میں ہی دیدے‘‘

(۲)...... یا اس ضمیر سے مراد خادم ہے کہ اگر خادم مالک کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کیلئے تیار نہ ہو تو بھی اسے اپنے ساتھ بٹھائیں اور کم از کم ایک دو لقمے ہی کھلا دیں۔ فتح الباری، کتاب الأطعمة، باب الأکل مع الخادم، ۹/۲۶۷۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: فَإِنْ كَانَ الطَّعَامُ مَشْفُوهاً قَلِيْلاً فَلْيَضَعْ فِي يَدِهٖ مِنْهُ أُكْلَةً أو أُكْـلَتَيْـنِ، یعنی خادم کو ساتھ بٹھا کر کھلایا جائے لیکن اگر کھانا کم اور کھانے والے زیادہ ہوں تو پھر خادم کے ہاتھ میں ایک دو لقمے ہی دیدیے جائیں۔ صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة المممالیک ۲/۵۲۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ کھانا جب زیادہ ہو تو پھر خادم کو ساتھ بٹھا کر ضرور کھلایا جائے، اور اگر اسے ساتھ بٹھانا ناگوار ہو یا وہ مالک کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہتا تو پھر اسے ایک دو لقمے نہیں بلکہ وافر مقدار میں کھانا دیدیا جائے تا کہ سیراب ہو کر کھا سکے۔ فتح الباری ۹/۲۶۷

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ فَضْلِ إِطْعَامِ الطَّعَامِ

یہ باب کھانا کھلانے کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَفْشُوْا السَّلاَمَ وَأَطْعِمُوْا الطَّعَامَ، وَ اضْرِبُوْا الْهَامَ تُوْرَثُوْا الْجِنَانَ.

حضرت ابوھریرۃ ؓ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور (کافروں کی) کھوپڑیاں (یعنی انکے سر) مار دو، تو تمہیں جنت کا وارث بنادیا جائیگا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَأَفْشُوْا السَّلاَمَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ.

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رحمٰن کی عبادت کرو، لوگوں

کو کھانا کھلاؤ، اور سلام پھیلاؤ تو جنت میں تم سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ افشوا السلام: سلام پھیلاؤ، عام کرو۔ الھام: یہ ھامۃ کی جمع ہے، کھوپڑی، سر، یہاں کفار کی کھوپڑیاں مراد ہیں۔ تُوْرَثُوا: یہ جمع مذکر حاضر مضارع مجہول کا صیغہ ہے، اور جواب امر ہونے کی وجہ سے حالت جزم میں ہے، اسی وجہ سے انکا نون اعرابی حذف ہو گیا ہے، تمہیں وارث بنا دیا جائیگا۔ الجِنَان: یہ الجنة کی جمع ہے: جنت، آخرت کی نعمتوں کا گھر، مومنین کا ٹھکانا۔

کھانا کھلانے کی فضیلت

مذکورہ احادیث میں چند ایسی چیزیں ذکر کی گئی ہیں جنہیں کرنے سے آدمی جنت میں داخل ہو جاتا ہے جبکہ دیگر فرائض و واجبات کو وہ پابندی کے ساتھ بجالائے، سلام کو پھیلانا، غرباء کو کھانا کھلانا، میدان جہاد میں کافروں کو مارنا، اور رحمٰن کی عبادت کرنا، یہ وہ چند امور ہیں جنکی ادائیگی سے آدمی جنت کا وارث بن سکتا ہے اور امن وسکون کے ساتھ بغیر کسی خوف کے جنت میں داخل ہو سکتا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ فَضْلِ الْعَشَاءِ

یہ باب رات کے کھانیکی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَعَشَّوْا وَلَوْ بِكَفٍّ مِنْ حَشَفٍ، فَإِنَّ تَرْكَ الْعَشَاءِ مَهْرَمَةٌ.

انس بن مالک کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رات کا کھانا کھایا کرو، اگرچہ خراب اور ردی کھجور کی ایک مٹھی ہی کیوں نہ ہو (اسی کو کھا لیا کرو)، اسلئے کہ رات کا کھانا چھوڑنا بڑھاپا (طاری کرتا) ہے۔

مشکل کلمات کے معنیٰ:۔ العَشاء: (عین پر زبر کے ساتھ) رات کا کھانا، ڈنر۔ تَعَشَّوْا: تم رات کا کھانا کھاؤ۔ حَشَف: (حاء اور شین پر زبر کے ساتھ) خراب کھجوریں جو پکنے سے پہلے سوکھ جاتی ہیں، ان میں نہ گٹھلی ہوتی ہے، اور نہ گودا، نہ چھلی، نہ مٹھاس۔ مَهْرَمَة: (میم پر زبر اور ہاء کے سکون کے ساتھ) بڑھاپے کی

آخری منزل کو پہونچنا، کمزور اور بوڑھا ہونا۔

رات کے کھانیکی فضیلت

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ رات کا کھانا اہتمام سے کھانا چاہیے، کیونکہ رات کے کھانے کو صحت کے صحیح رہنے میں بڑا اثر ہوتا ہے، اور کھانے کی کوئی بھی چیز کھائی جاسکتی ہے، بہت عمدہ اور اعلیٰ قسم کا کھانا کھانا ضروری نہیں، ولو بكف من حشف سے اسطرف اشارہ فرمادیا کہ بہت معمولی سی چیز کھانے سے بھی یہ سنت ادا ہوجائیگی، رات کا کھانا ترک کرنا آدمی کو بڑھاپے تک پہونچادیتا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ

یہ باب کھانا کھانے پر بسم اللہ...... پڑھنے کے بارے میں ہے

عَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَعِنْدَهُ طَعَامٌ، قَالَ: اُدْنُ يَا بُنَيَّ، فَسَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ.

عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے، اس وقت آپ کے سامنے کھانا لگا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے میرے چھوٹے بیٹے: قریب ہوجاؤ، اللہ کا نام لو، اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے قریب سے کھاؤ۔

عَنْ أَبِيْهِ عِكْرَاشَ بْنِ ذُوَيْبٍ قَالَ: بَعَثَنِيْ بَنُوْ مُرَّةَ بْنُ عُبَيْدٍ بِصَدَقَاتِ أَمْوَالِهِمْ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَدِمْتُ عَلَيْهِ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدْتُهُ جَالِسًا بَيْنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ، قَالَ: ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِيْ فَانْطَلَقَ بِيْ إِلٰى بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ فَقَالَ هَلْ مِنْ طَعَامٍ؟ فَأُتِيْنَا بِجَفْنَةٍ كَثِيْرَةِ الثَّرِيْدِ وَالْوَذْرِ فَأَقْبَلْنَا نَأْكُلُ مِنْهَا، فَخَبَطْتُ بِيَدِي فِيْ نَوَاحِيْهَا وَأَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ، فَقَبَضَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى عَلٰى يَدِي الْيُمْنٰى ثُمَّ قَالَ يَا عِكْرَاشُ: كُلْ مِنْ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ فَإِنَّهُ طَعَامٌ وَاحِدٌ، ثُمَّ أُتِيْنَا بِطَبَقٍ فِيْهِ أَلْوَانُ التَّمْرِ أَوِ

الرُّطَبِ،شَكَّ عُبَيْدُ اللّٰهِ،فَجَعَلْتُ آكُلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَجَالَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ الطَّبَقِ،قَالَ يَا عِكْرَاشُ : كُلْ مِنْ حَيْثُ شِئْتَ فَإِنَّهُ غَيْرُ لَوْنٍ وَاحِدٍ،ثُمَّ أُتِيْنَا بِمَاءٍ فَغَسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَدَيْهِ وَمَسَحَ بِبَلَلِ كَفَّيْهِ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ وَرَأْسَهُ،وَقَالَ:يَا عِكْرَاشُ: هٰذَا الْوُضُوْءُ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ.

عکراش بن ذؤیب سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ مجھے بنو مرہ نے اپنے اموال کی زکوۃ و صدقات دے کر آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا،جب میں مدینہ منورہ پہونچا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو مہاجرین اور انصار کے درمیان تشریف فرما پایا،راوی کہتے ہیں: پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ مجھے حضرت ام سلمہ کے گھر لے گئے،آپ نے فرمایا (یعنی پوچھا) کیا کھانے کی کوئی چیز ہے؟ پھر ہمارے پاس کھانے کا بڑا پیالہ لایا گیا جس میں زیادہ ثرید اور گوشت کے ٹکڑے تھے،ہم اس میں سے کھانے لگے،میں نے ہاتھ کو پیالے کے اطراف میں مارنا شروع کردیا،جبکہ رسول اکرم ﷺ اپنے سامنے سے کھا رہے تھے،حضور اکرم ﷺ نے میرے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا،اے عکراش:ایک جگہ سے کھاؤ،اسلئے کہ یہ ایک قسم کا کھانا ہے،پھر ہمارے پاس ایک ٹرے (طشتری) لائی گئی،جس میں مختلف قسم کی پکی یا کچی کھجوریں تھیں،راوی عبید اللہ کو شک ہے (کہ تمر کا لفظ فرمایا یا رطب کا) میں اپنے سامنے سے کھا رہا تھا،اور رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ تھال/طشتری کے (چاروں طرف) گھوم رہے تھے،آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عکراش! اب تم جہاں سے چاہو،کھا سکتے ہو کیونکہ یہ مختلف قسم کے کھانے ہیں،پھر ہمارے پاس پانی لایا گیا،اس سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے،اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کی تری کو اپنے چہرے،کہنیوں اور سر پر پھیر لیا،اور فرمایا اے عکراش! یہ وضو اس کھانے کی وجہ سے ہے جو آگ پر پکایا گیا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ،فَإِنْ نَسِيَ فِيْ أَوَّلِهٖ فَلْيَقُلْ: بِسْمِ اللّٰهِ فِيْ أَوَّلِهٖ وَآخِرِهٖ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے

چاہیے کہ بسم اللہ پڑھے، اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو پھر بسم اللہ فی اولہ وآخرہ (شروع اللہ کے نام سے کھانے کے شروع اور آخر میں) پڑھے۔

وَبِهٰذَا الْإِسْنَادِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ : كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْكُلُ طَعَاماً فِي سِتَّةٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَجَاءَ اَعْرَابِيٌّ فَاَكَلَهُ بِلُقْمَتَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اَمَا اَنَّهٗ لَوْ سَمّٰى لَكَفَاكُمْ .

اور اسی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے منقول ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چھ صحابہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، اتنے میں ایک بدو آیا، اس نے دو لقموں میں ہی وہ (سارا کھانا) کھالیا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاتا تو یہ کھانا سب کے لئے کافی ہو جاتا۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔ادن یا بنیّ: اے میرے چھوٹے بیٹے: قریب ہو جاؤ۔ مما یلیک: جو آپ کے قریب ہو۔ جفنة: بڑا پیالہ، ڈونگا، ج جفان۔ الثريد: روٹی کو چور کر شوربے میں بھگو کر بنایا ہوا ایک قسم کا کھانا۔ اَلْوَذْر: (واؤ پر زبر اور ذال کے سکون کے ساتھ) اَلْوَذْرَة کی جمع ہے: ہڈی کے بغیر گوشت کی بوٹی۔ اَقْبَلْنَا: ہم (کھانے پہ) لگ گئے، متوجہ ہو گئے۔ خبطت: میں ہاتھ مارنے لگا، پھیرنے لگا۔ طبق: پلیٹ، طشتری، تھال ج أطباق، طِبَاق۔

عمر بن ابی سلمہ

ابو سلمہ کا نام عبد اللہ ہے، عمر، انکے بیٹے ہیں، ابو سلمہ کی جب وفات ہوئی تو انکی اہلیہ "ام سلمہ" کی شادی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہوگئی، یوں وہ ازواج مطہرات میں شامل ہوگئیں، اور "عمر" حضور اکرم ﷺ کی پرورش میں آگئے، ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ عمر کی ولادت ہجرت کے دوسرے سال حبشہ میں ہوئی۔ اور جب آپ ﷺ کا دنیا سے انتقال ہوا تو حضرت عمر کی عمر نو سال تھی، پھر عبد الملک بن مروان کے عہد میں ۸۳ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی، حضور اکرم ﷺ سے بہت سی روایات کو یاد کیا، اور پھر ان سے بہت سے راویوں نے احادیث روایت کی ہیں۔ عمدة القاری، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين ۲۱/۲۹، مرقاة المفاتيح، ابواب الاطعمة، الفصل الاول ۸/۵۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق ان کی ولادت ہجرت سے دو سال پہلے ہوئی ہے، واللہ اعلم۔ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب التسمیۃ علی الطعام ۶۵۱/۹

کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم

بعض حضرات کے نزدیک کھانے کی ابتداء میں "بسم اللہ" پڑھنا واجب ہے، ان کا استدلال حدیث باب سے ہے، جس میں صیغہ امر ہے جو وجوب کیلئے ہوتا ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے، اور حدیث میں صیغہ امر وجوب کیلئے نہیں، بلکہ استحباب کیلئے ہے۔

"بسم اللہ" کے بارے میں اس باب کی تیسری حدیث زیادہ واضح اور صریح ہے، اس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو ابتداء میں بسم اللہ پڑھے اور اگر ابتداء میں پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے درمیان یا آخر میں جب یاد آجائے تو یہ کلمات "بسم اللہ فی اولہ واخرہ" کہہ لے۔

صرف "بسم اللہ" کے الفاظ کہہ دینا بھی کافی ہے، لیکن اگر پوری بسم اللہ پڑھی جائے تو زیادہ بہتر ہے، اسی طرح بلند آواز سے پڑھنا مستحب ہے تاکہ دوسروں کو بھی یاد آجائے۔

جب بسم اللہ پڑھکر کھانا شروع کیا جائے تو اس میں شیطان شریک نہیں ہوتا، اس کھانے میں برکت ہوجاتی ہے، ایسی صورت میں تھوڑا کھانا بھی بہت سے لوگوں کیلئے کافی ہوجاتا ہے، اور اگر بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کیا جائے تو شیطان بھی اس میں شریک ہوجاتا ہے، اور اس کھانے میں برکت نازل نہیں ہوتی، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسی باب میں حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چھ صحابہ کے ساتھ کھانا تناول فرمارہے تھے، اس دوران ایک بدو بسم اللہ پڑھے بغیر کھانے میں شریک ہوگیا اور دو لقموں میں ہی اسے کھالیا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتے تو یہ کھانا تم سب کیلئے کافی ہوجاتا، اور ختم نہ ہوتا۔ الکوکب الدری ۲۷/۳

یہ ایک خاص واقعہ ہے، کہ جس میں بسم اللہ کے بغیر اتنی بے برکتی ہوگئی کہ دو لقموں میں ہی وہ کثیر طعام ختم ہوگیا، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ آج بھی ایسا ہی ہوجائے، مقصود اس روایت سے یہ ہے کہ بسم اللہ

کے بغیر کھانے میں بے برکتی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے کھانے کے شروع میں بسم اللہ کا اہتمام کرنا چاہئے۔

جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر ایک دسترخوان پر کئی آدمی بیٹھیں، تو سب لوگ الگ الگ بسم اللہ پڑھیں، چنانچہ اس کی تائید اس باب کی آخری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں وہ دیہاتی بعد میں کھانے میں بسم اللہ پڑھے بغیر شریک ہو گیا تھا پھر بھی اس کھانے میں بے برکتی پیدا ہو گئی حالانکہ دوسرے ساتھیوں نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا تھا، جبکہ بعض علماء کے نزدیک جن میں حضرت امام شافعی بھی شامل ہیں، محض ایک آدمی کا بسم اللہ پڑھ لینا سب کیلئے کافی ہو جائیگا۔

پانی، دوا، اور مشروبات وغیرہ پینے کے وقت بسم اللہ پڑھنے کا بھی وہی حکم ہے جو کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا ہے۔

دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دائیں ہاتھ سے کھانا واجب ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں بائیں ہاتھ سے کھانے پر وعیدیں آئی ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا، آپ نے اسے فرمایا: اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اس نے کہا کہ میں (دائیں ہاتھ سے کھانے کی) طاقت نہیں رکھتا، وہ محض تکبر کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے نہیں کھا رہا تھا، آپ ﷺ نے اسے بددعا دی کہ تجھے کبھی طاقت نہ ہو، اسکا اثر تھا کہ ساری زندگی وہ شخص اپنا دایاں ہاتھ منہ کیطرف نہ اٹھا سکا۔

مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بائیں ہاتھ سے کھائے تو شیطان بھی اسکے ساتھ کھاتا ہے۔

اسی طرح طبرانی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک دن سبیعہ اسلمیہ کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھا تو اسکے لئے بددعا فرمائی، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بعد میں طاعون میں مبتلا ہو کر مر گئیں۔

لیکن جمہور علماء کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے کا حکم وجوب کے طور پر نہیں ہے، بلکہ یہ حکم استحباب کے طور پر ہے، حضرات شافعیہ کا مشہور مسلک بھی یہی ہے چنانچہ امام غزالی اور امام نووی رحمہما اللہ نے

اسی کو اختیار کیا ہے۔

وعید کی مذکورہ روایات کو جمہور زجر و تنبیہ اور مصالح شریعت پر محمول کرتے ہیں۔

یہ ذہن میں رہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانے کا یہ استحباب اس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو، لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے کھانا ممکن نہ ہو مثلاً دائیں ہاتھ میں زخم وغیرہ ہو، تو ایسی صورت میں بائیں ہاتھ سے کھایا جا سکتا ہے، اور اس میں کوئی کراہت بھی نہیں۔

اپنے سامنے سے کھانے کا حکم اور اس میں تفصیل

حدیث باب میں تیسرا حکم نبی کریم ﷺ نے یہ دیا کہ اپنے آگے سے کھایا جائے، پلیٹ میں ہاتھ ادھر ادھر نہ گھمایا جائے۔

جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم مستحب ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کھانا ایک قسم کا ہو، اور اگر کھانے مختلف انواع و اقسام کے ہوں تو پھر بغیر کسی کراہت کے ہاتھ ادھر ادھر بڑھایا جا سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، یہ حکم اس باب کی دوسری روایت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے، جس میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت عکراش سے فرمایا جب وہ پلیٹ میں ہاتھ ادھر ادھر گھما رہے تھے، کہ تم اپنے سامنے سے کھاؤ، کیونکہ یہ ایک قسم کا کھانا ہے، پھر جب طشتری اور ٹرے لائی گئی جس میں پختہ اور نیم پختہ کھجوریں تھیں، تو حضرت عکراش اپنے سامنے سے ہی کھانے لگے، تو آپ ﷺ نے حضرت عکراش سے فرمایا کہ تم اس پلیٹ اور تھال میں جہاں سے چاہو کھا سکتے ہو، کیونکہ یہ مختلف قسم کی کھجوریں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کھانے مختلف قسم کے ہوں تو پھر پلیٹ میں ہاتھ ادھر ادھر بھی گھمایا جا سکتا ہے۔

وَقَالَ: يَاعِكْرَاشُ هٰذَا الْوُضُوْءُ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ

اس وضو سے نماز والا وضو مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے ہاتھ دھونا اور کلی کرنا مراد ہے، اور یہ کھانے کے بعد مستحب اور مسنون ہے، عمدۃ القاری، ۲۱/۲۸، ۲۹۔ فتح الباری، ۹/۶۵۱، ۶۵۳۔ مرقاۃ المفاتیح، ابواب الأطعمة، الفصل الاول ۸/۵، ۸۔ شرح مسلم للنواوی، کتاب الاشربة، باب آداب الطعام والشراب ۲/۱۷۱، ۱۷۲۔

احادیث باب سے چند آداب کا ثبوت

باب کی احادیث اور اس سلسلے میں ذکر کردہ دوسری روایات سے درج ذیل چند آداب ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا۔

(۲)......دائیں ہاتھ سے کھانا۔

(۳)......اور اپنے سامنے سے کھانا، جبکہ کھانا ایک ہی قسم کا ہو، اور جب مختلف قسم کے کھانے اور چیزیں ہوں تو پھر اپنے سامنے سے ہی کھانا ضروری نہیں، ادھر ادھر بھی ہاتھ گھمایا جا سکتا ہے۔

(۴)......بسم اللہ پڑھکر کھانا شروع کیا جائے تو اس میں برکت ہو جاتی ہے۔

(۵)......ان کاموں سے اجتناب ضروری ہے جو شیطان اور کافروں کے مشابہہ ہوں۔

(۶)......جو شخص شرعی حکم کے خلاف کرے، اس کیلئے بددعا کا جواز۔

(۷)......دورانِ طعام نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا جائز ہے۔

(۸)......کھانے پینے کے آداب کی تعلیم مستحب ہے۔ فتح الباری، ۶۵۳/۹

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْبَيْتُوْتَةِ وَفِيْ يَدِهٖ رِيْحُ غَمَرٍ

یہ باب رات گذارنے یعنی سونے کی کراہت کے بارے میں ہے جبکہ ہاتھ پر چکناہٹ ہو۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ الشَّيْطَانَ حَسَّاسٌ لَحَّاسٌ، فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ، مَنْ بَاتَ وَفِيْ يَدِهٖ رِيْحُ غَمَرٍ فَأَصَابَهُ شَيْءٌ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ.

حضرت ابوھریرۃؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک شیطان بڑا باشعور اور (گوشت یا چربی لگے ہوئے ہاتھ کو) خوب چاٹنے والا ہے، لہذا اس سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو، جو شخص اس حال میں رات گذارے کہ اسکے ہاتھ میں چکنائی (اور کھانے کی بو) ہو (کہ کھانے کے بعد اس نے اسکو دھویا نہ ہو) اور پھر اسے

کوئی ضرر پہونچ جائے، (مثلاً کوئی کیڑا وغیرہ اسے کاٹ لے) تو وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے، (کیونکہ اس تکلیف کا سبب خود اسکی غلطی اور غفلت ہے)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ بَاتَ وَفِیْ یَدِهٖ رِیْحُ غَمَرٍ فَأَصَابَهُ شَیْءٌ فَلَا یَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں رات گذارے کہ اسکے ہاتھ میں چکنائی لگی ہوئی ہو، (اور اس نے دھویا نہ ہو) اور پھر اسکی وجہ سے اسے کوئی تکلیف پہونچ جائے، تو وہ بس اپنے ہی کو ملامت کرے۔

مشکل کلمات کے معنیٰ: ۔البیتوتة: رات گذارنا، سونا۔ غَمَرٌ: (غین اور میم پر زبر کے ساتھ) چکناہٹ، چربی اور گوشت وغیرہ کی بو۔ حَسَّاس: بہت جلدی محسوس کرنے والا، باشعور۔ لَحَّاس: زبان یا انگلی سے خوب چاٹنے والا۔ احذروہ: تم اپنے آپ کو شیطان سے بچا کر رکھو۔ فأصابه شيء: پھر اسے کوئی تکلیف دہ چیز پہونچ جائے یعنی نیند میں اسے کوئی کیڑا کاٹ لے اور اسے ضرر پہونچ جائے۔

کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر سونا مکروہ ہے

کھانے کے بعد ہاتھ دھونا مستحب ہے، تاکہ ہاتھوں پر لگی ہوئی چکنائی اور کھانے کی بو زائل ہو جائے، اور جب سونے کا ارادہ ہو تو پھر اور اہتمام کے ساتھ ہاتھوں کو صابن وغیرہ سے دھو کر صاف کر لینا چاہیے، کیونکہ اگر ہاتھوں پر چکنائی باقی رہے تو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی کیڑا اور موذی جانور یا کوئی جن انسان کو تکلیف پہونچائے، اگر ایسا ہو جائے تو یہ اسکی اپنی غفلت اور کوتاہی کا نتیجہ ہوگا، ایسے میں وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے۔

اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جو شخص ہاتھ دھوئے بغیر سو جائے تو وہ برص کی بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے، طبرانی نے ''اوسط'' میں حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں رات گذارے کہ اسکے ہاتھ میں چکنائی لگی ہوئی ہو، اور پھر اسے برص کی بیماری لگ جائے تو وہ اپنے

کو ہی ملامت کرے۔

ان الشیطان حساس لحاس اس سے مراد یہ ہے کہ شیطان کی حس بہت تیز ہے، اسے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اسکے ہاتھ پر چکنائی ہے، پھر اسے وہ چاٹتا ہے، لہذا اس سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو، اور "**فاصابه شيئ**" میں "**شيئ**" سے مراد ہر وہ چیز ہے جو نقصان دہ ہو، خواہ وہ موذی جانور اور حشرات الارض ہوں یا جنات اور شیطان، ان تمام سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ دھوئے بغیر نہ سویا جائے۔

تحفة الاحوذی، ابواب الأطعمة، باب ما جاء فی کراهية البيتوتة وفی يده غمر، ۴۸۵/۵۔

بحمد اللہ ۲۰ شعبان ۱۴۲۵ھ، ۶ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں یہ پورا ہوا۔

أبواب الأشربة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

رسول اللہ ﷺ سے مشروبات یعنی پینے کی چیزوں کے (آداب واحکام کے بارے میں) یہ ابواب ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ شَارِبِ الْخَمْرِ

یہ باب شراب خور کے (حکم اور وعید کے) بارے میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِيْ الدُّنْيَا فَمَاتَ وَهُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَشْرَبْهَا فِيْ الآخِرَةِ.

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز شراب (کے حکم) میں ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے، اور جس نے دنیا میں شراب پی اور پھر اسی عادت میں (توبہ کے بغیر) مرگیا تو آخرت میں شراب پینے سے محروم رہے گا۔

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَإِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَإِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَإِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِنْ عَادَ الرَّابِعَةَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَإِنْ تَابَ لَمْ يَتُبِ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَقَاهُ مِنْ نَهْرِ الْخَبَالِ، قِيْلَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَمَا نَهْرُ الْخَبَالِ؟ قَالَ: نَهْرٌ مِنْ صَدِيْدِ أَهْلِ النَّارِ.

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے شراب پی تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہ ہوں گی، ہاں اگر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا پھر اگر وہ دوبارہ شراب پینے لگے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نماز قبول نہیں کرے گا، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا، پھر اگر وہ چوتھی مرتبہ شراب

پینے لگے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں کرے گا، اب اگر وہ توبہ بھی کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا، اور اس کو ''نہر خبال'' سے پلائے گا، کسی نے پوچھا اے ابوعبدالرحمٰن ''نہر خبال'' کیا چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ اہل جہنم کی پیپ کا دریا ہے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- **الاشربة** : شراب کی جمع ہے: پینے کی چیز، شربت، مشروب، شراب۔ **مسکر** : نشہ آور چیز۔ **خمر** : (خاء پر پیش اور میم کے سکون کے ساتھ) انگور وغیرہ کا نشہ آور رس ج خمور۔ **یدمنها** : (یاء پر پیش، دال ساکن اور میم کے نیچے زیر) وہ شراب کا عادی ہے۔ **اربعین صباحاً** : چالیس دن۔ **نهر الخبال** : اہل جہنم کی پیپ کا دریا۔

دنیا میں شراب پینے والا آخرت میں شراب سے محروم رہے گا

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے شراب پینے سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے ام الفواحش کہا گیا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں کئی مقامات پر شراب خوری سے روکا گیا ہے، اور جو شخص شراب پینے کا خوگر ہو جائے اور توبہ بھی نہ کرے تو اس کے بارے میں سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں چند احادیث شراب خوری کی وعید سے متعلق ذکر کی ہیں۔

پہلی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی چیز نشہ آور ہو وہ شراب کے حکم میں ہے، لہٰذا وہ حرام ہے، اور فرمایا کہ جو شخص دنیا میں شراب کا عادی ہو، اور توبہ کے بغیر مر جائے تو وہ آخرت میں شراب نہیں پی سکے گا۔

لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ : اس جملے کے دو مطلب ہیں۔

۱)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص شراب پینے کا عادی ہو، اگر توبہ کے بغیر ہی مر جائے تو وہ اگر چہ معافی کے بعد جنت میں داخل ہو جائے، اسے جنت میں شراب نہیں ملے گی۔

یہ درست ہے کہ جنت میں ہر خواہش پوری ہوگی، کیوں کہ اہل جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وفیھا ما تشتھیه الانفس۔ لیکن یہ شخص یا تو اپنی اس خواہش کو بھول جائے گا، یا اس سے جنت میں شراب پینے کی خواہش سلب کردی جائے گی، گویا دنیا میں شراب خوری کے جرم میں جنت میں شراب پینے کی نعمت سے محروم رہے گا۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب عقوبۃ من شرب الخمر ۱۶۸/۲۔

اس کی تائید حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث مرفوع سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

" مَنْ لَبِسَ الْحَرِيرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ ، وَإِنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ . لَبِسَهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ وَلَمْ يَلْبَسْهُ هُوَ "

"جس نے دنیا میں ریشم پہنا تو وہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا، اور اگر وہ جنت میں داخل ہو جائے تو اور جنتی لوگ تو ریشم پہنیں گے، لیکن یہ شخص نہیں پہن سکے گا"

اسی مفہوم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث مرفوع ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِي وَهُوَ يَشْرَبُ الْخَمْرَ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ شُرْبَهَا فِي الْجَنَّةِ "

(میری امت میں سے جو کوئی اس حال میں مرے کہ وہ شراب پیتا ہو (اور اس نے توبہ بھی نہ کی ہو) تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت میں شراب کو حرام کردے گا)

فتح الباری کتاب الاشربۃ، باب قول اللہ تعالیٰ انما الخمر والمیسر .... ۳۹/۱۰، ۴۰

۲) علامہ خطابی اور بغوی نے "شرح السنۃ" میں اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا، کیوں کہ شراب اہل جنت کا مشروب ہے، جو اس سے محروم کردیا جائے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

فتح الباری کتاب الاشربۃ، باب قول اللہ تعالیٰ انما الخمر و المیسر .... ۳۹/۱۰، ۴۰

اس دوسرے مطلب پر اشکال ہوتا ہے کہ شراب خوری ایک گناہ کبیرہ ہے، اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا بہر حال جنت میں یا تو ابتداءً داخل ہوگا، اگر اللہ تعالیٰ درگذر فرمادیں، یا اپنے گناہ کی سزا بھگتنے کے بعد، تو پھر اس شراب کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہونے کا حکم کیوں لگایا گیا؟

اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں:

۱)...... جنت میں عدم دخول کا حکم اس شخص کے متعلق ہے جو شراب کو حلال سمجھ کر پیتا ہو، اور شراب کو حلال سمجھنے والا چونکہ کافر ہے، اس لئے ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

۲)...... یا اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص ابتداءً جنت میں داخل نہیں ہوگا، وہ اس گناہ کی سزا کاٹے گا، سزا بھگتنے کے بعد پھر جنت میں جائے گا، حدیث میں سزا بھگتنے کی مدت کو جنت میں داخل نہ ہونے سے ذکر کیا گیا ہے۔ **بذل المجهود ، كتاب الاشربة ، باب ما جاء في السكر ۱۶/۱۴ ، تكمله فتح الملهم ۳/۶۴۰**

۳)...... حدیث کا یہ جملہ صرف ڈرانے دھمکانے اور زجر ووعید کے لئے ہے، تاکہ مسلمان شراب خوری سے محفوظ رہیں، اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الحدود، باب بیان الخمر ووعید شار بھا ۷/۲۳۰۔ مکتبہ حقانیہ پشاور۔

شراب خور کی نماز قبول نہیں

جو شخص شراب پیئے اور پھر اس سے توبہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں فرماتے یعنی اسے ثواب نہیں ملتا گو اس کی فرض نماز ادا ہو جائیگی، توبہ کے بعد اگر دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب کر لے تو پھر اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوگی، اسی طرح توبہ توڑتے توڑتے اگر چوتھی بار بھی اس کا ارتکاب کرلے تو نہ صرف یہ کہ اس کی نماز چالیس دن تک قبول نہیں ہوگی بلکہ اب کی بار اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی اور آخرت میں دوزخیوں کی پیپ کی نہر سے اسے پلایا جائے گا۔

"توبہ کا قبول نہ ہونا" یہ زجر اور وعید کے طور پر ہے، تاکہ اس گناہ کی قباحت اس کے سامنے مزید واضح ہو جائے، ورنہ توبہ کا قبول ہونا دیگر احادیث میں منقول ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے گناہ کے بعد استغفار کرلیا، اس نے گناہ میں اصرار نہیں کیا اگر چہ وہ دن میں ستر بار بھی ایسا کرے"

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص بار بار شراب پیتا ہے، تو اسے حقیقی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، گناہ کے اسی اصرار پر وہ مرجاتا ہے، اور توبہ سے محروم رہتا ہے، اور پھر آخرت میں سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اسے اہل جہنم کی پیپ پلائیں گے۔

حدیث میں خاص طور پر شراب خور کی نماز کا ذکر کیا کہ وہ قبول نہیں ہوگی، اس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب نماز جیسی عبادت قبول نہیں ہوتی جو تمام بدنی عبادتوں سے افضل اور ممتاز ہے تو دوسری عبادتیں بطریق اولیٰ قبول نہیں ہونگی۔

''چالیس دن'' کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ یہ مدت انسان کے مزاج اور چال چلن کی تبدیلی میں اثر انداز ہوتی ہے، اور انسان کے نظام تخلیق میں انقلاب بھی ہر چالیس دن کے بعد ہوتا ہے، یہ ایام اگر آدمی نیک کام میں گذارے یا کوئی نیک عمل چالیس دن تک پابندی کے ساتھ کرے تو اس کی طبیعت ہر نیکی کے کام سے مانوس اور برائی سے بیزار ہو جاتی ہے اور نیکی کرنے کا اس میں جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح برے کام کا معاملہ ہے کہ اتنا عرصہ اگر اسے اہتمام سے کیا جائے تو انسان گمراہی پر پختہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے میں بھی اربعین لیلۃ کا ذکر ہے، یہ آیت اور وہ تمام احادیث جن میں چالیس یوم کی تخصیص کے ساتھ کوئی حکم بیان کیا گیا ہے اہل تصوف اور تبلیغی جماعت والوں کا مأخذ ہیں ان کی بنیاد پر وہ اصلاح وتربیت کے لئے مجاہدے کراتے ہیں، الکوکب الدری ابواب الاشربۃ باب ماجاء فی شارب الخمر ......۳/۳۱۔

اور حدیث میں چالیس دن کی تخصیص ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ شراب خور کے باطن میں شراب کا اثر مختلف نوعیتوں سے اتنی ہی مدت تک رہتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الحدود باب بیان الخمر ۷/۲۳۳

اربعین صباحاً۔ اس سے بظاہر نماز صبح مراد ہے کیونکہ یہ تمام نمازوں سے افضل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''صباحا'' سے یوم مراد ہو یعنی چالیس دن تحفۃ الاحوذی ۵/۴۸۹۔ اکثر شارحین حدیث نے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں۔ الکوکب الدری ۳/۳۱۔

حرمت شراب سے متعلق آیات

شراب کی حرمت سے متعلق قرآن مجید کی چار آیات بتدریج نازل ہوئی ہیں، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت فاروق اعظم، معاذ بن جبل اور چند انصاری صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شراب اور جوے کی خرابیاں اور مفاسد ذکر کئے کہ

ان سے عقل میں بھی فتور آتا ہے اور مال بھی ضائع ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ اس کے جواب میں سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ نازل ہوئی:

یسئلونک عن الخمر والمیسر، قل فیھما إثم کبیر و منافع للناس، واثمھما اکبر من نفعھما

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے ان میں (دنیاوی) فائدے بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے''

یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب چھوڑنے کا صرف مشورہ دیا گیا ہے، اسے حرام قرار نہیں دیا گیا، یہ گویا حرمت شراب کی تمہید اور اسکا ابتدائی اقدام تھا، اس آیت کے نزول کے بعد بعض صحابہ کرام نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے فوراً شراب چھوڑ دی، جبکہ بعض صحابہ مفاسد سے کنارہ کش ہو کر اسکا استعمال کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام میں سے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا، سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امامت کیلئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورہ قل یاایھا الکافرون کو غلط پڑھا، اس موقع پر سورہ نساء کی آیت نمبر ۴۳ نازل ہوئی:

یا یھا الذین امنوا لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاری.

اے ایمان والو: تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جامع الترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ النساء ۲/۱۳۲

یہ حرمت شراب سے متعلق دوسری آیت ہے جس میں صرف نماز کے اوقات میں شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اسکی اجازت رہی پھر ایک واقعہ پیش آیا جس میں حضرت عتبان بن مالک نے چند صحابہ کرام کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاص بھی تھے، کھانے کے بعد شراب پی گئی، اسی میں حضرت سعد نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں انصار مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح وثناء کی، اسپر ایک انصاری نوجوان کو

غصہ آ گیا، اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعد کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس انصاری نوجوان کی شکایت کی، اس وقت آپ ﷺ نے دعاء فرمائی: اَللّٰهُمَّ بَيِّن لَّنَا فِي الْخَمْرِ بَيَاناً شَافِياً "یا اللہ شراب کے بارے میں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرمادے"

اسپر شراب کے متعلق سورہ مائدہ کی تیسری اور چوتھی آیت نازل ہوئی، جن میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے۔

یا یھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون،انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوۃ فھل انتم منتھون.

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر، یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں، ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کردے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو کیا اب باز آؤ گے (یعنی اب بھی باز آجاؤ)

یہ شراب کے بارے میں تیسرا حکم ہے جس میں واضح انداز سے شراب کو حرام قرار دیا گیا، جبکہ پہلے اور دوسرے حکم میں صاف طور پر ممانعت نہیں فرمائی گئی معارف القرآن، سورۃ بقرہ، ۱/۵۲۱۔۵۲۳

سورہ مائدہ کی ان دو آیات میں حرمت شراب کے سات دلائل ہیں:

(۱)......شراب کو "رجس" کہا ہے یعنی گندگی، اور شریعت میں رجس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲)......"**من عمل الشیطان**" جو عمل شیطانی ہو وہ حرام ہوتا ہے۔

(۳)......لفظ فاجتنبوہ صیغہ امر ہے، اور امر وجوب کیلئے آتا ہے نیز جس چیز سے اللہ تعالیٰ اجتناب کا حکم دیں

تو وہ حرام ہوتی ہے۔

(۴)......لعلکم تفلحون ،اس میں فلاح موقوف ہے شراب وغیرہ سے اجتناب کے ساتھ،اور جس چیز کے اجتناب کے ساتھ فلاح وابستہ ہو،اسے کرنا حرام ہوتا ہے۔

(۵)......انما یرید الشیطان..........فی الخمر والمیسر ،جو چیز مسلمانوں میں بغض اور عداوت کا ذریعہ ہو وہ حرام ہوتی ہے۔

(۶)......ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوۃ وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روکے،وہ حرام ہے۔

(۷)......فهل انتم منتهون اس میں سوالیہ انداز سے حکم دیا گیا ہے کہ اس کام سے باز آجاؤ، کیونکہ یہ حرام ہے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک اور دلیل بھی اس آیت میں موجود ہے جس سے شراب کی حرمت مستفاد ہوتی ہے،اور وہ یہ کہ شراب کو اس آیت میں بتوں کے ساتھ ذکر کیا ہے،جس سے معلوم ہوا کہ بت پرستی کی طرح شراب بھی حرام ہے جیسا کہ ایک حدیث میں یوں منقول ہے:شارب الخمر کعابد الوثن شراب خور بت پرست کیطرح ہے۔مرقاۃ المفاتیح،کتاب الحدود،باب بیان الخمر ووعید شاربھا ۲۳۷/۷۔

مذکورہ صریح دلائل کے باوجود بعض ''دانشور'' مغربی تہذیب سے متأثر ہوکر یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے شراب کو کہاں حرام قرار دیا ہے،ان کے نزدیک یہ دلائل کافی نہیں ہیں،ان کی یہ فکر محض تعصب، جہالت اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے،جس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں حرمت شراب سے متعلق چار آیات نازل ہوئی ہیں ایک سورہ بقرہ میں جس میں شراب سے پیدا ہونے والے مفاسد اور گناہوں کا ذکر ہے،لیکن اس میں صراحۃً اسے حرام نہیں کیا گیا۔

دوسری آیت سورہ نساء والی ہے جس میں صرف اوقات نماز میں شراب سے منع کیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی، تیسری اور چوتھی آیات سورہ مائدہ میں ہیں،جن میں صاف طور پر شراب کو حرام کیا گیا ہے۔

شراب کی حرمت کب نازل ہوئی

شراب کی حرمت کے متعلق سورہ مائدہ کی آیت کب نازل ہوئی،اس میں اختلاف ہے،حافظ ابن

حجر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ سن آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہونے سے پہلے یہ حکم نازل ہوا، جبکہ حافظ شرف الدین دمیاطی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ آیت صلح حدیبیہ کے سال نازل ہوئی، یعنی سن چھ ہجری میں، ابن اسحاق کے نزدیک غزوہ بنی نضیر کے سال یہ حکم نازل ہوا، یہ غزوہ راجح قول کے مطابق سن چار ہجری میں واقع ہوا ہے۔ فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب قول اللہ تعالی: انما الخمر والمیسر ....۱۰/۳۸۔

ان اقوال میں کونسا قول راجح ہے، علامہ قسطلانی نے سن چھ ہجری کو ترجیح دی ہے، لیکن مشہور روایت سن چار ہجری کی ہے۔ تاریخ الخمیس فی أحوال أنفس نفیس، للشیخ حسین بن محمد المالکی ۲/۲۶، ط: بیروت

اشربہ کی قسمیں، ان کے احکام اور مذاہب ائمہ

اس میں تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ شراب حرام ہے، لیکن اسکے تفصیلی احکام میں کچھ اختلاف ہے، جسکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......ائمہ ثلاثہ امام مالک، شافعی، احمد اور حنفیہ میں سے امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک تمام نشہ آور مشروبات شراب ہی ہیں، ان کا قلیل اور کثیر استعمال مطلقاً حرام ہے، ان کے پینے والے پر حد جاری ہوگی، شراب کیطرح ہر نشہ آور مشروب ناپاک ہے، اور اسکی خرید و فروخت بھی جائز نہیں۔

(۲)......امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اشربہ کی تین قسمیں ہیں:

قسم اول: خمر یعنی شراب: یہ انگور کا کچا شیرہ ہوتا ہے، جب زیادہ رکھنے یا ابالنے کی وجہ سے اس میں شدت آجائے، وہ ابلنے لگے اور جھاگ پھینکنے لگے، البتہ امام ابو یوسف اور امام محمد جھاگ پیدا ہونے کی شرط نہیں لگاتے۔

اسکا حکم یہ ہے کہ اسکا قلیل و کثیر استعمال مطلقا حرام ہے، پینے والے پر حد جاری کی جائیگی، اگرچہ اس نے ایک قطرہ پیا ہو، یہ نجس العین ہے، اسکی خرید و فروخت بھی جائز نہیں اور اسکو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔

قسم دوم: اس میں تین قسم کے اشربہ ہیں:

(الف) طِلاء: یہ انگور کا شیرہ ہے جب اسے اتنا پکایا جائے کہ دو تہائی سے کم ختم ہو جائے۔

(ب) نقیع التمر: کھجور کا کچا شیرہ اسے "سکر" بھی کہا جاتا ہے۔ (سین اور کاف پر زبر کے ساتھ)

(ج) نقیع الزبیب: اس پانی کو کہتے ہیں جس میں کشمش ڈال دی جائے اور زیادہ دیر رہنے کی وجہ سے اس میں شدت اور ابال پیدا ہو جائے۔

ان تینوں قسموں کا حکم یہ ہے کہ یہ بھی شراب کے حکم میں ہیں، نجس ہیں، اور ان کا قلیل و کثیر استعمال حرام ہے، البتہ ان کے پینے والے پر امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک نشہ آور مقدار پینے کے بعد حد جاری کی جائیگی، اسکے بغیر نہیں، کیونکہ ان اشربہ کا "خمر" یعنی شراب ہونا قطعی نہیں، محض ظنی ہے، اور حد چونکہ شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے، اسلئے جب تک نشہ آور مقدار نہ پیے اس وقت تک حد جاری نہیں ہوگی، ان اشربہ کو حلال سمجھنے والا کافر نہیں ہوگا، جبکہ شراب کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان تینوں مشروبات کی خرید و فروخت جائز ہے جبکہ صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جائز نہیں۔

قسم سوم: مذکورہ چار قسموں یعنی خمر، طلاء، نقیع التمر اور نقیع الزبیب کے علاوہ باقی نشہ آور مشروبات مثلاً کھجور کی نبیذ یا کشمش کی نبیذ جسے تھوڑا پکا لیا گیا ہو یا انگور کا شیرہ جسے اسقدر پکایا جائے کہ اسکے دو حصے خشک ہو جائیں اور ایک حصہ باقی رہ جائے، اسی طرح شہد، انجیر، گندم اور جو وغیرہ کی نبیذ ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک ان کی قلیل مقدار کا استعمال جو نشہ آور نہ ہو، جائز ہے، تکملة فتح الملهم، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر ۳/۶۰۰، ۶۰۱۔ بشرطیکہ ان سے عبادات کیلئے طاقت حاصل کرنا مقصود ہو، عیش و عشرت اور جنسی طاقت کی غرض سے نہ ہو، جبکہ جمہور کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ بذل المجهود، کتاب الأشربة، باب ما جاء فی السکر ۱۶/۱۶، ۱۷۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امام صاحب اور جمہور کے درمیان دو چیزوں میں اختلاف ہے ایک اشربہ ثلاثہ یعنی طلاء، نقیع التمر اور نقیع الزبیب میں کہ امام صاحب کے نزدیک یہ خمر تو ہیں لیکن ان کا خمر (یعنی شراب) ہونا ظنی ہے قطعی نہیں، لہذا ان کے پینے والے پر حد جاری نہیں کی جائیگی، جبکہ جمہور کے نزدیک ان کا خمر ہونا ظنی نہیں، لہذا ان کے نزدیک پینے والے پر حد جاری کی جائیگی۔

دوسرا اختلاف شراب کی مذکورہ چار قسموں کے علاوہ دیگر نشہ آور مشروبات کی اس قلیل مقدار کے بارے میں ہے جو نشہ آور نہ ہو مثلاً نبیذ وغیرہ، امام صاحب کے نزدیک ان کی غیر نشہ آور قلیل مقدار کا استعمال جائز ہے، اور جمہور کے نزدیک جائز نہیں، نیز امام کے نزدیک یہ مشروبات نجس بھی نہیں ہیں۔

المبسوط للسرخسی ۱۴/۲۴۔

ذیل میں امام صاحب اور جمہور ائمہ کے چند دلائل ذکر کیے جاتے ہیں:

امام ابو حنیفہ کے دلائل

(۱)......امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال لغت سے ہے کہ لغت میں خمر کا اطلاق انگور کے شیرے پر ہوتا ہے، باقی پھلوں کے شیرے پر "خمر" کا اطلاق لغت میں نہیں ہوتا۔ لسان العرب، ۳۳۹/۵

اسکی تائید مصنف عبدالرزاق کی روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **الخمر من العنب** .... مصنف عبدالرزاق ۲۳۴/۹، رقم الحدیث ۱۷۵۴، اس میں تصریح ہے کہ شراب انگور کی ہوتی ہے، یہ روایت اگرچہ حضرت سعید بن میسب نے مرسلاً نقل کی ہے لیکن اسپر اجماع ہے کہ ان کی مرسل روایات مقبول ہوتی ہیں۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر ۶۰۱/۳

(۲)......حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ہے: **اَمَّا الْخَمْرُ فَحَرَامٌ لَا سَبِيْلَ اِلَيْهَا وَاَمَّا مَا سِوَاهَا مِنَ الْاَشْرِبَةِ فَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ**، شراب حرام ہے اسے کسی صورت نہیں پیا جاسکتا، اور شراب کے علاوہ دیگر مشروبات میں جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔ مصنف عبدالرزاق، ۲۲۲/۹۔

اس میں شراب اور دیگر مشروبات کے درمیان حکم کے اعتبار سے تفریق کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تمام نشہ آور مشروبات کو خمر نہیں کہا جاتا۔

(۳)......حضرت عبداللہ بن عباس کا اثر ہے: **حُرِّمَتِ الْخَمْرُ لِعَيْنِهَا، وَالسُّكْرُ مِنْ كُلِّ شَرَابٍ** شراب کو اصلاً حرام قرار دیا گیا ہے اور دیگر مشروبات میں وہ حرام ہے جو نشہ آور ہو۔ شرح معانی الاثار، کتاب الاشربۃ، باب الخمر المحرمۃ ماھی ۳۵۶/۲۔

(۴)......حضرت فاروق اعظم سے منقول ہے کہ انہوں نے اس نبیذ سے تھوڑا سا چکھا جو نشہ آور تھی، اگر قلیل

مقدار حرام ہوتی تو وہ کبھی نہ چکھتے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر ۳/۶۰۳۔

(۵)...... حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل یمن جا رہے تھے، حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ وہاں گندم اور جو کی شراب بنائی جاتی ہے، اسکا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اِشْرَبَا وَلَا تُسْکِرَا، وہ تم پی سکتے ہو لیکن انہیں نشہ آور نہ بنانا (کیونکہ ان میں جو نشہ آور ہو جائے، وہ جائز نہیں)۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں شراب کی وہ مقدار جو نشہ آور ہو، اور وہ مقدار جو نشہ آور نہ ہو، دونوں کے حکم میں فرق کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شراب کے علاوہ دیگر شرابوں کی غیر نشہ آور مقدار کا استعمال درست ہے۔ شرح معانی الاثار، **کتاب الأشربة، باب ما یحرم من النبیذ ۲/۳۶۰**

(۶)...... حضرت عبد اللہ بن شخیر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اشربہ یعنی مشروبات پینے سے منع فرمایا، آپ سے عرض کیا گیا کہ ان میں بعض کا پینا تو ضروری ہوتا ہے؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم انہیں اس وقت تک پی سکتے ہو جب تک کہ یہ تمہاری عقلوں کو بیوقوف نہ بنا دیں (یعنی نشہ آور نہ ہوں) اور تمہارے اموال کو ختم نہ کر دیں۔ مصنف عبد الرزاق ۹/۲۲۳

ان روایات سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ "شراب" صرف انگور کی ہوتی ہے، اور دوسری یہ کہ شراب کی مذکورہ چار قسموں کے علاوہ باقی مشروبات کی غیر نشہ آور مقدار کا استعمال جائز ہے۔

جمہور کے دلائل

امام ترمذی رحمہ اللہ نے **باب ما جاء فی شارب الخمر، باب ما جاء کل مسکر حرام، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام، باب ما جاء فی الحبوب التی یتخذ منها الخمر،** ان چار ابواب کے تحت جتنی روایات ذکر فرمائی ہیں، وہ تمام جمہور کے دلائل ہیں، ان احادیث کی تفصیل:

(۱)...... **باب ما جاء فی شارب الخمر** میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **کل مسکر خمر و کل مسکر حرام..........**

(۲)...... باب ما جاء کل مسکر حرام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

"نبی کریم ﷺ سے شہد کی شراب کے بارے میں پوچھا گیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ

شراب جونشہ آور ہووہ حرام ہے"

(۳)......**باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام** میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اسکی قلیل مقدار بھی حرام ہوتی ہے۔

نیز اس باب کی دوسری روایت جمہور کی دلیل ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر نشہ آور چیز حرام ہے، جس چیز کا ایک فرق (یہ ایک مدنی پیمانہ ہے، جس میں تین صاع آجاتے ہیں) نشہ آور ہو، تو اسکا چلو بھر بھی حرام ہے۔

(۴)......**باب ما جاء في الحبوب**......... میں نعمان بن بشیر کی روایت ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ گندم کی شراب ہوتی ہے، جو کی شراب ہوتی ہے، کھجور کی شراب ہوتی ہے، کشمش (انگور) کی شراب ہوتی ہے، اور شہد کی شراب ہوتی ہے۔

اسی طرح اس مفہوم کی روایات حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے **كتاب الاشربة باب الخمر من العنب، باب نزل تحريم الخمر، باب الخمر من العسل، باب ما جاء ما خامر العقل** ......ان چار ابواب کے تحت جتنی روایات ذکر فرمائی ہیں، وہ تمام جمہور کے دلائل ہیں، ان احادیث کی روشنی میں جمہور کہتے ہیں کہ "خمر" صرف انگور کے شیرے کا نام نہیں، بلکہ طلاء، نقیع الزبیب......وغیرہ بھی "خمر" ہیں، ایسے ہی نشہ آور نبیذ کا قلیل استعمال بھی ناجائز ہے۔

جمہور کے دلائل کا جواب

احناف کہتے ہیں کہ خمر کا اطلاق حقیقۃً اور لغۃً انگور کے شیرے پر ہوتا ہے، اور باقی مشروبات پر اسکا اطلاق مجازاً ہوتا ہے، جیسا کہ اسکی تفصیل گذر چکی ہے

اور "مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ" اور اس جیسی روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شراب کے علاوہ دیگر نشہ آور مشروبات بھی تمام امور میں "خمر" ہی ہیں، البتہ ان سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی

ہے کہ باقی نشہ آور مشروبات شراب کے حکم میں ہیں، لہذا شراب کیطرح ان کا قلیل و کثیر استعمال حرام ہے، تاہم تمام امور میں ان کا ''شراب'' کے حکم میں ہونا ان احادیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے حنفی حضرات نے حرمت کے حق میں جمہور کے مذہب کے مطابق فتوی دیا ہے کہ ان مشروبات کا قلیل و کثیر استعمال مطلقاً حرام ہے، اور ان کی بیع اور حد کے حق میں امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ ان کی خرید و فروخت اگر کسی جائز مقصد کیلئے ہو تو بغیر کسی کراہت کے جائز ہے اور ان کے استعمال سے حد بھی واجب نہیں ہوگی۔

الکحل کا شرعی حکم

عصر حاضر میں الکحل کا استعمال بہت عام ہو چکا ہے، بہت سی دواؤں، عطر، رنگوں اور کیمیکلز وغیرہ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اگر واقعی یہ انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو تو پھر یہ حرام ہے، نجس ہے، اور اسکا استعمال بھی جائز نہیں، لیکن اگر انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے تیار کی گئی ہو جیسا کہ اس زمانے میں بکثرت ایسا ہی ہے، تو پھر اسے علاج اور جائز مقاصد کیلئے اتنی مقدار میں استعمال کرنا جائز ہے، جس مقدار سے نشہ پیدا نہ ہوتا ہو، اور یہ نجس نہیں، پاک ہے، دوا وغیرہ میں آجکل جو الکحل استعمال کی جاتی ہے، وہ عموماً انگور یا کھجور سے نہیں بنائی جاتی، بلکہ دوسری اشیاء مثلاً چمڑا، گندھک، شہد، چھلکے، جو، گندم اور پٹرول وغیرہ سے حاصل کی جاتی ہے، چونکہ الکحل کو جائز مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور اسکا عام ابتلاء بھی ہے، اسلئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز اغراض و مقاصد کیلئے اسکا استعمال اور خرید و فروخت جائز ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الاشربۃ، اختلاف الفقھاء فی احکام الاشربۃ، حکم الکول المسکرۃ ج۳/ ۶۰۷، ۶۰۸۔

بَابُ مَا جَاءَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْبِتْعِ، فَقَالَ: كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ''بتع'' کے بارے میں

پوچھا گیا (کہ وہ حلال ہے یا حرام) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہر پینے والی چیز جو نشہ آور ہو، وہ حرام ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

ہر نشہ آور چیز حرام ہے

حضور اکرم ﷺ سے "شراب بتع" کے حکم کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ حلال ہے یا حرام؟ آپ ﷺ نے ایک اصولی حکم بیان فرمایا کہ ہر وہ شراب جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے، بتع (باء کے زیر اور تاء کے سکون کے ساتھ) اس شراب کو کہا جاتا ہے جو شہد سے بنائی جاتی ہے، اسکا رواج زیادہ تر ملک یمن میں ہوتا ہے۔

یہ روایات جمہور کے دلائل ہیں، جن سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو بھی نشہ آور چیز ہو، وہ شراب ہے، لہذا اسکا قلیل وکثیر استعمال حرام ہے، جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ان احادیث میں ہر نشہ آور چیز کا حکم بیان کیا گیا ہے، کہ وہ حرام ہے، ان میں ان کا خمر یعنی شراب ہونا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، لہذا ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو، خواہ وہ شراب ہو یا افیون اور چرس وغیرہ، شرعاً ان کا استعمال حرام ہے اور شراب کے علاوہ دیگر مشروبات کی وہ قلیل مقدار جو نشہ آور نہ ہو، اسکا استعمال جائز ہے، وہ کل مسکر حرام میں داخل نہیں ہے، عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب الخمر من العسل وھو البتع ۲۱/۱۶۹۔

بَابُ مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو، اس کا قلیل بھی حرام ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ.

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو، اسکی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، مَا أَسْكَرَ الْفَرَقُ مِنْهُ فَمِلْءُ الْكَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ. قَالَ أَحَدُهُمَا فِيْ حَدِيْثِهٖ: اَلْحُسْوَةُ مِنْهُ حَرَامٌ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نشہ آور چیز حرام ہے، جس چیز کا ایک فرق نشہ آور ہو تو اسکا چلو بھر بھی حرام ہوتا ہے۔

محمد بن بشار اور عبداللہ بن معاویہ ان دو راویوں میں سے ایک نے اپنی حدیث میں کہا: الحسوۃ منہ حرام، اسکا ایک گھونٹ بھی حرام ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- الفرق: (را پر زبر اور سکون کے ساتھ البتہ زبر زیادہ مشہور ہے) یہ ایک مدنی پیمانہ ہے جس میں سولہ رطل آجاتے ہیں، اور ایک رطل تقریباً آدھ سیر کا ہوتا ہے۔ مل الکف: چلو بھر۔ الحُسوۃ: (حاء پر پیش اور سین کے سکون کے ساتھ) گھونٹ، منہ بھر پینے کی چیز، ج: حُساً

جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اسکی قلیل مقدار کا استعمال بھی حرام ہے

مذکورہ باب کی تمام روایات سے جمہور اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ شراب اور دیگر تمام نشہ آور مشروبات کا استعمال حرام ہے، خواہ ان کی مقدار نشہ آور ہو یا نہ ہو، وہ کثیر ہوں یا قلیل کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو تو اس کی قلیل مقدار کو استعمال کرنا بھی حرام ہے۔

اور باب کی دوسری روایت میں فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، اور جس چیز کا ''فرق'' نشہ آور ہو تو اسکا چلو بھی حرام ہوتا ہے، اس میں ''فرق'' سے کثرت اور ''مل الکف'' سے قلت کیطرف اشارہ ہے کہ جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، تو اسکی تھوڑی مقدار کو بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

اس روایت میں تو ''مل الکف منہ حرام'' کے الفاظ ہیں، جبکہ محمد بن بشار یا عبداللہ بن معاویہ کے طریق میں اسکے بجائے، الحسوۃ منہ حرام کے کلمات ہیں، یہ صرف الفاظ کا فرق ہے، ورنہ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر نشہ آور چیز شراب ہو تو اسکا قلیل وکثیر علی الاطلاق حرام ہے، کیونکہ یہ نجس العین

ہے اور شراب کے علاوہ دیگر مشروبات کی غیر نشہ آور قلیل مقدار کی حرمت اس بنیاد پر ہے کہ قلیل مقدار کا استعمال کثیر کو استعمال کرنے کا سبب بنتا ہے، یا اسکی حرمت کا حکم اس وقت ہے جب اسے لہو ولعب اور نا جائز مقصد کیلئے استعمال کیا جائے، لیکن اگر اس غیر نشہ آور قلیل مقدار کو اس لئے پیا جائے تا کہ اس سے عبادات میں طاقت حاصل ہو تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک یہ جائز ہے، جبکہ امام محمد، امام شافعی، اور امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک اس کا استعمال بھی نا جائز اور حرام ہے۔

حنفیہ کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث اور صحابہ کرام کے آثار سے ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت طحاوی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس نبیذ لائی گئی، آپ نے اسے سونگھا، اسکا شدید اور گاڑا ہونا آپکو ناگوار ہوا، اسکی شدت کو ختم کرنے کیلئے آپ نے پانی منگوا کر اس میں ملایا اور پھر اسے پی لیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سخت قسم کی نبیذ پیا کرتے تھے اور فرماتے کہ ہم اونٹ نحر (ذبح) کرتے ہیں (اسلئے اسطرح کا نبیذ ہمیں استعمال کرنا پڑتا ہے تا کہ یہ کام آسانی سے ہو سکے)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کی دعوت کی، اس میں انہیں نبیذ پلائی گئی، لیکن بعض لوگوں نے اسے اس انداز سے پیا کہ انہیں اس سے نشہ ہو گیا، اسپر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حد لگائی، ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہی نے تو پلائی ہے پھر اسپر حد بھی لگا رہے ہیں، حضرت علی نے فرمایا کہ میں اسے نشہ کی وجہ سے حد لگا رہا ہوں..........

ان تمام روایات اور آثار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شراب کے علاوہ دیگر شرابوں کی غیر نشہ آور مقدار کا استعمال اگر عبادات میں طاقت کی نیت سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ اگر یہ چیز حرام ہوتی تو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام اسے استعمال نہ کرتے اور نہ پیتے ورنہ تو صحابہ کرام کو فاسق قرار دینا لازم آتا ہے، جو کسی طرح درست نہیں، اسکا استعمال جائز تھا جب ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ بذل المجهود، کتاب الأشربة، باب ماجاء في السكر، ۱۶/۱۶، ۱۷، ۱۸۔ الکوکب الدری، ۳/۳۳۔

حنفیہ کیطرف سے جمہور کے دلائل کا جواب کتاب الاشربہ کے پہلے باب میں گذر چکا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ نَبِيْذِ الْجَرِّ

یہ باب مٹکوں میں نبیذ بنانے کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ طَاوُسٍ أَنَّ رَجُلًا أَتٰی ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَبِيْذِ الْجَرِّ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ طَاوُسُ: وَاللّٰهِ إِنِّي سَمِعْتُهُ مِنْهُ.

طاؤس سے روایت ہے کہ ایک شخص ابن عمر کے پاس آیا اور عرض کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے مٹکوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: ہاں (منع فرمایا ہے) (سلیمان تیمی کہتے ہیں کہ) طاؤس فرماتے ہیں کہ: خدا کی قسم میں نے حضرت عبداللہ بن عمر ہی سے سنا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- نبیذ: انگور یا کھجور کو چند دن یا کچھ وقت کیلئے پانی میں رکھا جائے جس سے اس پانی میں مٹھاس یا کھٹاس پیدا ہو جائے خواہ وہ نشہ آور ہو یا نہ ہو، تو اس کو نبیذ کہا جاتا ہے، الجر: (جیم پر زبر اور ''را'' پر تشدید کے ساتھ پڑھا جائے) یہ جَرَّۃ کی جمع ہے: ہر وہ چیز جو مٹی سے بنائی جائے جیسے مٹکے وغیرہ۔

حدیث میں ''جر'' سے ایسے مٹکے اور مٹی کے برتن مراد ہیں جن پر روغن یا تارکول لگا کر ان کے مسام بند کر لیے جائیں تا کہ انگور یا کھجور کے اثرات جلد ہی اس نبیذ میں ظاہر ہو جائیں۔

مٹکوں میں نبیذ بنانے کا حکم

حدیث باب میں حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مٹکوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے، اور سلیمان تیمی کہتے ہیں کہ طاؤس فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث واقعی حضرت عبداللہ بن عمر سے سنی ہے، گویا یہ حدیث مرفوع ہے، اس میں کوئی انقطاع نہیں ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں حضرت امام احمد اور امام مالک فرماتے ہیں کہ مٹکوں میں اور حنتم اور دباء وغیرہ میں نبیذ بنانے کی ممانعت کا حکم اب بھی باقی ہے، یہ منسوخ نہیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی یہی موقف تھا کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانا ممنوع ہے۔ فتح الباری، کتاب

الاشربۃ، باب ترخیص النبی ﷺ فی الأوعیۃ ۱۰/۲۷۔ کیونکہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ حرمت بیان کی ہے اور نسخ کا ذکر نہیں کیا۔

لیکن جمہور یہ کہتے ہیں کہ مٹکوں اور حنتم وغیرہ میں نبیذ بنانے کی ممانعت کا حکم ابتداء میں تھا، بعد میں منسوخ ہوگیا، امام ترمذی رحمہ اللہ نے دو بابوں کے بعد ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں وہ احادیث ذکر کی ہیں جن میں ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، یہ احادیث مالکیہ وغیرہ کے خلاف حجت ہیں کیونکہ ان سے ان کے موقف کی تردید ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے ممکن ہے کہ حکم منسوخ کو بطور حکایت کے بیان کیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کو حکم کے منسوخ ہونے کا علم ہی نہ ہوسکا ہو، اسلئے حدیث باب سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

تکملۃ فتح الملھم، کتاب الاشربۃ، باب النھی عن الانتباذ فی المزفت ۳/۶۲۹۔

مٹکوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی وجوہ

شارحین حدیث نے اسکی پانچ وجہیں لکھی ہیں:

(۱)......زمانہ جاہلیت میں شراب بنانے کیلئے جو برتن استعمال ہوتے تھے، ان پر روغن اور تارکول لگا کر ان کے مسام بند کر لیے جاتے تھے، تاکہ بیرونی اثرات ان کے اندر اثر انداز نہ ہوسکیں، اسکا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں جب نبیذ بنائی جاتی تو نہایت جلد ہی اس میں شدت آجاتی، لیکن چونکہ وہ برتن ہر طرف سے بند ہوتا، نبیذ کے نشہ آور ہو جانے کا اندازہ لگانے میں غلطی کا امکان زیادہ تھا، ایسا نہ ہو کہ بے خبری کی وجہ سے نشہ آور نبیذ پی لی جائے، جو کہ حرام ہے اور اگر اسکے نشہ آور ہونے کا علم ہو جائے تو اسے گرانا پڑے گا، جس سے مال کو ضائع کرنا لازم آئیگا، اسلئے مٹکوں اور حنتم وغیرہ میں نبیذ بنانے سے منع کیا گیا تاکہ نہ تو دینی اعتبار سے نقصان ہو اور نہ ہی مال کا ضیاع ہو، البتہ مشکیزے میں نبیذ بنانے کی اجازت برقرار رہی کیونکہ اس میں اگر نبیذ نشہ آور ہو جاتی تو چمڑا پھول جاتا، جس سے اسکی حرمت کا علم ہو جاتا، اسلئے اسے جائز قرار دیا گیا۔ بذل المجھود، کتاب الاشربۃ، باب فی الأوعیۃ، ۱۶/۲۶

(۲)......علامہ نووی فرماتے ہیں کہ شراب کی حرمت کے ساتھ ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا گیا تا کہ دلوں میں شراب کی حرمت راسخ ہو جائے، پھر جب اسکی حرمت مشہور ہوگئی، طویل زمانہ گذر گیا، اور ان کے دل وجان میں اسکی حرمت بیٹھ گئی تو پھر یہ ممانعت ختم کر دی گئی، اور ہر قسم کے برتن میں نبیذ بنانا جائز قرار دیا گیا اس شرط کے ساتھ کہ اسے نشہ آور بنا کر نہ پیا جائے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب النھی عن الانتباذ عن المزفت......۲/۱۶۴۔

(۳)......بعض نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حنتم دباء وغیرہ زمانہ جاہلیت سے شراب بنانے کیلئے استعمال ہوتے تھے، شراب کی حرمت کے بعد ان برتنوں کو استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا گیا تا کہ شراب خوروں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

(۴)......ممانعت کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان برتنوں میں کچھ نہ کچھ شراب کا اثر تھا، کیونکہ ان میں شراب بنائی جاتی تھی، پھر ایک عرصے کے بعد جب یہ اثر ختم ہو گیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کے استعمال کی اجازت دیدی۔

(۵)......شریعت میں جب کسی چیز کو حرام قرار دیا جائے تو ابتدا میں اس میں خوب مبالغہ اور سختی سے کام لیا جاتا ہے تا کہ لوگ اس کام سے باز آجائیں، پھر جب لوگ اسے چھوڑ دیں اور مقصود حاصل ہو جائے تو سختی ختم ہو جاتی ہے، ایسے ہی شراب کی حرمت کا معاملہ ہے کہ حرمت شراب کے ساتھ ان برتنوں کو بھی استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تا کہ شراب کی حرمت وقباحت ہر لحاظ سے ان کے ذہنوں میں بیٹھ جائے،..........اسکے بعد ان برتنوں کے استعمال کی پھر اجازت دیدی گئی۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، الفصل الاول ۱/۱۷۳

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ أَنْ يُّنْبَذَ فِيْ الدُّبَّاءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْحَنْتَمِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ دباء، نقیر اور حنتم میں نبیذ بنانا مکروہ ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ قَالَ سَمِعْتُ زَاذَانَ يَقُوْلُ: سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ عَنْ مَا نَهَى عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْأَوْعِيَةِ وَأَخْبِرْنَاهُ بِلُغَتِكُمْ وَفَسِّرْهُ لَنَا بِلُغَتِنَا. قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَنْتَمَةِ وَهِيَ الْجَرَّةُ، وَنَهَى عَنِ الدُّبَّاءِ وَهِيَ الْقَرْعَةُ، وَنَهَى عَنِ النَّقِيْرِ وَهِيَ أَصْلُ النَّخْلِ يُنْقَرُ نَقْرًا أَوْ يُنْسَجُ

نَسْجًا، وَنَهَى عَنِ الْمُزَفَّتِ وَهُوَ الْمُقَيَّرُ، وَأَمَرَ أَنْ يُنْتَبَذَ فِي الْأَسْقِيَةِ.

عمرو بن مرہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے زاذان سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمر سے ان برتنوں کے بارے میں پوچھا، جن کے استعمال سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اور میں نے ان سے (عرض کیا کہ پہلے) ہمیں ان کی تفصیل اپنی زبان میں بتائیں اور پھر ان کی تشریح وتفسیر ہماری زبان میں فرمادیجئے، ابن عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے حنتمہ سے منع فرمایا ہے اور وہ مٹکا ہے، اور دباء سے منع فرمایا ہے، اور وہ کدو کا برتن ہے، اور نقیر سے منع فرمایا ہے اور وہ کھجور کی جڑ ہے جسے اندر سے کھوکھلا کر دیا گیا ہو یا (یوں فرمایا کہ) اسکا چھلکا اتار کر صاف کر دیا گیا ہو، اور مزفت سے منع فرمایا ہے اور یہ وہ برتن ہے جسپر روغن قیر ملا گیا ہو، اور رسول اللہ ﷺ نے مشکیزوں میں نبیذ بنانے کا حکم دیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- اَلدُّبَّاء: کدو کو خشک کر کے اور گودہ نکال کر جو برتن بنایا جاتا ہے اسے دباء کہتے ہیں، یہ برتن چونکہ قدرتی طور پر موسمی اثرات سے محفوظ ہوتا ہے اور اسکے مسام کم ہوتے ہیں، اسلئے اس مشروب میں جلد ہی نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حَنْتَمَة: اسکے معنی میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......رنگ دار گھڑا یا مٹکا، یہ اکثر سبز رنگ کا ہوتا تھا، اسلئے اسکا ترجمہ عموماً "الجرة الخضراء" سے کیا جاتا ہے، یعنی سبز مٹکا یا سبز رنگ کا روغنی گھڑا، یہ معنی راجح ہیں، کیونکہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں اسکی تصریح ہے۔

(۲)......عبداللہ بن عمرو، سعید بن جبیر اور ابوسلمہ کہتے ہیں کہ حنتم سے ہر قسم کے گھڑے مراد ہیں۔

(۳)......حضرت انس بن مالک وغیرہ سے منقول ہے کہ حنتم "خاص قسم کے سرخ گھڑے ہیں جو مصر سے لائے جاتے تھے اور ان پر تارکول ملا جاتا تھا۔

(۴)......عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ حنتم وہ سرخ رنگ کے گھڑے ہیں جن میں مصر سے شراب لائی جاتی تھی اور جنکی گردنیں ایک جانب ہوتی تھیں۔

(۵)......عطاء کہتے ہیں کہ حنتم ایسے گھڑے ہیں جو مٹی، بال اور خون سے بنائے جاتے تھے۔

ان تمام اقوال میں پہلا قول راجح ہے اسی کو اکثر محدثین نے اختیار کیا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۴۹۶/۵۔

نَقِیر: ''نقر'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ کھودنے اور کریدنے کے ہیں اور ''نقیر'' مفعول کے معنیٰ میں ہے یعنی کھدی ہوئی چیز، اہل عرب درخت کھجور وغیرہ کی جڑ کو اندر سے کرید کر اسے برتن بنا لیتے تھے، جسے شراب بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اَلْـمَـزَفَّت: وہ برتن جس پر روغن زفت یا روغن قیر ملا گیا ہو، زفت یا قیر ایک تارکول نما کالا تیل ہوا کرتا تھا جسے جہازوں اور کشتیوں پر ملا جاتا تھا، تاکہ پانی اندر داخل نہ ہو، زمانہ جاہلیت میں شراب کے برتنوں پر بھی اسے ملتے تھے، تاکہ شراب جلدی نشہ آور ہو جائے۔

بعض روایتوں میں ''مُقَیَّر'' کا لفظ ہے، مُقَیَّر ہو یا مُزَفَّت دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ینسح نسحا: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ سین اور حاء کے ساتھ ہے: کسی چیز کو اندر سے کرید کر صاف کرنا، جبکہ ترمذی اور مسلم کے بعض نسخوں میں ''جیم'' کے ساتھ تنسج منقول ہے، اس کے معنیٰ کپڑا بننے کے ہیں، حدیث کے معنی یہ ہونگے کہ کھجور کی جڑ کو بار بار چھیل کر برتن کی صورت بنا لینا، چونکہ اس کے چھیلنے اور بنانے میں کپڑا بننے کیطرح بار بار اوپر نیچے حرکت ہوتی ہے، اس مناسبت سے اس کو نسج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن علامہ نووی فرماتے ہیں کہ جیم کے ساتھ اسکا استعمال یہاں درست نہیں۔ الکوکب الدری ۳۴/۳ الاسقیۃ: سِقاء کی جمع ہے: مشکیزہ۔

اخبرناه بلغتكم وفسره لنا بلغتنا

زاذان ابن عمر سے کہتے ہیں کہ روایت تو آپ انہی عربی الفاظ کے ساتھ بیان کریں، جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں، کیونکہ وہ بابرکت ہیں البتہ ان کی تشریح ہماری لوکل زبان میں کر دیجئے تاکہ ہم ان کا مفہوم اچھی طرح سمجھ سکیں۔

دبا اور حنتم وغیرہ میں ابتداء میں نبیذ بنانا ممنوع تھا

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دبا، حنتم اور نقیر وغیرہ برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا کہ ان میں نبیذ نہیں بنا سکتے، البتہ مشکیزوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دی ہے، اسکی مزید تفصیل گذشتہ باب میں تحریر کی جا چکی ہے، اسے دیکھ لیا جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرُّخْصَةِ أَنْ يُّنْتَبَذَ فِيْ الظُّرُوْفِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ مذکورہ برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت ہے

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنِّي كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الظُّرُوْفِ. وَإِنَّ ظَرْفًا لَا يُحِلُّ شَيْئًا وَلَا يُحَرِّمُهُ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ.

سلیمان بن بریدہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک میں نے تمہیں (مذکورہ) برتنوں کے استعمال سے منع کیا تھا، لیکن کوئی برتن نہ تو کسی چیز کو حلال کرسکتا ہے اور نہ حرام کرسکتا ہے (اسلئے اب تم یہ برتن استعمال کر سکتے ہو البتہ) ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الظُّرُوْفِ، فَشَكَتْ إِلَيْهِ الْأَنْصَارُ، فَقَالُوْا لَيْسَ لَنَا وِعَاءٌ، قَالَ: فَلَا إِذاً.

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا تو انصار نے آپکی خدمت میں شکایت کی کہ ہمارے پاس تو ان کے علاوہ اور کوئی برتن ہی نہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر (ان کا استعمال) ممنوع نہیں۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- ظُــرُوف: ظرف کی جمع ہے: برتن۔ لایُـحِــل: حلال نہیں کرسکتا۔ لا یــحــرم: حرام نہیں کرسکتا۔ شَــکَــتْ: شکایت کی انصار نے۔ فَلَا اذاً: یہ شرط وجزاء ہے، اصل عبارت یوں ہے: اذا کان لا بد لکم منھا فلا نھی عنھا جب ان برتنوں کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو پھر یہ ممانعت نہیں۔

مذکورہ برتنوں میں نبیذ بنانا جائز ہے

حرمت شراب کے ساتھ ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا، جن میں عموماً شراب بنائی جاتی تھی، امام ترمذی رحمہ اللہ نے گذشتہ دوبابوں میں اسی ممانعت پر مشتمل احادیث ذکر کی ہیں، جنکی تفصیلی

بحث پہلے گذر چکی ہے، بعد میں یہ ممانعت منسوخ ہوگئی تھی، چنانچہ اس باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے وہ احادیث ذکر کی ہیں جن میں ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

پہلی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان برتنوں کے استعمال سے تمہیں منع کیا تھا لیکن چونکہ برتن نہ تو کسی چیز کو حلال کر سکتے ہیں اور نہ حرام کر سکتے ہیں، اسلئے اب میں ممانعت منسوخ کرتا ہوں، اور ان کے استعمال کی اجازت دیتا ہوں، البتہ وہ مشروب جس میں نشہ پیدا ہو جائے، اسے پینا حرام ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ ممانعت ان برتنوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ حرمت شراب کی وجہ سے تھی جب یہ حرمت لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگئی تو پھر یہ نہی منسوخ ہوگئی۔

باب کی دوسری حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان برتنوں (دبا، حنتم وغیرہ) سے منع فرمایا، اسپر حضرات انصار نے کہا کہ ان برتنوں کے سوا تو کوئی چارہ نہیں، تب آپ نے فرمایا کہ پھر اس صورت میں ممانعت نہیں ہے، انہیں استعمال کر سکتے ہو۔

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممانعت کا حکم ان برتنوں کی ضرورت نہ ہونیکی صورت پر تھا پھر جب لوگوں کی ضرورت ظاہر ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے استعمال کو برقرار رکھا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ممانعت کا حکم وحی جدید سے منسوخ ہوگیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں حکم کو برقرار رکھنا اور منسوخ کرنا حضور اکرم ﷺ کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیۃ ۱۷۸/۲۱۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان احتمالات کے باوجود اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ حضور اکرم ﷺ صرف اپنے اجتہاد سے ہی فیصلے فرماتے تھے، درست نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعیۃ ۷۲/۱۰

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السِّقَاءِ

یہ باب مشک میں (نبیذ بنانے کے بارے میں) ہے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنَّا نَنْبِذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ سِقَاءٍ يُوْكَأُ أَعْلَاهُ لَهُ عَزْلَاءُ نَنْبِذُهُ غُدْوَةً وَيَشْرَبُهُ عِشَاءً، وَنَنْبِذُهُ عِشَاءً وَيَشْرَبُهُ غُدْوَةً.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کیلئے
مشک میں نبیذ بنایا کرتے تھے، جس کے اوپر کا منہ باندھ دیا جاتا تھا، اور اسکے نیچے ایک چھوٹا
سامنہ تھا (اس سے نکال کر نبیذ پی جاتی تھی) ہم آپ ﷺ کیلئے صبح کے وقت کھجور بھگوتے
تھے تو آپ ﷺ اسے شام کو پیتے تھے اور شام کو کھجور بھگوتے تھے تو صبح پیتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- سِقَاء: مشک، مشکیزہ ج أسقية۔ یو کا: مشک یا تھیلی وغیرہ کو ڈوری سے باندھ دیا جائے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ لفظ "یو کی" "الف مقصورہ کے ساتھ ہے، کیونکہ اسکے حرف اصلی "و کی" ہیں، لہذا یہ معتل ہے، مہموز نہیں، اسلئے اسے ہمزہ کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا درست نہیں۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الأشربة، باب إباحة النبيذ ۱۶۸/۲۔ أعْلَاه: "ہ" ضمیر "سقاء" کیطرف لوٹ رہی ہے، : اس مشک کا اوپر والا دہانہ۔ عزلاء: (عین کے فتح، زاء کے سکون اور الف ممدودہ کے ساتھ) مشکیزہ یا برتن کے اس نچلے سوراخ کو کہا جاتا ہے جس سے پانی نکال کر پیا جاتا ہو۔ ننبذ: کھجور پانی میں بھگو کر نبیذ بناتے تھے۔ غُدْوَة: (غین کے پیش کے ساتھ) طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان کا وقت ج غُداً، و غُدُوٌّ۔ عشاء: (عین کے کسرے، شین کے فتح اور مد کے ساتھ) زوال شمس سے غروب آفتاب تک۔

حضور اکرم ﷺ کیلئے نبیذ بنانیکا ذکر

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ کیلئے نبیذ بنانے کا ذکر ہے کہ آپ کیلئے مشکیزہ میں نبیذ بنائی جاتی تھی، جس کے دو دہانے تھے، ایک اوپر اور ایک نیچے، اوپر کا منہ ڈوری وغیرہ سے بند کر دیا جاتا تھا، اور نیچے کے دہانے سے نبیذ نکال کر پی جاتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ مشکیزے میں نبیذ بنانا جائز ہے۔

ایک تعارض اور اسکا جواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیلئے اگر صبح کے وقت نبیذ بنائی جاتی تو آپ اسے شام کے وقت پی لیتے، اور شام کو بنائی جاتی تو صبح پی لیتے، اس سے زیادہ وقت کیلئے اس نبیذ کو نہ رکھا جاتا جبکہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "آپ کیلئے نبیذ بنائی

جاتی تو آپ اسے اس دن، دوسرے دن اور تیسرے دن کی شام تک پیتے تھے، پھر بھی اگر کچھ نبیذ بچ جاتی تو خادم کو پلا دیتے یا اسے گرا دیتے''

ان دونوں احادیث میں بظاہر تعارض ہے، شارحین حدیث نے اس کے تین جواب دیئے ہیں:

(۱)......حدیث عائشہ میں گو کہ ایک ہی دن پینے کا ذکر ہے، لیکن اس سے زیادہ دنوں کی چونکہ اس میں نفی نہیں ہے اسلئے دونوں احادیث میں تعارض نہیں۔

(۲)......دونوں احادیث دو مختلف اوقات کے اعتبار سے ہیں، حدیث عائشہ موسم گرما سے متعلق ہے، اس میں عموماً ایسی چیز ایک دن کے بعد خراب ہو جاتی ہے، کیونکہ اس زمانے میں اس طرح کی چیز کو زیادہ مدت کیلئے رکھنے کا موجودہ دور کیطرح کوئی بندوبست نہیں تھا اور ابن عباس کی حدیث موسم سرما سے متعلق ہے، سردی میں ایسی چیز تین دن تک خراب نہیں ہوتی، اس لحاظ سے ان میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ تکملۃ فتح الملهم، کتاب الاشربۃ، باب إباحۃ النبیذ ۳/۶۴۵۔

(۳)......بعض نے کہا کہ حدیث عائشہ میں تھوڑی نبیذ کا ذکر ہے، جو ایک ہی دن میں ختم ہو جاتی ہے، اور حدیث ابن عباس نبیذِ کثیر پر محمول ہے، جو تین دن تک پی جاسکے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب إباحۃ النبیذ ۲/۱۶۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْحُبُوْبِ الَّتِيْ يُتَّخَذُ مِنْهَا الْخَمْرُ

یہ باب ان دانوں (یعنی اشیاء واجناس) کے بارے میں ہے جن سے شراب بنائی جاتی ہے۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ مِنَ الْحِنْطَةِ خَمْراً، وَمِنَ الشَّعِيْرِ خَمْرًا، وَمِنَ التَّمْرِ خَمْرًا، وَمِنَ الزَّبِيْبِ خَمْرًا، وَمِنَ الْعَسَلِ خَمْرًا.

نعمان بن بشیر سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک گندم کی شراب ہوتی ہے، جو کی شراب ہوتی ہے، کھجور کی شراب ہوتی ہے، کشمش کی شراب ہوتی ہے، اور شہد کی شراب بنتی ہے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ: إِنَّ مِنَ الْحِنْطَةِ خَمْرًا

عمر بن خطاب سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ بیشک گندم کی شراب بنتی ہے۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ یَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الخَمْرُ مِنْ هَاتَیْنِ الشَّجَرَتَیْنِ: النَّخْلَةِ وَالْعِنَبَةِ.

ابوکثیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوھریرۃ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شراب ان دو درختوں یعنی کھجور اور انگور سے (بنتی) ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- الحبوب: حَبٌّ کی جمع ہے: دانہ، بیج، یہاں وہ چیزیں مراد ہیں جن سے شراب بنائی جاتی ہے۔ یتخذ: (مجہول کا صیغہ ہے) بنائی جاتی ہے۔ الحنطة: گندم۔ الشعیر: جو۔ التمر: کھجور۔ زبیب: کشمش۔ العسل: شہد۔ النخلة: کھجور کا درخت ج نَخلٌ و نَخِیلٌ۔ العنبة: انگور کی بیل۔

انگور کے علاوہ دیگر چیزوں کی شراب پر ''خمر'' کا اطلاق مجازاً ہے

حدیث باب سے جمہور یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کی شراب پر خمر کا اطلاق حقیقۃً ہوتا ہے، لہٰذا اسپر شراب کے احکام ہی جاری ہونگے، جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ خمر کا اطلاق شرعاً اور لغۃً صرف انگور کی شراب پر ہی ہوتا ہے، اور دیگر چیزوں کی شراب پر ''خمر'' کا لفظ مجازاً استعمال کیا گیا ہے، یہ مشروبات، ''خمر'' کے حکم میں ہیں، ....مزید تفصیل کیلئے کتاب الاشربہ کی ابتدائی مباحث دیکھ لی جائیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ خَلِیْطِ الْبُسْرِ وَالتَّمْرِ

یہ باب نیم پختہ اور خشک کھجور ملا کر نبیذ بنانے کے حکم کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عبدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَی أَنْ یُّنْتَبَذَ الْبُسْرُ وَالرُّطَبُ جَمِیْعًا.

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نیم پختہ اور تازہ کھجور ملا کر نبیذ بنانے سے منع کیا ہے۔

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهَی عَنِ الْبُسْرِ وَالتَّمْرِ أَنْ یُّخْلَطَ

بَيْنَهُمَا،وَنَهَى عَنِ الزَّبِيْبِ وَالتَّمْرِ أَنْ يُخْلَطَ بَيْنَهُمَا،وَنَهَى عَنِ الْجِرَارِ أَنْ يُنْتَبَذَ فِيْهَا.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نیم پختہ اور خشک کھجور ملا کر نبیذ بنانے سے منع کیا ہے،اور کشمش اور خشک کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع کیا ہے،اور مٹکوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- خلیط: مختلف چیزوں کو ملانا۔البُسر:(باء پر پیش اور سین کے سکون کے ساتھ): نیم پختہ کھجور، گدر کھجور۔التمر: خشک کھجور، چھوہارا، کھجور۔رطب: پکی ہوئی تازہ کھجور۔زبیب: خشک انگور یعنی کشمش، منقی، جرار: جرّۃ کی جمع ہے: مٹکے۔

خلیطین کا مسئلہ

حضور اکرم ﷺ نے نیم پختہ اور خشک کھجور، کشمش رمنقی اور کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا تھا، کیونکہ اسطرح دونوں کو ملانے سے جلد نشہ پیدا ہو جاتا ہے، ممانعت کا یہ حکم اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے،اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے،جسکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......امام مالک،امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کے نزدیک دو مخلوط چیزوں کی نبیذ علی الاطلاق حرام ہے،خواہ اس میں نشہ کی کیفیت ہو یا نہ ہو،ان کا استدلال احادیث باب سے ہے،جن میں مخلوط نبیذ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲)......جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ دو مخلوط چیزوں کی نبیذ بنانے کے متعلق جو ''نہی'' احادیث میں منقول ہے،اس سے ''مکروہ تنزیہ'' مراد ہے،لہذا اسطرح کی نبیذ جب تک نشہ آور نہ ہو،اسکا کراہت کے ساتھ استعمال جائز ہے،حرام نہیں،امام نووی رحمہ اللہ نے امام شافعی کا مسلک بھی یہی قرار دیا ہے۔

(۳)......احناف کے نزدیک دو مخلوط چیزوں کی نبیذ میں کوئی حرج نہیں، بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ نشہ آور نہ ہو۔عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب من رای ان لایخلط البسر ۲۱/۱۸۳، فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب

من رای ان لایخلط البسر ۱۰/۸۵۔

امام نووی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر اس مسئلہ میں تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''یہ تو صاحب شریعت ﷺ سے ''منابذہ'' یعنی اختلاف کرنا ہے، کیونکہ اس بارے میں ممانعت کی صحیح اور صریح احادیث موجود ہیں، اور اگر احادیث نہی کی وجہ سے حرام نہیں تو کم از کم اسے مکروہ ضرور قرار دینا چاہیے'' شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب کراھۃ الانتباذ التمر والزبیب مخلوطین ۲/۱۶۴

لیکن علامہ عینی رحمہ اللہ نے امام نووی کی تردید فرمائی ہے، اور کہا ہے کہ:

''یہ تو امام اعظم کے بارے میں ایک بھیانک جرأت ہے، کیونکہ امام صاحب نے اپنی طرف سے یہ بات نہیں کہی ہے بلکہ احادیث کو بنیاد بنا کر یہ مسلک اختیار کیا ہے'' عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب من رای ان لایخلط البسر ۲۱/۱۸۴۔

احناف کے دلائل

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسلک کیلئے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

(۱)......صفیہ بنت عطیہ کہتی ہیں کہ میں قبیلہ عبدالقیس کی کچھ عورتوں کے ساتھ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور ان سے ہم نے کھجور اور کشمش یا منقی کی مخلوط نبیذ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ایک مٹھی کھجور اور ایک مٹھی کشمش لیتی پھر اس کو ایک برتن میں ڈال دیتی، اور انہیں پانی میں ڈالکر ہاتھ سے ملتی اور گھلا دیتی، اور پھر نبی کریم ﷺ کو پلا دیتی۔

(۲)......سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے کشمش کی نبیذ بنائی جاتی تو اس میں کھجور ڈالی جاتی، اور کھجور کی نبیذ بنائی جاتی تو اس میں کشمش ڈالی جاتی، دونوں روایات کیلئے دیکھیے: سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، باب فی الخلیطین ۲/۵۲۱۔

(۳)......امام محمد رحمہ اللہ نے ''کتاب الاثار'' میں حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی خلیطین کا استعمال نقل کیا ہے۔

(۴)......کتاب الاثار میں ہے کہ ابن زیاد نے عبداللہ بن عمر کے پاس افطار کیا، تو انہوں نے افطاری کے

وقت انہیں نبیذ پلایا، جس سے ان کو نشہ ہو گیا، صبح کے وقت ابن عمر سے کہنے لگے کہ یہ کیسی نبیذ تھی جس کے پینے کے بعد میرے لئے (نشہ کی وجہ سے) گھر جانا بھی دشوار ہو گیا تھا، تو حضرت عبداللہ بن عمر نے جواب دیا کہ ہم نے اس میں کشمش/منقی اور عجوہ کھجور ہی ڈالی تھی، اسکے علاوہ تو اس میں اور کوئی چیز نہیں ملائی تھی۔

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دو مخلوط چیزوں کی نبیذ بنانا اور اسکا استعمال جائز ہے بشرطیکہ وہ نشہ آور نہ ہوں۔

احادیث باب کو حنفیہ نے ان روایات سے منسوخ قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں اسکی ممانعت تھی لیکن بعد میں اسکی اجازت دیدی گئی تھی، جس طرح کہ شراب کی حرمت کے ساتھ اسکے مخصوص برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دیدیا گیا تھا، پھر جب حرمتِ شراب ذہنوں میں راسخ ہو گئی تو ان برتنوں کا استعمال دوبارہ جائز کر دیا گیا، البتہ عصر حاضر کے بعض محقق حضرات فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں علی الاطلاق جواز کے بجائے مکروہ تنزیہی کا قول اختیار کیا جائے تو جواز اور نہی دونوں طرح کی احادیث کے درمیان ایک بہترین تطبیق ہو جاتی ہے اور دونوں قسم کی احادیث پر عمل ہو جاتا ہے، اور نسخ کی تاویل کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، جیسا کہ امام نووی کی رائے ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الاشربۃ، باب کراھۃ انتباذ التمر والزبیب مخلوطین ۳/۶۱۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الشُّرْبِ فِيْ آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

یہ باب سونے چاندی کے برتنوں میں پینے کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنِ الْحَكَمِ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ أَبِيْ لَيْلٰى يُحَدِّثُ أَنَّ حُذَيْفَةَ اسْتَسْقَى فَأَتَاهُ إِنْسَانٌ بِإِنَاءٍ مِنْ فِضَّةٍ فَرَمَاهُ بِهٖ وَقَالَ إِنِّيْ كُنْتُ قَدْنَهَيْتُهُ فَأَبَى أَنْ يَنْتَهِيَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الشُّرْبِ فِيْ آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلُبْسِ الْحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ. وَقَالَ: هِيَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ.

حکم سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی لیلیٰ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت حذیفہ نے پانی طلب کیا، تو کوئی انسان چاندی کے برتن میں ان کے پاس

پانی لایا، تو حضرت حذیفہ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا کہ میں نے اسے منع (بھی) کیا تھا لیکن اسکے باوجود یہ اس سے باز نہیں آیا، بیشک رسول اکرم ﷺ نے سونے، چاندی کے برتنوں میں پانی پینے سے، ریشم اور دیباج پہننے سے منع کیا ہے، اور فرمایا کہ یہ چیزیں کافروں کیلئے دنیا میں ہیں، اور تمہارے لئے آخرت میں ہونگی۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- انیة: اِناء کی جمع ہے: برتن۔ استسقی: پانی طلب کیا۔ فأبیٰ ان ینتھی: اسکا لفظی ترجمہ ہے: اس نے باز آنے سے انکار کر دیا، مراد یہ ہے کہ وہ باز نہیں آیا۔ الحریر: ریشم۔ الدیباج: ریشمی قیمتی کپڑا جس کے تانے بانے دونوں ریشم کے ہوں۔

سونے چاندی کے برتن استعمال کرنیکا حکم

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان مرد وعورت کیلئے سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں ہے، یہی چاروں اماموں کا مسلک ہے، حدیث باب میں ہے کہ حضرت حذیفہ نے پانی طلب کیا، بخاری کی روایت میں عراق کے شہر "مدائن" کا بھی ذکر ہے کہ اس میں یہ واقعہ پیش آیا، حضرت حذیفہؓ نے منع کیا کہ سونے، چاندی کے برتنوں میں پانی نہ دیا جائے، اسکے باوجود اس پر عمل نہیں کیا گیا، چنانچہ بخاری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے اس برتن کو پھینک دیا، اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کیلئے سونے چاندی کے برتن اور مردوں کیلئے ریشم کا استعمال حرام قرار دیا ہے۔ اور فرمایا: هِيَ لَهُمْ فِيْ الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الآخِرة.

اس جملے سے یہ مقصود نہیں کہ سونے چاندی کے برتن اور ریشم کفار کیلئے دنیا میں جائز قرار دیئے گئے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ کفار دنیا میں اپنی چاہت کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں، ان کی نظر میں جائز وناجائز اور حلال وحرام کی کوئی حیثیت نہیں، وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور لباس میں بھی مسلمانوں کے خلاف ریشم کا لباس اور عام برتنوں کے مقابلے میں سونے چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، ان کی اس آزادی اور طرز زندگی کو "هی لهم فی الدنیا" سے بیان کیا ہے، اور مسلمان چونکہ آزاد نہیں، بلکہ اسلامی حدود وضوابط کا پابند ہے، ہر وہ چیز جس سے انسان آخرت سے غافل ہو جائے اور

جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنے، اس سے منع کیا ہے، اور اجر بتا دیا کہ اگر تم اس کے مطابق زندگی گذارو گے تو یہ یہ نعمتیں تمہیں آخرت میں حاصل ہونگی، لہذا اگر دنیا میں سونے چاندی کے برتن اور ریشم کے استعمال سے پرہیز کرو گے تو یہ نعمتیں تمہیں آخرت میں عطا کی جائیگی اور کافر محروم ہونگے، اسی کو ولکم فی الاخرۃ سے بیان کیا ہے۔ عمدۃ القاری، کتاب الاطعمة، باب الأکل فی إناء مفضض، ۶۰/۲۱، تحفۃ الاحوذی، کتاب الاشربۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ الشرب فی آنیۃ الذھب والفضۃ ۵۰۹/۵۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ النَّهْيِ عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا

یہ باب کھڑے ہوکر (کھانے) پینے کی ممانعت کے بارے میں ہے

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا. فَقِيْلَ: الْأَكْلُ؟ قَالَ: ذَاكَ أَشَدُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہوکر پینے سے منع کیا ہے، تو پوچھا گیا کہ کھانا؟ تو آپ نے فرمایا کہ (کھڑے ہوکر) کھانا تو اس سے کہیں زیادہ سختی سے منع ہے۔

عَنِ الْجَارُوْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا.

جارود بن علاد سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہوکر پینے سے منع فرمایا ہے۔

عَنِ الْجَارُوْدِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : ضَآلَّةُ الْمُسْلِمِ حَرَقُ النَّارِ .

جارود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی گمشدہ چیز (اپنی ملکیت میں لے لینا گویا) جہنم کی آگ کا شعلہ (لینا) ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرُّخْصَةِ فِيْ الشُّرْبِ قَائِمًا

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں کھڑے ہوکر پانی پینے کی اجازت کا ذکر ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: كُنَّا نَأْكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ نَحْنُ نَمْشِيْ

وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَامٌ.

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے زمانے میں چلتے پھرتے کھالیا کرتے تھے اور کھڑے ہوکر پانی پی لیا کرتے تھے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ شَرِبَ مِنْ زَمْزَمَ وَهُوَ قَائِمٌ.

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آب زمزم کھڑے ہوکر پیا۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَشْرَبُ قَائِمًا وَ قَاعِدًا.

عمرو بن شعیب کے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کھڑے ہوکر پانی پیتے ہوئے دیکھا اور بیٹھ کر بھی۔

مشکل الفاظ کے معنی:- ضالة: گمشدہ چیز، گمشدہ چوپائے اونٹنی وغیرہ۔ حَرَق: (حاء اور راء پر زبر کے ساتھ) آگ، آگ کی لپٹ شعلہ۔ قِیَام: قائم کی جمع ہے: کھڑے ہونا۔ زمزم: (غیر منصرف ہے): مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے قریب ایک بابرکت کنواں ہے، جسکا شیریں پانی حاجی حضرات پیتے ہیں، اور تبرک کے طور پر اپنے وطن لے جاتے ہیں۔

کھڑے ہوکر پانی پینے کا مسئلہ

کھڑے ہوکر پانی پینے کے بارے میں روایات مختلف ہیں، بعض روایات میں ممانعت منقول ہے، جبکہ دیگر بعض روایات سے اسکا جواز ثابت ہوتا ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہاں دونوں طرح کی روایات ذکر فرمائی ہیں، پہلے باب میں ان روایات کو ذکر فرمایا جن سے کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، اور دوسرے باب میں وہ روایات ذکر فرمائی ہیں جن سے جواز ثابت ہوتا ہے، اسکے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی دونوں قسم کی روایات موجود ہیں، بظاہر ان روایات میں تعارض ہے، حضرات محدثین نے اس تعارض کے حل کیلئے تین طریقے اختیار کئے ہیں نسخ، ترجیح اور تطبیق، جسکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ احادیثِ نہی، جواز کی احادیث سے منسوخ ہوگئی ہیں، یعنی پہلے کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت تھی، لیکن بعد میں یہ ممانعت منسوخ ہوگئی۔

(۲)......ابوبکر اثرم نے احادیثِ جواز کو احادیث نہی پر ترجیح دی ہے، کیونکہ احادیثِ جواز، احادیث نہی کے مقابلے میں زیادہ قوی اور مضبوط ہیں۔

(۳)......اکثر حضرات نے دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق دی ہے، یہ تطبیق دو طرح سے دی گئی ہے:

(الف): امام طحاوی فرماتے ہیں کہ کھڑے ہوکر پانی پینا چونکہ طبی لحاظ سے صحت کیلئے نقصان دہ ہوتا ہے، اسلئے کھڑے ہوکر پینے سے منع کیا گیا ہے، لہذا کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت والی احادیث ضرر طبی کے اعتبار سے ہیں، اور احادیثِ جواز شرعی اجازت پر محمول ہیں۔

(ب): ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک احادیثِ نہی سے نہی تنزیہی مراد ہے، یعنی کھڑے ہوکر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے، تاہم دوسری احادیث کی وجہ سے اسکا جواز بھی ہے، اور کراہت تنزیہی بھی اس وقت ہے جب بیٹھکر پینا ممکن ہو، لیکن اگر کسی مقام پر بیٹھ کر پینا ناممکن ہو یا انتہائی مشقت ہو تو پھر کھڑے ہوکر پانی پینا مکروہ بھی نہیں ہوگا۔

یہ تمام اختلاف کھڑے ہوکر پانی پینے کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں ہے، باقی اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بیٹھ کر پانی پینا افضل ہے، اور حضور اکرم ﷺ کا عام معمول بھی بیٹھ کر ہی پانی پینے کا تھا، اگرچہ امت کی تعلیم وتبلیغ اور بیان جواز کیلئے آپ نے کبھی کبھار کھڑے ہوکر بھی پیا ہے، جیسے آپ نے سوار ہوکر طواف کیا ہے جبکہ پیدل چل کر طواف کرنا افضل ہے۔

اس سے یہ شبہہ بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب کھڑے ہوکر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے تو پھر آپ نے کھڑے ہوکر پانی کیسے پیا، کیونکہ آپ ﷺ تو مکروہ تنزیہی کا ارتکاب بھی نہیں فرماتے تھے، اس کا جواب یہی ہے کہ آپ نے ایسا بیانِ جواز کیلئے کیا ہے، اور جو عمل امت کو سکھانے کیلئے کیا جائے وہ مکروہ نہیں ہوتا بلکہ اسے کر کے دکھانا ایک نبی کی شرعی ذمہ داری ہوتی ہے، اسلئے یہ کہنا کہ آپ نے مکروہ تنزیہی والا عمل کیا ہے، درست نہیں ہے، فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب الشرب قائما ۱۰/۱۰۱، ۱۰۴، تکملۃ فتح الملھم، کتاب

للأطعمة، باب کراھیۃ الشرب قائما ۴/۹، ۱۲۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی کھڑے ہوکر ہرگز پانی نہ پیئے، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِئْ، اور جو بھولے سے کھڑے ہوکر پی لے تو اسے قے کرلینی چاہیے۔

اس حدیث میں قے کرنے کا حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے کہ ایسے شخص کیلئے بہتر ہے کہ وہ قے کرلے خواہ اس نے بھولے سے کھڑے ہوکر پیا ہو یا جان بوجھکر ایسا کیا ہو، اور اگر کوئی شخص ایسے موقع پر قے نہ کرے تو شرعاً اسپر کوئی حرج نہیں ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب فی الشرب قائما ۲/۱۷۳

آب زمزم پینے کا مسنون طریقہ

آب زمزم کھڑے ہوکر پیا جائے یا بیٹھ کر، اسکے متعلق علماء کے تین قول ہیں:

(۱)......بعض کے نزدیک عام پانی کیطرح زمزم بھی بیٹھکر پینا افضل ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے جو کھڑے ہوکر آب زمزم نوش فرمایا، وہ بیان جواز کیلئے تھا یا لوگوں کے ہجوم واژدحام کی وجہ سے تھا یا اس جگہ پر کیچڑ تھا جسکی وجہ سے بیٹھا نہیں جاسکتا تھا۔ خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی باب ماجاء فی صفۃ شراب رسول اللہ ﷺ: ۱۹۷

(۲)......بعض حضرات نے کھڑے ہوکر پینے اور بیٹھ کر پینے میں اختیار دیا ہے، ان کے نزدیک دونوں طریقے برابر ہیں، کوئی ایک دوسرے سے افضل نہیں۔ رد المختار، کتاب الطھارۃ، مطلب فی مباحث الشرب قائما، ۱/۹۵

(۳)......اکثر علماء نے آب زمزم کو کھڑے ہوکر پینا مستحب اور افضل قرار دیا ہے۔ ایضاً ومستدرک حاکم، الشرب من زمزم وادابہ ۱/۴۷۲۔

زمزم پینے کے آداب

(۱)......قبلہ رخ ہوکر پیا جائے۔

(۲)......تین سانس میں پیا جائے، اور ہر دفعہ کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد اللہ کہا جائے۔

(۳)......خوب پیٹ بھر کر پیا جائے۔

زمزم پینے سے پہلے جو دعا کی جائے، قبول ہوتی ہے، کئی علماء نے اس موقع پر دعا کی قبولیت کا ذکر کیا ہے۔ سنن ابن ماجۃ، کتاب المناسک، باب الشرب من زمزم (ص:۲۲۱) اسلئے مکمل ادب و احترام کے ساتھ، یہ پانی پینے سے پہلے اپنے لئے دعا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّنَفُّسِ فِي الإِنَاءِ

یہ باب برتن میں سانس لینے کے بارے میں ہے

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَنَفَّسُ فِيْ الإِنَاءِ ثَلاثًا وَيَقُوْلُ: هُوَ أَمْرَأُ وَأَرْوَى.

انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ (پانی پیتے وقت) برتن میں تین سانس لیتے تھے، اور فرماتے کہ (اسطرح پینا) زیادہ خوشگوار اور زیادہ سیرابی کا باعث ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَنَفَّسُ فِيْ الإِنَاءِ ثَلاثًا.

انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ (پانی پینے کے وقت) برتن میں تین سانس لیتے تھے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاتَشْرَبُوْا وَاحِدًا كَشُرْبِ الْبَعِيْرِ وَلٰكِنِ اشْرَبُوْا مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَسَمُّوْا إِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ، وَاحْمَدُوْا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم اونٹ کیطرح ایک سانس میں مت پیو، بلکہ دو سانس یا تین سانس سے پیو، اور جب پینے کا ارادہ کرو تو اللہ کا نام لو، اور جب برتن منہ سے ہٹاؤ (یعنی پی کر فارغ ہو جاؤ) تو اللہ کا شکر ادا کرو۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- التنفس فی الانساء: برتن میں سانس لینا۔ أمرأ: زیادہ مرغوب، زیادہ

خوشگوار۔أَرْوٰی: زیادہ سیراب کرنے والا۔وَاحِداً: یعنی شُرباً وَاحِداً ایک ہی دفعہ یعنی ایک سانس میں پینا۔اِذَا رَفَعْتُمْ: جب تم برتن کو منہ سے ہٹاؤ۔

پانی پیتے وقت سانس لینے کا مسنون طریقہ

سنت یہ ہے کہ پانی پینے کے درمیان تین سانس لیے جائیں، یہ سانس برتن کے اندر نہیں بلکہ برتن سے منہ کو الگ کر کے سانس لئے جائیں، ایک ہی سانس میں یکبارگی پانی پینا گو جائز ہے لیکن بہتر نہیں، اور اسطرح پینے سے طبی لحاظ سے بہت نقصانات بھی ہیں۔

نبی کریم ﷺ عموماً ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پانی پیتے تھے، اور فرماتے کہ اس انداز سے پانی پینا زیادہ پرلطف، خوشگوار، زیادہ سیرابی اور پیاس بجھانے کا باعث ہوتا ہے، جبکہ ایک ہی سانس میں پینے سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے، حدیث باب میں ایک ہی سانس میں یکبارگی پانی پینے کو اونٹ کے پینے کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ وہ اسی طرح پیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ تم دو یا تین سانسوں میں پانی پیا کرو، پینے سے پہلے بسم اللہ اور آخر میں اللہ کی حمد وثناء کی جائے۔

پانی پینے کے آداب

پانی پینے کے مندرجہ ذیل آداب مختلف احادیث میں منقول ہیں:

(۱)......پانی بیٹھ کر پیا جائے۔

(۲)......دائیں ہاتھ سے پیا جائے۔

(۳)......ابتداء میں بسم اللہ پڑھی جائے۔

(۴)......تین سانسوں میں پیا جائے اور ہر سانس کے ساتھ الحمد اللہ کہا جائے۔

(۵)......گلاس کے اندر سانس نہ لیا جائے بلکہ گلاس کو منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔

(۶)......اور پینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، اس کیلئے صرف ''الحمد للہ'' کہد ینا بھی کافی ہے تحفۃ الاحوذی ۶/۸

اور بعض علماء سے یہ دعا بھی منقول ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِی بِرَحْمَتِهٖ مَاءً اعَذْباً بَارِداً فُرَاتاً، وَلَمْ یَجْعَلْهُ بِذُنُوْبِی مِلْحاً أُجَاجاً.

''تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے مجھے محض اپنی رحمت سے میٹھا، ٹھنڈا اور خوشگوار پانی پلایا، اور اسے میرے گناہوں کی وجہ سے نمکین اور کھاری نہیں بنایا''

بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الشُّرْبِ بِنَفَسَيْنِ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں دو سانسوں سے پینے کا ذکر ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا شَرِبَ يَتَنَفَّسُ مَرَّتَيْنِ.

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بھی پانی پیتے تو دو مرتبہ سانس لیتے تھے۔

پانی پیتے وقت دو سانس لینا بھی جائز ہے

پچھلے باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کا عام معمول ذکر فرمایا کہ آپ پانی پیتے وقت برتن سے منہ الگ کر کے تین سانس لیتے تھے، یہی مسنون طریقہ ہے، اس باب میں یہ ذکر کیا کہ آپ ﷺ سے دو سانس میں پانی پینا بھی ثابت ہے، اسلئے یہ عمل گو جائز ہے تاہم اس طرح پینے کا عام معمول نہیں بنانا چاہیے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں یہ امکان ہے کہ راوی نے تیسرے سانس کا ذکر نہ کیا ہو، اس لئے دو سانسوں سے پانی پینے کے بارےمیں حدیث باب سے استدلال کرنا تام نہیں ہے ۔

تحفۃ الاحوذی ۸/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ النَّفْخِ فِيْ الشَّرَابِ

یہ باب مشروب میں پھونک مارنے کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ النَّفْخِ فِيْ الشَّرَابِ. فَقَالَ

رَجُلٌ: اَلْقَـذَاةَ أَرَاهَا فِيْ الإِنَاءِ؟فَقَالَ: أَهْرِقْهَا،فَقَالَ: فَإِنِّيْ لَاأَرْوَى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ؟ قَالَ: فَأَبِنِ الْقَدَحَ إِذاً عَنْ فِيْكَ.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مشروب (یعنی پینے کے برتن) میں پھونک مارنے سے منع کیا ہے،تو کسی آدمی نے عرض کیا: اگر میں برتن میں تنکا (وغیرہ) دیکھوں، تب بھی (پھونک نہیں مارسکتا) ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس تنکے کو بہادو، (اور ممکن ہے کہ پھونک مارنے کی ممانعت سے اس نے یہ بھی سمجھا ہو کہ پانی پینے کے دوران سانس بھی نہیں لینا، بلکہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پینا ہے، اس لئے) اس نے عرض کیا کہ بیشک میں تو ایک سانس میں پینے سے سیراب نہیں ہوتا، آپ نے فرمایا کہ (اسطرح پیو کہ پہلے تھوڑا سا پی کر) پیالہ کو اپنے منہ سے ہٹالو (اور برتن سے باہر سانس لے کر پھر پی لو)۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يُتَنَفَّسَ فِيْ الإِنَاءِ أَوْ يُنْفَخَ فِيْهِ.

عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ (کسی بھی مشروب کو پیتے وقت) برتن میں ہی سانس لیا جائے، یا اس میں پھونک ماری جائے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- النفخ: پھونک مارنا۔ القذاۃ: آنکھ یا پانی وغیرہ میں گرنے والا تنکا یا ذرہ۔ ''القذاۃ'' یہ لفظ ترکیب نحوی کے اعتبار سے مفعول ما اضمر عاملہ علی شریطۃ التفسیر ہے، اسلئے یہ حالت نصب میں ہے۔ أَهْرِقْهَا: اس پانی کو بہادیجئے۔ اس میں ''ھا'' ضمیر بعض کے نزدیک ''قذاۃ'' کیطرف لوٹ رہی ہے، اور ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر ''ماء'' کیطرف راجع ہے، اور لفظ ''ماء'' کبھی مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۱۰۴/۸۔ أَبِنْ: یہ باب افعال سے صیغہ امر حاضر ہے ''ابانۃ'' سے، اسکے معنی ہیں: ہٹالو، الگ کردو، جدا کردو۔ عَنْ فِيْكَ: اپنے منہ سے۔ يُتَنَفَّسُ فِيْ الإِنَاءِ: برتن میں سانس لیا جائے۔

پانی وغیرہ میں پھونک مارنا مکروہ ہے

نبی کریم ﷺ نے پانی وغیرہ میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے، ایک آدمی نے پوچھا کہ اگر اس پانی میں کوئی تنکا ہو تو اسے بھی نکالنے کیلئے پھونک نہیں مار سکتے، آپ نے فرمایا، اس تنکے کو نکالنے کیلئے کچھ پانی بہادو، اس نے شاید یہ سمجھا کہ جب پھونک نہیں مار سکتے تو پانی پینے کے دوران سانس بھی نہیں لے سکتے، اسلئے وہ کہنے لگا کہ میں تو ایک سانس میں پینے سے سیراب نہیں ہوتا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ پانی پی کر وہ برتن منہ سے الگ کرلو، اور پھر سانس لیکر دوبارہ پی لو۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... پانی پیتے وقت برتن کے اندر نہیں بلکہ برتن سے باہر سانس لینا چاہیے۔

(۲)...... کبھی پانی پینے کے دوران دو سانسوں پر بھی اکتفاء کیا جاسکتا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ سے دو سانسوں میں پانی پینا ثابت ہے، تاہم آپ کا عام معمول تین سانسوں میں ہی پانی پینے کا تھا، اور کسی روایت میں یہ منقول نہیں کہ آپ نے صرف ایک ہی سانس میں کبھی پانی پیا ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک سانس میں پانی پینے کو مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

(۳)...... بعض شارحین حدیث اس حدیث کی رو سے یہ فرماتے ہیں کہ ایک ہی سانس میں پینا اس حدیث سے ثابت ہے، کیونکہ اس میں "مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ" یعنی ایک ہی سانس سے پینے کا ذکر ہے، اور نبی کریم ﷺ نے چونکہ اس شخص کو منع نہیں کیا، اسلئے یہ جائز ہے، اگر چہ یہ طریقہ پسندیدہ نہیں، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، باب الاشربۃ، الفصل الثانی ۱۰۴/۸۔

باب کی دوسری حدیث میں ہے کہ برتن میں نہ تو سانس لیا جائے اور نہ اس میں پھونک ماری جائے، کیونکہ اسطرح کرنے میں بسا اوقات پانی وغیرہ میں تھوک گرنے، اور منہ کے بدبودار جراثیم اس میں منتقل ہو جاتے ہیں، جس سے دوسرے لوگوں کو گھن محسوس ہوتی ہے، خاص طور پر جب وہ شخص کسی نشہ مثلاً حقہ، نسوار اور سگریٹ وغیرہ کا عادی ہو اور مسواک وغیرہ سے منہ بھی صاف نہ کرتا ہو تو برتن میں سانس لینے اور پھونک مارنے کی صورت میں ضرور یہ اثرات اس چیز میں پہونچ جاتے ہیں، اس لئے ان سے منع کیا گیا

ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ پانی کے اندر ہی سانس لینا چوپاؤں کا طریقہ ہوتا ہے۔

برتن میں پھونک دو وجہ سے ماری جاتی ہے:

(۱)...... یا تو اس چیز کو ٹھنڈا کرنے کیلئے۔

(۲)...... اور یا اس میں سے کسی تنکے اور ذرے کو نکالنے کیلئے یا اسے ایک طرف کرنے کیلئے، رسول اللہ ﷺ نے دونوں حالتوں میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے، لہذا اگر وہ چیز گرم ہو تو پھونکوں سے اسے ٹھنڈا نہ کیا جائے بلکہ اسے تھوڑی دیر یوں ہی رکھدیا جائے تا کہ وہ ٹھنڈی ہو جائے، ایسے ہی پانی وغیرہ میں اگر کوئی تنکا ہو تو اسے نکالنے کیلئے نہ تو پھونکیں ماری جائیں اور نہ ہی انگلی استعمال کی جائے کیونکہ اس سے طبیعت میں کراہت محسوس ہوتی ہے بلکہ اسے کسی اور تنکے اور خلال وغیرہ سے باہر نکال لیا جائے، یا اسے نکالنے کیلئے پانی کا کچھ حصہ اسکے ساتھ بہادیا جائے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الاشربۃ، ۶/۱۰ اور مرقاۃ المفاتیح ۸/۱۰۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ التَّنَفُّسِ فِيْ الإِنَاءِ

یہ باب برتن میں سانس لینے کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ قَتَادَةَ عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِيْ الإِنَاءِ.

عبداللہ بن ابی قتادہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم میں سے جب کوئی پانی (وغیرہ) پیئے تو برتن کے اندر سانس نہ لے۔

برتن کے اندر سانس لینا مکروہ ہے

پانی پیتے وقت برتن کے اندر سانس لینا مکروہ ہے، نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، برتن میں سانس لینا خلافِ تہذیب ہے، اور طبع سلیم اس سے نفرت بھی کرتی ہے، کیونکہ اسطرح کرنے سے برتن میں لعاب وغیرہ کے گرنے کا قوی امکان ہوتا ہے، جو دوسروں کیلئے بہرحال باعثِ اذیت ہوتا ہے، اس لئے برتن میں سانس سے احتراز ہی کرنا چاہیے۔ عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب النھی عن التنفس فی الاناء ۔ ۲۱/۲۰۰

ایک تعارض اوراسکا جواب

حدیثِ باب بظاہر حضرت انس کی حدیث کے ساتھ متعارض ہے، کیونکہ حدیث باب میں نبی کریم ﷺ نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے، جبکہ حدیث انس میں ہے کہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَنَفَّسُ فِي الإِنَاءِ ثَلٰثًا کہ رسول اللہ ﷺ برتن میں تین بار سانس لیتے تھے۔

شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں حقیقۃً کوئی تعارض نہیں ہے، دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے، حدیث باب میں ممانعت کا حکم اس وقت ہے جب برتن کے اندر ہی سانس لیا جائے، اور برتن کو منہ سے دور نہ کیا جائے، اور برتن کو منہ سے الگ کر کے جب سانس لیا جائے تو اس میں کوئی کراہت نہیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ ایسا ہی کرتے تھے کہ برتن کو منہ سے دور کر کے سانس لیتے تھے، حضرت انس کی حدیث میں اسی کو بیان کیا گیا ہے، اس لئے دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ فتح الباری، کتاب الأشربۃ، باب الشرب بنفسین اوثلاثۃ ۱۰/۱۱۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ اخْتِنَاثِ الأَسْقِيَةِ

یہ باب مشکیزوں سے منہ لگا کر پینے کے (حکم) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رِوَايَةً: أَنَّهُ نَهَى عَنِ اخْتِنَا ثِ الأَسْقِيَةِ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مشکیزوں سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع کیا ہے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- اختناث: خنث سے باب افتعال کا مصدر ہے: مشک کے منہ کو اوپر کیطرف موڑ کر اندر سے پانی پینا۔ الَاَسْقِيَة: سقاء کی جمع ہے: مشکیزہ۔

مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پینے کا حکم

حضور اکرم ﷺ نے مشکیزے وغیرہ کا منہ موڑ کر اس سے براہ راست پانی پینے سے منع فرمایا ہے، محدثین نے اس ممانعت کی مختلف مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں:

(۱)...... بسا اوقات مشکیزے کے اندر کوئی کیڑا اور دوسرے حشرات چلے جاتے ہیں، جو براہ راست منہ لگا کر پینے سے وہ پیٹ میں جاسکتے ہیں، اسلئے منع فرمایا۔

(۲)......اس طرح پینے میں ضرورت سے زیادہ پانی صرف ہوتا ہے، اور پانی کے ضیاع کا خدشہ ہوتا ہے۔

(۳)...... کپڑوں اور جسم وغیرہ پر پانی گرنے کا قوی امکان ہوتا ہے۔

(۴)...... مشکیزے سے منہ لگا کر پینے سے بسا اوقات پانی پیٹ میں زیادہ مقدار میں چلا جاتا ہے، جو معدے کیلئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت کراہت تنزیہی کے درجے میں ہے، اس سے حرام مراد نہیں ہے، کیونکہ ایسی روایات موجود ہیں جن سے مشکیزے سے براہ راست منہ لگا کر پانی پینے کا جواز ثابت ہوتا ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اگلے باب میں اسی رخصت کا ذکر فرمایا ہے۔ فتح الباری کتاب الاشربۃ، باب الشرب من فم السقاء ۱۰/۱۱۲

بَابُ الرُّخْصَةِفِیْ ذٰلِکَ

یہ باب مشک کے منہ سے پانی پینے کے جواز کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أُنَيْسٍ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِیَّ ﷺ قَامَ إِلٰی قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ فَخَنَثَهَا ثُمَّ شَرِبَ مِنْ فِيْهَا.

عبداللہ بن انیس کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہیں، اتنے میں آپ نے مشک کا منہ اوپر کیطرف موڑا اور پھر اس کے منہ سے پانی پیا۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِیْ عَمْرَةَ عَنْ جَدَّتِهٖ كَبْشَةَ قَالَتْ: دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَشَرِبَ مِنْ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا فَقُمْتُ إِلٰی فِيْهَا فَقَطَعْتُهٗ.

عبدالرحمن بن ابی عمرۃ اپنی دادی حضرت کبشہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے، تو آپ نے کھڑے کھڑے

لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے پانی پیا، پھر میں مشک کے منہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور اس حصے کو کاٹ لیا (جس پر حضور ﷺ کے ہونٹ مبارک لگے تھے)۔

مشک کے منہ سے پانی پینا جائز ہے

اس باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں جن سے مشک کے منہ سے براہ راست پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے، دونوں روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے کھڑے کھڑے لٹکے ہوئے مشکیزے کے منہ سے پانی پیا، حضرت کبشہ فرماتی ہیں کہ میں نے مشک کا وہ حصہ جس پر نبی کریم ﷺ کے ہونٹ مبارک لگے تھے اسے کاٹ لیا، یہ کاٹنا یا تو ادب کی وجہ سے تھا تا کہ اسے کوئی اور استعمال نہ کرے اور اس پر کسی اور کا منہ نہ لگے یا برکت کیلئے اسے رکھا گیا تا کہ اسکے ذریعہ برکت اور شفاء حاصل کی جائے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، باب الاشربۃ، الفصل الثانی ۱۰۵/۸

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے تبرکات لینا اور انہیں اپنے پاس رکھنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ انہیں ناجائز مقاصد اور اسلام کے خلاف کاموں کیلئے استعمال نہ کیا جائے۔

احادیث میں تعارض اور اسکا حل

اس باب کی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشک کے منہ سے براہ راست پانی پینا جائز ہے، کوئی حرج نہیں، جبکہ اس سے پہلے باب میں ممانعت ذکر کی گئی ہے، دونوں طرح کی روایات میں بظاہر تعارض ہے، اس تعارض کے ازالے کیلئے محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......جن احادیث میں مشک کے منہ سے پانی پینے سے منع کیا گیا ہے، اس سے وہ بڑی مشک مراد ہے جس کا منہ زیادہ بڑا اور کھلا ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح کی مشک سے پانی پینے کی بناء پر وہ تمام مفاسد پیش آتے ہیں جو پہلے ذکر کئے گئے ہیں، اور نبی کریم ﷺ کا عمل چھوٹی مشک سے متعلق ہے جسکا منہ تنگ ہوتا ہے، اور اس میں مذکورہ نقصانات کا خطرہ نہیں ہوتا۔ فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب الشرب من فم السقاء ۱۱۳/۱۰۔

(۲)......شارح ترمذی علامہ ابن العربی نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگی ضرورت کی وجہ

سے یا وقت کی تنگی کی وجہ سے یا برتن نہ ہونے کی وجہ سے مشکیزے کے منہ سے پیا ہو گویا ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا گیا، اور ممانعت والی احادیث کا تعلق عام حالات سے ہے۔ عارضۃ الاحوذی، کتاب الأشربۃ، باب ما جاء فی النھی عن اختناث الاسقیۃ ۸۲/۸۔

(۳)...... ممانعت کا تعلق دوام اور عادت سے ہے کہ اسطرح مشک سے منہ لگا کر پینے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے اس میں دیگر خرابیوں کے علاوہ مشک کے منہ میں رفتہ رفتہ بدبو پیدا ہونے لگتی ہے، اور نبی کریم ﷺ کا عمل بیان جواز کیلئے تھا۔ شرح الطیبی، کتاب الاطعمۃ باب الاشربۃ، الفصل الاول ۱۸۶/۸۔

(۴)...... علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت مکروہ تنزیہی کے درجے میں ہے، حرمت کے درجے میں نہیں، اور آپ کا عمل بیان جواز کیلئے تھا، اور مکروہ تنزیہی اور جواز دونوں میں کوئی تعارض نہیں، یہ جمع ہو سکتے ہیں۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب آداب الطعام ۱۷۳/۲۔

(۵)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ رخصت کی احادیث، ممانعت کی احادیث کیلئے ناسخ ہیں، گویا ممانعت منسوخ ہو چکی ہے۔ شرح الطیبی، ۱۸۶/۸۔ مرقاۃ المفاتیح، ۹۳/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَنَّ الْأَيْمَنِيْنَ أَحَقُّ بِالشُّرْبِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ دائیں طرف بیٹھے ہوئے لوگ (کھانے) پینے میں زیادہ حقدار ہیں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيْبَ بِمَاءٍ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ أَعْرَابِيٌّ وَعَنْ يَسَارِهٖ أَبُوْ بَكْرٍ فَشَرِبَ ثُمَّ أَعْطَى الْأَعْرَابِيَّ وَقَالَ: الْأَيْمَنُ فَالْأَيْمَنُ.

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایسا دودھ لایا گیا جس میں پانی ملایا گیا تھا، آپ ﷺ کی دائیں جانب ایک اعرابی اور بائیں جانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے، آپ ﷺ نے دودھ پیا، پھر اعرابی کو دیا اور فرمایا کہ دائیں طرف بیٹھا ہوا شخص (پانی وغیرہ دینے میں) زیادہ حقدار ہوتا ہے، پھر اسکے ساتھ والا دایاں آدمی

زیادہ حقدار ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ :- ایـمـنیـن: اَیـمَـن کی جمع ہے: دائیں طرف بیٹھے ہوئے لوگ۔ اتـی بلبن: آپکے پاس دودھ لایا گیا۔ شیب: ملایا گیا، مکس اور خلط ملط کیا گیا، شاب یشوب سے ہے۔

الایمن فالایمن کی نحوی ترکیب

اس کی ترکیب نحوی میں دو احتمال ہیں، اسی وجہ سے الایمن فالایمن کو مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں اور منصوب بھی:

(۱)...... یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور اسکی خبر محذوف ہے اور وہ "اَحَقُّ" یا "مُـقَـدَّمٌ" ہے اصل عبارت یوں ہے: اَلْاَیْمَنُ اَحَقُّ فِی الشُّرْبِ فَالْأَیْمَنُ اَحَقُّ ہے۔

(۲)...... یا یہ دونوں لفظ فعل محذوف کے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں یعنی: اَعْـطِ یـا قَدِّمِ الْاَیْمَنَ فَالْأَیْمَنَ۔ فتح الباری، کتاب الاشربۃ، باب شرب اللبن بالماء، ۱۰/۹۴۔

کھانے پینے میں دائیں طرف کے لوگوں سے ابتداء کرنا مستحب ہے

اس حدیث سے یہ درس حاصل ہوتا ہے کہ کھانے پینے میں ان لوگوں سے ابتداء کرنا سنت ہے جو ساقی کے دائیں جانب بیٹھے ہوں، خواہ امیر ہو یا غریب، علم وفضل یا عمر کے اعتبار سے بڑا ہو یا چھوٹا، ہر صورت میں دائیں جہت کا لحاظ رکھنا چاہئے، بشرطیکہ مجمع اس امیر اور ساقی کے ہر طرف یعنی دائیں، بائیں اور سامنے موجود ہو، ایک ہی جانب نہ ہو، کیونکہ اگر مجمع ایک ہی جانب بیٹھا ہو، صرف دائیں جانب یا بائیں جانب یا سامنے تو پھر امیر کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے پہلے پلا دے، چنانچہ آپ ﷺ نے دودھ پینے کے بعد دائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک اعرابی کو دیا جبکہ دوسری جانب حضرت صدیق اکبر تشریف فرماتھے جو بلاشبہ علم وفضل اور مقام کے اعتبار سے اس اعرابی سے بلند تھے، لیکن اسکے باوجود آپ نے تعلیم وادب سکھانے کی خاطر دائیں جانب کو ترجیح دی۔

جمہور علماء کے نزدیک دائیں جہت کا لحاظ کرنا مستحب ہے، جبکہ علامہ ابن حزم اسے واجب قرار دیتے ہیں، ان کی رائے کو جمہور نے رد کردیا ہے، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اگرچہ

صرف دودھ کا ذکر ہے کہ دائیں طرف سے پلایا جائے لیکن یہ حکم کھانے پینے کی ہر چیز میں عام ہے، کہ ان تمام موقعوں میں دائیں طرف کے لوگوں سے آغاز کرنا سنت ہے، شرح مسلم للنووی، کتاب الاشربۃ، باب استحباب الماء واللبن......۲/۱۷۴و۱۷۵

ایک تعارض اور اسکا حل

باب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دائیں جانب بیٹھا ہو تو اسے دوسرے تمام حضرات پر مقدم کیا جائے، اگرچہ دوسرے اس سے افضل ہوں، مگر حدیثِ باب بظاہر حضرت عبداللہ بن عباس کی اس حدیث سے متعارض ہے، جسے ابویعلی نے سندِ قوی کے ساتھ نقل کیا ہے، اس میں یہ حکم ہے:

"كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا سَقٰى، قَالَ: ابْدَؤُا بِالْأَكْبَرِ"

"آپ ﷺ جب کسی کو پانی (وغیرہ) پلاتے تو (خادم سے) فرماتے کہ ان میں سب سے بڑے سے ابتداء کرو"

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانی وغیرہ پلانے میں "اکبر" کا لحاظ کرنا چاہیے، نہ کہ دائیں جہت میں بیٹھے لوگوں کا، بظاہر ان دونوں روایات میں تعارض ہے؟

شارحین حدیث نے اس تعارض کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے عمومی حکم مراد نہیں ہے بلکہ یہ حدیث اس حالت سے متعلق ہے جب تمام لوگ ایک طرف بیٹھے ہوں یعنی سامنے کیطرف یا دائیں بائیں جانب، ایسی صورت میں ابتداء بڑے سے ہی کرنی چاہیے، لیکن اگر لوگ دائیں بائیں بیٹھے ہوں تو پھر دائیں طرف بیٹھے لوگوں سے ابتداء کرنا مستحب ہے اگرچہ اسطرف بیٹھا ہوا چھوٹا ہی ہو، حدیث باب اسی صورت پر محمول ہے، عمدۃ القاری، کتاب الاشربۃ، باب الایمن فالایمن فی الشرب ۲۱/۱۹۶۔ فتح الباری، ۱۰/۱۰۷۔

دودھ میں پانی ملانے کا حکم

دودھ میں اس غرض سے پانی ملانا تا کہ اسے بڑھا کر فروخت کیا جائے، یہ چونکہ دھوکہ ہے، اسلئے یہ تو

ناجائز اورحرام ہے،لیکن اگر اپنے پینے کیلئے دودھ میں پانی ملایا جائے تو یہ جائز ہے،اس میں کوئی حرج نہیں،حدیث باب میں بھی دودھ میں پانی اسی مقصد کیلئے ملایا گیا تھا،کیونکہ دودھ دوہنے کے وقت گرم ہوتا ہے،اورعرب کا علاقہ بھی گرم ہے،اسلئے دودھ کی حرارت کوختم کرنے کیلئے اسکے ساتھ ٹھنڈا پانی ملایا جاتا تھا تا کہ اسطرح اس میں اعتدال پیدا ہو جائے۔تحفۃ الأحوذی،ابواب الاشربۃ،۱۴/۶۔فتح الباری۹۳/۱۰۔

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ سَاقِيَ الْقَوْمِ آخِرُهُمْ شُرْبًا

یہ باب اس بیان میں ہے کہ قوم کو پلانے والا سب سے آخر میں پیئے گا

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: سَاقِي الْقَوْمِ آخِرُهُمْ شُرْبًا.

ابوقتادہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کو پلانے والا سب سے آخر میں پیئے گا۔

ساقی کو آخر میں پینا چاہیے

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جوشخص کسی مجمع وغیرہ کو پانی وغیرہ پلائے تو اسے چاہیے کہ پہلے تمام حاضرین کو پلائے، جذبہ ایثار اور قربانی کا نمونہ پیش کرے، اور خود آخر میں پیئے، ایسے ہی جوشخص کسی منصب پر فائز ہو اور کوئی ذمہ داری اسکے سپرد ہو تو اس میں اپنے ذاتی کام اور مصلحت کے بجائے قومی مفاد اور عوامی مصلحت کو پیش نظر رکھے، اور اپنے ماتحتوں اور رعایا کے کام ترجیحی بنیادوں پر حل کرے، صرف اپنے مسائل اور معاملات کو حل کرنا، اور دوسروں کو نظر انداز کر کے اپنے احباب اور رشتہ داروں کو ترجیح دینا اسلامی مزاج کے سراسر خلاف ہے۔تحفۃ الاحوذی،۱۵/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ أَيُّ الشَّرَابِ كَانَ أَحَبَّ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کونسا مشروب زیادہ پسند تھا۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ أَحَبُّ الشَّرَابِ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْحُلْوَ الْبَارِدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو پینے کی

چیزوں میں میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا۔

عَنِ الزُّهْرِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ: أَيُّ الشَّرَابِ أَطْيَبُ؟ قَالَ: الْحُلْوُ الْبَارِدُ.

امام زہری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسا مشروب زیادہ اچھا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھنڈا اور میٹھا (مشروب زیادہ اچھا ہوتا ہے)

آپ ﷺ کو میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا، کیونکہ یہ جسمانی حرارت کو دور کرنے اور صحت کیلئے مفید ہونے کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور شکر کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

حدیث میں "الحلو البارد" (میٹھی اور ٹھنڈی چیز) سے صرف پانی ہی مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے عموم مراد ہے کہ آپکو ہر میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا خواہ وہ میٹھا پانی ہو یا دودھ، نبیذ ہو یا شہد وغیرہ کا شربت، اس وضاحت سے حدیثِ باب اور ان دو حدیثوں کے درمیان مطابقت اور یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پینے کی چیزوں میں دودھ سب سے زیادہ پسند تھا، اور دوسری روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو مشروبات میں شہد سب سے زیادہ محبوب تھا۔

"والصحيح ما روى الزهري عن النبي ﷺ مرسلاً"

اس عبارت سے امام ترمذی رحمہ اللہ یہ بتانا چاہیے ہیں کہ امام زہری نے اس روایت کو دو طرح سے نقل کیا ہے ایک مسنداً یعنی سند کے ساتھ، جسطرح اس روایت میں سند مذکور ہے: عن الزهري، عن عروة، عن عائشة، اور دوسرا اس روایت کو مرسلاً یعنی صحابیہ کے ذکر کے بغیر روایت کیا ہے، بلکہ عبارت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ امام زہری کی وہ روایت جو بذریعہ ارسال ہم تک پہونچی ہے وہ صحیح ہے، گویا امام ترمذی نے مرسل کو ترجیح دی ہے، اور انہوں نے شمائل میں اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس روایت کو اکثر راویوں نے مرسل ہی روایت کیا ہے، اسلئے یہی صحیح ہے، البتہ صرف ابن عیینہ نے اسے مسنداً ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی کی اس تحقیق پر بحث ہے:

(۱)......سفیان بن عیینہ ایک ثقہ راوی اور تابعی ہیں، جب وہ اس حدیث کو عن معمر، عن الزهری، عن عروة، عن عائشة مرفوعا روایت کر رہے ہیں تو یقیناً اس روایت کی سند صحیح ہوگی، اور جس طریق میں ثقہ راوی زیادہ ہوں تو وہ سند اور متن دونوں اعتبار سے مقبول ہوتی ہے۔

(۲)......اس میں کوئی شک نہیں کہ مرسل روایت جمہور کے نزدیک حجت ہے، اور فضائل اعمال میں سب کے نزدیک معتبر ہوتی ہے، لیکن اسکے باوجود ابن ہمام کی تصریح کے مطابق ''مسند روایت'' کے مقابلے میں مرسل کا اعتبار نہیں ہوتا اگر چہ اسے اکثر راویوں نے مرسلاً ہی ذکر کیا ہو۔

(۳)......نیز امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اور حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو مسند احضرت عائشہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، باب الاشربۃ، الفصل الثانی ۱۰۶/۸۔

ان تمام وجوہ سے طریق مسند ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

کان احب الشراب......کی ترکیب نحوی

کان فعل ناقص ہے، ''احب الشراب'' اسکا اسم ہے اور مرفوع ہے، اور ''الحلو البارد'' اسکی خبر ہے اور حالت نصب میں ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''احب الشراب'' منصوب ہو، اور کان کی خبر مقدم ہو، اور ''الحلو البارد'' کان کا اسم مؤخر ہو اور مرفوع ہو، اس احتمال کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۶/۶۔

قد فرغت من تحرير ابواب الاشربة بتاريخ ۱۴ ذيقعده ۱۴۲۵ عند العشاء المطابق ۴ ينائر ۲۰۰۵م

والحمد لله على ذالك اولا وآخراً وأسأل الله عز وجل أن يوفقني لتكميل هذه المسيرة الصالحة. امين.

أَبْوَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم

یہ ابواب ایسی احادیث پر مشتمل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والدین وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کے بارے میں ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ

یہ باب والدین کے ساتھ نیکی کے بارے میں ہے

حَدَّثَنَا بَهْزُ بْنُ حَكِيْمٍ، حَدَّثَنِيْ أَبِيْ عَنْ جَدِّيْ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، مَنْ أَبَرُّ؟ قَالَ: أُمَّكَ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمَّكَ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمَّكَ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أَبَاكَ ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ

بہز بن حکیم اپنے والد حکیم سے اور وہ میرے (یعنی بہز کے) دادا یعنی معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول: میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ماں سے حسن سلوک کرو، میں نے عرض کیا پھر کس سے نیکی کروں؟ آپ نے فرمایا: اپنی ماں سے، میں نے عرض کیا پھر کس سے؟ آپ نے فرمایا: اپنی ماں سے، میں نے عرض کیا پھر کس سے نیکی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے باپ سے حسن سلوک کرو، پھر زیادہ قریبی رشتہ داروں سے پھر اسکے بعد دیگر قریبی رشتہ داروں سے درجہ بدرجہ (نیکی اور حسن سلوک کرو)۔

مشکل الفاظ: بِرّ: (باء کی زیر کے ساتھ): نیکی، اطاعت، حسن سلوک، اس لفظ سے عموماً وہ نیکی اور بھلائی مراد ہوتی ہے جو والدین کے ساتھ کی جائے۔ صِلة: کسی کے ساتھ بھلائی کرنا، تعلقات کو جوڑنا۔ اَبَرُّ: (باء پر زبر اور راء کی تشدید کے ساتھ) واحد متکلم کا صیغہ: میں (کس کے ساتھ) نیکی کروں۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

قرآن وحدیث میں بیسیوں مقام پر والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اور جائز

امور میں انکی اطاعت اور فرمانبرداری کو اسلام نے ضروری قرار دیا ہے، ہاں اگر والدین خلافِ شرع کسی چیز کا حکم دیں تو پھر ان کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔

یوں تو حسن سلوک اور نیکی والد اور والدہ دونوں کے ساتھ کرنی چاہیے لیکن حدیث باب کی روشنی میں جمہور علماء کے نزدیک ماں کا حق والد کے مقابلے میں زیادہ ہے، کیونکہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین بار ماں کے ساتھ نیکی کرنیکا حکم دیا ہے اور پھر والد اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

ماں کا حق اسلئے مقدم ہے کہ وہ حمل کی تھکاوٹ، وضع حمل کی تکلیف اور ایک طویل عرصہ بچے کو دودھ پلانے کی مشقت برداشت کرتی ہے، اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے: **حملته امه کرها ووضعته کرها، وحمله وفصاله ثلثون شهرا**" مرقاة المفاتیح، کتاب الاداب، باب البر، والصلة ۶۴۸/۸۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبة ۴۹۲/۱۰، ۴۹۳۔

ان تمام احسانات کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ اور خاص طور پر اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرے، ان کی خدمت کی سعادت سے سرشار ہو کر دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو، اور ان سے دعائیں لیکر اپنی آخرت کو سنوارے۔

موجودہ دور میں چونکہ مسلم معاشرہ دینی تعلیمات سے بہت دور ہو چکا ہے، ہر طرف مفاد پرستی اور خود غرضی کا راج ہے، اسلئے اولاد کا بھی والدین کے ساتھ برائے نام سا تعلق رہ گیا ہے، ان کی خدمت کے بجائے اپنے دنیوی کاروبار کو ترجیح دی جاتی ہے، یہ رویہ اسلامی رو سے جائز نہیں ہے، ہر ممکن کوشش کی جائے کہ والدین کے ساتھ نرم رویہ رکھا جائے، اگر وہ ظلم بھی کر دیں تو بھی ان کے ساتھ بد اخلاقی اور بدتمیزی سے پرہیز کی جائے، اگر والدین کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب کرتے ہوں تو ادب و احترام سے ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اسکے باوجود اگر وہ راہ راست پر نہ آئیں تو پھر ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں ہے، خاموشی اختیار کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے ان کیلئے تہ دل سے مانگا جائے تا کہ انہیں ہدایت حاصل ہو جائے۔

باب

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَيُّ

الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟قَالَ:الصَّلاَةُ لِمِيْقَاتِهَا،قُلْتُ:ثُمَّ مَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ،قَالَ:قُلْتُ:ثُمَّ مَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟قَالَ:الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ،ثُمَّ سَكَتَ عَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَوِ اسْتَزَدْتُهُ لَزَادَنِيْ.

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول!اعمال میں سب سے فضلیت والاعمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا:نماز کو اسکے وقت میں پڑھنا،میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا:والدین کے ساتھ نیکی کرنا،میں نے کہا پھر کونسا عمل اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا:راہ خدا میں جہاد کرنا،(عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں) پھر نبی کریم ﷺ مجھ سے خاموش ہوگئے،اوراگر میں آپ سے مزید سوال کرتا تو آپ بھی مزید جواب ارشادفرماتے۔

اسلام میں کونسے اعمال افضل ہیں

اسلام میں کونساعمل سب سے زیادہ فضیلت کا حامل ہے،احادیث میں مختلف موقعوں پر آپ ﷺ نے مختلف جواب ارشادفرمائے ہیں،چنانچہ حدیث باب میں سب سے افضل عمل ''وقت پرنماز پڑھنے'' کوقرار دیا گیا ہے،حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایمان باللہ اور جہادفی سبیل اللہ کوافضل عمل فرمایا گیاہے،...........،

بظاہران جوابات میں تعارض ہے،شارحین حدیث نے ان کے درمیان تین طرح سے تطبیق دی ہے:

(۱)......نبی کریم ﷺ سائل کے حالات کے لحاظ سے جواب ارشادفرماتے،جس کیلئے جو چیز زیادہ مناسب ہوتی،یاجسکی اسے زیادہ ضرورت ہوتی،یا جس عمل کی اس میں رغبت اورشوق ہوتااس کیلئے اسی عمل کوافضل قرار دیدیا جاتا تھا،جو بہادر اور جفاکش نظر آتا،اسے جہاد کی تلقین فرماتے،جو مالدار ہوتا اسے راہ خدا میں خرچ کرنیکی ترغیب،اورجس کے والدین خدمت کےمحتاج ہوتے،اسے والدین کی خدمت کا ارشاد ہوتا،جونماز میں ذراسست معلوم ہوتا،اسے وقت پرنماز پڑھنا بتایا جاتا،سائل کے اعتبار سے کسی بھی عمل کوافضل قرار دیکر آپ جواب ارشادفرماتے تھے،اس سے دوسرے کسی عمل کی اہمیت کوختم کرنایانظرانداز کرنامقصودنہیں ہوتا تھا۔

(۲)......جوابات میں اختلاف مختلف اوقات اور زمانوں کے اعتبار سے رونماہوا ہے،جس وقت جس عمل کی

زیادہ ضرورت ہوتی اسے افضل عمل فرمایا گیا ہے، جہاد ابتداء اسلام میں سب سے افضل عمل قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت غلبہ اسلام کا یہی ایک مؤثر ذریعہ تھا، ایسے میں آپ نے صحابہ کرام کو جہاد کا افضل ہونا ارشاد فرمایا، لہذا جس وقت جو عمل آپ نے حالات واحوال کے اعتبار سے زیادہ اہم سمجھا، اسے افضل عمل قرار دیدیا۔

(۳)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اسطرح کے جوابات میں ایک عمل کی دوسرے پر کسی فضیلت کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف احکام کی تبلیغ پیش نظر ہے کہ یہ امر یا عمل بھی امور خیر اور افضل اعمال میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ لفظ ''الاعمال'' سے پہلے ''مِنْ'' محذوف ہے، گویا سوال یہ ہے: ای من الاعمال افضل؟ اعمال میں سے کونسا عمل افضل ہے، اس طرح محذوف نکالنے سے کسی عمل کا دوسرے پر افضل ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ فتح الباری، کتاب الإیمان باب اطعام الطعام من الاسلام، باب من قال ان الإیمان ھو العمل ۱/۶۷،۱۰۷۔ تحفۃ الاحوذی ،۶/۲۰۔ کشف الباری، کتاب الإیمان، باب اطعام الطعام من الإسلام ۱/۲۰۷۔

بَابُ الْفَضْلِ فِيْ رِضَا الْوَالِدَيْنِ

یہ باب والدین کی رضا مندی کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ قَالَ: إِنَّ رَجُلًا أَتَاهُ فَقَالَ إِنَّ لِيْ امْرَأَةً وَإِنَّ أُمِّيْ تَأْمُرُنِيْ بِطَلَاقِهَا، فَقَالَ أَبُوْ الدَّرْدَاءِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: الْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَإِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذٰلِكَ الْبَابَ أَوِ احْفَظْهُ. وَرُبَمَا قَالَ سُفْيَانُ : إِنَّ أُمِّيْ ، وَرُبَمَا قَالَ : أَبِيْ.

حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا، کہنے لگا کہ میری ایک بیوی ہے، اور میری ماں اسے طلاق دینے کا حکم دے رہی ہے، (تو کیا ان کی بات مان لوں) حضرت ابوالدرداء نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کا درمیانہ دروازہ ہے، لہذا اگر تم چاہو تو اس دروازے کو ضائع کردو یا اسے محفوظ کرلو۔ اور سفیان نے اس روایت میں کبھی ماں کا ذکر کیا ہے اور کبھی باپ کا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: رِضَا الرَّبِّ فِيْ رِضَا

الْوَالِدِوَسَخَطُ الرَّبِّ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ.

عبد اللہ بن عمر و سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: رب کی رضا والد کی رضامندی میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ :- اَوْسَطُ: درمیانہ۔ اِنْ شِئْتَ: اگر آپ چاہیں۔ اَضِعْ: تو ضائع کر۔ او احفظه: یا اسے تو محفوظ کر، سخط: (سین اور خاء پر زبر کے ساتھ): ناراضگی، غضب۔

والدین کو خوش رکھنے کی فضیلت

ان احادیث سے والدین کو خوش رکھنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ نے والد کو اور دوسری روایت کے مطابق والدہ کو جنت کا درمیانی دروازہ قرار دیا ہے، اور والد کی رضامندی اور ناراضگی کو اللہ کی رضا اور ناراضگی کا سبب بتایا ہے، لہٰذا اولاد کو حتی الامکان والدین کو خوش ہی رکھنا چاہیے، تاکہ انہیں یہ فضیلت حاصل ہو سکے، اولاد اگر ایسا کرلے تو اس نے گویا جنت کے اس دروازے کو محفوظ کرلیا، اور اگر انکے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، انہیں خوش نہ رکھا، تو اس نے وہ دروازہ ضائع کر دیا، پھر اسے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑیگا۔

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں ضروری ہے اور کن میں نہیں

ہمارے معاشرے میں اولاد اپنے والدین کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں افراط اور تفریط سے دوچار ہے، بعض لوگ والدین کے حقوق بالکل ادا نہیں کرتے، حتی کہ ان سے تعلقات بھی منقطع کر دیتے ہیں، جبکہ دوسرے بعض مسلمان والدین کی خدمت اور اطاعت میں اس قدر غلو سے کام لیتے ہیں کہ اپنی بیوی اور اولاد کے حقوق بھی ضائع کر دیتے ہیں، اور اسی کو وہ دین سمجھتے ہیں، اس طرز عمل سے کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور آپس کی لڑائی اور بحث مباحثہ روز کا معمول بن جاتا ہے، ان خرابیوں سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ یہ جانا جائے کہ کونسے حقوق میرے ذمے واجب ہیں، اور کونسے غیر واجب، تاکہ حق تلفی سے بچا جا سکے، اس کیلئے مندرجہ ذیل تفصیل کو سامنے رکھنا چاہئے:

(۱)......جو امر شرعاً واجب ہو اور ماں باپ اس سے منع کریں تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے مثلاً اگر مالی وسعت کم ہے کہ والدین پر خرچ کرنے سے بیوی بچوں کے حقوق واجبہ ضائع ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں بیوی بچوں کو تکلیف دیکر والدین پر خرچ کرنا جائز نہیں، یا مثلاً اگر بیوی شوہر کے ماں باپ سے الگ رہنے کا مطالبہ کرے، یہ اس کا شرعی حق ہے، لیکن ماں باپ اسے اپنے ساتھ ہی رکھنے کا کہیں تو شوہر کیلئے اس حالت میں جائز نہیں کہ وہ بیوی کی مرضی کے بغیر اپنے والدین کے ساتھ اسے رکھے، یا مثلاً والدین حج فرض یا ضروری علم دین حاصل کرنے سے منع کریں تو اس میں بھی ان کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔

(۲)......خلاف شرع امور میں والدین کی اطاعت جائز نہیں ہے، مثلاً کسی ناجائز ملازمت کا حکم دیں، یا کسی بدعت وغیرہ کا کہیں یا کسی اور ناجائز کام کا کہیں ....تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

(۳)......جو امر شریعت میں نہ واجب ہو اور نہ ممنوع، بلکہ مباح یا مستحب ہو اور والدین اسکے کرنے یا نہ کرنے کا کہیں تو اس میں ان کی اطاعت کی جائیگی یا نہیں؟ اس میں یہ تفصیل ہے:

اگر اس شخص کو اس کام کی ایسی ضرورت ہو کہ اسکے بغیر تکلیف ہوگی مثلاً غریب آدمی ہے، علاقے میں کوئی روزگار نہیں ہے، اسکے لئے وہ جانا چاہتا ہے، مگر والدین اسے بلا وجہ روکتے ہیں تو ایسی صورت میں والدین کی اطاعت ضروری نہیں ہے، اور اگر ضرورت اس درجے کی نہیں ہے کہ اس کے بغیر تکلیف ہوگی تو بھی اس عمل سے باز رہنا ضروری نہیں، بلکہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام میں اسکو کوئی خطرہ یا ضرر ہے یا نہیں، یا اس کام میں مشغولیت کی وجہ سے والدین کو تکلیف تو نہیں ہوگی جبکہ کوئی اور دیکھ بھال کرنے والا بھی نہ ہو:

(۱)......اگر اس کام میں خطرہ ہے یا اسکے جانے سے والدین کو بے سروسامانی کی وجہ سے تکلیف ہوگی تو پھر والدین کی مخالفت جائز نہیں مثلاً جہاد میں جانا چاہتا ہے حالانکہ وہ اسپر فرض نہیں یا سفر پر جانے کی وجہ سے والدین کو اور کوئی سنبھالنے والا نہ ہو، خادم کا بندوبست بھی نہ ہو سکے، اور وہ کام اور سفر بھی کوئی ضروری نہیں تو اس حالت میں والدین کی اطاعت لازم ہوگی۔

(۲)......لیکن اگر اس کام میں کوئی خطرہ نہ ہو اور سفر پر جانے کی وجہ سے والدین کو تکلیف وغیرہ پہونچنے کا بھی ظاہراً کوئی احتمال نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کیلئے جانا جائز ہے، والدین کی اطاعت فرض نہیں ہے، اگرچہ

مستحب یہی ہے کہ ایسے موقع پر بھی ان کی بات مان لے۔

بعض اوقات والدین کسی بیٹے سے کہتے ہیں کہ جو کچھ تم کما کر لائے ہو وہ سارا ہمیں دیدو، اس میں بھی ان کی اطاعت واجب نہیں ہے، اور اگر وہ اسپر جبر اور سختی کریں گے تو گنہگار ہونگے۔ امداد الفتاوی، رسالہ تعدیل حقوق الوالدین ۴/۴۸۶۔

والدین کے مطالبہ پر بیوی کو طلاق دینے کا مسئلہ

والدین میں سے کسی کا اگر اپنی بہو سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے یا ان کے گمان کے مطابق وہ ان کی خدمت نہ کرے...... تو پھر وہ اپنے بیٹے سے بڑی سختی سے کہتے ہیں کہ تم اسے طلاق دیدو، ہم تمہاری دوسری جگہ شادی کردیں گے۔

اسطرح کی صورتحال میں جذبات میں نہیں آنا چاہیے، بلکہ اس میں یہ دیکھا جائے کہ اس کے والدین کو اگر اسکی بیوی سے واقعۃً تکلیف پہونچتی ہو، انتہائی بد اخلاق اور بد مزاج عورت ہو، کہ اسکے ساتھ گذارہ نہ ہوسکتا ہو، ایسی صورت میں اگر والدین اس سے بیوی کو طلاق دینے کا کہیں تو پھر اس پر طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے، لیکن اگر والدین کو اسکی بیوی سے کوئی واقعی تکلیف نہیں بلکہ والدین خواہ مخواہ اسے طلاق دینے کا کہہ رہے ہیں، جیسا کہ اس زمانے میں والدین کیطرف سے طلاق دینے کا مطالبہ اکثر محض ہٹ دھرمی اور ضد اضدی پر مبنی ہوتا ہے، یہ مطالبہ برائے مطالبہ ہوتا ہے، جسکا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ایسی صورت میں والدین کے حکم پر عمل اس کیلئے ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں طلاق دینا عورت پر ایک طرح کا ظلم کرنا ہے، طلاق اللہ تعالٰی کی نظر میں بڑی بری چیز ہے، صرف مجبوری میں اسکی اجازت دی گئی ہے، خواہ مخواہ طلاق دینا ظلم اور مکروہ تحریمی ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس مطالبہ پر طلاق دے ہی دے تو اس سے اسکی بیوی پر طلاق واقع ہو جائیگی۔ امداد الفتاوی، رسالہ: تعدیل حقوق الوالدین ۴/۴۸۰، ۴۸۵، درس ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، باب ما جاء فی الرجل یسئالہ ابواہ ان یطلق زوجتہ ۳/۵۰۳، ۵۰۴

اور والدین کی طرف سے خدمت نہ کرنے کا شکوہ بھی درست نہیں ہے اسلئے کہ بہو پر اپنے ساس سسر کی خدمت کرنا شرعاً نہ فرض ہے نہ واجب، ہاں اگر وہ اخلاقی طور پر خوشی سے خدمت کرے تو یہ اسکی

سعادت اوراحسان ہے۔

بعض والدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اپنی چوکھٹ تبدیل کرنیکا یعنی بیوی کوطلاق دینے کا کہاتو والد کے حکم کی وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی بیوی کوطلاق دیدی، اسکی روشنی میں وہ اپنی اولاد سے یہ کہتے ہیں کہ جسطرح حضرت اسماعیل علیہ السلام نے باپ کے امر کی وجہ سے اہلیہ کوطلاق دیدی تھی اسیطرح تم بھی طلاق دیدو، لیکن اس واقعہ سے استدلال اسلئے درست نہیں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یہ بیوی انتہائی ناشکر گذار تھی جسکی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کوطلاق دینے کا کہا، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی بہو سے حالات دریافت کیے کہ کیا حال ہے، کیسی زندگی گذر رہی ہے، کھانے اور پانی وغیرہ کا نظام سب ٹھیک ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ ہم لوگ انتہائی سختی میں ہیں، بڑی مجاہدانہ زندگی گذار رہے ہیں، کھانے پینے کا بھی کچھ نہیں ملتا............فتح الباری، کتاب الانبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی ۴۹۹/۶

حدیثِ باب میں ممکن ہے کہ وہ سائل جو حضرت ابوالدرداء کے پاس مسئلہ پوچھنے آئے، ان کی اہلیہ اپنی ساس کو بہت ستاتی اور تکلیف پہونچاتی ہو جس کی وجہ سے وہ اسے طلاق دینے کا اپنے بیٹے سے کہہ رہی ہو، ان حالات کا اندازہ لگا کر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنادی کہ والدین کی اطاعت کرنی چاہیے، والد جنت کا درمیانی دروازہ ہے اگر اسکی بات کو جھٹلا دیا گیا تو گویا اس دروازے کو ضائع کر دیا گیا۔

تاہم موجودہ دور میں اگر کسی کے والدین اسے طلاق دینے کا کہیں یا اسے اسپر مجبور کریں تو اس شخص کو چاہیے کہ کسی نیک اور ماہر مفتی سے رجوع کرے اور پھر اسکے بعد فیصلہ کرے کہ مجھے طلاق دینی چاہیے یا نہیں، کسی مفتی سے پوچھے بغیر محض والدین یا رشتہ داروں کے جبر یا برانگیختہ کرنے کی وجہ سے بیوی کوطلاق دینا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ عُقُوْقِ الْوَالِدَيْنِ

یہ باب والدین کی نافرمانی کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ بَكْرَةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَلَا أُحَدِّثُكُمْ

بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟ قَالُوْا: بَلَى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: الإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ، قَالَ: وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِئًا، قَالَ: وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ أَوْ قَوْلُ الزُّوْرِ، فَمَا زَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُهَا حَتَّى قُلْنَا: لَيْتَهُ سَكَتَ.

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا: ہاں کیوں نہیں (ضرور بتادیجئے) اے اللہ کے رسول، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ (اسکی ذات یا صفات میں) کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، ابوبکرہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ سیدھے بیٹھ گئے جبکہ (پہلے) آپ تکیہ لگا کر تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے (مزید) فرمایا: اور جھوٹی گواہی (یا فرمایا) جھوٹی بات، آپ ﷺ یہ جملہ مسلسل ارشاد فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم کہنے لگے کہ کاش آپ خاموش ہو جائیں۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مِنَ الْكَبَائِرِ أَنْ يَّشْتِمَ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَشْتِمُ أُمَّهُ فَيَشْتِمُ أُمَّهُ.

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، صحابہ نے (یہ سن کر) عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالیاں دیتا ہے، آپ نے فرمایا: جی ہاں (کبھی تو براہ راست گالی دی جاتی ہے، اور کبھی) کوئی شخص کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ (انتقام کے طور پر) اسکے باپ کو گالی دیتا ہے، اور (جب) کوئی شخص کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اسکی ماں کو گالی دیتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: —**عُقُوق:** (عین اور قاف پر پیش کے ساتھ) نافرمانی کرنا، بدسلوکی کرنا، واجب خدمت انجام نہ دینا، عرف میں استعمال کے اعتبار سے یہ لفظ عموماً والدین کی نافرمانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ **الکبائر:** کبیرۃ کی جمع ہے: وہ بڑا گناہ جس کی شرعاً صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی ہو، اور جس پر سخت

وعید کا ذکر آیا ہو، اور جو توبہ کے بغیر معاف بھی نہ ہوتا ہو۔ مُتَّکِئاً: تکیہ اور سہارا لگا کر۔ لَیْتَهٗ سکت: کاش کہ آپ خاموش ہو جائیں۔ یَسُبُّ، یَشْتِمُ: گالی گلوچ دینا اور برا بھلا کہنا۔

والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا گناہ کبیرہ ہے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے چند بڑے بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسکی ذات میں یا اسکی صفات میں سے کسی صفت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کیساتھ بدسلوکی کرنا، اپنی گفتگو یا عمل سے انہیں دکھ دینا، اور انکی خدمت نہ کرنا جبکہ وہ خدمت کے محتاج بھی ہوں، اور جھوٹی گواہی دینا، یہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔

یوں تو یہ گناہ سارے ہی انتہائی گھناؤنے ہیں، لیکن آپ ﷺ نے ''جھوٹی گواہی'' کے ذکر کے وقت خاص طور پر اپنی نشست بھی تبدیل فرمادی، سیدھے بیٹھ کر یہ جملہ ''وشهادة الزور'' بار بار ارشاد فرماتے رہے، صحابہ تمنا کرنے لگے کہ آپ خاموش ہو جائیں، یہ اہتمام اس لئے کیا گیا کہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنے کو ہر مسلمان برا سمجھتا ہے، لیکن جھوٹی گواہی دینے میں بہت سے مسلمان کوتاہی کر جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بہت سے اسباب ہوتے ہیں، چنانچہ جھوٹی گواہی حسد، بغض، دشمنی اور مال ودولت کی لالچ .... کی وجہ سے دی جاتی ہے، اس کا نقصان صرف ایک بندے تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ بیسیوں لوگ اسکی لپیٹ میں آتے ہیں جبکہ شرک کا نقصان صرف اس آدمی کی ذات تک ہی محدود ہوتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی عقوق الوالدین ۶/۲۳، ۲۴۔

دوسروں کے والدین کو برا بھلا کہنا دراصل اپنے والدین کو برا بھلا کہنا ہے

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے والدین کو برا بھلا کہنا اور گالی دینا گناہ کبیرہ اور حرام ہے، صحابہ کرام کو تعجب ہوا کہ کوئی اپنے والدین کو بھی گالیاں دے سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں ایسا ہوتا ہے، بعض لوگ تو جہالت اور گمراہی کی اس حد تک پہونچ جاتے ہیں کہ والدین کو براہ راست برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں اور گالیاں دینے لگتے ہیں، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، اور والدین کو گالیاں دینے کا دوسرا طریقہ

بالواسطہ ہے کہ انسان دوسرے کے والد کو گالیاں دیتا ہے تو وہ جواباً اسکے والد کو گالیاں دیتا ہے، ایک شخص دوسرے کی ماں کو برا بھلا کہتا ہے، تو وہ بھی انتقاماً اسکی ماں کو سب وشتم کرتا ہے، لہذا دوسروں کے والدین کو سب وشتم کرنا، برا بھلا کہنا درحقیقت اپنے والدین کو برا بھلا کہنا ہے، کیونکہ اپنے والدین کو گالیاں دلوانے کا ذریعہ یہ شخص بنا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ جسطرح اصل گناہ حرام ہوتا ہے اسی طرح اس تک پہونچنے کے جو بھی ذرائع اور وسائل ہوں وہ بھی ناجائز اور حرام ہونگے، لہذا دوسروں کے والدین کو گالیاں دیکر اپنے والدین کو گالیاں دلوانے کا ذریعہ بننا بھی حرام ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب البر والصلۃ، ۸/۶۵۳، ۶۵۴۔

اولاد کو عاق کرنے کا شرعی حکم

بعض لوگ جب اپنی اولاد میں سے کسی کے ساتھ ناراض ہو جائیں تو وہ وصیت کرتے ہیں کہ مثلاً میرا فلاں بیٹا میرے ترکہ کا وارث نہیں ہوگا، میں اسے عاق کرتا ہوں، عرف میں اسے "عاق نامہ" کہا جاتا ہے، لوگ اسکی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ بیٹا اپنے باپ کی میراث سے محروم رہے گا لیکن اسلام کی نظر میں اسطرح کی وصیت ناجائز اور حرام ہے، اور شرعاً اسکا کوئی اعتبار بھی نہیں، کیونکہ حق وراثت کسی کے ختم کرنے سے ساقط نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وارثوں کے جو حصے مقرر فرمائے ہیں، اسے "عاق نامہ" سے ساقط نہیں کیا جا سکتا، اسلئے جس شخص کو عاق کیا گیا ہو وہ وراثت سے محروم نہیں ہوگا، بدستور وارث رہے گا، اور اسے اپنا شرعی حصہ ملے گا۔

ہاں اگر کوئی شخص کسی بیٹے کی نافرمانی وغیرہ کی وجہ سے اسے کچھ نہ دینا چاہے تو اسکا طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہی اس بیٹے کے علاوہ دوسرے تمام وارثوں کے درمیان اپنی تمام جائداد وغیرہ برابر برابر تقسیم کردے کیونکہ زندگی میں جو چیز اولاد میں تقسیم کی جائے اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے حصوں میں فرق نہیں کیا جاتا، یہ ہبہ کے حکم میں ہے، اسلئے سب کے درمیان تمام چیزیں مساوی طریقے سے تقسیم ہونگی، البتہ اگر کوئی بیٹا یا بیٹی زیادہ محتاج ہو، یا کوئی بیٹا زیادہ فرمانبردار اور خدمتگذار ہو، اس وجہ سے انہیں زیادہ دیا جائے تو یہ جائز ہے یا کسی

فاسق بیٹے کو بالکل نہ دیا جائے کہ وہ اس مال وغیرہ کو مزید اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے گا تو اس طرح کرنا بھی جائز ہے۔ امداد الفتاوی، کتاب الفرائض، ۳۶۴/۴، امداد المفتین، ص:۱۰۵۰۔

بَابٌ فِيْ إِكْرَامِ صَدِيْقِ الْوَالِدِ

یہ باب والد کے دوست کے اکرام (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ أَنْ يَصِلَ الرَّجُلُ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ.

ابن عمر سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بیشک نیکیوں میں سب سے افضل نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں سے صلہ رحمی اور احسان کرے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: - أَبَرّ: سب سے افضل اور اعلیٰ نیکی۔ البِر: (باء کی زیر کے ساتھ) نیکی، احسان و دّ: (واؤ پر پیش کیساتھ) محبت، دوستی۔ اهل و د: دوست، اہل محبت۔

باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

والد کی غیر موجودگی میں خواہ وہ سفر میں ہوں یا وفات ہو چکی ہو، ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنے کو نبی کریم ﷺ نے سب سے افضل اور اعلیٰ نیکی قرار دیا ہے، کیونکہ جو شخص والد کی غیر موجودگی میں والد کا اتنا لحاظ اور احساس کر رہا ہے تو والد کی موجودگی میں بطریق اولیٰ ان کے حقوق کا خیال رکھتا ہوگا۔ شرح الطیبی، کتاب الاداب، باب البر والصلۃ ۱۵۱/۹۔

حدیث میں اگرچہ صرف والد کے دوستوں کا ذکر ہے، لیکن اس میں والدہ کی سہیلیاں بھی شامل ہیں کہ ان کے ساتھ بھی رواداری، حسن سلوک اور احسان کرنا چاہیے۔ تحفۃ الاحوذی، ۲۵/۶۔

بَابٌ فِيْ بِرِّ الْخَالَةِ

یہ باب خالہ کے ساتھ نیکی کرنے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ. وَفِي

الْحَدِيْثِ قِصَّةٌ طَوِيْلَةٌ .

براء بن عازب سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خالہ ماں کے درجے میں ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک طویل واقعہ ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ أَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا فَهَلْ لِيْ تَوْبَةٌ؟ قَالَ هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ فَبِرَّهَا.

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ: مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہے، تو کیا میرے لئے توبہ (کی کوئی صورت) ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تو کیا تمہاری خالہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم اس کے ساتھ حسن سلوک کرو (اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہارا وہ گناہ معاف فرمادیں گے)۔

مشکل الفاظ کے معنی:- فَبَرَّهَا: (باء پر زبر اور راء کی تشدید کیساتھ) خالہ کے ساتھ نیکی کرو

اصبت: میں نے ارتکاب کرلیا۔

خالہ کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں، جن میں خالہ کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کا حکم دیا گیا ہے، آپ ﷺ نے بچے کی پرورش کے لحاظ سے خالہ کو ماں کے درجے میں قرار دیا ہے، جبکہ ماں نہ ہو، کیونکہ خالہ دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں بچے کی صحیح طریقے سے تعلیم و تربیت کرسکتی ہے، اور اس میں ایک گونہ شفقت بھی زیادہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ماں کی غیر موجودگی میں پھوپھی کے مقابلے میں خالہ بچے کی پرورش کی زیادہ حقدار ہے۔

حدیث میں طویل واقعہ کیا ہے

"**وفی الحدیث قصة طویلة**" اس سے امام ترمذی رحمہ اللہ حدیث کے بقیہ قصے کی طرف اشارہ کررہے ہیں، یہ حدیث یعنی "الخالة بمنزلة الأم" اسی طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس قصے کی کچھ تفصیل:

حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے دن تین چیزوں پر مشرکین مکہ سے صلح کی، مشرکین میں سے جو شخص حضور کے پاس آئیگا اسے واپس کر دیا جائیگا، جو مسلمان مشرکین کے پاس آگیا تو اسے وہ واپس نہیں کریں گے اور حضور اس سال عمرہ نہیں کر سکتے، اگلے سال عمرے کیلئے آسکتے ہیں اور مکہ میں صرف تین دن رہنے کی اجازت ہوگی۔

جب حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام عمرہ کر کے مکہ مکرمہ سے نکلنے لگے تو حضرت حمزہ کی کمسن بیٹی بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑی، اور آپکو یا عم یا عم سے نداء دینے لگی اے میرے چچا، اے میرے چچا! اے میرے چچا یعنی چچا کے بیٹے، کیونکہ آپ ﷺ انکے چچا نہیں بلکہ چچا زاد تھے لیکن اہل عرب احترام اور تعظیم کی وجہ سے یا عم سے خطاب کرتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت حمزہ اگر چہ نبی کریم ﷺ کے نسب کے لحاظ سے چچا تھے، لیکن چونکہ آپکے رضاعی بھائی بھی تھے، اسلئے انکی کمسن بیٹی نے نبی کریم ﷺ کو یا عم سے خطاب کیا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ انہیں اپنے ساتھ لے لو، مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد حضرت علی، زید بن حارثہ اور حضرت جعفر کے درمیان اس بات میں بحث مباحثہ ہو گیا کہ حضرت حمزہ کی بیٹی کس کے پاس ہوگی، ہر ایک ان کے ساتھ اپنے رشتہ کا ذکر کرنے لگا:

حضرت علی نے کہا: میں اسکی پرورش کا زیادہ حقدار ہوں کیونکہ میرے چچا کی بیٹی ہے، حضرت جعفر نے کہا: دو وجہ سے میں اسے پرورش کیلئے لینے کا زیادہ اہل ہوں، ایک تو اس وجہ سے کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ اس کی خالہ اسماء بنت عمیس میری اہلیہ ہے، حضرت زید نے کہا: یہ میرے بھائی حمزہ کی بیٹی ہے (حضور اکرم ﷺ نے حضرت زید اور حمزہ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا)۔

نبی کریم ﷺ نے تینوں کی گفتگو سننے کے بعد حضرت حمزہ کی بیٹی کی پرورش کا فیصلہ ان کی خالہ کیلئے

کیا، اور فرمایا: الخالة بمنزلة الام، خالہ ماں کے درجے میں ہوتی ہے، (اوران حضرات کی دلجوئی کیلئے فرمایا) چنانچہ حضرت علی سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں یعنی ہمارا نسب ایک ہی ہے، حضرت جعفر سے فرمایا: تم شکل وصورت اور اخلاق کے لحاظ سے میرے مشابہ ہو، اور حضرت زید سے فرمایا: تم ہمارے دینی بھائی اور آزاد کردہ ہو۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب الصلح مع المشرکین ۱/۳۷۲، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء ۲/۶۱۰۔

اس معاہدے میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ اہل مکہ میں سے اگر کوئی شخص حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جانا چاہے تو اسے جانے کی اجازت نہیں ہوگی، اسپر شبہہ یہ ہوتا ہے کہ پھر حضرت حمزہ کی بیٹی کو نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ کیوں لے لیا، بظاہر یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے؟

اس شبہہ کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)...... یہ معاہدہ ان لوگوں پر نافذ تھا جو بالغ اور مکلف ہوں، حضرت حمزہ کی بیٹی چونکہ کمسن تھی، اسلئے اسے ساتھ لے جانا معاہدے کے خلاف نہیں ہے۔

(۲)...... اس معاہدے کا اطلاق صرف مردوں پر تھا، مسلمان عورتیں اس میں شامل نہیں ہیں، لہذا مرد حضرات اس معاہدے کی رو سے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے نہیں آسکتے تھے، عورتوں پر کوئی پابندی نہیں تھی، اسلئے حضرت حمزہ کی بیٹی کے واقعہ سے شبہہ درست نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء ۷/۶۴۴۔

خالہ ماں کا درجہ رکھتی ہے

باب کی دوسری حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... خالہ اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں، حدیث میں "ذنباً عظیماً" سے گناہ صغیرہ مراد ہے، کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے یہ گناہ معاف ہوجاتا ہے اور "عظیم" کا لفظ اس صحابی نے محض جذبہ ایمانی اور کمال تقوی کی وجہ سے کہا ہے کیونکہ گناہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناراضگی کا ذریعہ ہوتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سائل کا گناہ واقعی

گناہ کبیرہ ہی ہو اور آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا ہو کہ اس شخص کا یہ گناہ خالہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے معاف ہو جائیگا، گویا یہ اس صحابی کی خصوصیت ہے ورنہ گناہ کبیرہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک کہ انسان اس سے باقاعدہ تہ دل سے توبہ نہ کرلے۔ شرح الطیبی، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ ۹/۱۶۰، مرقاۃ المفاتیح، ۶۶۸/۸

(۲)......خالہ ماں کا درجہ رکھتی ہے، لہذا اسکے ساتھ بھی ماں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ دُعَاءِ الْوَالِدَيْنِ

یہ باب والدین کی دعا کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيْهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ، وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ عَلٰى وَلَدِهٖ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تین دعائیں (ضرور) قبول ہوتی ہیں، ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں: مظلوم کی دعاء، مسافر کی دعاء اور والد کی اپنے بیٹے کے خلاف بددعا۔

مشکل الفاظ کے معنی:- دَعَوات: دَعْوة کی جمع ہے: دعاء، پکار۔ مستجابات: مستجابۃ کی جمع ہے: مقبول ہونا، دعوۃ الوالد علی والدہ: ''دعا'' کے صلہ میں جب لفظ ''علی'' آجائے تو اس وقت اسکے معنی ''بددعا'' کے ہوتے ہیں اور اگر اسکے بعد ''لام'' آجائے جیسے دعا للولد، تو پھر اسکے معنی دعاء خیر کے ہوتے ہیں، اس حدیث میں یہ لفظ بددعا کے معنی میں ہے۔

والدین کی بددعا ضرور قبول ہوتی ہے

اس حدیث میں تین قسم کی دعاؤں کا ذکر ہے کہ وہ ضرور قبول ہوتی ہیں، مظلوم کی فریاد، اس سے عرش الٰہی لرز اٹھتا ہے، مسافر کی دعا اور والد کی اپنی اولاد کے خلاف بددعاء، اس لئے اس طریقے سے زندگی گذاری جائے کہ نہ تو کسی پر ظلم اور زیادتی ہو، اور نہ ہی والدین کو بددعا دینے کا موقع دیا جائے بلکہ ہر انسان کے ساتھ

عدل وانصاف اور حسن اخلاق کا برتاؤ کیا جائے اور والدین کو خدمت اور جائز امور میں ان کی اطاعت کے ذریعے خوش رکھا جائے تاکہ ان کی بددعاء کی زد میں نہ آجائیں، اور جو شخص مسافر ہو، اسے چاہیے کہ وہ دوران سفر اپنے لئے، والدین، عزیز واقارب اور تمام امت کیلئے خیر وعافیت کی دعائیں مانگنے کا معمول رکھے، کیونکہ یہ وہ موقع ہے کہ جس میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے، سفر میں اللہ کی نافرمانی، فضول گفتگو اور گناہوں سے بچنے کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

ترکیب نحوی:- ''ثلث دعوات'' یہ مبتدا ہے اور ''مستجابات'' خبر ہے

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ حَقِّ الْوَالِدَيْنِ

یہ باب والدین کے حق کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَجْزِىْ وَلَدٌ وَالِدًا إِلَّا أَنْ يَّجِدَهُ مَمْلُوْكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ.

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی بیٹا اپنے والد (کے احسان) کا بدلہ نہیں دے سکتا (خواہ وہ کتنے ہی احسانات کرلے) مگر یہ کہ وہ اپنے والد کو غلام پائے، اسے خرید ے اور پھر آزاد کردے (اس طرح کرنے سے گویا اس نے اپنے والد کے احسان کا بدلہ دیدیا)

مشکل الفاظ کے معنیٰ: لا یجزی: (یاء پر زبر کے ساتھ) وہ بدلہ نہیں دے سکتا۔ مملوک: غلام۔ یُعتِقه: اسے وہ آزاد کردے۔

والدین کے احسانات

اس دنیا میں انسان کے وجود کا ظاہری سبب والدین ہیں، وہ اولاد کی نشو ونما میں طرح طرح کی مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، اپنے آرام وراحت کے مقابلے میں ہر وقت اولاد کے آرام وراحت کو ترجیح دیتے ہیں، انکی ساری زندگی اسی فکر اور کشمکش میں گذرتی ہے،............ یہ وہ احسانات ہیں کہ

انسان ان کا بدلہ کسی بھی طرح نہیں اتار سکتا اگر چہ ساری زندگی ان کی دیکھ بھال اور خدمت میں گذار دے۔

ہاں ایک صورت میں بیٹا ان احسانات کا بدلہ اتار سکتا ہے، جبکہ وہ اپنے والد یا والدہ کو کسی کا غلام پائے، اور پھر انہیں خرید کر آزاد کردے، اور انہیں آزادی کی نعمت دلا دے، اس عمل سے گویا اس نے ان احسانات کا حق ادا کردیا، کیونکہ آزادی وہ عظیم نعمت ہے جس سے انسان کو حیات ثانیہ حاصل ہوتی ہے، غلامی کا طوق، جو بلاشبہ ایک نقص اور عیب ہے، گلے سے اتر جاتا ہے، اور اب وہ کامل انسان شمار ہوتا ہے، اور تمام معاملات، تصرفات اور احکام میں آزاد لوگوں کی طرح ہو جاتا ہے۔

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب انسان کسی محرم رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ خود ہی آزاد ہو جاتا ہے، الگ سے اس کیلئے کوئی لفظ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، اس حدیث میں اگر چہ خریدنے کے بعد الگ سے آزادی کا ذکر ہے لیکن یہ اس وجہ سے ہے کہ "خریداری" آزادی کا سبب ہے، اسکا یہ مطلب نہیں کہ خریدنے کے بعد پھر مستقل الفاظ سے اسے آزاد کیا جائے، تحفۃ الاحوذی، ۲۸/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ قَطِيْعَةِ الرَّحِمِ

یہ باب رشتے اور ناتے توڑنے (کی وعید) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ قَالَ: اشْتَكَى أَبُوْ الدَّرْدَاءِ فَعَادَهُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فَقَالَ: خَيْرُهُمْ وَأَوْصَلُهُمْ مَا عَلِمْتُ أَبُوْ مُحَمَّدٍ، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: أَنَا اللّٰهُ وَأَنَا الرَّحْمٰنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنَ اسْمِي، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ.

ابوسلمہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء بیمار ہوئے تو ان کی عیادت کیلئے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آئے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے علم کے مطابق لوگوں میں سب سے بہتر اور زیادہ صلہ رحمی کرنیوالے ابومحمد یعنی عبدالرحمن بن عوف ہیں، عبدالرحمن بن عوف نے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بلند و برتر اور بزرگ ہیں، فرماتے ہیں: میں اللہ ہوں، میں ہی رحمٰن ہوں، میں نے رحم یعنی رشتے ناتے کو پیدا کیا ہے، اور میں نے اس رشتے ناتے کیلئے (لفظِ رحم) اپنے نام (یعنی رحمٰن کے لفظ) سے نکالا ہے، لہٰذا جو شخص رحم کو جوڑیگا (اسکے حقوق ادا کریگا) تو میں بھی اسکو (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑونگا، اور جو شخص رحم کو توڑے گا (اسکے حقوق نہیں ادا کرے گا، تو میں بھی اسکو (اپنی رحمتِ خاص سے) جدا کردونگا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ :- قَطِیْعَة: قطع تعلق، بے تعلقی، رشتہ داروں سے علیحدگی اور ترکِ تعاون۔ الرَحِم: (راپر زبر اور حاء کے نیچے زیر کے ساتھ) رشتہ ناتہ، قرابت مطلق رشتہ دار، خواہ وہ محرم ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ وارث ہو یا نہ ہو، ج اَرحام۔ عــــادہ: انہوں نے بیمار پرسی اور عیادت کی۔ اشتـــکـــی: وہ بیمار ہوئے۔ اَوْصَلُھم: لوگوں میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا۔ تبارک: بلند و برتر ہونا، خدا کا ہر عیب سے پاک اور مقدس ہونا۔ تعالیٰ: بلند و برتر اور عالیشان ہونا۔ رحمٰن: بڑا مہربان، زبردست رحمت والا، یہ وصف صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور کیلئے یہ وصف جائز نہیں ہے، لفظ رحمٰن اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اس میں ''رحیم'' کے مقابلے میں زیادہ مبالغہ ہے، لفظ ''رحیم'' میں وہ خاص رحمت ملحوظ ہے جو آخرت میں صرف مومنین کیلئے ہوگی، جبکہ لفظ ''رحمٰن'' میں عام رحمت مراد ہے جو دنیا میں مومن و کافر سب کو شامل ہے۔ شَقَقْتُ: میں نے نکالا اور لیا۔ لھا: یہ ضمیر ''رحم'' کیطرف لوٹ رہی ہے۔ وصلھا: جو اس رشتے کو جوڑے گا۔ وصلتہ: میں اسکو (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑونگا۔ بَتَتُّہٗ: یہ لفظ بَتّ سے ہے، اور واحد متکلم کا صیغہ ہے، میں اسکو (اپنی رحمتِ خاص سے) جدا کردونگا، توڑ دونگا۔

رشتہ داروں سے قطع تعلق کی وعید

نبی کریم ﷺ نے حدیث قدسی کے ذریعے رشتے جوڑنے کی تعریف اور تعلقات توڑنے کی مذمت بیان فرمائی ہے، اسکی اہمیت کے پیش نظر انداز یہ اختیار کیا ہے کہ ''میں اللہ ہوں'' اور پھر فرمایا کہ رشتے ناتے اور قرابت کیلئے لفظ ''رحم'' اللہ تعالیٰ نے اپنے نام ''رحمٰن'' سے نکالا ہے، دونوں کا مادہ اور حروف ایک ہی ہیں، گویا

رحم، رشتے ناتے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے، لہذا جو شخص میرے نام کی لاج رکھتے ہوئے رشتے ناتے کے حقوق ادا کریگا تو میں اسے اپنی رحمت کے ساتھ منسلک کرونگا، اور جو قطع تعلقی اور اسکے حقوق میں غفلت سے کام لیگا تو میں بھی اسے اپنی رحمت خاص سے الگ کر دوں گا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ، ۶۶۵/۸۔

لفظ ''رحمٰن'' سے اسطرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جسطرح اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں مومن و کافر، نیک و بد ہر قسم کے لوگوں کیلئے عام ہے، انہیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، اسی طرح رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے میں نہایت تحمل، برداشت اور نرمی سے کام لینا چاہیے، تاہم اللہ کی نافرمانی میں ان کا ساتھ دینا بہرحال جائز نہیں۔

حدیث قدسی کی تعریف

حدیث قدسی: اس حدیث کو کہا جاتا ہے جسے نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کر کے بیان فرمائیں، اسکا معنیٰ اور مفہوم اللہ کیطرف سے ہوتا ہے، اور الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں،

اسطرح کی حدیث کو **قال اللہ تبارک وتعالیٰ یاقال اللہ تعالیٰ فیما رواہ عنہ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم یاقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یرویہ عن ربہ عز و جل** کے الفاظ سے روایت کیا جاتا ہے۔ تیسیر مصطلح الحدیث، دکتور محمود الطحان (ص:۱۲۶)

حدیثِ باب بھی حدیث قدسی ہے، جس کے راوی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔

ترکیب نحوی:- **خیرھم و أوصلھم ما علمت** یہ مبتداء ہے اور ''**ابو محمد**'' خبر ہے، ''ابو محمد'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۲۹/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ صِلَةِ الرَّحِم

یہ باب صلہ رحمی یعنی رشتے جوڑنے (کی حقیقت) کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلَكِنَّ

الْوَاصِلَ الَّذِیْ إِذَا انقَطَعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا.

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا: کامل صلہ رحمی کرنیوالا وہ شخص نہیں ہے جو (صلہ رحمی کا) بدلہ دے بلکہ کامل صلہ رحم کرنیوالا وہ ہے کہ جب اسکا رشتہ اور تعلق منقطع ہو جائے (اور اسکی قرابت کوتوڑ دیا جائے) تو (بھی) وہ اس قرابت کو قائم رکھے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ عَنْ أَبِیْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ.

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قطع تعلق کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- صلة: کسی سے تعلق رکھنا۔ الواصل: صلہ رحمی کرنے والا۔ المکافئ: بدلہ دینے والا۔ انقطعت رحمه: اسکی قرابت منقطع ہو۔ صحیح بخاری کی روایت میں قُطِعَتْ رحمُه کے الفاظ ہیں یعنی اسکی قرابت کو ختم کیا جائے۔

صلہ رحمی کا اصل مفہوم

اگر کوئی شخص صرف اس رشتہ دار کے ساتھ بدلہ کے طور پر احسان اور نیکی کرے اور اسکے ساتھ آنا جانا رکھے جو اسکے ساتھ احسان اور نیکی کرتا ہے، اسکی خوشی اور غمی میں شریک ہوتا ہے، تو اسکو حقیقی معنی میں صلہ رحمی نہیں کہیں گے، بلکہ اسے احسان کا بدلہ چکانا کہا جائیگا، اور وہ شخص کامل صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوگا، اور اگر یہ اس رشتہ دار کے ساتھ اچھا برتاؤ اور احسان کرے جو اس کے ساتھ برے طریقے سے پیش آتا ہے، رشتہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتا، اور نہ ہی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ شخص اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر اسکے ساتھ صلہ رحمی کرے، تو بلاشبہ یہ شخص کامل صلہ رحم کرنے والا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کا کامل ترین جذبہ وہ ہے جسکی بنیاد بدلہ چکانے پر نہ ہو بلکہ محض حق

شناسی اور حق قرابت کی ادائیگی کے احساس پر ہو، خواہ اسکا حق کسی نے ادا کیا ہو یا ادا نہ کیا ہو، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اصل جوانمرد وہی شخص ہوتا ہے جو اپنے حقوق کا کسی سے مطالبہ نہ کرے اور خود دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے درپے رہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا ہے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دو، یہی کمال ایمان کی علامت ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس شخص کے ساتھ صلہ رحمی کرو جو تعلقات توڑتا ہے، اور اس شخص کے ساتھ حسن سلوک کرو جو آپکے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا ہے۔

حدیث میں **لیس الواصل بالمکافي** سے کمال کی نفی مراد ہے کہ کامل صلہ رحم کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلہ کے طور پر صلہ رحمی کرے لیکن چونکہ اس میں بھی ایک لحاظ سے صلہ رحمی پائی جاتی ہے اسلئے ایسے شخص کو قطع رحم کرنے والا نہیں کہا جائیگا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ ۶۵۹/۸۔

قطع رحمی کرنیوالا جنت میں داخل نہیں ہوگا

باب کی دوسری حدیث میں ہے کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسکے دو معنی بیان کئے ہیں:

(۱)......اس سے مراد وہ شخص ہے جو قطع رحمی کو بغیر کسی سبب اور شبہہ کے حلال اور جائز سمجھتا ہے، حالانکہ اسے علم ہے کہ شریعت میں قطع تعلقی حرام ہے، ایسا شخص چونکہ کافر ہوتا ہے، اسلئے ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہیگا اور جنت میں کبھی داخل نہیں کیا جائیگا۔

(۲)......یا یہ مراد ہے کہ قطع رحمی کرنے والا نجات یافتہ اور سابقین کے ساتھ ابتداء میں ہی جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اپنے گناہوں کی بقدر سزا بھگتنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسے جنت میں داخل کیا جائیگا۔ شرح مسلم للنووی، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا، ۳۱۵/۲

صلہ رحمی سے کیا مراد ہے

صلہ رحمی کے معنی یہ ہیں کہ رشتہ داروں کو اپنی طاقت کے بقدر فائدہ پہونچایا جائے اور انکی تکلیف اور مشکل کو حل کیا جائے، اسکے مختلف درجات ہیں، رشتے کو جوڑنا واجب اور توڑنا گناہ کبیرہ ہے، اور بعض

صورتوں میں رشتہ داروں کے تعلق کی رعایت اور ان سے نیک سلوک کرنے کی زیادہ اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے، اور بعض صورتوں میں زیادہ اہمیت نہیں ہوتی، ابن جمرہ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی کی موقع اور حالات کے اعتبار سے مختلف صورتیں ہوتی ہیں، صلہ رحمی مالی تعاون، کسی ضرورت کے موقع پر رشتہ دار کا ہاتھ بٹانے، تکلیف کو دور کرنے، خندہ پیشانی سے پیش آنے اور دعا کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اور سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ آپس میں بول چال اور ملاقات باقی رہے، اگرچہ یہ محض سلام وکلام کی حد تک ہو۔

لیکن اگر رشتہ دار غیر مسلم، گمراہ، فاسق وفاجر اور گنہگار ہوں تو ایسے میں ان سے بائیکاٹ کرنا، تاکہ وہ راہ راست پر آجائیں، یہی صلہ رحمی ہے اور حکمت کے ساتھ وعظ ونصیحت اور ان کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے، تاہم صلہ رحمی کا یہ حق ہر صورت میں باقی رہتا ہے کہ ان کیلئے دعائیں کی جائیں تاکہ وہ اسلام قبول کرلیں، اور اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں۔ فتح الباری، کتاب الأدب، باب من وصل وصلہ اللہ، ۵۱۲/۱۰

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ حُبِّ الْوَالِدِ وَلَدَهُ

یہ باب والد کا اپنی اولاد کی محبت کے بیان میں ہے

عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ يَقُوْلُ زَعَمَتِ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ خَوْلَةُ بِنْتُ حَكِيْمٍ قَالَتْ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ وَهُوَ مُحْتَضِنٌ أَحَدَ ابْنَيْ ابْنَتِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ: إِنَّكُمْ لَتُبَخِّلُوْنَ وَتُجَبِّنُوْنَ وَتُجَهِّلُوْنَ وَإِنَّكُمْ لَمِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ.

عمر بن عبد العزیز کہتے ہیں کہ ایک نیک عورت یعنی خولہ بنت حکیم کہتی ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ اپنی بیٹی فاطمہ کے دو بیٹوں (حضرت حسن وحسین) میں سے ایک کو گود میں لیے ہوئے نکلے (ان بچوں سے) فرمانے لگے: بیشک تم بخیل کردیتے ہو، بزدل، اور جاہل بنادیتے ہو، اور بلاشبہ تم اللہ (کے پیدا کئے ہوئے) خوشبودار پودے ہو۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- مُحْتَضِن: گود میں لینے والا۔ لَتُبَخِّلُوْنَ: تم بخیل کردیتے ہو۔ تجبنون: تم بزدل بنادیتے ہو۔ تجهلون: تم جاہل بنادیتے ہو۔ رَيْحَان: (۱) ہر خوشبودار پودا (۲) نازبو، ج

رَیَاحِیْن (۳) رحم ومہربانی (۴) رزق۔

اولاد کی محبت کے اثرات

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اولاد کی محبت کے اثرات کا ذکر فرمایا ہے کہ جب کسی کی اولاد ہو جائے تو وہ بخل شروع کر دیتا ہے، خرچ کرنے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے تا کہ یہ مال ودولت اولاد کے کام آئے، اور اولاد کی وجہ سے آدمی بزدل ہو جاتا ہے، جہاد میں جانے سے گریز کرتا ہے، انکی پرورش کی خاطر ہمہ تن محنت میں مصروف رہتا ہے، یوں اولاد جاہل بنا دیتی ہے، اور فرمایا کہ اولاد اللہ کیطرف سے خوشبودار پودے ہیں۔

انکم لمن ریحان الله، اس جملے سے اولاد کی تعریف کی گئی ہے۔

شارحین حدیث نے ''ریحان'' کے دو معنیٰ بیان کئے ہیں:

(۱)......اس سے مراد خوشبودار پودا ہے، کہ جسطرح اس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے، اسی طرح اولاد بھی خوشبودار پودے ہیں کہ انہیں بھی سونگھ کر تسکین حاصل کی جاتی ہے۔

(۲)......ابن التین کہتے ہیں کہ ریحان سے مراد ''رزق'' ہے، اور اس جملے کے معنی ہونگے کہ تم اللہ تعالیٰ کیطرف سے رزق ہو، جو اس نے محض اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمایا۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد......۱۰/۵۲۴

اس حدیث سے یہ درس حاصل ہوتا ہے کہ مسلمان کو اولاد کی محبت میں اسقدر غلو اور تجاوز نہیں کرنا چاہیے کہ جس سے وہ اسلامی احکام پر عمل نہ کر سکے، اولاد سے محبت ضرور کی جائے لیکن شرعی حدود میں رہتے ہوئے، اعتدال کے ساتھ تا کہ اسلامی احکام پر صحیح طریقے سے عمل کیا جا سکے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ رَحْمَةِ الْوَلَدِ

یہ باب بچوں سے پیار کرنے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: أَبْصَرَ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ یُقَبِّلُ الْحَسَنَ. وَقَالَ ابْنُ أَبِیْ عُمَرَ الْحَسَنَ أَوِ الْحُسَیْنَ، فَقَالَ: إِنَّ لِیْ مِنَ الْوَلَدِ عَشَرَةً مَا

قَبَّلْتُ أَحَدًا مِنْهُمْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، کہ آپ حسن کو بوسہ دے رہے تھے، ابن ابی عمر کہتے ہیں کہ حسن یا حسین کو (بوسہ دے رہے تھے، انہیں شک ہے کہ ان میں سے کون تھا) اقرع بن حابس نے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں، (لیکن) ان میں سے کسی کو بھی میں نے بوسہ نہیں دیا، آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص (اولاد اور دوسرے لوگوں پر) رحم نہیں کرتا، اسپر (اللہ کیطرف سے بھی) رحم نہیں کیا جاتا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: - اَبْصَرَ: اس نے دیکھا۔ انه: "ہ" ضمیر شان ہے۔ یُقَبِّلُ: وہ بوسہ دیتا ہے۔ لا یرحم: رحم نہیں کرتا (یہ معروف کا صیغہ ہے)۔ لا یرحم: اسپر رحم نہیں کیا جاتا (یہ مجہول کا صیغہ ہے)

بچوں سے پیار اور شفقت کرنیکا حکم

حضرت اقرع بن حابس نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ حضرت حسن یا حسین کو بوسہ دے رہے ہیں تو انہیں تعجب ہوا، کہنے لگے کہ میرے دس بیٹے ہیں، اور میں نے کسی کو بھی بوسہ نہیں دیا، اسپر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی مخلوق اور اولاد پر شفقت نہیں کرتا، اور ان پر رحم نہیں کرتا تو اسپر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولاد سے پیار کرنا، انہیں گود میں لینا، بوسہ دینا اور ان سے دل لگی کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے، یہ فطرت کا تقاضا ہے، جسے ادا کرنا چاہیے، اور جو شخص بچوں سے پیار و محبت اور بوس و کنار نہیں کرتا اس سے آپ ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ النَّفَقَاتِ عَلَى الْبَنَاتِ وَالْأَخَوَاتِ

یہ باب لڑکیوں اور بہنوں پر خرچ کرنے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ كَانَتْ لَهُ ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ أَوِ ابْنَتَانِ أَوْ أُخْتَانِ فَأَحْسَنَ صُحْبَتَهُنَّ وَاتَّقَى اللّٰهَ فِيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں پھر ان کے ساتھ اس نے اچھا سلوک کیا اور ان (کی پرورش) کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہا، تو اس کیلئے جنت ہے۔

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَایَکُوْنُ لِأَحَدِکُمْ ثَلَاثُ بَنَاتٍ أَوْ ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ فَیُحْسِنُ إِلَیْهِنَّ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جس کسی کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں پھر وہ ان سے حسن سلوک کرے تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنِ ابْتُلِیَ بِشَیْءٍ مِنَ الْبَنَاتِ فَصَبَرَ عَلَیْهِنَّ، کُنَّ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص لڑکیوں میں سے کچھ (یعنی ایک یا دو یا زیادہ) کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کیا جائے پھر وہ ان (کی پرورش کی مصیبتوں) پر صبر کرتا رہا تو وہ لڑکیاں (اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی نیکیاں) اس کیلئے دوزخ کی آگ سے پردہ بنیں گی۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: دَخَلَتِ امْرَأَةٌ مَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا فَسَأَلَتْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِیْ شَیْئًا غَیْرَ تَمْرَةٍ فَأَعْطَیْتُهَا إِیَّاهَا فَقَسَمَتْهَا بَیْنَ ابْنَتَیْهَا وَلَمْ تَأْکُلْ مِنْهَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ وَدَخَلَ النَّبِیُّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مَنِ ابْتُلِیَ بِشَیْءٍ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ کُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک دن) میرے پاس ایک عورت آئی، اسکے ساتھ اسکی دو بچیاں بھی تھیں، اس نے (مجھ سے، کھانے کیلئے کچھ) مانگا، (لیکن) اسکو میرے پاس ایک کھجور کے علاوہ اور کچھ بھی نہ مل سکا، چنانچہ میں نے اسکو وہی ایک کھجور دیدی، اس نے وہ کھجور اپنی بچیوں میں بانٹ دی، اور خود اس میں سے کچھ نہیں کھایا پھر وہ

اٹھی اور باہر چلی گئی، اتنے میں نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے، میں نے آپ سے (اس عورت کا) یہ واقعہ بیان کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص ان بچیوں میں سے کچھ (یعنی ایک یا دو یا زیادہ) کی وجہ سے آزمایا جائے (یعنی اللہ تعالیٰ اسے بیٹیاں عطا فرمائیں) تو وہ بچیاں (اور ان کے ساتھ حسن سلوک) اس کیلئے دوزخ کی آگ سے پردہ بنیں گی۔

عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ دَخَلْتُ أَنَا وَهُوَ الْجَنَّةَ كَهَاتَيْنِ وَأَشَارَ بِإِصْبَعَيْهِ.

ابوبکر بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی (اور انکے اخراجات برداشت کرتا رہا) تو میں اور وہ ان دو (انگلیوں) کیطرح (ایک ساتھ) جنت میں داخل ہونگے، اور آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (انگشت شہادت اور درمیانی انگلی) سے اشارہ کیا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- اَحْسَنَ صُحْبَتَهُنَّ: ان بیٹیوں یا بہنوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، حسن سلوک کیا۔ عال: اس نے بچوں کی پرورش کی، انکے اخراجات برداشت کئے۔ جاریتین: جاریۃ کا تثنیہ ہے: دو لڑکیاں۔ ھاتین: اس سے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی مراد ہے، آپ ﷺ نے ان دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔

بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

ان احادیث میں ان لوگوں کی فضیلت اور ثواب کا ذکر ہے جو اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرتے ہیں، انکے ہر قسم کے اخراجات اور خرچے برداشت کرتے ہیں، انہیں اپنے اوپر بوجھ نہیں سمجھتے، اور نہ ہی کسی طرح کا انہیں طعنہ دیتے ہیں، ان کی نشو ونما اور پرورش صبر وتحمل کے ساتھ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی شادیاں کرادیں۔

لفظ ''احسان'' ان تمام امور کو شامل ہے، نیز راجح قول کے مطابق لفظ ''احسان'' میں واجب

اخراجات اور مزید حسن سلوک وغیرہ بھی داخل ہے، لہذا جو شخص شرعی اصولوں کی روشنی میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ بچپن سے شادی بیاہ تک برابر اچھا برتاؤ کرتا رہا، اپنی حیثیت اور عرف کے مطابق ان کے جذبات کا بھی خیال کرتا رہا، تو اس کیلئے جنت ہے، اور یہ بچیاں اس کیلئے جہنم سے نجات کا ذریعہ بنیں گی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے دو بچیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں تو میں اور وہ ان دو انگلیوں کیطرح ایک ساتھ جنت میں داخل ہونگے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنے اور اس شخص کے درمیان کمال قرب اور اتصال کو ظاہر کرنے کیلئے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح یہ دو انگلیاں آپس میں متصل اور قریب ہیں اسی طرح قیامت کے دن، میں اور وہ ایک دوسرے کے قریب ہونگے اور جنت میں ایک ساتھ داخل ہونگے، فتح الباری، کتاب الادب، باب رحمة الولد......۱۰/۵۲۵، مرقاة المفاتیح، کتاب الادب، ۶۸۲/۸

اس باب کی پہلی حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری ہیں، ان کا اصل نام سعد بن مالک بن سنان ہے، اور سعد بن ابی وقاص کا اصل نام سعد بن مالک بن وھیب ہے۔ تحفة الاحوذی ۶/۳۵

بہنوں اور بیٹیوں کیوجہ سے ابتلاء سے کیا مراد ہے

"من ابتلی بشیئ من البنات" جو شخص بچیوں میں سے کچھ کے ساتھ آزمایا گیا...........،

اس "ابتلاء" سے کیا مراد ہے، اس بارے میں شارحین حدیث کے درمیان اختلاف ہے، جسکی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد لڑکیوں کی پیدائش ہے، اسے ابتلاء اسلئے کہا ہے کہ اسلام سے پہلے لوگ بچیوں کو انتہائی ناپسند کرتے تھے، انہیں زندہ دفن کردیا جاتا تھا، جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس رسم کو ختم کیا گیا، اور لڑکیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ اور حسن سلوک کی ترغیب دی گئی۔

(۲)......حافظ عراقی کے نزدیک ابتلاء سے "اختبار اور امتحان" مراد ہے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ بچیاں دے کر آزماتے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت

میں ''تقویٰ'' کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ تقوی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا، خوف خدا نہیں ہوگا تو وہ شخص نہ تو بہنوں اور بیٹیوں کے حقوق ادا کریگا اور نہ ہی ان کے ساتھ حسن سلوک کریگا۔

(۳)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ''ابتلاء'' سے وہ محنت ومشقت اور تکلیف مراد ہے جس کا بچیوں کی وجہ سے آدمی کو بسا اوقات سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا جو شخص صبر واستقامت کے ساتھ اس وقت کو گذار لے تو اسے جنت عطا کی جائیگی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......لڑکیوں کے حقوق کا زیادہ خیال رکھنا، کیونکہ یہ لڑکوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں۔

(۲)......محتاج شخص کیلئے سوال کا جواز۔

(۳)......سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دیدینا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سائلہ کو ایک کھجور دیدی۔ فتح الباری ۱۰/۵۲۴۔

ایک تعارض اور اسکا جواب

حدیث باب میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس سائلہ کو صرف ایک کھجور دی جسکے دو ٹکڑے کر کے اس نے اپنی بچیوں میں تقسیم کئے، اور خود کچھ نہیں کھایا، جبکہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے جس میں تین کھجوروں کے دینے کا ذکر ہے، ایک ایک کھجور اپنی دو بچیوں کو اس نے دی اور تیسری کھجور جب وہ خود کھانے لگی تو بچیوں نے اس سے مانگ لی، اس نے وہ بھی آدھی آدھی اپنی بچیوں کو دیدی، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے ان کی اپنی بچیوں کے ساتھ اسطرح کی شفقت سے بڑا تعجب ہوا۔

ان دونوں روایات میں بظاہر تعارض ہے حدیث باب میں صرف ایک ہی کھجور کا ذکر ہے جبکہ صحیح مسلم کی روایت میں تین کھجوروں کا ذکر ہے، اس تعارض کے ازالے کیلئے محدثین نے دو حل پیش کئے ہیں:

(۱)......ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابتداء میں صرف ایک کھجور دی ہو، بعد میں دو مزید کھجوریں مل گئیں تو وہ بھی دیدیں، اسلئے صحیح مسلم میں تینوں کھجوروں کا ذکر کردیا اور ابتداء میں چونکہ ایک ہی کھجور تھی اسلئے ترمذی کی روایت میں صرف اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲)......اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعے ہوں، ایک موقع پر ایک کھجور کا واقعہ پیش آیا، اور دوسرے کسی موقع پر تین کھجوروں کا واقعہ پیش آیا، ایک دفعہ کا ذکر ترمذی میں اور دوسری بار کا ذکر صحیح مسلم میں ہے، اس لحاظ سے کوئی تعارض نہیں ہوگا۔ فتح الباری، ۵۲۴/۱۰۔ تحفۃ الاحوذی، ۳۶/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ رَحْمَةِ الْيَتِيْمِ

یہ باب یتیم پر مہربانی (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قَبَضَ يَتِيْمًا مِنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِيْنَ إِلٰى طَعَامِهٖ وَشَرَابِهٖ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ الْبَتَّةَ إِلَّا أَنْ يَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ.

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے جو شخص کسی یتیم کو (کھانا کھلانے کیلئے) اپنے کھانے اور پینے کیطرف لے جائے، یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کرلے جو بخشا نہ جائے (یعنی شرک کرلے)۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ، وَأَشَارَ بِإِصْبَعَيْهِ يَعْنِي السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰى.

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں ان دو انگلیوں کیطرح (قریب) ہونگے، اور نبی کریم ﷺ نے اپنی دو انگلیوں یعنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- قبض: وہ لے جائے۔ طعامه وشرابه: ان کی ضمیریں "مَن" کیطرف لوٹ رہی ہیں۔ البتة: یقینی طور پر، قطعاً، بلاشبہ۔ کافل: اخراجات وغیرہ کا ذمہ اٹھانے والا اور "کافل الیتیم" سے وہ شخص مراد ہے جو یتیم کے ہر قسم کے خرچے اور ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لے۔ یتیم: اس نابالغ لڑکے یا لڑکی کو کہا جاتا ہے جس کا والد مرگیا ہو ج اَیتام۔

یتیم کو پالنے کی فضیلت

ان احادیث میں یتیم کے ساتھ حسن سلوک اور اسے پالنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے،

پہلی حدیث میں فرمایا کہ جو مسلمان کسی یتیم کو کھانا کھلانے کیلئے لے جائے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل کریں گے، ہاں اگر وہ ایسا کوئی گناہ کرلے جو معاف نہ ہو سکے یعنی شرک کرلے اور بغیر توبہ کے ہی مر جائے تو پھر جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

جنت میں داخل ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں، بعض لوگ دین پر استقامت اور ثابت قدمی کی وجہ سے پہلی دفعہ ہی جنت میں چلے جائیں گے، اسے "دخول اولیٰ" کہا جاتا ہے، اور بعض لوگ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل کیے جائیں گے اسے "دخول ثانوی" کہا جاتا ہے، حدیث بالا میں جنت میں داخل ہونے کی دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔

حدیث میں "ذنبا لا یغفر" سے شرک مراد ہے، اور بعض کے نزدیک اس سے "مظالم خلق"، یعنی مخلوق پر ظلم وزیادتی مراد ہے کہ یہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اگر توبہ کے بغیر ہی مر گئے تو اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ان گناہوں پر سزا کا فیصلہ ہو سکتا ہے ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۳۸۔

دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا قیامت اور جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے، کمال قرب کو ظاہر کرنے کیلئے آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا، کہ جس طرح یہ دو انگلیاں آپس میں قریب قریب ہیں، اسی طرح ہم دونوں بھی ایکدوسرے کے قریب ہونگے۔

اور صحیح بخاری کی روایت میں وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئاً کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ان دو انگلیوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی، انہیں ملایا نہیں، اسطرف اشارہ کرنے کیلئے کہ نبی اور کافل الیتیم کے درمیان درجات کے اعتبار سے فرق ہوگا، اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے آپ ﷺ نے ان دو انگلیوں کے درمیان

تھوڑا سا فاصلہ رکھا ہے۔

حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ کافل الیتیم جنت میں نبی کریم ﷺ کے قریب اس وجہ سے ہوگا کہ نبی اور کافل الیتیم کے درمیان ایک طرح کی مناسبت پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ جسطرح نبی کو ایک ایسی قوم کیطرف نبی بنا کر بھیجا جاتا ہے جو دینی امور سے نا آشنا ہوتی ہے، وہ نبی ان سب کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے، انکی تعلیم و تربیت اور اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، اسی طرح کافل الیتیم بھی اس بچے کی ضمانت اٹھاتا ہے جو نہ دین سمجھتا ہے اور نہ دنیا، اسکو پالتا ہے، تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتا ہے، اور اسے حسن سلوک سکھاتا ہے، اس اعتبار سے ایک نبی اور یتیم کے مربی کے درمیان مناسبت پائی جاتی ہے، اسلئے یتیم کا مربی جنت میں نبی ﷺ کے قریب ہوگا۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیما ۱۰/۵۳۵، ۵۳۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ رَحْمَةِ الصِّبْيَانِ

یہ باب بچوں پر مہربانی اور شفقت (کی فضیلت) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يَقُوْلُ: جَاءَ شَيْخٌ يُرِيْدُ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَبْطَأَ الْقَوْمُ عَنْهُ أَنْ يُوَسِّعُوْا لَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا.

انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک بزرگ نبی کریم ﷺ سے ملاقات کیلئے آئے، (مجمع میں ہجوم زیادہ تھا) لوگوں نے اسے راستہ دینے میں دیر کردی (یہ منظر دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کا احترام نہ کرے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا.

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے (یعنی

ہمارے طریقے پر) نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑے کی عزت وحیثیت کو نہ پہچانے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم میں سے وہ شخص نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم اور ہمارے بڑے کا ادب واحترام نہ کرے، جو نیکی کا حکم اور برائی سے نہ روکے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: - الصبیان: یہ صبی کی جمع ہے: وہ بچہ جسکا ابھی دودھ چھڑا دیا گیا ہو۔ أَبْطَأَ: اس نے دیر کردی۔ یُوَسِّعُوْا لَه: اس کیلئے کشادگی کرو یعنی راستہ دو۔ ولم یُوقِّرْ: جو ادب واحترام نہ کرے۔ شرف: عزت وحیثیت، بلند مرتبہ، ج اشراف۔ المعروف: نیکی، بھلی بات۔ المنکر: برائی، اللہ کی نافرمانی، گناہ۔ لیس منا: ہم میں سے نہیں یعنی ہمارے طریقے اور سنت پر نہیں۔ باب کی آخری حدیث میں یوقر، یامر اور یَنْهَ یہ تینوں افعال ''یرحم'' پر معطوف ہیں، اور لم کے تحت ہیں اسلئے یہ حالت جزم میں ہیں۔

بچوں پر شفقت اور بڑوں کا احترام کرنے کا حکم

ان احادیث میں چھوٹوں پر شفقت و پیار، بڑوں کا ادب واحترام، نیکی کا حکم اور برائی سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام، نیکی کا حکم اور برائی سے نہیں روکتا وہ ہمارے طریقے اور سنت پر نہیں ہے، اسلئے ان صفات سے آراستہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

لیس منا کے معنیٰ

شارحین حدیث نے اس کے تین معنیٰ بیان کئے ہیں:

(۱)......امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ لیس منا کے معنیٰ لیس من سنتنا ولیس من ادبنا ہیں یعنی وہ شخص ہمارے طریقے اور ادب پر نہیں ہے، اس جملے سے مقصود محض زجر اور تنبیہ ہوتا ہے تا

کہ وہ ان امور کا ارتکاب نہ کرے، اس سے اسے دائرہ اسلام سے نکالنا مقصد نہیں ہے، جیسے جب کوئی والد اپنے بیٹے سے ناراض ہو جائے تو وہ اسے کہتا ہے: لَسْتُ مِنْكَ وَلَسْتَ مِنِّي: میں تم سے اور تم مجھ سے نہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ تم میرے طریقے پر نہیں ہو۔

(۲)......سفیان ثوری لیس منا کا مفہوم لیس من ھدینا وسنتنا یا لیس مثلنا بیان کرنے کو ناپسند کرتے تھے، وہ فرماتے کہ اس جملے کی اس طرح کی کوئی تاویل وتشریح نہ کی جائے، اسے اپنی اصلی حالت پر چھوڑا جائے تاکہ اس کا اثر دلوں پر صحیح طریقے سے پڑے کیونکہ اسطرح زجر میں زیادہ مبالغہ اور شدت معلوم ہوتی ہے

(۳)......بعض حضرات کے نزدیک لیس منا کے معنی: لیس علی دیننا الکامل کے ہیں یعنی وہ شخص ہمارے کامل دین پر نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب الجنائز، باب لیس منا من شق الجیوب ۲۱۰/۳۔

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی وضاحت

اس میں ''ابیہ'' کی ضمیر ''عمرو'' کیطرف اور جدہ کی ضمیر ''شعیب'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اس طرح یہ روایت متصل ہوگی، کیونکہ شعیب کے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ صحابی ہیں، شعیب کے والد ''محمد'' تابعی ہیں صحابی نہیں ہیں، یہ سند یوں ہوگی:

عن عمرو بن شعیب، عن شعیب بن محمد، عن عبد اللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب العلم، الفصل الثانی ۴۹۳/۱۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ رَحْمَةِ النَّاسِ

یہ باب لوگوں پر رحم کرنے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لَمْ يَرْحَمِ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللّٰهُ.

جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو لوگوں پر رحم نہ کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اسپر رحم نہیں کریگا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ يَقُوْلُ: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ.

ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: کسی بدبخت (کے دل) سے ہی رحمت وشفقت نکالی جاتی ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ. اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ. الرَّحِمُ شِجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعَهُ اللّٰهُ.

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے لہذا تم زمین والوں پر رحم وشفقت کروتا کہ تم پر وہ رحم کرے جو آسمان میں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) ''رحم'' رحمٰن کی شاخ ہے، لہذا جو شخص رحم کو جوڑے گا (یعنی اسکے حقوق ادا کریگا) تو اللہ تعالیٰ اسکو (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑیں گے، اور جو اسکو توڑے گا (یعنی اسکے حقوق ادا نہ کرے) تو اللہ تعالیٰ اسکو (اپنی رحمت خاص سے) جدا کردیں گے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- لا تنزع الرحمة: (یہ فعل مجہول ہے): رحمت نہیں نکالی جاتی۔ شقی: بدبخت، اس سے کافر اور گنہگار مراد ہے۔ شجنة: (شین پر زبر، زیر اور پیش تینوں طرح پڑھ سکتے ہیں، اور جیم کے سکون کے ساتھ) گھنی ٹہنی، الجھی ہوئی شاخ۔

مخلوق خدا پر رحم اور شفقت کی فضیلت

ان احادیث میں بڑی تاکید کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے کہ مخلوقِ خدا پر رحمت وشفقت کی جائے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر رحم نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اسپر رحمت نازل نہیں کرتے۔

''الا من شقی'' اس بدبخت سے کافر یا فاسق وفاجر مراد ہے، اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے کفر وعناد اور گنہگار اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنے دل کو اسقدر سخت بنالیتا ہے کہ اس کے اندر سے وہ انسانی جذبہ بھی ختم ہوجاتا ہے جو ایک انسان کو مخلوق خدا پر رحم وشفقت کرنے پر آمادہ کرتا ہے چنانچہ یہ بدبخت اسی

سخت دلی اور شقاوت قلبی کے ساتھ دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا رہتا ہے، طرح طرح کی تھکاوٹ برداشت کرتا ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے اسے بہر حال خسارا اٹھانا پڑتا ہے بشرطیکہ کفر اور گناہ سے توبہ کے بغیر دنیا سے چلا جائے، اور جو لوگ خلق خدا پر رحم کرتے رہتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ رحم کرتے ہیں، اور حکم دیا گیا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کریگا۔

"من فی الارض (زمین والوں): اس میں عموم ہے، ہر قسم کی مخلوق کو شامل ہے، خواہ وہ انسان ہوں یا جانور، مومن ہوں یا کافر، نیک ہوں یا برے ہر ایک کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا جائے برے اور ظالم پر رحم یہ ہے کہ اسے برائی اور ظلم سے روکا جائے، اور جانور پر رحم یہ ہے کہ اسے ضرورت کے مطابق وقت پر چارہ دیا جائے، اس سے زیادہ کام اور مارا پیٹا نہ جائے کیونکہ ان پر ظلم کرنا جائز نہیں ہے۔

"من فی السماء" (آسمان والا یا والے) اس کے دو معنیٰ ہیں:

(۱)......اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جسکی قدرت تمام آسمانوں اور زمین پر ہے، حدیث کے معنی یہ ہونگے کہ تم زمین والوں پر شفقت و رحم کرو، اسکی وجہ سے تم پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائیں گے۔

(۲)......بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد فرشتے ہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں، ان کا رحم یہ ہے کہ وہ رحم کرنے والے انسانوں کے دشمنوں اور تکلیف پہونچانے والی مخلوق جنات و شیاطین اور شریر انسانوں سے اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا و استغفار اور رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، الفصل الثانی ۸/۴۰۷۔ شرح الطیبی، ۹/۱۸۰، ۱۸۱۔

الرحم شجنة من الرحمن ، رحم رحمٰن کی ایک شاخ ہے، مراد یہ ہے کہ لفظ رحم، لفظ رحمٰن سے لیا گیا ہے، دونوں کے حروف ایک ہی ہیں، گویا صلہ رحمی کا رحمٰن سے ایک خصوصی تعلق اور ربط ہے، یہ مراد نہیں کہ رحم اللہ تعالیٰ کی ذات میں سے ہے اور اسکا جزء ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہے، فتح الباری، کتاب الآداب، باب من وصل وصلہ اللہ ۱۰/۵۱۲۔ اسکی مزید تفصیل حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو باب ماجاء فی قطیعۃ الرحم میں تفصیل سے گذر چکی ہے۔

بَابٌ فِيْ النَّصِيْحَةِ

یہ باب نصیحت اور خیر خواہی (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ، ثَلاثَ مِرَارٍ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ.

حضرت ابوھریرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دین نصیحت (اور خیر خواہی کا نام) ہے، حضور نے یہ بات (تاکید کے طور پر) تین بار ارشاد فرمائی، صحابہ کرام نے پوچھا اے اللہ کے رسول یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کیلئے اور کس کے حق میں کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کیلئے، اللہ کی کتاب کیلئے، مسلمانوں کے اماموں (یعنی اسلامی حکومت کے سربراہوں اور علماء) کیلئے، اور تمام مسلمانوں کیلئے۔

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: بَايَعْتُ النَّبِیَّ ﷺ عَلٰی إِقَامِ الصَّلاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ.

عبداللہ بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھوں گا، زکوۃ دوں گا اور ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کرونگا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- الدین: اسکے لغوی معنیٰ ہیں: مذہب، عقیدہ، ہر وہ طریقہ جس کے ذریعے اللہ کی عبادت کی جائے، اور اصطلاح شرع میں تین چیزوں کے مجموعے (۱) دل سے توحید ورسالت وغیرہ کا اعتقاد۔ (۲) زبان سے ان کا اقرار۔ (۳) اور اعضاء وجوارح سے ارکانِ اسلام پر عمل کو دین کہا جاتا ہے۔ اب دین اللہ کی نظر میں صرف دین اسلام ہے، اسکے علاوہ اب کوئی اور دین قبول نہیں ہے۔ النصیحة: نصیحت، خیر خواہانہ مشورہ جس میں نیکی کی دعوت اور فساد سے بچنے کی ترغیب ہو، ہمدردی، اخلاص ج نصائح۔ ائمۃ: امام کی جمع ہے: رہنما پیشوا۔ بایعت: میں نے بیعت کی، بیعت کے معنیٰ ہیں: دین پر چلنے کا عہد و پیماں۔

دین خیر خواہی کا نام ہے

''دین نصیحت ہے'' مراد یہ ہے کہ نصیحت اور خیر خواہی دین کے اعمال میں سے افضل ترین عمل ہے یا یہ کہ نصیحت اور خیر خواہی دین کا ایک اہم عظیم الشان شعبہ ہے، صحابہ نے پوچھا کہ یہ خیر خواہی کس کیلئے کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''خیر خواہی اللہ کیلئے'' یہ ہے کہ اسکی توحید پر ایمان لایا جائے، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اخلاص کے ساتھ اسکے احکام کی اطاعت کرے اسکی نعمتوں کا شکر ادا کرے، نیک لوگوں سے محبت اور برے لوگوں سے نفرت کرے۔

''خیر خواہی اللہ کی کتاب قرآن کیلئے'' اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اسے سیکھا اور سکھایا جائے، پابندی سے اسکی روزانہ تلاوت کی جائے، اسکے معانی اور احکام پر عمل کیا جائے، اور اہل باطل کیطرف سے اگر قرآن کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ کیا جائے تو اسکا ہر ممکن دفاع کیا جائے۔

بعض روایات میں اسکے بعد ''ولرسولہ'' بھی ہے، اس کے معنی: ''خیر خواہی رسول اللہ کیلئے'' یہ ہے کہ ان پر ایمان لائے اور انکی تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ ''مسلمانوں کے سربراہوں'' کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ جائز امور میں ان کی اطاعت اور تعاون کیا جائے اور اگر وہ خلاف شرع کام کرنے لگیں یا کرنے کا حکم دیں تو اپنی طاقت کے بقدر حسن تدبیر اور خوش اسلوبی سے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔

''ائمہ'' میں علماء بھی شامل ہیں جو لوگوں کی دینی رہنمائی کرتے ہیں، ان کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی عزت وتکریم کی جائے، شرعی احکام اور دینی مسائل میں قرآن وسنت کے مطابق جو کچھ وہ کہیں، اسکو قبول کیا جائے، اور ان پر عمل کیا جائے۔ ''وعامتھم'' اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو ان کے حق میں دنیا اور آخرت کے لحاظ سے بہتر ہو، ان کو تکلیف پہونچانے سے پرہیز کیا جائے، ان کو راحت رسانی کی کوشش کی جائے، اور ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔

یہ حدیث سارے دین کا خلاصہ ہے، اسلئے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کیونکہ اس

میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کا بھی ذکر ہے اور بندوں کے حقوق کا بھی، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب کی دوسری حدیث میں حضرت جریر بن عبد اللہ کی بیعت کا ذکر ہے جس میں نماز پڑھنے، زکوۃ دینے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کا بیان ہے، اس میں پہلی دو چیزیں حقوق اللہ کیطرف اشارہ کر رہی ہیں، اور والنصح لکل مسلم سے حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق کا ثبوت ہے، نماز اور زکوۃ کو خاص طور پر اسلئے ذکر کیا کہ یہ دونوں ایمان کے بعد اہم ہیں اور مشہور بھی ہیں، تاہم اس میں اسلام کے باقی ارکان روزہ اور حج بھی داخل ہیں، ان کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب الإیمان، باب قول النبی ﷺ الدین النصیحۃ ۱/۱۸۳ و ۱۸۴۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ۸/۱۰۷، ۲۰۲۔

حضرت جریر بن عبد اللہ اوران کا ایک عجیب واقعہ

حضرت جریر بن عبد اللہ قبیلہ بجلیہ کے فرد تھے، ان معروف صحابہ کرام میں سے ہیں جن کیلئے نبی کریم ﷺ نے دعائیں فرمائی ہیں، وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے آپ ﷺ کے پاس آنے کی ہر وقت اجازت تھی، اور آپ ﷺ مجھے دیکھ کر ہمیشہ مسکرایا کرتے تھے۔

زمانہ جاہلیت سے یمن میں ایک گھر تھا جسے ذوالخلصہ، کعبہ یمانیہ اور کعبہ شامیہ کہا جاتا تھا، اس میں بت نصب تھے، لوگ ان کی عبادت کرتے تھے، آپ ﷺ نے حضرت جریر بن عبد اللہ وغیرہ کو اسے منہدم کرنے کیلئے بھیجا تھا، انہوں نے اسے منہدم کیا، آپ ﷺ کو جب واپس آکر اطلاع دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں بہت دعائیں دیں۔

حضرت جریر بن عبد اللہ صحابہ کرام میں بہت حسین جمیل تھے، ان کو یوسف ھذہ الأمۃ (حسن وجمال میں اس امت کے یوسف علیہ السلام) کہا جاتا تھا۔

کئی سارے غزوات اور جہادی معرکوں میں شرکت فرمائی ہے۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، حرف الجیم ۱/۵۸۲، ۵۸۳۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل جریر بن عبد اللہ ۲/۲۹۷۔

خیر خواہی کے بارے میں ان کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جریر نے تین سو درہم میں ایک گھوڑا خریدا، پھر انہوں نے گھوڑا بیچنے والے سے کہا کہ تمہارا یہ گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے، کیا

تم اسکی قیمت چار سو درہم لو گے؟ اس نے کہا: ابن عبداللہ! تمہاری مرضی ہے، پھر جریر بن عبداللہ نے کہا کہ یہ گھوڑا تو چار سو درہم سے بھی زیادہ قیمت کا معلوم ہوتا ہے، کیا تم اسکی قیمت پانچ سو درہم لینا پسند کرو گے؟ وہ اسی طرح اسکی قیمت سو سو درہم بڑھاتے گئے یہاں تک وہ گھوڑا انہوں نے تین سو درہم کے بجائے آٹھ سو درہم میں خریدا، جب لوگوں نے ان سے اس گھوڑے کی قیمت بڑھانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے یہ بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان سے خیر خواہی کرونگا، چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا مالک اسکی وہ قیمت طلب نہیں کر رہا جو اسکی صحیح قیمت بنتی ہے تو میں نے اسکی خیر خواہی کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق ۸/۳۰۷۔

بیعت کی تعریف اور اسکا حکم

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کامل بزرگ متبع سنت کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کرنا، اور آئندہ اسکی رہنمائی میں دین پر چلنے کا عہد کرنا۔

اسکا قدیم اور مسنون طریقہ یہی چلا آرہا ہے کہ بیعت کے وقت بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر عہد کیا جائے، اگرچہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا لازم اور ضروری نہیں ہے، جس کام پر بیعت کی جائے اسکی پابندی شرعاً ضروری اور واجب ہے اور خلاف ورزی حرام ہے۔

ہر مسلمان مرد و عورت پر اپنی اصلاح کرنا فرض ہے، اور تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جب تک کسی اللہ والے سے رابطہ نہ ہو، نفس کی اصلاح نہیں ہوتی، اور اسلامی احکام پر چلنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے اپنی اصلاح کیلئے کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق تو ضروری ہے، البتہ رسمی بیعت کرنا ضروری نہیں، کسی نیک بزرگ سے مناسبت کے بعد بیعت کر لی جائے تو بہتر ہے، لیکن بیعت مقصود نہیں، اصل مقصد نفس کی اصلاح ہے، یہ بیعت کے بغیر بھی کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

آجکل اصلاح نفس سے عوام تو کیا، علماء بھی غافل ہو چکے ہیں، جب کسی سے اس موضوع پر بات کی جاتی ہے تو یہ جواب آتا ہے کہ اس زمانے میں ایسا کوئی شیخ ہی نہیں کہ جس سے اصلاحی تعلق قائم کیا جائے، لیکن

ان کی یہ بات غلط ہے، ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جو واقعی شیخ کامل ہوتے ہیں، جستجو اور تلاش کی ضرورت ہے۔

شیخ کامل کی پہچان

شیخ کامل وہ شخص ہوتا ہے، جو شریعت کا پابند ہو، سنت پر چلنے کا اہتمام کرتا ہو، بدعات ورسوم اور خلافِ شرع کا ارتکاب نہ کرتا ہو۔

شیخ کامل کی چند علامات یہ ہیں:

(۱)......ضرورت کے موافق علمِ دین رکھتا ہو۔ (۲)......اسکے عقائد، اعمال اور اخلاق شریعت کے مطابق ہوں۔ (۳)......دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔ (۴)......اپنے کمال کا دعوی نہ کرتا ہو۔ (۵)......کسی شیخ کامل متبع سنت کی خدمت میں رہا ہو، اور اسکی طرف سے بیعت لینے کی اسے اجازت حاصل ہو۔ (۶)......اس زمانے کے علماء اور بزرگان دین اسکے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں۔ (۷)......اس سے تعلق رکھنے والے سمجھدار اور دیندار لوگ ہوں اور اکثر شریعت کے پابند ہوں۔ (۸)......وہ اپنے مریدوں کی اصلاح کا خیال رکھتا ہو، اور شریعت کے خلاف ان سے کوئی کام ہو جائے تو اسپر روک ٹوک کرتا ہو۔ (۹)......اس کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہو اور دنیا کی محبت میں کمی ہو۔(۱۰)......اس میں دوسروں کی اصلاح کی صلاحیت ہو، گندے اخلاق کے چھوڑنے اور اخلاق حسنہ کی تلقین کرتا ہو۔

جس انسان میں یہ علامات ہوں وہ شیخ کامل ہے، اس سے اصلاحی تعلق قائم کیا جاسکتا ہے، اور جس میں یہ صفات نہ پائی جائیں اس سے اصلاحی تعلق قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ معارف القرآن، سورہ الفتح، ۸/۲۷۔ آپکے مسائل اور ان کا حل ۷/۳۶۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ شَفَقَةِ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ

یہ باب مسلمان کی مسلمان پر شفقت (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَخُوْنُهُ

وَلا يَكْذِبُهُ، وَلا يَخْذُلُهُ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُهُ. التَّقْوَى هٰهُنَا. بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْتَقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے (لہذا) ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی نہ تو خیانت کرے، نہ اسپر جھوٹ بولے اور نہ اسکی مدد و نصرت کو ترک کرے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو، مال اور اسکا خون حرام ہے، تقوی یہاں ہے (آپ ﷺ نے اپنے دل کیطرف اشارہ فرمایا) مسلمان آدمی کی برائی کیلئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

عَنْ أَبِىْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا.

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمن، مؤمن کیلئے ایک مکان کی مانند ہے، (یعنی سارے مسلمان مضبوطی اور طاقت حاصل کرنے کے اعتبار سے ایک مکان کیطرح ہیں) جسکا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ أَحَدَكُمْ مِرْآةُ أَخِيْهِ، فَإِنْ رَأَى بِهٖ أَذًى فَلْيُمِطْهُ عَنْهُ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص اپنے مسلمان بھائی کے حق میں آئینہ کی طرح ہے، لہذا اگر وہ اس میں کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے دور کردے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- لا یخونہ: مسلمان، مسلمان کی خیانت نہ کرے۔ لَا یَخْذُلُہ: وہ اسکو بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔ عِرضہ: (عین پر زیر کے ساتھ) عزت و آبرو، ج، اَعراض۔ یحتقر: وہ ذلیل وحقیر سمجھے، حقارت کی نظر سے دیکھے۔ البُنیان: (باء پر پیش کے ساتھ) مکان، عمارت۔ یَشُدّ: وہ مضبوط کرتا

ہے، مدد دیتا ہے۔ مِرآة: آئینہ۔ أذى: عیب، خرابی، کمی۔ فليمطه: تو اسے چاہیے کہ وہ اسے دور کرے، ہٹائے۔

مسلمان پر شفقت کرنیکی فضیلت

اس باب کی احادیث معاشرت اور رہن سہن سے متعلق ہیں، ان میں بیان کردہ امور پر اگر مسلمان صحیح طریقے سے عمل پیرا ہو جائے تو معاشرے میں پھیلی ہوئی ان تمام خرابیوں کا سد باب ہو جائے، جو مسلم معاشرے کو دیمک کیطرح چاٹتی چلی جارہی ہیں، آج ہر انسان اس فکر میں تو ہوتا ہے کہ دوسرے اسکی حق تلفی نہ کریں، اسکے تمام حقوق بجالائیں، لیکن وہ خود دوسروں کے کتنے حقوق ادا کر رہا ہے، اسکی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی، اسی وجہ سے سارا معاشرہ طرح طرح کے فساد سے دوچار ہے۔

پہلی حدیث میں خیانت، جھوٹ اور مسلمان کی مدد نہ کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت وآبرو، مال ومتاع اور اسکی جان کی حفاظت کو لازم قرار دیا ہے، ہتک عزت، اموال کے ضیاع اور قتل کو حرام قرار دیا ہے۔

''تقوی یہاں پر ہے'' اسکا مطلب یہ ہے کہ تقوی کا تعلق دل سے ہے، اور دل کی باتوں پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو علم نہیں، لہذا جو شخص بظاہر کفر وشرک اور گناہوں سے پرہیز کرتا ہے، اسکی قلبی کیفیت جو بھی ہو، اسے کسی بھی صورت میں حقیر وکمتر سمجھنا جائز نہیں ہے۔

اور بعض نے اسکے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جس شخص کے دل میں صحیح طریقے سے تقوی اور خوف خدا ہو تو وہ کسی مسلمان کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ ہر ایک کو اپنے سے بہتر اور اچھا سمجھتا ہے، اور اپنے کو ان سے کم سمجھتا ہے۔

بلکہ علماء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کافر کو بھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، کیونکہ یہ بھی گناہ ہے، البتہ دل میں کفر کی حقارت ہونی چاہیے اور اسکو برا سمجھنا چاہیے، اسی طرح گناہ کی حقارت اور برائی تو دل میں ہو لیکن کافر اور گنہگار کی ذات سے کوئی حقارت نہیں ہونی چاہیے، مرقاة المفاتیح، کتاب الآداب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق ۸/۶۹۰

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے:

''میں اپنے آپکو ہر مسلمان سے فی الحال اور کافر سے فی المآل والاحتمال کمتر سمجھتا

ہوں، یعنی اپنے آپکو ہر مسلمان سے اس وقت اور کسی کافر کو اس احتمال پر کہ شاید یہ کسی وقت مسلمان ہو جائے، اور مجھ سے آگے بڑھ جائے، اپنے آپکو کمتر سمجھتا ہوں'' اصلاحی خطبات، غریبوں کی تحقیر نہ کیجئے ۲/۲۰۶

اپنے کو بلند و عالیشان اور دوسروں کو حقیر سمجھنا درحقیقت تکبر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، تکبر کے جراثیم انسانی رگ و پے میں روح کیطرف پیوست ہو جاتے ہیں، انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرے اندر تکبر نہیں ہے، میں سراپا عجز وانکسار ہوں، لیکن عملاً اس میں تکبر ہوتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اللہ والوں سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہیے تاکہ اخلاق رذیلہ سے نکل کر اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو جائے اور تواضع کی دولت اسے حاصل ہو جائے۔

مسلمان آپس میں ایک مکان کی مانند ہیں

نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس مکان کے ساتھ تشبیہ دی جس کے سارے اجزاء اور حصے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں، جڑے ہوئے ہوں، اس طرح وہ عمارت نہایت مضبوط اور پختہ ہو جاتی ہے، پھر اسے منہدم کرنا آسان نہیں ہوتا، اسی طرح اگر مسلمان شرعی بنیادوں پر اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرلیں، تو پوری ملتِ اسلامیہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط اور طاقتور ہو جائے، پھر کسی کافر کو یہ جرأت نہیں ہو سکے گی کہ وہ مسلمانوں کیطرف حقارت آمیز نظریں اٹھا سکے، آج پوری دنیا میں مسلمان ظلم وستم کی چکیوں میں پس رہے ہیں، ان کو بنیادی حقوق سے بھی محروم کیا جارہا ہے، اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے، ان میں اختلاف وانتشار کے ایسے ایسے کانٹے جڑ پکڑ چکے ہیں جنہیں ختم کرنا بظاہر ناممکن سانظر آرہا ہے، لیکن اگر بین الاقوامی سطح پر چند سرکردہ مسلمان حکمت عملی کے ساتھ اخلاص کی نعمت سے سرشار ہو کر اس ڈوبتی ناؤ کو کنارے لگانے کی کوشش کریں تو ہوسکتا ہے کہ عالم اسلام پر چھائے ہوئے ذلت ورسوائی کے سرخ بادل چھٹ جائیں، اور امت مسلمہ کی تقدیر کا رخ بدل جائے، وماذلک علی اللہ بعزیز ، فتح الباری، کتاب الآداب، **باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضا**، ۱۰/۵۵۲۔

مؤمن ایک آئینہ ہے

حدیث میں اہل ایمان کوا یکدوسرے کا آئینہ قرار دیا ہے، آئینہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انسان کوخاموشی سے عیب بتادیتا ہے، اس انسان کے علاوہ کسی اور سے وہ اسکا تذکرہ بھی نہیں کرتا، اور صرف ایک بار ہی عیب نہیں بتاتا بلکہ جتنی بار انسان آئینہ کے سامنے آتا ہے، ہر دفعہ ہی وہ عیب اور داغ ودھبہ بتا دیتا ہے، اسکے بعد انسان اس آئینہ کے بتانے سے وہ عیب دور کرلیتا ہے، اس آئینہ سے کوئی بحث ومباحثہ اور لڑائی جھگڑا نہیں کیا جاتا بلکہ انسان اس کا احسان مند ہوتا ہے، کہ اس نے عیب پر اطلاع دی، اسی طرح ہر مسلمان دوسرے مسلمان کیلئے ایک آئینہ ہے، اس میں کوئی عیب اور برائی دیکھے تو اسے تنہائی میں پیار ومحبت اور حکمت کے ساتھ بتادے، اس انداز سے کہ وہ شخص یہ سمجھے کہ یہ شخص صرف میرے فائدے کی ہی بات کررہا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی مقصد اسکا نہیں ہے، انداز اور لب ولہجہ سخت، توہین آمیز اور ہٹ دھرمی کا نہ ہو، بلکہ اسکے حرف حرف سے پیار اور شفقت کی بومہکتی ہو، یہی دعوت وتبلیغ کا مسنون طریقہ ہے، بتانے والا اس عیب دار مسلمان کے علاوہ کسی اور سے اس عیب کا ذکر نہ کرے، کیونکہ اس طرح سارا ماحول پھر خراب ہوجاتا ہے، اور جس کو وہ عیب بتایا جائے، تو اسے خندہ پیشانی اور وسیع الظرفی کے ساتھ خیر خواہ مسلمان کی گفتگو مان لینی چاہیے، اسے اپنی ہتک اور توہین سمجھنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔شرح الطیبی ،۹/۱۸۷۔

بحسب امریٍ.........کی ترکیب نحوی

"بحسب امری من الشر" مبتدا ہے، باءزائد ہے، اور ان یحتقر.........خبر ہے، مرقاة المفاتیح، ۸/۶۹۲۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "بحسب امری" کو خبر مقدم اور ان یحتقر ....کو مبتدا مؤخر قرار دیا جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السَّتْرِ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ

یہ باب مسلمانوں کے (عیب اور نقص) ڈھانپنے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ

الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ،وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ فِيْ الدُّنْيَا يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِيْ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ،وَمَنْ سَتَرَ عَلٰى مُسْلِمٍ فِيْ الدُّنْيَا سَتَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِيْ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ،وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کے دنیا کے غموں میں سے کسی غم کو دور کرے تو اللہ تعالیٰ اسکو قیامت کے دن کے غموں میں سے ایک بڑے غم سے نجات دے گا، اور جو کسی تنگدست پر دنیا میں آسانی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسپر دنیا اور آخرت میں آسانی کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان (کے بدن یا عیب) کو ڈھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اسکی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مشغول رہتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- نَفَّسَ: غم اور تکلیف دور کرنا۔ کُرْبة: غم، تکلیف ج کُرَب۔ یَسَّر: آسانی کرے۔ مُعْسِر: تنگدست محتاج۔ سَتَرَ: پردہ پوشی کرے، ظاہر نہ کرے۔ عَوْن: مدد، نصرت۔

خدمت خلق اور دوسروں کے عیوب چھپانے کی فضیلت

اس حدیث میں مخلوق خدا کی خدمت اور پردہ پوشی کی فضیلت بیان کی گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کے ایک غم اور تکلیف کو دور کرتا ہے، اسکی خوشحالی اور راحت کا ذریعہ بنتا ہے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بہت بڑے غم سے اسے نجات دیں گے، اور فرمایا کہ جو کسی تنگدست مسلمان کیلئے سامانِ راحت پیدا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اسکے لئے آسانی کے راستے کھولدیتے ہیں، مشکل سے مشکل کام یوں حل ہو جاتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان کے جسم کو ڈھانپنے کیلئے کپڑا دیتا ہے یا اس کے عیوب اور خامیوں پر پردہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

"ستر الله عليه" اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکی ستر پوشی فرمائیں گے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اسکے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں:

(۱)...... اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکے گناہ اور عیوب لوگوں سے پوشیدہ رکھیں گے۔

(۲)...... اللہ تعالیٰ نہ تو اسکے گناہوں کا ذکر کریں گے، اور نہ اسکا حساب ہوگا۔ شرح مسلم للنووی ۲/۳۲۲

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ دنیا میں ان مسلمانوں کے عیوب چھپانا مستحب ہوتا ہے جو شرم وحیا کے مالک ہوں، جنکی زندگی بظاہر پاکیزہ اور صاف ستھری ہوتی ہے، ان سے اگر کوئی باعثِ عیب امر کا ارتکاب ہو جائے تو وہ خود بھی اسے پوشیدہ رکھتے ہیں، ایسے میں دوسروں کو بھی ان کے اس عیب پر پردہ ہی ڈالنا چاہیے، لیکن وہ مسلمان جو حیا کا احساس نہیں رکھتے، جو سرِ عام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کرتے ہیں، اس کھلم کھلا بغاوت اور سرکشی پر انہیں ذرا بھی ندامت نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کو ان کے عیوب اور گناہوں پر ٹوکنا اور انہیں تنبیہ کرنا لازم ہے، اس کے باوجود اگر وہ اس نافرمانی سے باز نہ آئیں تو اسلامی حکومت کے ذمہ دار حضرات تک یہ بات پہونچائی جائے تاکہ وہ ایسے لوگوں کی اصلاح کر سکیں، اصلاح معاشرہ کی غرض سے فسادی لوگوں کے عیوب حکمران کے سامنے بیان کرنا یا کسی ملزم کی تحقیق وتفتیش میں اسکے عیوب کا ذکر کرنا یہ گناہ نہیں ہے، شرعاً یہ جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں ان چیزوں کا ذکر کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم ،۲/۳۲۰۔ مرقاۃ المفاتیح ،۸/۶۸۹، ۶۹۰۔

حدیث کا آخر بڑی ہی فضیلت اور شرف کا حامل ہے، اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد و نصرت میں مشغول رہتے ہیں جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد اور اعانت میں مصروف رہتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اپنی حیثیت اور طاقت کے بقدر ضرور دوسروں کی خدمت کرنی چاہیے، ہمارے معاشرے میں بیسیوں لوگ ہیں جو دوسروں کی خدمت کے محتاج ہوتے ہیں، جو اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ شاید کوئی مسلمان ہمارے دکھوں کا مداوا بن جائے، ان سے دعائیں لیجئے، اور بڑھ چڑھ کر مخلوق خدا کی ہر لحاظ سے خدمت کیجیے، اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الذَّبِّ عَنِ الْمُسْلِمِ

یہ باب مسلمان (کی عزت) کے دفاع (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيْهِ رَدَّ اللّٰهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

ابوالدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی آبروریزی (یعنی اسکی غیبت کرنے) سے روکے اور اسکا دفاع کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکے منہ (یعنی جان) سے جہنم کی آگ کو روکیں گے اور اسکا دفاع کریں گے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- اَلذَّبُّ: دفاع کرنا، روکنا، ہٹانا، بچاؤ کرنا۔ رَدَّ: اس سے رد کرے، روکے، دفاع کرے۔

مسلمان کی عزت وآبرو کے دفاع کی فضیلت

اس حدیث میں اس آدمی کی فضیلت کا ذکر ہے جو دوسرے مسلمان کی عزت وآبرو کا دفاع کرتا ہے، دوسرا شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے، یہ شخص اسے منع کرتا ہے کہ غیبت نہ کرو، چونکہ آبروریزی اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، اسلئے جو شخص کسی مسلمان کی عزت وآبرو بچاتا ہے، اسکا دفاع کرتا ہے، اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اسکے چہرے سے یعنی اسکی ذات سے جہنم کی آگ کو دور کریں گے۔

''چہرے'' کو خاص طور پر اسلئے ذکر کیا ہے کہ تمام اعضاء میں سب سے اشرف اور محترم عضو چہرہ ہوتا ہے، مراد اس سے پورا جسم ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۴۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْهِجْرَةِ

یہ باب (مسلمان بھائی) سے ترک ملاقات کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ أَيُّوْبَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَحِلُّ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيَصُدُّ هٰذَا وَيَصُدُّ هٰذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِيْ يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ

ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ملنا جلنا چھوڑے رکھے، (اور صورت یہ ہو کہ جب) وہ دونوں کہیں آمنے سامنے ہو جائیں تو یہ بھی (اس سے) منہ پھیر لیتا ہے، اور وہ بھی منہ دوسری طرف کر لیتا ہے، (گویا دونوں ہی ایکدوسرے سے سلام و کلام اور ملاقات سے احتراز کرتے ہیں) اور ان میں بہتر شخص وہ ہے جو سلام میں پہل کرے (تاکہ تعلقات درست ہو جائیں)

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- الھجرۃ: (حاء کے کسرے اور جیم کے سکون کے ساتھ): ترک کلام، ترک تعلق، ترک ملاقات، ملنا جلنا چھوڑنا۔ لا یحل: حلال نہیں ہے، جائز نہیں۔ یلتقیان: وہ دونوں ایکدوسرے کے آمنے سامنے ہو جائیں۔ یَصُد: منہ پھیر لے، اعراض کر لے، منہ دوسری طرف کر لے۔

مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک ملاقات جائز نہیں

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی معاشرتی زندگی اس انداز سے گذارنی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائیوں سے تعلقات بنا کر رکھے، ''مسلمان بھائی'' خواہ رشتہ دار ہو یا عام کوئی شخص ہو، بلاوجہ کسی سے بھی تعلقات منقطع کرنا اور ان سے سلام و کلام چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

اگر کسی وجہ سے آپس میں ناراضگی ہو ہی جائے تو یہ تین دن سے بڑھنی نہیں چاہیے، حدیث میں ''تین دن'' کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تین دن تک ملنا جلنا چھوڑنا حرام نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی ناراضگی کا اثر انسانی طبیعت میں عموماً تین دن تک ضرور رہتا ہے، لہذا تین دن تک اگر اس غیظ وغضب کی وجہ سے آپس میں گفتگو وغیرہ چھوڑ دی جائے تو اسکی گنجائش ہے، تاہم تین دن کے بعد یہ ناراضگی نہیں رہنی چاہیے، صلح وصفائی کے ذریعہ اس ناراضگی کو خوش سلوبی کے ساتھ حل کر لینا چاہیے۔

دینی یا دنیاوی نقصان کے اندیشے سے تعلقات ختم کرنیکا حکم

اس پر علماء کا اجماع ہے کہ اگر کسی شخص سے تعلقات برقرار رکھنے میں دینی اعتبار سے نقصان کا قوی

اندیشہ ہے یا دنیاوی لحاظ سے اس سے شدید تکلیف کا خطرہ ہو، تو اس سے تین دن سے زیادہ بھی گفتگو چھوڑی جاسکتی ہے، فتنے کے اس دور میں ہر خاندان میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن سے تعلقات رکھنے میں دینی یا دنیاوی اعتبار سے عموماً نقصان پہونچتا ہے، ایسی صورت میں ان سے الگ تھلگ ہو جانا اور کنارہ کشی اختیار کرنا جائز ہے تاہم بہتر یہی ہے کہ ایسے لوگوں سے زیادہ تعلقات بیشک نہ رکھے جائیں، لیکن کبھی کبھار سلام وکلام اور ملاقات کر لینی چاہیے۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانے کے ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں، جن سے مسلمانوں کا دینی مصلحتوں کے پیش نظر ایکدوسرے سے ترک ملاقات کا ثبوت ملتا ہے، غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے صحابہ کرام سے پچاس دن تک ترک ملاقات، آپ ﷺ کا ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ ہو جانا، عبد اللہ بن عمر کا اپنے بیٹے بلال سے دینی امر کی وجہ سے بات چیت چھوڑنا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عبد اللہ بن زبیر سے ایک عرصے تک ملاقات نہ کرنا یہ سب وہ واقعات ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دینی معاملات میں ناراضگی تین دن سے زیادہ بھی باقی رکھی جاسکتی ہے، لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ نیت صحیح ہو اور اس میں کسی نفسانی خواہش اور دنیاوی مفاد کا ہرگز دخل نہ ہو۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب ما ینھی عنہ من التھاجر............۷۵۸/۸، ۷۵۹۔ شرح الطیبی، ۲۰۸/۹۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اگر والد اپنی اولاد سے یا استاد اپنے شاگرد سے، یا شیخ اپنے مرید سے اصلاح وتربیت کے نقطہ نظر سے ترک ملاقات کرے تو یہ بھی تین دن کے ساتھ خاص نہیں ہے، کیونکہ اس میں منشا ان کی تربیت ہے، بغض وعداوت یا اور کوئی غرض نہیں ہے، اسلئے جب تک اصلاح نہ ہو جائے، ان سے ترک ملاقات جائز ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الھجر فوق ثلاث ۳۵۴/۵۔

ایک اشکال اور اسکا حل

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبد اللہ بن زبیر سے کس وجہ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا، جبکہ وہ ان کی خالہ بھی تھیں اور ام المؤمنین بھی، بظاہر ان کا یہ عمل مذکورہ حدیث کے خلاف معلوم ہوتا ہے؟

شارحین حدیث نے اس کے دو جواب ذکر کئے ہیں:

(۱)......علامہ طبری فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے ان سے دینی مصلحت کی وجہ سے براہ راست ملاقات کرنا چھوڑا تھا، پردے کے پیچھے ان سے گفتگو اور سلام کا سلسلہ برقرار تھا، اور مذکورہ وعید اس وقت لاگو ہوتی ہے جب انسان بالکل تعلقات منقطع کردے، سلام تک نہ کرے، لیکن کسی بھی طریقے سے سلام وکلام ہوجائے تو یہ قطع رحمی اور ترک تعلق کے زمرے میں نہیں آتا۔

(۲)......حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس جواب کو ضعیف قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ صحیح جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عبداللہ بن زبیر سے ایک بات پر ناراض ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے ان سے ترک ملاقات کرلی تھی، ناراضگی کی وجہ یہ پیش آئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جو کچھ بھی مال آتا، اسے وہ فوراً صدقہ کردیتی تھیں، عبداللہ بن زبیر سارے مال کو صدقہ کرنا اسراف سمجھتے تھے، اسلئے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا کہ: "وَاللّٰهِ لَتَنْتَهِيَنَّ عائشةُ اَوْ لَأَ حْجُرَنَّ عَلَيْهَا" بخدا حضرت عائشہ اس طرز عمل سے باز آجائیں ورنہ میں ان کو دینا بند کردونگا اوران پر تصرفات کرنے کی پابندی لگادونگا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ ناراض ہوگئیں، اور عبداللہ بن زبیر سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی۔

عبداللہ بن زبیر کے اس انداز سے چونکہ حضرت عائشہ کے حق میں تنقیص لازم آئی، وہ ام المؤمنین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خالہ بھی تھیں گویا عبداللہ بن زبیر کی جانب سے خالہ کے حق میں ایک قسم کی حق تلفی پائی گئی، اور بسا اوقات اجنبی شخص سے اتنی شکایت نہیں ہوتی جتنی قریبی رشتہ دار سے ہوجاتی ہے، اسلئے حضرت عائشہ نے سزاءً ان کی اصلاح اور تربیت کی خاطر ان سے سلام وکلام منقطع کردیا، تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوجائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے تین مخلص صحابہ سے سزا کے طور پر ملنا جلنا اور سلام وکلام چھوڑ دیا تھا، اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی کیا تھا، اور پھر ایک مدت کے بعد عبداللہ بن زبیر نے چند صحابہ کے ساتھ ان سے صلح کرلی تھی۔

ترک ملاقات کے دو درجے

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترک ملاقات کے دو درجے ہیں:

(۱) بالکل تعلقات ختم کر دیئے جائیں، سلام تک چھوڑ دیا جائے۔

(۲)......زیادہ تعلق نہ رکھا جائے، البتہ کبھی کبھار سلام وکلام کرلیا جائے۔

حدیث میں مذکورہ وعید اس وقت ہے جب انسان ترک ملاقات پہلے درجے کی کرے، لیکن اگر کوئی شخص کسی خاص وجہ سے ترک تعلق دوسرے درجے کا کرتا ہے تو یہ اس وعید میں نہیں آتا، یہ جائز ہے۔

وخيرهما الذی يبدأ بالسلام علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص سلام میں پہل کرے وہ افضل ہے، کیونکہ اس نے ابتداء کر کے گویا یہ بتا دیا کہ میرے دل میں فلاں سے ذاتی طور پر کوئی بغض وعداوت نہیں ہے، یہ اسکی عاجزی اور متواضع ہونیکی علامت ہے۔

نیز حدیث کے اس جملے کی روشنی میں اکثر علماء فرماتے ہیں کہ ترک تعلق کے بعد اگر اس شخص کو سلام کیا جائے یا سلام کا جواب دیا جائے اور ضرورت کے وقت آپس میں گفتگو کرلیں تو یہ ترک تعلق اور ''هجرة'' سے نکل جاتا ہے، وعید اس وقت ہے جب سلام اور ضروری کلام تک نہ کیا جائے۔ فتح الباری، کتاب الأدب، باب الهجرة، ۱۰/۶۰۸، ۶۰۹۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پہل کر کے سلام کرے، لیکن دوسرا شخص سلام کا جواب نہ دے، تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے، اس سے ترک تعلقات نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ واجب ہے، کیونکہ سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ سے وہ فاسق ہوگیا ہے، اور فاسق کے ساتھ اس وقت تک ترک تعلق کیا جاسکتا ہے، جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب ما ینھی عنہ من التھاجر ۸/۷۵۹۔

لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اگر ظاہری رکھ رکھاؤ اور لوگوں کو محض دکھلانے کیلئے آپس میں صرف سلام کرلیں، سلام کے علاوہ ضروری گفتگو نہ کریں، بلکہ ہر شخص ترک کلام کا اہتمام کرے تو یہ قطع تعلق کے حکم میں ہے، اور حدیث میں مذکورہ وعید کے وہ مستحق ہونگے۔ تکملۃ فتح الملھم ۵/۳۵۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ مُوَاسَاةِ الأَخِ

یہ باب بھائی کی غمخواری (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: لَمَّا قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ الْمَدِيْنَةَ آخَى رَسُوْلُ

اللّٰهِ ﷺ بَيْنَهُ وَبَيْنَ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ،فَقَالَ لَهُ:هَلُمَّ أُقَاسِمْكَ مَالِي نِصْفَيْنِ وَلِيَ امْرَأَتَانِ فَأُطَلِّقُ إِحْدَاهُمَا فَإِذَا انْقَضَتْ عِدَّتُهَا فَتَزَوَّجْهَا،فَقَالَ:بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ،دُلُّوْنِي عَلَى السُّوْقِ،فَدَلُّوْهُ عَلَى السُّوْقِ،فَمَا رَجَعَ يَوْمَئِذٍ إِلَّا وَمَعَهُ شَيْءٌ مِنْ أَقِطٍ وَسَمْنٍ قَدِ اسْتَفْضَلَهُ،فَرَآهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَعْدَ ذٰلِكَ وَعَلَيْهِ وَضَرُ صُفْرَةٍ فَقَالَ: مَهْيَمْ، فَقَالَ: تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً مِنَ الْأَنْصَارِ،قَالَ:فَمَا أَصْدَقْتَهَا؟قَالَ:نَوَاةً.قَالَ حُمَيْدٌ أَوْ قَالَ:وَزْنَ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ،فَقَالَ:أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ.

حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب عبدالرحمٰن بن عوف (ہجرت کر کے) مدینہ منورہ آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سعد بن الربیع کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا(اور انہیں بھائی بھائی بنا دیا) چنانچہ حضرت ربیع نے عبدالرحمٰن سے کہا: آؤ، میں اپنا مال دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا تمہیں دیدوں، اور میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے ایک کو طلاق دیدوں، پھر جب اسکی عدت گذر جائے تو تم اس سے نکاح کر لینا، اسپر عبدالرحمٰن نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ تمہارے اہل وعیال اور مال میں خوب برکت دے، مجھے تم بازار کا راستہ بتا دو، چنانچہ انہوں نے بازار کا راستہ بتا دیا، (بازار جا کر کچھ کاروبار کیا) وہ اس دن بازار سے اس حال میں لوٹے کہ ان کے پاس کچھ پنیر اور گھی تھا جو انہوں نے بطور نفع کے بچایا تھا، پھر اسکے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان پر کچھ زردی کا اثر ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا بات ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے مہر کیا مقرر کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ایک گٹھلی بھر سونا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: ولیمہ کر لو خواہ ایک بکری سے ہی ہو۔

مشکل الفاظ کے معنی: —مؤاساۃ: غمخواری اور ہمدردی کرنا خواہ مال کے ذریعہ ہو یا کسی دوسرے طریقے

سے ہو۔اخی: یہ ''مؤاخاۃ'' سے ہے: ایک کو دوسرے کا بھائی بنانا، دونوں میں رشتہ اخوت قائم کرنا، بھائی چارہ قائم کرنا، بھائی بندی کرانا۔هَلُمَّ: یہ اسم فعل ہے امر حاضر کے معنی میں: آؤ۔ خلیل کہتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل ''لَمّ'' ہے، اور لَمَّ الله شعثه سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ اس کے پراگندہ حالات کو درست کردے، اور ''ھا'' برائے تنبیہ ہے، پھر الف کو گرا کر هَلُمَّ کردیا۔

یہ لفظ اہل حجاز کے نزدیک واحد، تثنیہ، جمع مذکر اور مؤنث تمام حالتوں میں ایک ہی طرح یعنی مفرد رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، اور اہل نجد کے نزدیک یہ فعل امر ہے، جس میں تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے چنانچہ تثنیہ کیلئے هَلُمَّا، جمع مذکر کیلئے هَلُمُّوا، واحد مؤنث کیلئے: هَلُمِّي، اور جمع مؤنث کیلئے: هَلْمُمْنَ کہا جائیگا، البتہ اہل حجاز کی لغت کو زیادہ فصیح قرار دیا گیا ہے۔أُقَاسِمْکَ: میں آپ سے تقسیم کرلوں، حصہ بٹوالوں۔ یہ لفظ ''هلم'' کے جواب میں واقع ہے اسلئے یہ حالت جزم میں ہے۔ دُلُّونِي: مجھے بتادو، میری رہنمائی کرو۔اِقِط: (ہمزے پر زبر اور قاف کے نیچے زیر): پنیر۔سَمَن: گھی۔قد استفضله: تحقیق اس نے اسکو بچالیا۔وضر: (واؤ اور ضاد کی زبر کے ساتھ): اثر، نشان ج اَوْضَار۔ صُفْرَة: (صاد پر پیش اور فاء کے سکون کے ساتھ) زردی، رنگ کا پیلا پن، اس زردی سے خلوق کی زردی مراد ہے، خلوق وہ زرد رنگ کی خوشبو ہے جو عموماً زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، اور عورتیں استعمال کرتی ہیں۔مَهْيَمْ: (میم پر زبر، ہاء کے سکون اور یاء کی زبر کے ساتھ) یہ مبنی بر سکون اور برائے استفہام بمعنیٰ ''ما'' ہے، یعنی ما حالک؟ ماشانک، آپکا کیا حال ہے، کیا بات ہے، کیا شان ہے۔مَا أَصْدَقْتَهَا: تو نے اسکا مہر کیا مقرر کیا ہے۔وَزْن نواة من ذهب: گٹھلی کے برابر سونے کا وزن۔امام احمد بن حنبل کے نزدیک وزن نواۃ سے (3,1/3) درہم کے برابر چاندی کا وزن مراد ہے، جبکہ اسحاق بن راہویہ کے یہاں اس سے پانچ درہم کے برابر چاندی مراد ہے، اسی پر امام خطابی وغیرہ کا جزم اور یقین ہے، اور اکثر علماء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اَوْلِمْ: تم ولیمہ کرلو۔

غمخواری اور بھائی چارے کا ذکر

اس حدیث میں اس مواخاۃ اور بھائی چارے کا ذکر ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ

میں آنے کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم کی تھی، انصاری صحابہ نے بڑی فراخدلی سے مہاجرین کے ساتھ تعاون کیا، ہر میدان میں ان کا ہاتھ بٹایا، اپنے مال ومتاع اور جائداد میں انہیں شریک کر کے مالک بنا دیا، جس کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں، اس نے ایک کو باقی رکھ کر باقیوں کو ان کی خاطر طلاق دے دی۔

حدیث باب میں بھی اسی ایثار اور قربانی کا ذکر ہے کہ حضرت سعد بن ربیع نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو مال کی پیشکش کی، اپنی دوسری بیوی کو ان کے لئے طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انہیں دعا دی اور کہا کہ آپ مجھے بازار کا راستہ بتا دیں، انہوں نے محنت اور کوشش کے ذریعہ اپنے خرچے کا بندوبست کیا، کاروبار کے ذریعہ نفع کمایا، اور پھر ایک انصاری خاتون سے شادی کرلی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ ولیمہ کرلو اگرچہ ایک بکری ذبح کر کے ہی ہو۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں، ایک دوسرے کی مدد کرنے اور غمخواری وہمدردی پر بھائی چارہ قائم کر لیتے تھے، پھر وہ دونوں نسبی بھائی کیطرح ہو جاتے، ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے، اس کو وہ لوگ "حِلف" کہتے تھے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ اور بھائی چارہ قائم کیا، یہ بھائی چارہ بھی اس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ یہ لوگ اسکی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے تھے، پھر جب قرآن مجید کی یہ آیت: "واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتاب الله" نازل ہوئی تو میراث کا حکم منسوخ ہوگیا، پھر میراث صرف رشتہ داری کی بنیاد پر ملتی تھی، لیکن بھائی چارہ اس معنی میں کہ ایکدوسرے کی مدد ونصرت اور غمخواری کی جائے، یہ اب بھی باقی ہے، جو قیامت تک جاری رہے گا جسکی بہت زیادہ فضیلت منقول ہے۔ **تکملة فتح الملهم، کتاب فضائل الصحابة، باب مواخاة النبی صلی الله علیه وسلم بین أصحابه، ۲۹۸/۵۔**

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْغِيْبَةِ

یہ باب غیبت (کی حقیقت) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْغِيْبَةُ؟ قَالَ: ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا

يَكْرَهُ. قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِيهِ مَا أَقُوْلُ؟ قَالَ: إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهُ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ غیبت کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اسطرح کرو کہ جس کو وہ (اگر سنے تو) ناپسند کرے، سائل نے عرض کیا: یہ بتادیجئے کہ اگر میرے اس بھائی میں (کہ جس کا میں نے برائی کے ساتھ ذکر کیا ہے) وہ عیب ہو، جو میں نے بیان کیا ہے، (تو کیا پھر بھی غیبت ہوگی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ عیب اس میں واقعی ہو جس کو تم نے ذکر کیا ہے تو تم نے اسکی غیبت کی اور اگر اس میں وہ برائی نہ ہو جسے تم نے ذکر کیا ہے تو تم نے اسپر بہتان لگایا ہے (اور غیبت ہو یا بہتان، شرعاً دونوں ہی حرام ہیں)

مشکل الفاظ کے معنیٰ :- فقد اغتبته: تحقیق تم نے اسکی غیبت کی۔ فقد بَهَتَّهُ: یقیناً اسپر تم نے بہتان لگایا۔

غیبت کی تعریف اور اس کا حکم

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کی تعریف اور اسکی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، غیبت یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں ایسی کوئی بات کہنا یا کوئی عیب ذکر کرنا جس کو وہ سنتا تو ناپسند کرتا، اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ اگر وہ بات سچی نہ ہو، محض غلط الزام لگائے تو یہ تہمت ہے، غیبت اور تہمت دونوں کی حرمت کا ذکر قرآن مجید سے ثابت ہے۔

اور اس میں عموم ہے کہ اس بات اور عیب کا تعلق خواہ اس کے بدن سے ہو یا عقل سے، اسکے دین کے بارے میں ہو یا دنیا کے بارے میں، اسکے اخلاق و افعال سے متعلق ہو یا نفس سے، مال و اسباب کے بارے میں ہو یا اولاد سے متعلق ہو، والدین کے بارے میں ہو یا اہل و عیال اور ملازمین کے بارے میں، اسکے لباس وغیرہ سے متعلق ہو یا کلام و گفتگو سے، اسکی شکل و صورت سے متعلق ہو یا رہن سہن اور اٹھنے بیٹھنے

سے، اسکی حرکات وسکنات سے ہو یا عادات سے، خواہ یہ بات اسکی نرمی، سختی، سخت گوئی یا نرم خوئی سے متعلق ہو یا خاموشی سے اور یا ان چیزوں کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز سے ہو جو اسکی ذات سے متعلق ہو سکتی ہے، یہ تمام چیزیں غیبت میں داخل ہیں۔

غیبت جس طرح زبان اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارے سے بھی ہوتی ہے، مثلاً کسی کے لنگڑے پن کی نقل اتارنا، یا ہاتھ، آنکھ اور سر کے اشارے سے کسی کی توہین وتحقیر کرنا، اس انداز سے بھی غیبت ہوتی ہے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب الغیبۃ ۱۰/ ۵۷۵۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان والغیبۃ ۸/۵۷۰۔

غیبت کا حکم یہ ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہے اور حرام ہے، اور غیبت جسطرح مسلمان کی حرام ہے، اسی طرح بچے، پاگل اور مسلمان ملک میں رہنے والے کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے، کیونکہ انہیں بھی تکلیف پہونچانا شرعا حرام ہے، اور جو کافر حربی ہیں یعنی اپنے کافر ملک میں ہی رہتے ہیں، ان کی غیبت گو حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے مکروہ ضرور ہے، اسلئے ان کی غیبت کر کے اپنے وقت کو ضائع کرنے سے بچانا چاہئیے۔

غیبت سننا بھی حرام ہے

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے، سننا بھی ویسا ہی حرام ہے، لہٰذا اس آدمی کے سامنے جب کسی کی غیبت شروع کی جائے تو اسے روکنے کی کوشش کرے، روک نہ سکے، تو اسے سننے سے ضرور پرہیز کرے، کیونکہ قصد وارادے سے کسی کی غیبت سننا بھی غیبت کرنے کے حکم میں ہوتا ہے، اس کے بارے میں حضرت میمونؒ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے ایک زنگی کا مردہ جسم ہے، اور مجھے کہا جا رہا ہے کہ اسے کھاؤ، میں نے کہا: کیوں، اس نے کہا: اسلئے کہ تو نے فلاں کی غیبت کی ہے، میں نے کہا: خدا کی قسم میں نے تو اسکے متعلق کوئی اچھی بری بات نہیں کی، تو اس شخص نے کہا: ہاں، لیکن تو نے اسکی غیبت سنی تو ہے اور تو اسپر راضی بھی رہا، اس خواب کے بعد حضرت میمون کا حال یہ تھا کہ وہ نہ تو کسی کی غیبت کرتے تھے اور نہ اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔ معارف القرآن، سورۃ الحجرات، ۱۲۲/۸۔

غیبت کرنے والوں کا انجام

غیبت چونکہ ایک سنگین گناہ ہے، اسلئے احادیث میں اسکے بارے میں سخت وعیدیں منقول ہیں، چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱)......حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور ان کی آبروریزی کرتے تھے۔

(۲)......حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کی غیبت نہ کرو، اور ان کے عیوب کی جستجو نہ کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے عیب کی تلاش کرتا ہے، اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اسکو اسکے گھر کے اندر بھی رسوا کر دیتا ہے۔

(۳)......حضرت مستورد سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص غیبت کر کے کسی مسلمان کا ایک لقمہ بھی کھائیگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جہنم سے اسکی مثل کھلائیگا......۔

سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ۔ ۳۲۰/۲۔

(۴)......حضرت ابو سعید خدری اور جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے، پھر توبہ کرلیتا ہے، تو اسکا گناہ معاف ہو جاتا ہے، اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی۔ شعب الایمان لابی بکر احمد بن حسین البیھقی، باب فی تحریم اعراض الناس: ۳۰۶/۵، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

بعض موقعوں پر غیبت کی اجازت ہے

بعض صورتوں میں غیبت کا جواز احادیث سے ثابت ہے، مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا

مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں، بشرطیکہ وہ ضرورت اور مصلحت شرعاً معتبر ہو، عموماً چھ وجہ سے غیبت کرنا جائز ہوتا ہے:

(۱)...... کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کر سکے۔

(۲)...... کسی کی اولاد اور بیوی کی شکایت اسکے باپ اور شوہر سے کرنا جو ان کی اصلاح کر سکے۔

(۳)...... حدیث کے راویوں اور گواہوں کا حال بتانا۔

(۴)...... کسی واقعہ کے متعلق فتوی حاصل کرنے کیلئے اصل صورتحال بتانا۔

(۵)...... مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دنیوی شر سے بچانے کیلئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کیلئے اسکا حال بتانا۔

(۶)...... جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے گناہ کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے، اسکے برے اعمال کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں، مگر بلا ضرورت اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے مکروہ ہے، حاصل یہ کہ کسی کی برائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اسکی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت اور مجبوری سے غیبت کی گئی ہو تو یہ جائز ہے۔

شرح مسلم للنووی، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الغیبۃ ۲/۳۲۲۔ معارف القرآن، سورۃ الحجرات، ۱۲۳/۸

اسی طرح اگر انسان کسی کو متعین کیے بغیر عمومی الفاظ سے کسی عیب وغیرہ کا ذکر کرے مثلاً بعض لوگوں نے کہا، یا فلاں علاقے کے لوگوں کا یہ طرز عمل ہے، .... یہ انداز بھی غیبت میں داخل نہیں ہے۔

غیبت کا ازالہ کیسے کیا جائے

غیبت ایک ایسا سنگین گناہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ضائع ہوتا ہے اور بندے کا حق بھی، اسلئے جس شخص کی غیبت کی گئی ہے، اس سے معاف کرانا ضروری ہے، بشرطیکہ اسکے علم میں آچکا ہو کہ اس نے میری غیبت کی ہے جب تک اس سے معاف نہیں کرائیگا اس وقت تک یہ گناہ معاف نہیں ہوگا، اور معاف کرانے کیلئے پوری تفصیل بتانا ضروری نہیں ہے، مختصر انداز سے یوں کہدے کہ آپ کے حق میں مجھ سے جو کوتاہی ہوگئی ہو یا میری زبان سے جو نامناسب الفاظ آپکی شان میں کبھی نکل گئے ہوں، انہیں درگذر کر دیں۔

اور اگر غیبت کی خبر اس بندے تک نہ پہونچی ہو یا جسکی غیبت کی ہے وہ مرگیا ہے یا دور دراز علاقے

میں رہتا ہے یا اس کا کچھ پتہ ہی نہیں تو اس صورت میں گو اس سے معاف کرانا ضروری نہیں مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اس کے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہ کا اقرار کرنا ضروری ہے، اور جسکی غیبت کی ہے، اس کیلئے کثرت سے توبہ واستغفار کرتا رہے اور اس کیلئے مغفرت اور بخشش کی دعا مانگتا رہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس گناہ کا ازالہ ہو جائیگا۔ معارف القرآن، سورہ حجرات، ۱۲۲/۸، ۱۲۳

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْحَسَدِ

یہ باب حسد (کی حرمت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَقَاطَعُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَحَاسَدُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں قطع تعلق نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرو (یعنی اعراض نہ کرو) اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو، اور نہ آپس میں حسد کرو، اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو، اور کسی مسلمان کیلئے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے (بغیر کسی شرعی وجہ کے) تین دن سے اوپر ترک تعلق کرے۔

عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا حَسَدَ إِلَّا فِيْ اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ.

سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو خصلتوں میں حسد کرنا جائز ہے، ایک اس شخص کی خصلت جسے اللہ نے مال دیا، وہ اس میں سے رات اور دن کے اوقات میں (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتا ہے، اور دوسری اس شخص کی خصلت جسکو اللہ تعالیٰ نے قرآن (کی دولت) عطا فرمائی، وہ اسکے حق کو رات اور

دن کے اوقات میں ادا کرتا ہے (یعنی اسکی تلاوت اور اسپر عمل کرتا ہے)

مشکل الفاظ کے معنیٰ: -لا تقاطعوا: تم ایکدوسرے سے قطع تعلق نہ کرو۔ لا تدابروا: ایکدوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو، اعراض نہ کرو۔ بعض کے نزدیک "تقاطع" اور "تدابر" دونوں اعراض کے معنیٰ میں ہیں، فرق دونوں میں یہ ہے کہ ملاقات سے پہلے ہی اگر اعراض کرلیا جائے تو اسے "تقاطع" کہتے ہیں اور ملاقات کے بعد اعراض کیا جائے تو اسے "تدابر" کہتے ہیں، الکوکب الدری، ۵۲/۳۔ لا تباغضوا: آپس میں بغض نہ رکھو اور نہ ایسے اسباب اختیار کرو جن سے بغض پیدا ہو۔ اثنتین: اس سے دو خصلتیں اور عادتیں مراد ہیں: اللہ کے راستے میں خرچ کرنا اور قرآن کا حق ادا کرنا۔ آتاہ اللہ: اللہ نے اس کو عطا کیا/ اٰناء: ساعات، گھڑیاں، لحات، اوقات، یہ جمع ہے، اسکے واحد میں چار لغتیں ہیں: إنًا، أنًا، إنًی، إنوٌ، بعض کی رائے یہ ہے کہ اسکا مفرد إِنیً ہے بروزن مِعیً، اسکی جمع اٰنا، بروزن أمعاء آتی ہے۔ یقوم بہ: وہ اس قرآن کا حق ادا کرتا ہے یعنی نماز میں اور نماز سے باہر اسکی تلاوت اور اسپر عمل کرتا ہے۔

بغض کے معنیٰ اور اسکے درجات

"بغض" کے معنیٰ ہیں: دوسرے سے نفرت کرنا، اس سے دل میں دشمنی کرنا، اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپس میں بغض رکھنے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ "بغض" ایک ایسی تباہ کن اندرونی بیماری ہے جو اکثر اوقات آدمی کے اعمال کو ضائع کردیتی ہے اور آدمی کو اسکا شعور تک نہیں ہوتا، یوں وہ خود اللہ تعالیٰ کی نظر میں مبغوض اور ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔ بغض اور کینہ کے تین درجات ہیں:

(۱)......اگر یہ بغض اس حد تک بڑھ جائے کہ اسکے ظاہری اعمال میں اسکا اثر ظاہر ہونے لگے، مثلاً بغض رکھنے والا شخص اس دوسرے کی غیبت کرتا پھرتا ہے، اس سے کلام اور ملاقات چھوڑ دی، یا اسے برا بھلا کہتا رہتا ہے، بغض کا یہ درجہ انتہائی ناپسندیدہ ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔

(۲)......دل میں قصد واختیار سے اسکے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرتا ہے، اور اپنے ذہن میں اسے دکھ

اور تکلیف پہونچانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے، اسی درپے رہتا ہے کہ اسے صدمہ پہونچاؤں، یہ بھی گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا باعث ہے۔

(۳)......اور اگر دل میں غیر اختیاری طور پر خود بخود ہی دوسرے کی ناگواری ہے، اس سے انقباض سا رہتا ہے، مزید نفرت کے اور کوئی جذبات اس کے بارے میں نہیں ہیں، بغض کا یہ درجہ گو کہ گناہ نہیں ہے، اور نہ ہی باعث عذاب ہے، لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہے کہ اس انقباض میں اضافہ ہوتے ہوتے کہیں یہ بغض کے اس درجے میں نہ شامل ہو جائے جو گناہ ہے، اس لئے مسلمان کو ہر وقت اپنے نفس پر کڑی نظر رکھنی چاہئے تا کہ اس گناہ میں نہ مبتلا ہو جائے۔

بغض کا علاج

بغض کی بیماری کے علاج کیلئے ان امور کا اہتمام کیا جائے:

(۱)......جس انسان سے بغض ہو گیا ہے، اسکی خوبیاں اور احسان سوچے جائیں۔

(۲)......بغض پر سزا اور عذاب کو بار بار یاد کیا جائے۔

(۳)......طبیعت کے نہ چاہنے کے باوجود مبغوض کی غلطیوں اور زیادتیوں سے درگذر کیا جائے۔

(۴)......اسکی اصلاح اور خیر و عافیت کی دعا کرتے رہیں۔

(۵)......اللہ تعالیٰ سے خشوع و خضوع کے ساتھ تہ دل سے اپنی اصلاح کی دعا کی جائے تا کہ بغض اور اس جیسی مہلک امراض سے شفا حاصل ہو جائے۔ تکملة فتح الملهم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم التحاسد......۳۵۰/۵۔

آج مسلم معاشرے میں دیگر گناہوں کیطرح بغض کا گناہ بھی بہت پھیلا ہوا ہے، تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی درجے میں اس گناہ میں ضرور مبتلا ہے، الا ما شاء اللہ، انہی جذبات کی تسکین کیلئے آپس میں اختلافات، دشمنیاں اور آئے دن لڑائی جھگڑوں کے واقعات پیش آتے ہیں، عوام تو کیا، اہل علم میں بھی یہ مرض پورے آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے، اور غضب یہ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اسے گناہ سمجھتے ہیں اور اسکی اصلاح کی فکر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے، آمین۔

حسد ایک مہلک مرض

حِسد کہتے ہیں کہ دوسرے کی کسی نعمت کو دیکھ کر یہ تمنا کی جائے کہ یہ نعمت اس سے ختم ہو جائے، خواہ مجھے حاصل ہو یا نہ ہو، یہ حرام اور ناجائز ہے۔

اور اگر اپنے لئے اس نعمت کے حصول کی آرزو کرے لیکن دوسرے سے اس نعمت کا خاتمہ مقصود نہ ہو مثلاً کسی کی نعمت دیکھ کر یوں دعا کرتا ہے کہ یا اللہ جو نعمت آپ نے فلاں کو عطا فرمائی، اسکی اس نعمت میں اور زیادہ اضافہ فرما، اور مجھے بھی اس جیسی نعمت عطا فرما، اسے "غبطہ" اور "رشک" کہا جاتا ہے، شرعاً یہ جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔

حسد ایک ایسا گندہ مرض ہے جو انسان کو دیمک کیطرح چاٹتا رہتا ہے، حاسد ہر وقت اس پریشانی میں پگھلتا رہتا ہے کہ فلاں سے یہ نعمت زائل ہو جائے، حالانکہ اس نعمت کا زوال اسکے بس میں نہیں ہوتا، حسد کیوجہ سے انسان اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گر جاتا ہے، حسد ہی وہ پہلا گناہ ہے جو شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام سے جنت میں ہو گیا تھا، اور اسکی وجہ سے شیطان کو ہمیشہ کیلئے ذلیل ورسوا کر دیا گیا۔

کسی انسان سے حسد درحقیقت ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے، یہ گویا اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہے، اگر اس کا ایمان مضبوط ہوتا تو یہ اللہ کے ہر قسم کے فیصلے پر دل و جاں سے خوش ہوتا، دوسرے سے نعمت کے زوال کی تمنا کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی ذات پر ایمان مکمل نہیں ہے، ورنہ یہ حسد نہ ہوتا، مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ساتھ جو معاملہ فرما رہے ہیں وہ سو فیصد مصلحت کے مطابق ہے، خواہ اسکی وہ مصلحت مجھے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، میں کون ہوتا ہوں کہ اللہ کی تقدیر پر حملہ کر کے یوں کہوں کہ یہ نعمت اسکے پاس نہیں ہونی چاہئے، فلاں کے پاس ہونی چاہئے، وہ رب کائنات ہے، وہ خالق ہے، وہ ہر انسان کی رگ رگ سے آشنا ہے، وہی اسکی مصلحتیں اور حکمتیں سمجھ سکتا ہے اور وہ وہی فیصلہ فرماتا ہے جو انسان کیلئے بہر حال موزوں ہوتا ہے۔

حسد کے مراتب اوران کے احکام

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حسد بھی درحقیقت بغض اور کینہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، حسد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، یہاں پر چار مراتب ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱)......انسان اس بات کو پسند کرے کہ دوسرے سے نعمت زائل ہو جائے، خواہ وہ نعمت اسے حاصل نہ ہو، حسد کا یہ مرتبہ انتہائی برا اور حرام ہے۔

(۲)......چاہتا ہے کہ یہ نعمت فلاں سے ختم ہو جائے اور مجھے حاصل ہو جائے، حسد کا یہ مرتبہ بھی ناجائز ہے۔

(۳)......کسی کی نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے، اگرچہ اسکے پاس بھی رہے، اسکے حصول کیلئے تگ ودو کرتا ہے، کوشش کے باوجود جب وہ نعمت اسے حاصل نہیں ہوتی تو پھر یہ تمنا کرتا ہے کہ اس سے بھی یہ نعمت زائل ہی ہو جائے، تاکہ اسے مجھ پر اس نعمت کے اعتبار سے برتری حاصل نہ ہو، اور ہم دونوں برابر ہو جائیں، یہ بھی ناجائز ہے۔

(۴)......اس نعمت کے حصول کیلئے کوشش کرتا ہے اور اگر اسے حاصل نہ ہو تو بھی دوسرے سے اس نعمت کا خاتمہ پیش نظر نہیں ہے، حسد کا یہ درجہ "غبطہ" کہلاتا ہے، یہ اگر دنیاوی امور سے متعلق ہو تو جائز ہے اور اگر دینی امور کے بارے میں ہو تو مستحب ہے۔

حسد کا علاج

جب انسان کو کسی سے حسد ہو جائے تو اس کے علاج کیلئے مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا جائے تو اس سے ان شاء اللہ یہ مرض ختم ہو جائیگا:

(۱)......حسد کے نقصانات اور اسکی وعیدیں بار بار سوچی جائیں۔

(۲)......جس سے حسد ہوا ہے اسکے لئے یوں دعا کریں کہ یا اللہ مجھے فلاں شخص سے حسد ہو گیا ہے، اسے دنیا اور آخرت میں خیر وعافیت عطا فرما، اسکی اس نعمت میں اور تمام نعمتوں میں خوب سے خوب اضافہ فرما۔

(۳)......لوگوں کے سامنے اسکی تعریفیں کی جائیں اگرچہ طبیعت نہ چاہ رہی ہو، اور اسکی جس چیز پر حسد ہوا ہے

اس نعمت پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جائے۔

(۴)......اسکے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کیا جائے، ہو سکے تو کبھی کوئی چیز ہدیہ میں دیدی جائے۔

(۵)......اپنے لئے بھی تہ دل سے اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے تا کہ اس مرض سے نجات ہو جائے۔

ان امور پر کچھ ہی عرصہ عمل کیا جائے تو اسکے اثرات نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

تکملة فتح الملھم، کتاب البر والصلة، باب تحریم التحاسد ۳۵۱/۵و۳۵۲۔

وکونوا عبادالله کی ترکیب

"عباد الله" حالت نصب میں ہے، اسکے نصب کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں

(۱)......"عبادالله" "کونوا" کی خبر اول ہو، اور "اخوانا" خبر ثانی۔

(۲)......عباداللہ منادی مضاف ہو، اور اسکے شروع میں "یا" حرف ندا محذوف ہو، یعنی یا عباد الله۔

فصاحت و بلاغت کی رو سے پہلے احتمال کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ حاسدین اور بغض رکھنے والے گویا اپنے عمل سے وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہوں، انہیں حکم دیا جارہا ہے کہ تم اللہ کے بندے اسطرح بن جاؤ، کہ تمہارے رہن سہن اور اعمال سے یہ چیز نمایاں نظر آئے۔ تکملة فتح الملھم، ۳۵۳/۵۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ تم سب اس طرح زندگی گذارو جسطرح دو نسبی بھائی زندگی گذارتے ہیں، ان کی نشست و برخاست سے شفقت و محبت، غمخواری، ایک دوسرے کا تعاون، نصیحت و خیر خواہی اور الفت و پیار ہر ایک محسوس کرتا ہے، یہی طرز زندگی تمام مسلمانوں کو اپنانا چاہئے، ایک دوسرے سے اعراض، نفرت و عداوت، حسد اور کینہ بہر حال کامل مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔

فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ۵۹۲/۱۰۔

لا حسد الا فی اثنتین کا مطلب

اس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دو خصلتوں میں حسد کرنا جائز ہے، حالانکہ حسد تو ہر

صورت میں حرام ہے، اسلئے شارحین حدیث نے اسکی درج ذیل تاویلیں بیان کی ہیں:

(۱)......حدیث میں ''حسد'' سے ''غبطہ اور رشک'' مراد ہے، حسد مراد نہیں، معنیٰ یہ ہیں کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں آدمی کو دوسرے پر رشک کرنا چاہئے، ان کے علاوہ اور کوئی چیز قابل رشک نہیں ہے۔

(۲)......بعض نے اسکا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر اسلام میں حسد کی گنجائش ہوتی تو یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں حسد کرنا جائز ہوتا، مگر چونکہ شرعاً کسی چیز میں حسد کرنا جائز نہیں ہے، اسلئے ان دو خصلتوں میں بھی حسد کرنا جائز نہیں ہے۔ شرح الطیبی، کتاب العلم، الفصل الاول ۱/۳۵۹۔

(۳)......علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ حدیث میں حسد سے شدید حرص اور رغبت مراد ہے، اور معنیٰ یہ ہیں کہ ان دو چیزوں میں شدید حرص اور رغبت کرنا جائز ہے، لیکن ان کے علاوہ کسی اور چیز میں شدت حرص جائز نہیں ہے، کیونکہ شدتِ حرص حسد کا ذریعہ اور سبب ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسکی وجہ سے حسد میں مبتلا ہو جائے۔ الکوکب الدری، ابواب البر والصلۃ، باب فی الحسد ۳/۵۳۔

حسد کے جواز کی صورتیں

حسد کرنا جائز نہیں ہے، البتہ دو صورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان میں حسد کیا جا سکتا ہے، ایک اس وقت جبکہ کوئی نعمت کسی کافر کے پاس ہو اور دوسرا اس وقت جب کوئی فاسق و فاجر اور گنہگار انتہائی آسودہ اور خوشحال ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناجائز امور اور گناہوں میں استعمال کر رہا ہو تو ان دو قسم کے لوگوں سے نعمت کے خاتمہ کی آرزو کرنا اور ان سے حسد کرنا جائز ہے۔ فتح الباری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم و الحکمۃ ۱/۲۲۱۔ مرقاۃ، کتاب العلم، الفصل الاول ۱/۴۵۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ التَّبَاغُضِ

یہ باب آپس میں بغض رکھنے اور نفرت کرنے کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ وَلٰكِنْ فِيْ التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ.

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یقینی بات ہے کہ شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ (جزیرہ عرب میں) نمازی (یعنی مسلمان) اسکی پرستش کریں، لیکن فتنہ وفساد پھیلانے اور دوسروں کے خلاف اشتعال دلانے سے ناامید نہیں ہوا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:۔ التباغض: ایک دوسرے سے نفرت اور عداوت کرنا۔ أیس: مایوس اور ناامید ہوگیا۔ التحریش: فتنہ وفساد پھیلانا، ایک دوسرے کے خلاف اکسانا، بھڑکانا، اشتعال دلانا اور فساد پھیلانے پر آمادہ کرنا۔ ان یعبده المصلون: نمازی شیطان کی عبادت کریں، اس سے مراد بت پرستی ہے، کیونکہ شیطان بتوں کی عبادت کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اہل ایمان کو " المصلون" سے تعبیر کیا، اسلئے کہ نماز تمام اعمال میں افضل اور ایمان کی علامت ہے۔

شیطان کی شر انگیزی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے جزیرہ عرب سے شرک ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا، کلمہ توحید لوگوں کے دلوں میں اس طرح راسخ ہوگیا کہ شیطان اس بات سے مایوس ہی ہوگیا کہ مسلمان اس جزیرے میں اسکی پرستش کریں، اسلام سے نکل کر سب کے سب مرتد ہو جائیں اور شرک کرنا شروع کردیں،............ ان تمام چیزوں سے اسے مایوسی ہوگئی، لیکن چونکہ گمراہ کرنا اور بہکانا شیطان کی فطرت میں داخل ہے اسلئے وہ جزیرہ عرب میں مسلمانوں میں اختلافات ڈالنے اور فتنہ وفساد برپا کرنے میں کوشش کرتا رہے گا، اس سے وہ مایوس نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لیکر آج تک جزیرہ عرب میں بت پرستی اور شرک نہیں ہوا، ہر دور میں توحید کا پرچم ہی لہراتا رہا، یہ درست ہے کہ مسیلمہ کذاب کے پیروکار اور حضرت صدیق اکبر کے عہد خلافت میں زکوۃ سے انکاری اگرچہ مرتد ہوگئے تھے، لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ اس نے بت پرستی اور شرک کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ "عبادت" سے یہاں بت پرستی مراد ہے گو

کہ ارتداد ہوا ہے، لیکن بت پرستی نہیں ہوئی۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب تحریش الشیطان ۱۵۸/۶۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ''عبادت'' کو صرف بت پرستی کے ساتھ خاص کردینا درست معلوم نہیں ہوتا، شیطان کی دعوت صرف بت پرستی کیطرف ہی نہیں ہوتی بلکہ کفر کی مختلف اقسام کیطرف ہوتی ہے، لہذا حدیث میں ''ان یعبده المصلون '' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی ''عبادت'' یعنی نماز کے ساتھ شیطان کی عبادت کو جمع نہیں کریں گے کہ ایک طرف تو نماز پڑھیں اور دوسری طرف بت پرستی بھی کریں جیسا کہ یہود ونصاری اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ شرک میں مبتلا ہو گئے، یہود نے حضرت عزیز کو اور نصاری نے حضرت مریم اوران کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو اللہ کے ساتھ مستقل معبود بنالیا۔

مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان باب فی الوسوسۃ ۲۴۹/۱ وشرح الطیبی، ۲۰۸/۱۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے، چنانچہ جزیرۃ العرب میں بتوں کی عبادت نہیں ہوسکی، البتہ شیطان نے لوگوں میں اختلافات ضرور ڈالے ہیں۔ شرح مسلم للنووی، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب تحریش الشیطان ۳۷۶/۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ إِصْلَاحِ ذَاتِ الْبَيْنِ

یہ باب آپس میں اصلاح کے بارے میں ہے

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ إِلَّا فِيْ ثَلَاثٍ: يُحَدِّثُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ لِيُرْضِيَهَا، وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ، وَالْكَذِبُ لِيُصْلِحَ بَيْنَ النَّاسِ.

اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، مرد اپنی بیوی سے جھوٹ بولے تاکہ اسے خوش کرے، اور جنگ وجہاد میں جھوٹ بولنا، اور جھوٹ بولنا تاکہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أُمِّهِ أُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ قَالَتْ: سَمِعْتُ

رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَيْسَ بِالْكَاذِبِ مَنْ أَصْلَحَ بَيْنَ النَّاسِ فَقَالَ خَيْرًا، أَوْ نَمَّا خَيْرًا.

ام کلثوم بنت عقبہ کہتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان (جھوٹ کے ذریعے) صلح و صفائی کرائے، اور وہ اچھی بات کہے یا (یوں فرمایا) دوسروں تک (اصلاح کے لئے) اچھی بات پہونچائے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: -ذَاتُ الْبَيْنِ: رشتہ، قرابت، تعلق، جوڑ۔ إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ: ان احوال کی اصلاح جو لوگوں کے درمیان پیش آتے ہیں۔ لا يحل: حلال نہیں ہے۔ ليصلح: تاکہ وہ صلح وصفائی کرائے۔ خيراً: اچھی بات۔ نَمَا: اس نے اصلاح اور خیر کی نیت سے بات پہونچائی۔ اور اگر فساد کی نیت سے بات پھیلائی جائے تو اس کیلئے نَمّی (میم کی تشدید کے ساتھ) استعمال ہوتا ہے۔

حدیث میں ''کذب'' سے کیا مراد ہے

اس باب کی روایات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان صلح وصفائی وغیرہ کیلئے جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے، تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں اتفاق و اتحاد قائم رہے، باہمی اختلافات اور لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں، کیونکہ اتفاق و اتحاد سے دشمن کے مقابلے پر قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور اختلاف و انتشار سے دشمن غالب ہو جاتا ہے، انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے مستحکم اور مضبوط ہونے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق و اتحاد کی ترغیب دی ہے، اور اس کیلئے جھوٹ کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حدیث میں مذکورہ تین موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، لیکن اس ''کذب'' سے مراد کیا ہے، کیا اس سے واقعی جھوٹ ہی مراد ہے یا توریہ اور تعریض؟ اس میں علماء کرام کے دو نقطہ نظر ہیں:

(۱)......ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ حدیث میں ''کذب'' سے صریح جھوٹ ہی مراد ہے کہ ان مقامات پر

اسکا بولنا جائز ہے، کیونکہ ان میں مصلحت پیش نظر ہوتی ہے، اور جھوٹ اس وقت مذموم ہوتا ہے جب محض نقصان اور دھوکہ دینے کیلئے ہو، ان حضرات کا استدلال مندرجہ ذیل امور سے ہے:

(۱)......حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات سے کہ انہوں نے تین مقامات پر جھوٹ سے کام لیا:

(۱)......اپنی بیوی حضرت سارہ کو ظالم بادشاہ کی ہوس سے بچانے کیلئے اپنی بہن بتایا۔

(۲)......قوم سے تہوار میں شریک نہ ہونے کیلئے کہا: إني سقيم ''میں بیمار ہوں''۔

(۳)......بتوں کو توڑنے کے بعد جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے تو یہ بت نہیں توڑے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: بل فعله كبيرهم، تم یہ احتمال کیوں فرض نہیں کرتے کہ یہ حرکت میں نے نہیں کی بلکہ ان کے بڑے (گرو) نے کی ہے۔

(۲)......دوسرا استدلال حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے سے ہے کہ ان کے منادی نے انکے بھائیوں کے قافلے سے اعلان کیا تھا: ايتها العير انكم لسارقون، اے قافلے والو: تم چور ہو، حالانکہ انہوں نے تو چوری نہیں کی تھی، اسکے باوجود جھوٹ میں انہیں چور کہا گیا ہے۔

(۳)......ایک فقہی مسئلہ سے استدلال ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی کو قتل کرنے کے درپے ہو، اور کسی سے پوچھے کہ فلاں کہاں ہے، تو اسپر لازم ہے کہ اسے یہ جواب دے کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، اگرچہ وہ شخص اسی کے پاس روپوش ہو اور اسکے علم میں ہو، اس مسئلے میں بھی فقہائے کرام نے بالاتفاق جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے۔

ان واقعات کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ جسطرح ان صورتوں میں جھوٹ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے واقع ہوا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی کذب ہی مراد ہے، توریہ اور تعریض مراد نہیں ہے۔

(۲)......دوسرا فریق علامہ طبری وغیرہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں صریح جھوٹ کسی بھی موقع پر جائز نہیں ہے، اگر کہیں جھوٹ کی اجازت کا ذکر ہے بھی تو اس سے توریہ مراد ہے ''توریہ'' کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مقصد کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن کے دو مفہوم ہوں، سننے والا ان سے ایک معنی سمجھے، اور بولنے والے کی نیت دوسرے معنی کی ہو، اس طرح اپنا مقصد بھی پوشیدہ رہتا ہے اور آدمی جھوٹ سے بھی بچ جاتا ہے۔

ان کے نزدیک مذکورہ تمام واقعات میں صریح جھوٹ کا استعمال نہیں ہوا بلکہ ان سب میں توریہ کے

طور پر کلام کیا گیا جس سے مخاطب نے ایک معنی مراد لیا جبکہ متکلم کے ذہن میں دوسرا معنی تھا، بیوی کو بہن بتانے سے مراد اسلامی اور دینی بہن ہے،"انی سقیم کے معنی غمگین اور رنجیدہ کے ہیں، **بل فعله کبیرھم** میں مجازی نسبت کے طور پر اس فعل کو بڑے بت کیطرف منسوب کیا ہے، کیونکہ بڑا بت ہی اس کاروائی کا سبب بنا ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الکذب وبیان مایباح عنہ۲/۳۲۵

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا، اور نہ یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا، بلکہ یہ سب کام بامر الٰہی اسی کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے، جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء وامتحان کی تکمیل ہو رہی تھی، اس جواب کیطرف خود قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر کی یوسف کیلئے اپنے بھائی کو روکنے کی، معارف القرآن، سورۃ یوسف، ۵/۱۱۶۔

اور فقہی مسئلے میں چونکہ اضطراری حالت ہے اسلئے اس میں صریح جھوٹ بولنا جائز ہے، فتح الباری، کتاب الصلح باب لیس الکاذب۔۵/۳۷۶۔

حاصل یہ کہ حتی الامکان صریح جھوٹ سے بچا جائے، اور توریہ کا استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کیا جائے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ تین موقعوں پر اگر توریہ سے مقصد حاصل نہ ہو تو پھر صریح جھوٹ بولنا جائز ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الجھاد والسیر، باب جواز الخداع فی الحرب۳/۳۲۔

تین موقعوں پر جھوٹ کا جواز

(۱)......شوہر اپنی بیوی کو خوش کرنے کیلئے ایسی کوئی بات کہدے جو جھوٹ کے مشابہ ہو، صریح جھوٹ نہ ہو، مثلاً یہ کہدے کہ میں تجھے فلاں چیز خرید کر دونگا، نیت یہ ہو کہ اگر اللہ نے اسکی ہمت اور توفیق دی تو اس وقت خرید دونگا، شوہر کا بیوی کے سامنے جھوٹ بولنا یا اسکے برعکس اسکا منشاء آپس میں پیار و محبت اور معاملات کو سلجھانا ہو تو یہ جائز ہے، لیکن مرد کا بیوی کو یا بیوی کا مرد کو دھوکا دینا بالاجماع حرام ہے۔

(۲)......جنگ کے موقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے مثلاً دشمن سے کہے **مات امامکم الاعظم** (تمہارا امام اعظم مرگیا) نیت یہ ہو کہ گذشتہ زمانوں میں تمہارا بڑا امام مرگیا تھا، یا یوں کہے: غداً یاتینا مدد، کل ہماری مدد آئیگی

نیت میں یہ ہو کہ طعام آئیگا۔

(۳)......لوگوں میں صلح کرانے کیلئے جھوٹ بولنا، دو آدمیوں میں جھگڑا یا کوئی اختلاف ہے، تیسرا شخص ان میں صلح کرانا چاہتا ہے، وہ ان دونوں کے پاس الگ الگ جاتا ہے، ہر ایک کو دوسرے کا سلام پہونچاتا ہے، اسے کہتا ہے کہ فلانا آپ کے بارے میں بڑے اچھے جذبات رکھتا ہے، آپکی تعریفیں کرتا ہے .... پھر اس دوسرے کے پاس آکر اسی طرح کی باتیں کرتا ہے، تاکہ ان کے درمیان صلح ہو جائے، اس عمل میں اگر اسے جھوٹ بولنا پڑے تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ فتنہ وفساد قتل سے بھی بڑا گناہ ہے، اسے ختم کرنے کیلئے گفتگو میں خوب مبالغہ کرنا بھی جائز ہے، اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قال خیرا یا نما خیرا فرمایا، لوگوں کی صلح وصفائی کرنا اسلام کی نظر میں انتہائی عظیم الشان عمل ہے، اگر کہیں صلح کرانیکا موقع ملے تو پورے عزم وہمت اور جذبے سے یہ عبادت سرانجام دینی چاہئے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الکذب ۳۲۵/۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْخِيَانَةِ وَالْغِشِّ

یہ باب خیانت اور دھوکے (کی وعید) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي صِرْمَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ ضَارَّ ضَارَّ اللّٰهُ بِهِ، وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ.

ابوصرمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص (کسی مسلمان کو شرعی وجہ کے بغیر) کوئی ضرر اور نقصان پہونچائیگا تو اللہ تعالیٰ اسکو ضرور نقصان پہونچائیگا۔ (یعنی اسکو عملِ بد کی سزا دیگا) اور جو شخص (کسی مسلمان کو) مشقت وتکلیف میں ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اسکو مشقت وتکلیف میں ڈالے گا۔

عَنْ أَبِي بَكْرِ الصِّدِّيْقِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا أَوْ مَكَرَ بِهِ.

ابوبکر صدیق سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص رحمت الٰہی سے دور ہے جو کسی مؤمن کو ضرر پہونچائے یا اس کے ساتھ مکر وفریب کرے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- الخیانة: دھوکہ، بے ایمانی، غبن کرنا۔ اَلْغِشّ: (غین پر زبر اور زیر کے ساتھ) دھوکہ ملاوٹ، کھوٹ، خیانت، غداری۔ ضَارٌّ: (راء پر تشدید) جو ضرر اور نقصان پہونچائے۔ شَاقٌّ: (قاف پر تشدید) جو مشقت و تکلیف پہونچائے۔ شَقَّ: مشقت میں ڈالے گا، دشواری اور مشکل پیدا کریگا۔ مَلْعُوْنٌ: دھتکارا ہوا، وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور خیر سے دور ہو۔ مَکَرَبِہٖ: اس نے اسکو دھوکہ اور فریب دیا۔

کسی مسلمان کو ضرر و مشقت پہونچانا جائز نہیں

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کو ضرر و مشقت اور تکلیف پہونچانا جائز نہیں ہے، جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر کسی مسلمان کو تکلیف پہونچائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرر پہونچائیگا یعنی اسکو اس عمل بد کی سزا دیگا۔

وَمَنْ شَاقَّ: اسکے دو معنی بیان کئے گئے ہیں:

(۱)...... جو شخص کسی سے دشمنی کریگا تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص سے دشمنی فرمائیں گے۔

(۲)...... جو کسی کو مشقت میں ڈالے گا، اللہ تعالیٰ بھی اسے مشقت میں ڈالیں گے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "مشقت" اور "ضرر" دونوں کے معنی قریب قریب ہیں البتہ "ضرر" کا استعمال مال کی تباہی کیلئے اور مشقت کا استعمال بدن کی اذیت کیلئے ہوتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرمایا کہ جو شخص کسی کو ظاہری طور پر نقصان پہونچائے یا پوشیدہ طور پر، جانی نقصان ہو یا مالی، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکار دیا جاتا ہے، دور کر دیا جاتا ہے، اور جو شخص رحمتِ الٰہی سے دور کر دیا جائے تو اس کے لئے دنیا و آخرت میں ذلت و پستی اور خسارہ ہی خسارہ ہے۔

حدیث میں "ضار" سے ضرر ظاہری اور "مکر به" سے پوشیدہ ضرر مراد ہے۔

مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب ما نھی من التھاجر...... ۷۷/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ حَقِّ الْجِوَارِ

یہ باب پڑوس کے حق کے بارے میں ہے

عَنْ مُجَاهِدٍ: أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو ذُبِحَتْ لَهُ شَاةٌ فِيْ أَهْلِهِ فَلَمَّا جَاءَ

قَالَ: أَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُوْدِيِّ؟ أَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُوْدِيِّ؟ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا زَالَ جِبْرَائِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ.

مجاہد سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو کیلئے ان کے گھر میں بکری ذبح کی گئی، جب وہ گھر تشریف لائے تو دریافت کیا کہ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی ہدیہ دیا ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جبرائیل امین مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر وصیت اور تاکید فرماتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وارث قرار دیدیں گے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا زَالَ جِبْرَائِيْلُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرئیل امین۔ اللہ تعالیٰ کی آپ پر اور جبرئیل امین پر رحمتیں ہوں۔ مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر وصیت فرماتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وارث قرار دیدیں گے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خَيْرُ الْأَصْحَابِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهٖ، وَخَيْرُ الْجِيْرَانِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهٖ.

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک دوستوں میں سب سے بہتر دوست وہ ہے جو اپنے دوست کیلئے بہتر ہو، اور پڑوسیوں میں سب سے بہتر اللہ کے نزدیک وہ پڑوسی ہے جو اپنے ہمسایہ کیلئے بہتر ہو (یعنی اسکے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا ہو)۔

مشکل الفاظ کے معنی: — **جوار:** (جیم پر زیر کے ساتھ) پڑوس۔ **أهديتم:** اس سے پہلے ایک ہمزہ برائے استفہام محذوف ہے: کیا تم نے ہدیہ بھیجا۔ **یوصینی:** مجھے وصیت اور تاکید کرتے رہے۔ **سیورثه:**

عنقریب وہ پڑوسی کووارث قرار دیدیں گے۔ **اصحاب**: صاحب کی جمع ہے: دوست، رفقاء۔ **الجیران**: جار کی جمع ہے: پڑوسی۔ **صلوات الله علیهما**: اللہ تعالیٰ کی آپ علیہ السلام اور جبرائیل امین پر رحمتیں ہوں۔

پڑوسیوں کی اقسام اور پڑوس کی حد

حدیث میں لفظ "جــــار" عام ہے، پڑوسی خواہ کافر ہو یا مسلمان، رشتہ دار ہو یا نہ ہو، نیک ہو یا بد، دیہاتی ہو یا شہری، مکان کے متصل رہتا ہو یا کچھ دور، ان تمام کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، طبرانی نے حضرت جابر سے حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ پڑوسیوں کی تین قسمیں ہیں:

(۱)...... کافر پڑوسی، اسے صرف ایک حق یعنی حق جوار (حق پڑوس) حاصل ہوتا ہے، کافر کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کی جائے اور اسکی ایذاء رسانی سے اجتناب کیا جائے، البتہ گہرے تعلقات اور دوستی کفار کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

(۲)...... مسلمان پڑوسی: اسکے دو حق ہیں، ایک حق جوار اور دوسرا حق اسلام۔

(۳)...... مسلمان رشتہ دار پڑوسی، اسکے تین حقوق ہیں، ایک حق جوار، دوسرا حق اسلام، تیسرا قرابت اور رشتہ داری کا حق۔

ان حقوق کو پیش نظر رکھ کر پڑوسیوں کے ساتھ معاملہ کرنا چاہئے۔

پڑوس میں کتنے مکان آتے ہیں، اسکی حد میں اختلاف ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پڑوس کی حد میں ہر طرف سے چالیس گھر ہوتے ہیں، امام اوزاعی اور ابن شہاب زہری کی بھی یہی رائے ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اذان کی آواز جہاں جہاں تک پہونچتی ہے وہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار ۵۴۲/۱۰ و باب حق الجوار ۵۴۸/۱۰۔

بعض نے کہا کہ جو شخص ایک محلہ یا شہر میں رہتا ہے وہ ان سب کا پڑوسی ہے۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۸۵/۵۔

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک اور اسکے حقوق کی تفصیل

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اچھا برتاؤ کرے، ہدیہ دینا، سلام کرنا، مسکرا کر ملنا، اس کی خیریت دریافت کرنا، ضرورت کے وقت اسکا تعاون کرنا، اور ہراس کام اور چیز سے اجتناب کرنا جس سے اسے تکلیف پہونچنے کا امکان ہو، .... یہ تمام چیزیں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں شامل ہیں۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار ۱۰/۵۴۲

حضرت معاذ بن جبل کی ایک حدیث ہے، اس میں پڑوسیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے پوچھا کہ پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں، آپ نے فرمایا:

> ”اگر وہ قرض مانگے تو آپ اسے قرض دیں، مدد مانگے تو اسکی مدد کریں، بیمار ہو جائے تو اسکی بیمار پرسی کریں، محتاج ہو تو اسے عطیہ دیں، فقیر ہو تو اسپر احسان کریں، مسرت اور خوشی کے موقع پر اسکو مبارکباد دیں، کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو اسے تسلی دیں، وہ مر جائے تو اسکے جنازے میں ساتھ جائیں، اسکی اجازت کے بغیر اپنے مکان کی تعمیر اس طرح نہ کریں کہ اسکی ہوا ہی رک جائے، کوئی پھل خریدیں تو کچھ اسے بھی ہدیہ کریں، ہدیہ نہیں کرسکتے تو چھپا کر گھر لے جائیں، وہ پھل بچوں کو دیکر باہر نہ نکالیں کہ اس پڑوسی اور اس کے بچوں کو حسرت اور پریشانی ہوگی“ فتح الباری کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الاخر...... ۱۰/۵۴۷۔

باب کی مذکورہ احادیث میں ایک مسلمان کو اسکی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل امین مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ اسکو وارث بھی قرار دیدیا جائیگا۔

باب کی دوسری حدیث میں فرمایا کہ بہترین شخص وہ ہے جو اپنے دوست کے ساتھ اچھا ہو اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الإِحْسَانِ إِلَى الْخَادِمِ

یہ باب خادم کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِىْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ فِتْيَةً تَحْتَ أَيْدِيْكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِنْ طَعَامِهٖ وَلْيُلْبِسْهُ مِنْ لِبَاسِهٖ وَلَا يُكَلِّفْهُ مَا يَغْلِبُهُ، فَإِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ.

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے بھائیوں کو آپکے ماتحت غلام بنایا ہے، لہذا جس شخص کا بھائی اسکے ماتحت ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے کھانے سے اسکو کھانا کھلائے، اور اپنے لباس سے اسکو لباس پہنائے، اور اسے کسی ایسے امر کا مکلّف و ذمہ دار نہ بنائے جو اسپر غالب آجائے، اور اگر (کسی وجہ سے) ایسے امر کا مکلّف بنائے جو اسپر غالب آجائے تو (پھر) اسکا تعاون کرنا چاہئے۔

عَنْ أَبِىْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَيِّئُ الْمَلَكَةِ.

حضرت ابوبکر صدیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ماتحتوں کے ساتھ بدسلوکی کرنیوالا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مشکل الفاظ کے معنی: -إخوانکم: أخ کی جمع ہے: تمہارے بھائی، یعنی ماتحت غلام اور ملازم۔ فتیة: فتی کی جمع ہے: غلام، ملازم، خادم۔ فلیطعمه: اسے کھلانا چاہئے۔ لِیُلْبِسْه: چاہے کہ اسے اپنے لباس سے پہنائے۔ لا یکلفه: اسے مکلّف اور ذمہ دار نہ بنائے۔ فلیعنه: چاهئے کہ اسکی مدد کرے۔ سَیِّئ: برا، بد۔ سیئ الملکة: (میم اور لام پر زبر کے ساتھ) وہ شخص جو اپنے غلاموں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہو۔

خادمین کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اپنے ماتحتوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، انہیں وہی

کھلایا جائے جو خود کھائے، جو لباس خود پہنے اسی طرح کا لباس اپنے ماتحتوں کو بھی پہنائے، اور اس کی طاقت سے زیادہ ایسے کام وغیرہ کا اسے مکلّف نہ بنایا جائے جو وہ برداشت ہی نہ کر سکے، ایسے میں خود اس کے ساتھ اس کام میں شریک ہو جائے، اور فرمایا کہ جو شخص اپنے ماتحتوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا ہے وہ جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوگا، جب تک وہ اسکی سزا نہ بھگت لے، اسلئے اگر کسی کے ماتحت غلام اور خادم ہوں تو ان کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنا چاہئے، ظلم وزیادتی اور ناانصافی کرنا جائز نہیں ہے۔

تحفۃ الأحوذی، ۶/۶۴۔

بَابُ النَّهْيِ عَنْ ضَرْبِ الْخُدَّامِ وَشَتْمِهِمْ

یہ باب خادمین کو مارنے اور ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ أَبُوْ الْقَاسِمِ ﷺ نَبِيُّ التَّوْبَةِ: مَنْ قَذَفَ مَمْلُوْكَهُ بَرِيْئًا مِمَّا قَالَ لَهُ، أَقَامَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْحَدَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ كَمَا قَالَ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ توبہ والے نبی ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مملوک (غلام) پر تہمت لگائے حالانکہ وہ اس تہمت سے بری ہے جو اس کو لگائی گئی ہے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسپر حد قائم فرمائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا ہو جیسا کہ اس کے بارے میں آقا نے کہا ہے۔

عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ قَالَ: كُنْتُ أَضْرِبُ مَمْلُوْكًا لِيْ فَسَمِعْتُ قَائِلًا مِنْ خَلْفِي يَقُوْلُ: اعْلَمْ أَبَا مَسْعُوْدٍ، اعْلَمْ أَبَا مَسْعُوْدٍ فَالْتَفَتُّ فَإِذَا أَنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ. قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ: فَمَا ضَرَبْتُ مَمْلُوْكًا لِيْ بَعْدَ ذٰلِكَ.

ابومسعود انصاری فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا، اسی دوران میں نے پیچھے سے سنا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے، اے ابومسعود سن لو، اے ابومسعود جان لو، میں (پیچھے کی طرف) متوجہ ہوا، تو دیکھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھے خطاب کر کے) فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ تجھ پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں بنسبت اس قدرت کے جو تیری اس غلام پر ہے، (اس قدر عظیم قدرت کے باوجود وہ آپکی غلطیوں سے درگذر کرتے ہیں) ابو مسعود کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کسی غلام کو نہیں مارا۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- خُدّام: خادم کی جمع ہے: خدمتگار، غلام، ماتحت ملازم۔ شتمهم: ان کو برا بھلا کہنا۔ نبيُّ التوبة: یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے: توبہ والا نبی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز کم از کم ستر یا سو مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔ قذف: تہمت لگائے۔ بریئاً: بری، بے گناہ۔ التفتُ: میں متوجہ ہوا۔ لله اقدر: یقیناً اللہ تعالیٰ زیادہ قادر ہے، اقدر اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔

غلاموں کو مارنے اور برا بھلا کہنے سے ممانعت کا حکم

باب کی پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص غلام یا ماتحت کی عفت و پاکدامنی پر حملہ آور ہو جائے، حالانکہ وہ بے گناہ ہے، یہ محض تکبر و غرور کی وجہ سے تہمت لگا رہا ہے، تو ایسے شخص پر گو کہ دنیا میں کوئی حد نہیں جاری ہوگی، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اسپر حد قائم کریں گے، اور اسے اس الزام کی سزا دیں گے، ہاں اگر مولی سچا ہے، اور واقعی اس غلام میں وہ خرابی پائی جاتی ہے تو پھر اس مولی پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ آقا اگر اپنی باندی یا غلام پر تہمت اور الزام لگائے تو دنیا میں اس آقا پر شرعی حد نہیں جاری کی جائیگی، کیونکہ حدود ادنی شبہہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں، یہاں ملکیت کی وجہ سے شبہہ پیدا ہو گیا ہے، اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے، یہ غلام خواہ کامل ہو یا ناقص مثلا مدبر، مکاتب یا ام ولد ہو، مولیٰ پر دنیا میں شرعی حد تو نہیں جاری ہوگی لیکن تعزیراً مولیٰ کو اس الزام کی وجہ سے کچھ سزا ضرور دی جائیگی، تاکہ آئندہ وہ اس قسم کی الزام تراشی سے باز رہے۔

دوسری حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا ماتحت اور غلام خواہ کتنی بڑی غلطی کرلے تو آقا کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہئے، ایسا نہیں کہ غلام غلطی نہیں کریگا، وہ غلطی ضرور کریگا لیکن اسکی غلطیوں کو یہ سوچ کر

معاف کردیا جائے کہ میں بھی تو اللہ کا بندہ ہوں، اسکی بندگی میں کتنی کوتاہی کرتا ہوں، طرح طرح کے گناہ اور نافرمانی کرتا ہوں، وہ غالب قدرت کے باوجود مجھے سزانہیں دیتا، میری فوراگرفت نہیں کرتا، لہذا مجھے بھی اس غلام کے ساتھ ایسا ہی عفو ودرگذر کا سلوک کرنا چاہئے۔

الکوکب الدری، ابواب البر والصلة، باب النھی ....۵۴/۳، تحفۃ الاحوذی،............۶۶/۶

لله اقدر ......کی ترکیب نحوی

"لله اقدر علیک منک علیه" – "لله" میں لام برائے تاکید ہے، لفظ "اللہ" مبتدا ہے، اور "اقدر" خبر ہے، "علیک اور منک" ظرف ہیں جو "اقدر" سے متعلق ہیں، اور "علیه" کاف خطاب سے حال ہے، عبارت یوں ہوگی: اقدر علیک منک حال کونک قادراً علیه، وہ اللہ تجھ پر تیری بنسبت کہیں زیادہ قادر ہے جتنا کہ تو اسپر قادر ہے۔ تحفۃ الاحوذی،............۶۷/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَدَبِ الْخَادِمِ

یہ باب غلام وخادم کوادب سکھانے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ خَادِمَهُ فَذَكَرَ اللّٰهَ فَارْفَعُوْا أَيْدِيَكُمْ.

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مارے اور (اس دوران) وہ اللہ کا نام (یعنی واسطہ) ذکر کر دے تو تم اپنے ہاتھ (مارنے سے) اٹھالو۔

غلام کوادب سکھانے کا حکم

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)......اپنے ماتحت خادم اور غلام کو ادب واحترام سکھانا چاہیے، تاکہ اسے معاشرے میں زندگی گذارنے کا سلیقہ آجائے، اور اپنے ذمہ واجب ہونے والے حقوق سے آگاہ ہوجائے۔

(۲)......اصلاح وتربیت کی خاطر تھوڑا بہت مارنے کی بھی گنجائش ہے، لیکن اگر وہ اس مارنے کے دوران اللہ کا واسطہ دیکر معاف کرنے کا کہے، اسکا یہ کہنا دل سے ہو، مکروفریب اور دھوکہ کی بنیاد پر نہ ہو تو پھر اسے اللہ کے نام کے ادب کی وجہ سے معاف کر دینا چاہئے، البتہ اگر اللہ کا واسطہ وہ دھوکہ دینے کیلئے دے رہا ہے تو پھر ہاتھ ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے، ایسی صورت میں اصلاح کی خاطر مناسب سزا مکمل دینی چاہئے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی ادب الخادم ۶/۶۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْعَفْوِ عَنِ الْخَادِمِ

یہ باب غلام اور خادم کو معاف کرنے کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمْ أَعْفُو عَنِ الْخَادِمِ؟ فَصَمَتَ عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ، ثُمَّ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمْ أَعْفُوْ عَنِ الْخَادِمِ؟ قَالَ: كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً.

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول میں خادم کو کتنی مرتبہ معاف کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھر اس نے کہا یا رسول اللہ میں خادم کو کتنی بار معاف کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر روز ستر مرتبہ (خادم کو معاف کیا کرو)

خادم کو معاف کرنے کا حکم

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خادم سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دینا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کے سوال پر فرمایا کہ ہر روز ستر مرتبہ معاف کیا کرو، عربی زبان میں " سبعین مرة" کا لفظ کثرت کیلئے استعمال ہوتا ہے مراد یہ ہے کہ بار بار اسے معاف کیا جائے، اس سے تحدید مقصود نہیں ہے۔

فصمت عنه النبی صلی الله علیه وسلم.

یہ خاموشی کس وجہ سے تھی، شارحین حدیث نے اسکی دو وجہیں بیان کی ہیں:

(۱)......وحی کی انتظار کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔
(۲)......بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت فرمانا سوال کو ناپسند کرنے کی وجہ سے تھا، کیونکہ معاف کرنا تو بہترین عمل ہے، اس کے لئے عدد معین کرنا مناسب نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی العفو عن الخادم ۶/۶۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَدَبِ الْوَلَدِ

یہ باب اولاد کو ادب سکھانے کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَأَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ.

جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کا اپنے بیٹے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

حَدَّثَنَا أَيُّوْبُ بْنُ مُوْسَى عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نُحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ.

ایوب بن موسیٰ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی باپ نے بیٹے کو حسن ادب سے افضل کوئی عطیہ نہیں دیا۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- یتصدق: صدقہ کرے۔ صاع: غلہ ناپنے کا ایک پیمانہ۔ نَحَلَ: (نون اور حاء کی زبر کے ساتھ) کسی کو کوئی چیز اپنے مرضی سے دینا۔ نُحل: (نون پر پیش اور حاء کے سکون کے ساتھ) بخشش، عطیہ۔

اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کی اہمیت

ان احادیث سے اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اسے اللہ کے راستے میں ایک صاع صدقہ کرنے سے بھی افضل قرار دیا ہے، اور والد کی طرف سے دینی تعلیم وتربیت اولاد کیلئے سب سے بڑا

عطیہ ہے، اس سے مفید اور قیمتی چیز اور کوئی نہیں ہے، آج ہر انسان اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے مین بڑا فکر مند ہوتا ہے، اسکی معیشت کا مسئلہ اسکے ذہن پر سوار رہتا ہے، اولاد کے مستقبل کو روشن اور پر سکون بنانے کیلئے والد دولت کمانے کا ہر ہر حربہ استعمال کرتا ہے، اور بسا اوقات حلال وحرام کی بھی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی، لیکن اولاد کی دینی تعلیم وتربیت ہورہی ہے یا نہیں، اسکی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا کتنا اثر ہے، قرآن و حدیث کے ساتھ اسکا کتنا لگاؤ اور ان پر عمل کا جذبہ ہے یا نہیں، اسکی زندگی کا ہر قدم اسلام کے قریب ہورہا ہے یا دور، اسکی قطعاً پرواہ نہیں ہے، مغربی تہذیب وتمدن اور یہودی ثقافت کی یلغار نے عالم اسلام کو بالکل بے حس بنادیا ہے، اسکی ایمانی غیرت کا جنازہ نکال دیا ہے، آج ایک مسلمان مسلمان ہونے کے باوجود انگریزی تعلیم و تہذیب کو وقت کی ضرورت سمجھتا ہے، اسے ترقی کا معیار قرار دیتا ہے، حالانکہ ترقی کا راز اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے، اور قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے میں ہے، اسلام اس سے ہرگز منع نہیں کرتا کہ عصری تعلیم کو سیکھا جائے، بلکہ اسے صحیح طریقے سے سیکھنے کا حکم دیتا ہے، لیکن ایسے میں اسلامی تعلیمات کو بالکل پس پشت ڈالدینا یہ بہر حال جائز نہیں ہے، اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والد کیطرف سے سب سے بڑا عطیہ اولاد کیلئے وہ حسن ادب اور صحیح دینی تعلیم وتربیت ہے اور یہ والد کی شرعی ذمہ داری ہے، اس میں کوتاہی کی گئی تو اللہ کے ہاں اس کی باز پرس ہوسکتی ہے۔

اولاد کی تعلیم وتادیب اور دینی تربیت ایک صاع صدقہ کرنے سے کیسے بہتر ہے، اسکی مختلف وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱)......اولاد کی تعلیم وتربیت یقیناً صحیح محل پر واقع ہوتی ہے، اور صدقہ صحیح مصرف پر استعمال ہوا ہے یا نہیں، اسکا یقین نہیں ہے، اسلئے حسن ادب کو صدقہ سے افضل قرار دیا ہے۔

(۲)......اولاد کی تربیت میں علمی افادہ ہے، جبکہ صدقہ میں عملی افادہ ہے، اور علمی افادہ چونکہ بہتر ہوتا ہے اسلئے اولاد کی تربیت کو افضل کہا ہے۔

(۳)......بچوں کی تعلیم وتربیت کا اثر ہمیشہ باقی رہتا ہے، جبکہ صدقہ جلد ہی ختم ہوجاتا ہے۔

(۴)......اولاد کی دینی تربیت نہ کرنے پر گرفت ہوسکتی ہے اور نفلی صدقہ نہ دینے میں کوئی پکڑ نہیں ہے۔

مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ۸/۱۱۷۔

(۵)......علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی اولاد کی دینی تربیت کرتا ہے، تو ان کے اعمال وافعال والدین کیلئے صدقہ جاریہ ہو جاتے ہیں، اور صدقہ کے لئے صدقہ جاریہ ہونا ضروری نہیں ہے، اس کا ثواب جلد ہی ختم ہوسکتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی ادب الولد ۶/۷۰۔

ایوب بن موسی عن ابیه عن جده کی وضاحت

"ایوب بن موسی عن ابیه عن جده" اس کا پورا نسب اسطرح ہے: ایوب بن موسی بن عمرو بن سعید بن العاص، اس میں "عن ابیه" کی ضمیر "ایوب" کیطرف ہے یعنی **عن موسی بن عمرو**، اور "عن جده" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں:

ایک احتمال یہ ہے کہ یہ ایوب کیطرف لوٹ رہی ہو: ایوب کے دادا یعنی عمرو بن سعید، یہ صحابی نہیں ہیں، حضرت عثمان غنی کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئے، اس لحاظ سے یہ حدیث مرسل ہوگی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر "موسی" کیطرف لوٹ رہی ہو، موسی کے دادا یعنی سعید بن العاص، یہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہو گئے تھے اور ظاہر یہی ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہوگا مگر محدثین کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے، اس وجہ سے ان کی روایت کو مرسل صحابہ قرار دیا گیا ہے، تاہم اس سے روایت کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جمہور کے نزدیک حدیث مرسل قابل استدلال اور حجت ہوتی ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ۸/۱۱۷۔ تھذیب التھذیب، حرف المیم، رقم: ۷۲۷۷، ۸/۴۱۸، ط: دار الفکر: بیروت۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ قَبُوْلِ الْهَدِيَّةِ وَالْمُكَافَأَةِ عَلَيْهَا

یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جو ہدیہ قبول کرنے اور اسکا بدلہ دینے کے بارے میں ہیں۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَيُثِيْبُ عَلَيْهَا.

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے اور اسکا بدلہ بھی عنایت فرماتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- ھَــدِیَّة: کسی عوض اور بدلہ کی نیت کے بغیر کوئی چیز دینا، ہدیہ، تحفہ ج ھدایا۔ المکافأة: بدلہ دینا۔ یثیب: وہ بدلہ دیتے۔

ہدیہ قبول کرنا اور اسکا بدلہ دینا سنت ہے

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو خوش کرنے کیلئے کوئی چیز ہدیہ کرے، اس کا رزق اور آمدن بھی حلال ہو، ہدیہ دینے کا مقصد غلط اور ناجائز نہ ہو، اور نہ ہی اپنی برتری اور احسان جتانا پیش نظر ہو تو ایسی صورت میں اسکا ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، اور جب گنجائش ہو تو اسے بھی جواباً کوئی چیز ہدیہ میں دینی چاہیئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول بھی فرماتے اور اسکا بدلہ بھی دیتے تھے، بدلہ دینے میں کوشش کرے کہ اس کے ہدیہ سے بڑھکر بدلہ دے، زیادہ قیمتی نہ ہو تو کم از کم اس کے ہدیہ کے بقدر ہی دیدے تو بہتر ہے۔

اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کر کے حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ ہدیہ کا بدلہ دینا واجب ہے، جبکہ حنفیہ اور شوافع وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ بدلہ کی نیت سے ہدیہ دینا درست نہیں ہے، شرعاً یہ ہدیہ نہیں، بلکہ مجہول قیمت کے بدلے ایک بیع (خرید وفروخت) ہے، کیونکہ ہبہ اور بیع میں شرعاً اور عرفاً فرق ہے، جس معاملے میں عوض اور بدلہ ہو تو وہ ''بیع'' ہے اور جس میں بدلہ اور عوض کی نیت نہ ہو، محض تبرع اور احسان کرنا مقصود ہو تو یہ ہبہ ہے۔ فتح الباری، کتاب الھبۃ، باب المکافاۃ فی الھبۃ ۲۶۳/۵۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ الشُّکْرِ لِمَنْ أَحْسَنَ إِلَیْکَ

یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جن میں اس شخص کا شکر کرنیکا ذکر ہے جو آپ کے ساتھ احسان کرے۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لَا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرِ اللّٰهَ.

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰهَ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوشخص لوگوں کا شکرنہیں ادا کرتا وہ اللہ کا شکر بھی نہیں ادا کرتا۔

دوسری روایت کا ترجمہ بھی یہی ہے۔

شکرادا کرنے کا حکم

ان روایات سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)......اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے، اور شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ نعمتوں کو صرف جائز جگہ پر ہی استعمال کیا جائے، ناجائز امور اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی بھی نعمت کو استعمال کرنا درحقیقت یہ نعمت کی ناشکری ہے، اس کے بارے میں قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔

(۲)......کوئی انسان آپ کے ساتھ نیکی کرے تو اسکا تہ دل سے شکرادا کرنا چاہئے، جوشخص لوگوں کا شکرادا نہیں کرتا، وہ گویا اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا، کیونکہ لوگوں کا شکرادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، جب وہ اس حکم پر عمل نہیں کر رہا تو وہ اللہ کے حکم سے روگردانی، غفلت اور اعراض کر رہا ہے، یوں اس نے اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کیا۔

لہذا ایک مسلمان کی یہ عادت ہونی چاہئے کہ وہ لوگوں کا ضرور شکر ادا کیا کرے، کیوں کہ جو لوگوں کا شکرادا نہیں کرتا، اسے اللہ کا شکرادا کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

"من لم يشكر الناس" علامہ خطابی نے اس کے دو معنی بیان کئے ہیں:

(۱)......جس آدمی کا مزاج لوگوں کی ناشکری کا بن چکا ہو، ضرور اس کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی پائی جاتی ہے۔

(۲)......اللہ تعالیٰ بندے کا شکر اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ بندہ لوگوں کا شکرادا نہ کرے، گویا اللہ کا شکر بندوں کا شکر کرنے پر موقوف ہے۔ الكوكب الدري، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في الشكر ۳/۵۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ صَنَائِعِ الْمَعْرُوْفِ

یہ باب ان روایات کے بیان میں ہے جو نیکی کے کاموں کے بارے میں ہیں

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَبَسُّمُکَ فِيْ وَجْهِ أَخِيْکَ لَکَ صَدَقَةٌ، وَأَمْرُکَ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهْيُکَ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَةٌ، وَإِرْشَادُکَ الرَّجُلَ فِيْ أَرْضِ الضَّلَالِ لَکَ صَدَقَةٌ، وَبَصَرُکَ لِلرَّجُلِ الرَّدِئِ الْبَصَرِ لَکَ صَدَقَةٌ، وَإِمَاطَتُکَ الْحَجَرَ وَالشَّوْکَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَکَ صَدَقَةٌ، وَإِفْرَاغُکَ مِنْ دَلْوِکَ فِيْ دَلْوِ أَخِيْکَ لَکَ صَدَقَةٌ.

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور تیرا اچھی بات کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، اور بھولی ہوئی جگہ میں کسی انسان کو راستہ بتانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور نابینے آدمی کی رہنمائی کرنا تیرے لئے صدقہ ہے، اور راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی ہٹانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور تیرا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا صدقہ ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: **صنائع:** صنیعۃ کی جمع ہے: کام۔ **المعروف:** بھلائی، احسان، نیکی۔ **تبسمک:** تیرا مسکرانا۔ **إرشادک:** تیرا راستہ بتانا، رہنمائی کرنا۔ **أرض الضلال:** بھولی ہوئی زمین اور جگہ۔ **الردی البصر:** نابینا آدمی۔ **إماطتک:** تیرا ہٹانا، صاف کرنا۔ **الشوک:** کانٹا۔ **إفراغک:** تیرا اُڈالنا۔

نیکی کے چند کام

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے سات کام ذکر کئے ہیں:

(۱)...... مسلمان بھائی سے مسکرا کر بات چیت اور ملاقات کرنا کہ اس سے اسکا دل خوش ہوتا ہے۔

(۲)...... نیکی کا حکم دینا، لفظ ''معروف'' میں ہر نیکی اور بھلائی داخل ہے۔

(۳)...... برائی اور اللہ کی نافرمانی سے روکنا، اور لفظ ''منکر'' میں تمام مفاسد، برائیاں اور گناہ آجاتے ہیں۔

(۴)......ایسی جگہ کہ جہاں راستہ کا بالکل علم نہ ہوسکتا ہو، وہاں کسی انسان کی رہنمائی کرنا۔

(۵)......کسی نابینا یا کمزور نظر والے آدمی کی رہنمائی کرنا۔

(٦)......ہر تکلیف دہ چیز پتھر، کانٹا اور ہڈی وغیرہ راستہ سے ہٹانا۔

(۷)......ضرورت کے وقت مسلمان بھائی کو پانی دینا، اور ہر اس چیز میں اسکا تعاون کرنا جس کی اسے ضرورت ہو۔

یہ معاشرتی زندگی کے چند روشن اصول ہیں جنہیں اپنا کر ایک مسلمان پرسکون زندگی گذار سکتا ہے وہ زندگی جس سے خالق ارض وسماء خوش ہو جائے، جو ایمانِ کامل کی علامت ہے، اس لئے ہر مسلمان کو ان اوصاف سے آراستہ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْمِنْحَةِ

یہ باب عطیہ (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ مَنَحَ مَنِيْحَةَ لَبَنٍ أَوْ وَرِقٍ، أَوْ هَدَى زُقَاقًا كَانَ لَهُ مِثْلُ عِتْقِ رَقَبَةٍ.

براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی کو (عاریت کے طور پر) دودھ والا جانور عطیہ دے یا چاندی کا عطیہ (یعنی رقم قرض) دے یا کسی کو راستہ بتادے تو اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہوگا۔

مشکل الفاظ کے معنی: -المنحة: (میم کی زیر اور نون کے سکون کے ساتھ) عطیہ، کسی دوست کو عارضی استعمال اور استفادہ کیلئے واپسی کی شرط کے ساتھ زمین، سواری یا جانور وغیرہ دینا۔ منیحة: اس دودھ والی اونٹنی یا بکری کو کہا جاتا ہے جو کسی دوست کو صرف استعمال کیلئے عاریت کے طور پر دی جاتی ہے۔

ابو عبید فرماتے ہیں کہ اہل عرب کے ہاں منیحہ دو معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے:

(ا)......کسی کو کوئی چیز مالک بنا کر دیدینا۔

(۲)......دودھ والے جانور اونٹنی یا بکری اسطرح کسی کو عاریت کے طور پر دیدینا کہ اتنے عرصہ کیلئے اسکی تمام چیزوں سے وہ فائدہ اٹھائے اور پھر مالک اسے واپس کرلے، منیحة ورق: چاندی کا عطیہ یعنی قرض دینا،ھدی :رہنمائی کرے، بتائے۔زقاقاً :راستہ، گلی، ج، ازقة۔فتح الباری، کتاب الھبة، باب فضل المنیحة ۳۰۵/۵۔

منیحہ کی فضیلت

اس حدیث میں ان امور کا ذکر ہے جن کے ذریعے آدمی دوسرے بھائی کو نفع پہونچاتا ہے، کسی کو کچھ عرصہ کیلئے دودھ والا جانور اونٹنی یا بکری عطیہ دینا تاکہ اس سے وہ استفادہ کرے اور پھر واپس کردے، یا کسی کو قرض دینا یا کوئی راستہ یا گلی کوچہ بتانا، یہ تمام امور اللہ کے نزدیک ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب کا ذریعہ ہیں، جسطرح کوئی شخص جب غلام آزاد کردے تو وہ گویا اپنے آپ کو جہنم سے بچالیتا ہے اسی طرح حدیث میں مذکورہ کاموں میں سے کوئی کام کرنے سے بھی آدمی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاسکتا ہے۔ تحفة الاحوذی،۶/۷۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ إِمَاطَةِ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ

یہ باب اس روایت کے بارے میں ہے جس میں راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کا ذکر ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِيْ فِيْ الطَّرِيْقِ إِذْ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ فَأَخَّرَهُ فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ.

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص راستے میں جارہا تھا، اچانک اس نے کانٹے دار شاخ پائی، اور اسے ہٹادیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکی قدر فرمائی اور اسکی مغفرت فرمادی۔

مشکل الفاظ کے معنی: -إمَاطة: ہٹانا، صاف کرنا۔الأذیٰ: تکلیف دہ چیز۔غصن شوک: کانٹے دار شاخ۔أخره: اس کو راستے سے ہٹادیا۔شکر الله: اللہ نے قدر فرمائی، کام کا اجروثواب دیا۔

راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کی فضیلت

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ راستہ میں جو بھی گندی اور تکلیف دہ چیز ہو، اسے ہٹادینا چاہئے، اس

عمل کو اللہ تعالیٰ اس قدر، قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اسکی بخشش فرما دیتے ہیں۔

"فشکر اللہ لہ" علامہ جزری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام "شکور" بھی ہے، جس کے معنی "قدر دان" کے ہیں، لہذا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندے کے تھوڑے سے نیک عمل کو بڑھاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسکی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۷۸۔

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْمَجَالِسَ بِالْأَمَانَةِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ مجالس (کی باتیں) امانت ہیں

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ.

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آدمی کوئی بات بیان کرے، پھر (اس دوران) وہ ادھر ادھر دیکھے تو یہ بات امانت ہے۔

مجلس کی باتیں امانت ہوتی ہیں

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک حدیث مرفوع کے الفاظ سے عنوان قائم کیا یعنی المجالس بالأمانة، اس روایت کو امام ابو داؤد نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی مجلس میں کوئی بات کرے تو وہ مجلس امانت ہے، لہذا اس میں زیر بحث گفتگو کو مجلس سے باہر پھیلانا نہیں چاہئے۔

"ثم التفت"، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں:

(۱)...... بات کرنے والا شخص گفتگو کے دوران ادھر ادھر دیکھ کر گفتگو کرے، تاکہ کوئی دوسرا شخص نہ سن سکے، یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ بات پوشیدہ رکھی جائے، ظاہر نہ کی جائے۔

(۲)...... یا التفات سے مراد یہ ہے کہ متکلم گفتگو کر کے دوسری طرف متوجہ ہو جائے یا اس مجلس سے اٹھ جائے تب بھی وہ بات امانت ہے، شرعی ضرورت کے بغیر اسکا اظہار کرنا جائز نہیں ہے۔

امام ترمذی کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تمام مجالس کی باتیں امانت ہوتی ہیں، متکلم خواہ ان باتوں کے پوشیدہ رکھنے کا کہے یا نہ کہے۔

بعض باتوں کو ظاہر کرنا واجب ہے

مجلس میں اگر ایسی بات ہوئی ہو جس کے چھپانے میں متکلم کا فائدہ ہے تو شرعاً وہ امانت ہے، اسکا اظہار جائز نہیں ہے، آجکل عموماً خاندانوں اور رشتہ داروں میں لڑائی جھگڑے اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ مجلس کی باتیں پھیلا دی جاتی ہیں، انہیں پوشیدہ نہیں رکھا جاتا، اسلئے اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے کہ اگر مجلس کی بات پوشیدہ رکھنے کے قابل ہے تو اسے پوشیدہ ہی رکھا جائے، تاہم اگر مجلس کی بات ایسی ہو جس کے ظاہر کرنے میں کوئی نقصان اور فتنہ نہ ہو یا اسکے اظہار سے دوسرے لوگوں کو فائدہ ہو تو ایسی صورت میں اسکا اظہار جائز ہے، اور اگر اس بات کے چھپانے میں کسی اور کا نقصان ہو تو پھر اسکا اظہار کرنا لازم ہو جاتا ہے، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجالس امانت ہوتی ہیں سوائے تین مجلسوں کے کہ ان کی باتوں کا اظہار کرنا ضروری ہوتا ہے، کسی کو ناحق مار دیا گیا ہو، کسی عورت کی عصمت دری کی گئی ہو یا کسی کا مال ناحق لیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں چونکہ دوسرے لوگوں کا نقصان ہے، اسلئے ان کا بتانا ضروری ہے۔
الکوکب الدری، ۵۵/۳، ۵۶۔ سنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث ۳۲۰/۲۔

"فھی امانة" یہ جملہ اسمیہ ہے، اس میں "ھی" ضمیر لفظ "حدیث" کیطرف لوٹ رہی ہے، جو اگرچہ مذکر ہے، لیکن ضمیر مؤنث، خبر یعنی امانة کی وجہ سے لائی گئی ہے، اور بعض نے کہا کہ "ھی" ضمیر "الکلمة" کیطرف لوٹ رہی ہے، جو کلام سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ تحفة الاحوذی، ۷۹/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السَّخَاءِ

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جن میں سخاوت (کی فضیلت) کا ذکر ہے

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّهُ لَيْسَ لِيْ مِنْ شَئٍ إِلَّا مَا أَدْخَلَ عَلَيَّ الزُّبَيْرُ، أَفَأُعْطِي؟ قَالَ نَعَمْ، لَا تُوْكِي فَيُوْكَى عَلَيْكَ. يَقُوْلُ :

لَاتُحْصِیْ فَیُحْصٰی عَلَیْکِ .

اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول: بیشک میرے پاس اس آمدن کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں، جو (میرے شوہر) زبیر بن عوام مجھے دیتے ہیں، تو کیا میں اس مال میں سے عطیہ (یعنی صدقہ) کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں (صدقہ کیا کرو) اسپر تو بندھن نہ لگا، ورنہ تجھ پر بندھن لگادی جائیگی،

(بعض راوی نے اسکی تفسیر کی ہے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تم گن کر نہ دو، ورنہ تمہیں بھی گن گن کر دیا جائیگا۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰهِ، قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ، بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ، بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ. وَالْجَاهِلُ السَّخِیُّ أَحَبُّ إِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ.

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سخی آدمی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے، جنت کے بھی قریب ہے، لوگوں کے بھی قریب ہے، اور جہنم سے دور ہے، اور بخیل آدمی اللہ سے دور، جنت سے دور، لوگوں سے دور، اور جہنم کے قریب ہوتا ہے، اور جاہل سخی اللہ کے نزدیک عبادت گذار بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ :- السخاء: (سین اور خاء پر زبر کے ساتھ) بغیر عوض کے کوئی چیز دینا۔ لیس لی من شیٔ: میرے پاس کوئی مال نہیں ہے۔ لا تُوکی: تم انہیں ڈوری سے نہ باندھو یعنی اپنے پاس ذخیرہ کر کے نہ رکھیں۔ یقول: یہ کسی راوی کا قول ہے، اسکی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف لوٹ رہی ہے۔

"لا تحصی فیحصی علیک" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسکے دو معنی بیان کئے ہیں:

(۱)......تنگدلی کے ساتھ گن گن کر نہ دو (اس سے برکت اٹھ جاتی ہے) ورنہ تمہیں بھی حساب سے اور گن گن

کردیا جائیگا۔

(۲)...... گن گن کر مال کو جمع اور ذخیرہ نہ کرو کہ اس سے خرچ ہی نہ کرے ورنہ تم پر بھی اللہ تعالیٰ کیطرف سے رزق کو بند کردیا جائیگا۔ فتح الباری، کتاب الزکاۃ، باب التحریض علی الصدقۃ ۳۸۳/۳

سخاوت کی فضیلت

ان احادیث سے اللہ کے راستے میں صدقہ دینے اور سخاوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، سخی انسان ہر جگہ سرخرو اور باعزت ہوتا ہے، جبکہ بخیل اللہ سے اور ہر چیز سے دور ہوتا ہے، اسلئے اپنی آمدن میں سے ایک حصہ ضرور اللہ کے راستے میں صدقہ کرنا چاہئے۔

نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوہر کے مال سے عورت کچھ صدقہ کرسکتی ہے، بشرطیکہ شوہر کی طرف سے اسے کسی نہ کسی طرح اجازت ہو، اسے کوئی اعتراض نہ ہو، لیکن اگر شوہر کیطرف سے بالکل اجازت نہ ہو اور وہ اس سے تنگ ہوتا ہو تو پھر شوہر کے مال سے خرچ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وہ معمولی مقدار جس سے عموماً کسی کو اعتراض نہیں ہوتا اسے اجازت کے بغیر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، ہاں اگر کوئی اتنا ہی کنجوس ہو جو اس سے بھی منع کرتا ہو تو ایسی صورت میں عورت کیلئے خرچ کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب الزکاۃ، باب أجر الخادم إذا تصدق ۳۸۶/۳

عورت کا اپنا ذاتی مال یہ چونکہ عورت کی ملکیت ہے، اس لئے اسے خرچ کرنے میں شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہے، اسکے بغیر بھی وہ خرچ کرسکتی ہے۔

اور فرمایا: وہ جاہل جو اگرچہ عالم تو نہیں، زیادہ ذکر و نوافل اگرچہ نہیں کرتا لیکن وسیع الظرفی کے ساتھ سخاوت کرتا ہے وہ اس عبادت گذار عالم سے بہتر ہے اور اللہ کے ہاں محبوب ہے جو اگرچہ عبادت تو خوب کرتا ہے لیکن خرچ نہیں کرتا، بخل سے کام لیتا ہے، اور بخل درحقیقت دنیا کی محبت کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جس آدمی کے دل میں دنیا کی محبت ہو وہ کوئی بھی غلطی کرسکتا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے، اسلئے آدمی یہ کوشش کرے کہ میرے اندر سخاوت کی صفت ہو، نہ کہ بخل کی، کیونکہ سخاوت کے ذریعہ وہ اللہ کے ہاں قرب حاصل کرسکتا ہے۔

اور بخیل اللہ کے ہاں مبغوض اور ناپسندیدہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے ذمے کے واجب اور فرض مالی حقوق ادا نہیں کرتا اور نفلی عبادت میں مصروف رہتا ہے، اور فرائض ادا نہیں کرتا، تو جو شخص فرائض و واجبات کو ادا کرتا ہو، زیادہ نفلی عبادات نہ کرتا ہو وہ اللہ کی نظر میں محبوب ہوتا ہے اس شخص سے جو فرائض ادا نہیں کرتا اور صرف نوافل اور نفلی عبادات میں مشغول رہتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا ۶/۸۱۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْبُخْلِ

یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جو بخل (کی مذمت) کے بارے میں ہیں

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِيْ مُؤْمِنٍ: الْبُخْلُ، وَسُوْءُ الْخُلُقِ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن (کامل) میں دو عادتیں بخل اور بداخلاقی جمع نہیں ہوسکتیں۔

عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا بَخِيْلٌ وَلَا مَنَّانٌ.

ابوبکر صدیق سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دھوکے باز، بخیل اور احسان جتلانے والا جنت میں (پہلی دفعہ ابتداء میں ہی) داخل نہیں ہوگا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عصيه وسلم: اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ، وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ.

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن بھولا بھالا اور شریف ہوتا ہے، اور گنہگار دھوکا دینے والا اور کمینہ ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- سوء الخلق: (خاء اور لام پر پیش کے ساتھ) بری عادت، گندی خصلت۔ خَبٌّ: (خاء پر زبر اور باء مشدد) دھوکا دینے والا، فسادی۔ مَنّان: احسان جتلانے والا۔ غِرٌّ: (غین کے نیچے زیر) سیدھا سادہ، بھولا بھالا، جسے آسانی سے دھوکا دیا جاسکے، دوسروں سے حسن ظن رکھنے

والا۔ کریم: شریف، مہربان۔ الفاجر: کافر، فاسق، گنہگار۔ لئیم: کمینہ، گھٹیا آدمی

بخل ایک بری خصلت

مذکورہ احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخل کی مذمت بیان فرمائی ہے، مسلمانوں کو اس سے بچنے کا حکم دیا، کیونکہ بخل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی ناپسند ہے، پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کے اندر دو خصلتیں یعنی بخل اور بد اخلاقی جمع نہیں ہوسکتیں، اس جمع نہ ہونے سے کیا مراد ہے شارحین حدیث نے اس کے مختلف مطلب بیان فرمائے ہیں، ان کی تفصیل:

(۱)...... پہلا مطلب یہ ہے کہ کسی مؤمن میں ان دو خصلتوں کا پایا جانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ یہ بری صفات ہیں، جو ایمان کے مناسب نہیں ہیں۔

(۲)...... علامہ تورپشتی نے لا تجتمعان کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ کسی مسلمان میں یہ دو خصلتیں اس انداز سے کامل طریقے سے پائی جائیں کہ کبھی بھی اس سے جدا نہ ہوں، اور وہ انہیں پسند بھی کرتا ہو، اس طرح کا اجتماع نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ایمان کے منافی ہے، لیکن اگر یہ عادتیں کبھی کبھار پائی جائیں یا تھوڑی مقدار میں پائی جائیں، اور وہ مؤمن ان کی وجہ سے اپنے نفس کو ملامت کرتا رہتا ہے اور وہ ان کی وجہ سے شرمندہ بھی ہوتا ہے، تو یہ ایمان کے منافی نہیں ہے۔

(۳)...... اس میں کمال ایمان کی نفی ہے کیونکہ اس کا ایمان اگر کامل ہوتا تو یہ خصلتیں اس میں نہ پائی جاتیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسکا ایمان ناقص ہے، لہذا اسے اپنا ایمان کامل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تحفۃ الاحوذی، ۸۳/۶۔

(۴)...... حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس کے اخلاق اور مال سے دوسروں کو فائدہ پہونچے، اور بخیل آدمی کے بخل کی وجہ سے اور بد اخلاق اور بد مزاج انسان کی بد اخلاقی و بدمزاجی کی وجہ سے دوسروں کو راحت کیا، تکلیف پہونچتی ہے، اسلئے مؤمن کو چاہئے کہ وہ ان عادتوں سے اپنے ایمان کو بچائے، تا کہ اسے ایمان کا وہ درجہ حاصل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔ الکوکب الدری، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۵۶/۳۔

دوسری حدیث میں تین چیزیں دھوکہ دینا، بخل کرنا اور احسان جتلانا ذکر کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہونگے، کیونکہ یہ چیزیں بسا اوقات انسان کو کفر تک پہونچا دیتی ہیں، لہذا دیگر کافروں کی طرح یہ بھی جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے، اس معنی کے لحاظ سے جنت میں داخل نہ ہونا حقیقی معنی کے اعتبار سے ہوگا۔

اور اگر "خَبٌّ، و بخیل و منان" سے مؤمن مراد ہو تو پھر جنت میں دخول اولی یعنی ابتداء جنت میں داخلے کی نفی مراد ہوگی، اسلئے کہ ایمان کی وجہ سے بالآخر وہ جنت میں ضرور داخل ہونگے، لیکن ان بری صفات سے پاک وصاف ہوکر خواہ دنیا میں توبہ واستغفار کے ذریعہ، یا آخرت میں کچھ عرصہ سزا بھگت کر یا اللہ تعالیٰ کے معاف کردینے کی وجہ سے، اس کے بعد انہیں جنت میں داخل کیا جائیگا۔

تیسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کامل ایمان والا شخص سیدھا سادہ اور شریف ہوتا ہے، زمانے کی فتنہ پردازیوں اور شرارتوں کو نہیں سمجھتا، مکر وفریب اور دھوکہ بازی سے کوسوں دور ہوتا ہے، جبکہ فاجر وفاسق شخص ہر وقت لوگوں کو دھوکہ دینے کے درپے رہتا ہے، اس کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے، اسکی نقل وحرکت اور گفتگو سے خست ودناءت اور کمینہ پن ٹپکتا ہے، جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے۔

ایک اشکال اور اسکے جوابات

حدیث میں ہے کہ "مومن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاسکتا" اور فرمایا: "مؤمن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے" ان احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن خوب تجربہ کار اور زمانے کے نشیب وفراز سے آشنا ہوتا ہے، اسے اللہ کی طرف سے ایسا نور فراست اور بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی سے دھوکہ نہیں کھاتا، اور المؤمن غر کریم سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن اسقدر سادہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے دھوکا کھاجاتا ہے، بظاہر ان روایات میں تعارض ہے؟

شارحین حدیث نے اس کے تین جواب دیئے ہیں:

(۱)......المؤمن غر کریم...... سے مراد یہ ہے کہ مؤمن لوگوں سے حسن ظن رکھتا ہے، کسی کے ساتھ مکرو فریب اور دھوکے سے پیش نہیں آتا، لیکن احتیاط کے باوجود کبھی محض حسن ظن کی وجہ سے دھوکہ کھاجاتا ہے، وہ

بھی ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار، اسلئے روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۲)......المؤمن غر کریم کا تعلق دنیوی امور سے ہے اور " لا یلدغ " اخروی امور کے بارے میں ہے اس لئے دونوں میں تعارض نہیں۔

(۳)......بعض نے کہا کہ لا یلدغ، نفی نہیں، بلکہ نہی اور انشاء ہے، گویا حکماً منع کیا جارہا ہے، اور المؤمن غر کریم میں خبر ہے۔ الکوکب الدری، ۵۷/۳

خصلتان...... کی ترکیب نحوی

اس حدیث کی تین ترکیبیں کی گئی ہیں:

(۱)......"خصلتان" موصوف "لا تجتمعان فی مؤمن" صفت، موصوف صفت ملکر خبر مقدم، اور البخل و سوء الخلق، مبتدا مؤخر۔

(۲)......ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ خصلتان لا تجتمعان فی مؤمن، موصوف صفت ملکر مبتدا، اور البخل و سوء الخلق "خبر۔

(۳)......حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "خصلتان" مبدل منہ، البخل و سوء الخلق بدل، مبتدا، اور "لا تجتمعان فی مؤمن" خبر ہے، تحفۃ الاحوذی، ۸۳/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ النَّفَقَةِ عَلَى الْأَهْلِ

یہ باب اہل وعیال پر خرچ کرنیکی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْأَنْصَارِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰى أَهْلِهٖ صَدَقَةٌ.

ابومسعود انصاری سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا صدقہ ہے۔

عَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَفْضَلُ الدِّيْنَارِ دِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ الرَّجُلُ عَلٰى عِيَالِهٖ، وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ الرَّجُلُ عَلٰى دَابَّتِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَدِيْنَارٌ يُنْفِقُهُ الرَّجُلُ

عَلٰى أَصْحَابِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

ثوبان سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل دینار وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے، اور وہ دینار بہتر ہے جسے آدمی اس چوپائے پر خرچ کرے جو اللہ کی راہ میں استعمال ہو رہا ہو، اور وہ دینار بہتر ہے جسے انسان اپنے ان ساتھیوں پر خرچ کرے جو اللہ کے راستے میں (اس کے ساتھ) ہوں۔

قَالَ اَبُوْقِلَابَةَ : بَدَأَ بِالْعِيَالِ ثُمَّ قَالَ : وَاَىُّ رَجُلٍ اَعْظَمُ أَجْراً مِنْ رَجُلٍ يُنْفِقُ عَلٰى عِيَالٍ لَهُ صِغَارٍ يُعِفُّهُمُ اللّٰهُ بِهٖ وَيُغْنِيْهِمُ اللّٰهُ بِهٖ .

ابو قلابہ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیال سے ابتدا فرمائی، اور فرمایا: اجر وثواب میں کونسا آدمی اس شخص سے بڑھ سکتا ہے جو اپنے چھوٹے عیال پر خرچ کرے، اللہ تعالیٰ اسکی وجہ سے انکو سوال سے محفوظ فرماتے ہیں، اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انہیں بے نیاز کر دیتے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی: -یعفّھم: (یاء پر پیش اور عین کے نیچے زیر) اللہ تعالیٰ ان کو پاکدامن بنائیں گے اور سوال سے محفوظ رکھیں گے۔ یغنیھم: اللہ تعالیٰ ان کو بے نیاز کردے گا۔ غنی بنادے گا۔

اہل وعیال پر خرچ کرنیکی فضیلت

ان احادیث میں اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنیکی فضیلت کا ذکر ہے، یہ خرچہ خواہ واجب ہو یا نفلی، اللہ کی رضا کی نیت سے خرچ کیا تو اجر وثواب بھی ملے گا، نیت کے بغیر گو ثواب نہیں ملے گا لیکن اسکے ذمہ کا فرض ادا ہو جائیگا۔

"اھل" سے کیا مراد ہے، اس میں دو احتمال ہیں:

(۱)...... بیوی اور دیگر رشتہ دار، معنی یہ ہونگیں کہ اپنے اہل خانہ بیوی، اولاد اور دیگر عزیز واقارب پر خرچ کرنا باعث اجر وثواب ہے۔

(۲)...... یا اس سے اہلیہ اور اولاد مراد ہے، کیونکہ ان کا خرچہ شوہر کے ذمہ واجب ہوتا ہے، دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرنا بدرجہ اولیٰ باعث ثواب ہوگا، اسلئے کہ جب واجب خرچے پر اجر وثواب ہے تو غیر واجب

اور نفلی خرچ پر یقیناً اجر وثواب ہوگا۔

اہل وعیال وغیرہ پر خرچ کرنے کو ''صدقہ'' سے تعبیر کیا ہے، اس طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ جسطرح نفلی خرچ کرنے پر اجر وثواب ملتا ہے، ایسے ہی ذمے میں واجب اور فرض خرچہ کرنے پر بھی اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، لہذا واجب صدقے کو نفلی صدقات سے مقدم رکھنا چاہئے۔

دوسری حدیث میں تین قسم کے لوگوں پر خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ اسکا فائدہ دوسرے لوگوں تک پہونچتا ہے، اسلئے ان پر خرچ کرنا بہت خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، بہتر یہی ہے کہ اسی ترتیب سے خرچ کیا جائے جسطرح حدیث میں ذکر کیا گیا ہے، پہلے اہل وعیال پر، پھر راہ خدا میں مشغول جانور پر، پھر راہ خدا کے دوستوں پر، جمہور علماء کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس ترتیب کا لحاظ اگر ہو سکے تو بہتر ہے، شرعاً واجب اور ضروری نہیں ہے،

حدیث کے آخر میں ابوقلابہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وعیال پر خرچ کرنیکا ذکر کرکے فرمایا کہ اپنے چھوٹوں پر خرچ کرنا سب سے افضل ہے، کہ وہ اس سے سوال کی ذلت سے بچ جاتے ہیں اور استغناء کی زندگی گذارتے ہیں، اس سے درحقیقت اہل وعیال پر خرچ کرنیکی فضیلت اور اہمیت کو ذکر کرنا مقصود ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۸۶،۸۵/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الضِّيَافَةِ وَغَايَةُ الضِّيَافَةِ إِلٰى كَمْ هِيَ

یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جن میں مہمان نوازی اور اسکی مدت کا ذکر ہے کہ وہ کتنی ہے۔

عَنْ أَبِيْ شُرَيْحِ الْعَدَوِيِّ أَنَّهُ قَالَ: أَبْصَرَتْ عَيْنَايَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَسَمِعَتْهُ أُذُنَايَ حِيْنَ تَكَلَّمَ بِهِ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ. قَالُوْا وَمَا جَائِزَتُهُ؟ قَالَ: يَوْمٌ وَلَيْلَةٌ قَالَ: وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَمَا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَسْكُتْ.

ابوشریح عدوی کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور

میرے کانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو سنا جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلام فرمارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوشخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے یعنی اسکی خوب بتکلف خاطر مدارات کرے، صحابہ نے پوچھا کہ ''جائزہ'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہمان کے ساتھ تکلف واحسان کرنیکا زمانہ ایک دن اور ایک رات ہے، اور فرمایا: ضیافت اور مہمان داری کرنے کا زمانہ تین دن ہیں، اور اس (یعنی تین دن) کے بعد جو دیا جائیگا وہ ہدیہ وخیرات ہوگا، اور جوشخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ خیر کی بات کہے یا خاموش رہے۔

عَنْ أَبِیْ شُرَیْحِ الْکَعْبِیِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: الضِّیَافَةُ ثَلاثَةُ أَیَّامٍ، وَجَائِزَتُهُ یَوْمٌ وَلَیْلَةٌ، وَمَا أَنْفَقَ عَلَیْهِ بَعْدَ ذٰلِکَ فَهُوَ صَدَقَةٌ، وَلَا یَحِلُّ لَهُ أَنْ یَثْوِیَ عِنْدَهُ حَتّٰی یُحْرِجَهُ.

ابوشریح کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضیافت ومہمانداری کا زمانہ تین دن ہے، اور مہمان کا جائزہ یعنی اسکی بتکلف خدمت واحسان کرنے کا زمانہ ایک دن اور ایک رات ہے، اور میزبان اسکے بعد جو خرچ کریگا تو وہ ہدیہ وصدقہ ہوگا، اور مہمان کیلئے حلال (یعنی جائز) نہیں کہ (تین دن کے بعد) وہ میزبان کے پاس اس کی مرضی کے بغیر اتنا ٹھہرے یہاں تک کہ وہ اسے تنگ کردے۔

وَمَعْنٰی قَوْلِہٖ: ''لَایَثْوِیْ عِنْدَهُ'' یَعْنِی الضَّیْفَ لایُقِیْمُ عِنْدَهُ حَتّٰی یَشْتَدَّ عَلٰی صَاحِبِ الْمَنْزِلِ، وَالْحَرَجُ هُوَ الضِّیْقُ، اِنَّمَا قَوْلُهُ '' حَتّٰی یُحْرِجَهُ '' یَقُوْلُ: حَتّٰی یُضَیِّقَ عَلَیْهِ.

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ '' لا یثوی عندہ'' کے معنی یہ ہیں کہ مہمان میزبان کے پاس اسقدر نہ ٹھہرے کہ صاحب خانہ مشکل میں پڑ جائے، اور ''حـرج'' کے معنی ''تنگی'' کے

ہیں، اور "حتی یحرجه" کے معنی ہیں: یہاں تک کہ وہ اسے تنگ کردے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- غاية الضيافة: مہمان نوازی کی مدت اور انتہاء۔ جائزة: تحفہ، ہدیہ، بتکلف خاطر مدارات کرنا۔ لا يحل: حلال اور جائز نہیں۔ أن يثوی: کہ وہ ٹھہرے۔ حتی یحرجه: یہاں تک مہمان میزبان کو تنگ کردے۔

مہمان نوازی کی شرعی حیثیت

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مہمان کا حق ہے کہ اسکا ادب واحترام اور اکرام کیا جائے، اس کے ساتھ خندہ پیشانی اور حسن اخلاق سے گفتگو وغیرہ کی جائے، اور اپنی حیثیت اور استطاعت کے بقدر ضرور اسکی خدمت کی جائے، جمہور علماء کے نزدیک مہمان نوازی اور ضیافت کرنا سنت مؤکدہ اور مستحب عمل ہے جبکہ امام لیث رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقا واجب ہے

اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک صرف گاؤں والوں پر واجب ہے، اہل شہر پر نہیں، کیونکہ گاؤں میں کھانے وغیرہ کا عام انتظام نہیں ہوتا، جبکہ شہر میں ہوٹل وغیرہ ہوتے ہیں، جن سے کھانے وغیرہ کا بندوبست آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جو حضرات وجوب کے قائل ہیں، وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

(۱)......حدیث باب جس میں ہے: **وَمَا أَنْفَقَ عَلَيْهِ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ** جو تین دن کے بعد میزبان پر خرچ کرے گا تو وہ تبرع واحسان اور صدقہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے تین دن کی ضیافت صدقہ نہیں، بلکہ واجب ہے۔

(۲)......**لَيْلَةُ الضَّيْفِ حَقٌّ وَاجِبٌ**، مہمان نوازی کرنا ایک حق واجب ہے۔

(۳)......**فَخُذُوا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِیْ يَنْبَغِیْ لَهُمْ**، ان سے اپنی ضرورت کے بقدر ضیافت کا حق لے لو، یعنی اگر کسی علاقے کے لوگ مہمان نوازی نہ کریں تو جبراً ان سے مہمان نوازی کا حق وصول کر سکتے ہو، اس سے معلوم ہوا کہ مہمان نوازی کرنا واجب ہے جب ہی تو زبردستی کرنیکا اختیار دیا گیا ہے۔

جمہور پہلی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تین دن مہمان کی خدمت اور مہمان نوازی کرنا ایک اخلاقی حق ہے، جسے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دینا چاہئے، اسے اپنے اوپر بوجھ اور مصیبت نہیں سمجھنا چاہئے، اور تین دن کے بعد اگر خدمت کی جائے تو یہ محض تبرع، احسان اور صدقہ ہوگا، تین دن کے بعد ضیافت کو ''صدقہ'' سے تعبیر کر کے دراصل تین دن ضیافت کی اہمیت کو بتانا پیش نظر ہے اسکا وجوب بتانا مراد نہیں ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الأطعمة، باب الضیافة ۶۹/۸

دوسری حدیث میں حق واجب سے صرف تاکید مقصود ہے، عربی میں ''واجب'' کے معنی ثابت کے ہیں، اس سے اصطلاحی وجوب ثابت کرنا مراد نہیں ہے۔

تیسری حدیث کے مختلف مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱)...... یہ حالت اضطرار پر محمول ہے، کہ جو مہمان اضطراری حالت تک پہونچ جائے، اور لوگ اسکی ضیافت نہ کریں تو ایسی صورت میں وہ زبردستی اپنی جان بچانے کیلئے کچھ لے سکتا ہے۔

(۲)...... یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا، اس وقت غریب لوگوں کا خیال رکھنا واجب تھا، پھر جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہو گیا، فقراء اور محتاج لوگوں کی حالت بہتر ہوگئی تو پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

(۳)...... یہ ان مخصوص اہل ذمہ لوگوں کے بارے میں کہا گیا جن سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگر مسلمانوں کا لشکر وہاں سے گذرے گا تو وہ ضیافت کریں گے، معاہدہ پر عمل چونکہ واجب تھا اس لئے ان سے زبردستی حق ضیافت وصول کرنے کی اجازت دی گئی۔

(۴)...... جبراً حق ضیافت لینے کی اجازت اسلامی حکومت کے ان افراد کے لئے ہے جنہیں زکوۃ وصدقات وصول کرنے کیلئے ملک کے اطراف میں بھیجا جائے، ان کے پاس اپنا کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہ ہو، اور اس بستی والے ان کی ضیافت اور خدمت نہ کریں، تو ایسے میں ان کیلئے بقدر ضرورت اس بستی والوں سے جبراً حق ضیافت وصول کرنا جائز ہے۔

(۵)...... بعض یہ کہتے ہیں کہ ''خذوا'' کے معنی یہاں ''لینے'' کے نہیں ہیں، بلکہ زبان سے انہیں رسوا کرنا اور برا بھلا کہنا مراد ہے، کہ لوگوں کے درمیان ان کی اس بے رُخی کو بیان کیا جائے تا کہ لوگوں کو اس عمل کی قباحت

معلوم ہو جائے، اور پھر کوئی اس طرح کا رویہ اختیار نہ کرے۔ فتح الباری، کتاب المظالم، باب قصاص المظلوم اذا وجد مال ظالمۃ ۱۳۶/۵۔تکملۃ فتح الملہم، کتاب اللقطۃ، باب الضیافۃ ونحوھا ۶۲۹/۲۔

مہمان نوازی کی مدت

''مہمان نوازی کی مدت تین دن ہے، اس کے بعد جو کچھ دیا جائے وہ صدقہ ہے۔''

علامہ خطابی اور دوسرے کئی محدثین نے اسکی تشریح یوں کی ہے کہ کل مدت ضیافت تین دن ہے، ان میں پہلے دن تو خوب اکرام کیا جائے، کھانے وغیرہ میں ذرا تکلف کیا جائے، دوسرے اور تیسرے دن معمول کے مطابق خدمت کی جائے،..........ان تین دنوں کے بعد جو کچھ دیا جائے وہ ''حق ضیافت'' نہیں بلکہ محض تبرع اور صدقہ ہے۔ عمدۃ القاری، کتاب الادب، ۱۷۵/۲۲

ابن بطال رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضیافت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے دن تو اسکی خدمت میں ہدیہ اور تحفہ پیش کیا جائے، دوسرے دن معمول سے ہٹ کر کھانے میں تکلف کیا جائے، اور تیسرے دن جو بھی موجود ہو، اسے حاضر کیا جائے، اس کے بعد میزبان کو اختیار ہے چاہے خدمت کرے یا نہیں، جسطرح صدقہ نافلہ میں اختیار ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ خطابی اور ابن بطال دونوں کی تشریح کے مطابق کل مدت ضیافت تین دن ہے، ابوعبید اور دوسرے بعض محدثین نے ''یوم الجائزہ'' کو الگ شمار کیا ہے، ان کے نزدیک مہمان نوازی کے تین دن اور ایک دن ''جائزہ'' ہے، اسطرح کل چار دن بن جاتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح کتاب الاطعمۃ، باب الضیافۃ ۱۷/۸۔ اسکی تائید مسلم شریف کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، اس میں ہے :الضيافة ثلاثة أيام و جائزته يوم و ليلة ۔ الصحیح لمسلم، کتاب اللقطۃ، باب الضیافۃ ونحوھا ۸۰/۲

(مہمان نوازی کی مدت تین دن ہے اور ایک دن ''جائزہ'' کا ہے) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''جائزہ'' ضیافت کے بعد ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ مہمان کی تین دن تک ضیافت کی جائے کہ یہ اسکا حق ہے، اور اس کے بعد جس دن وہ جانے لگے تو اسکی خدمت میں کچھ ہدیہ اور تحفہ بھی پیش کیا جائے، اور اگلی منزل تک جانے کیلئے اسے زادِراہ بھی دیا جائے، اس کو ''جِیزہ'' کہتے ہیں، ایک دوسری حدیث میں اسکی

طرف اشارہ کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "جائزہ" کے ایک اور معنی بیان کئے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر مہمان ٹھہرے تو اسکی ضیافت تین دن ہے، اور نہ ٹھہرے تو اس کیلئے "جائزہ" ہے، گویا ان کے نزدیک "ضیافت" کا تعلق تین دن رہنے والے مہمان سے ہے، اور "جائزہ" کا تعلق اس مہمان سے ہے جو قیام کا ارادہ نہ رکھتا ہو بلکہ کچھ دیر کیلئے آیا ہو۔ فتح الباری، کتاب الأدب، باب اکرام الضیف، ۶۵۳/۱۰۔

ولا یحل له ان یثوی عنده حتی یحرجه

کسی مہمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ میزبان کے پاس اس قدر ٹھہرے کہ اسے حرج، تنگی اور تکلیف میں مبتلا کردے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: حتی یؤثمه (یہاں تک کہ اسے گناہ میں مبتلا کردے) امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قدر نہ ٹھہرے کہ میزبان کو گناہ میں مبتلا کردے، کیونکہ زیادہ رہنے کی وجہ سے ممکن ہے میزبان اسکی غیبت شروع کردے یا اسے کوئی تکلیف دیدے یا کوئی بدگمانی کرنے لگے تو اس طرح میزبان گناہ میں مبتلا ہو جائیگا، شرح مسلم للنووی، کتاب اللقطة، باب الضیافة ونحوها ۸۰/۲۔

لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب مہمان کے زیادہ رہنے کی وجہ سے میزبان تنگی میں مبتلا ہو، اگر مہمان کے رہنے سے میزبان کو کوئی حرج اور تکلیف نہیں ہو رہی تو ایسی صورت میں مہمان کے ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فتح الباری، ۶۵۴/۱۰۔

"فلیکرم ضیفه جائزته" اس میں "ضیفه"، مفعول بہ ہے، اور "جائزة" بدل اشتمال ہے، اور بعض نے کہا کہ یہ منصوب بنزع الخافض ہے، اصل عبارت یوں ہے: "فلیکرم ضیفه بجائزته"۔ تکملة فتح الملهم، کتاب اللقطة، باب الضیافة ونحوها ۶۲۸/۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السَّعْيِ عَلَى الأَرْمَلَةِ وَالیَتِیْمِ

یہ باب اس روایت پر مشتمل ہے جو بیوہ، مسکین اور یتیم کیلئے کوشش کرنے کی فضیلت کے بارے میں ہے۔

عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَیْمٍ یَرْفَعُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: السَّاعِيْ عَلَى الأَرْمَلَةِ

وَالْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، أَوْ كَالَّذِيْ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ.

صفوان بن سلیم مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوہ اور مسکین کیلئے کوشش کرنے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والے شخص کیطرح ہے یا اس شخص کیطرح ہے جو دن میں روزہ اور رات میں قیام (یعنی عبادت) کرتا ہے۔

مشکل الفاظ: -السعی: کوشش، محنت۔ الساعی: کوشش کرنیوالا، کمانیوالا۔ ارملة: (ہمزے پر زبر، را ساکن اور میم پر زبر) محتاج، غریب، وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو، خواہ اس نے شادی کی ہو یا نہ کی ہو، رنڈا مرد، بیوہ عورت ج اَرَامِل و اَرَامِلة۔ مسکین: (۱)......وہ شخص جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ (۲)......وہ شخص جس کے پاس تھوڑا سا ہو۔ (۳)......ضعیف، فقیر۔

بیوہ اور یتیم کی پرورش اور کفالت کی فضیلت

اس حدیث میں اس شخص کی فضیلت کا ذکر ہے جو کسی مسکین بیوہ، کسی تنگدست اور یتیم کی کفالت اور ان کا خرچہ برداشت کرتا ہے، ان کیلئے کمانے کی مشقت برداشت کرتا ہے، شب وروز اسی کوشش اور تگ ودو میں رہتا ہے، تاکہ کما کر ان بے کسوں کی خدمت کر سکے، یہ اس مجاہد کی طرح ہے جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہے، جس سے بیت المال میں مال غنیمت جمع ہوتا ہے، اور اس سے تمام مستحق لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ یہ اس شخص کیطرح ہے جو دن کو روزہ اور رات میں کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتا ہے، جو اجر وثواب اور اللہ کی رحمت اسے حاصل ہوتی ہے، یہ سارا اسے بھی حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ ان تنگدستوں کی پرورش کرتا ہے، اور ان کی ضروریات مہیا کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔ تحفة الاحوذی، ۸۸/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ طَلَاقَةِ الْوَجْهِ وَحُسْنِ الْبِشْرِ

یہ باب خندہ روئی اور شگفتگی کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ وَإِنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ وَأَنْ تُفْرِغَ مِنْ دَلْوِكَ

فِيْ إِنَاءِ أَخِيْكَ.

جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نیکی صدقہ ہے (یعنی باعث اجر وثواب ہے) اور بیشک یہ بھی نیکی ہے کہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملاقات کرے، اور یہ بھی نیکی ہے کہ تو اپنے ڈول (یا برتن) سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالدے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- طلاقة الوجه: خندہ روئی، بشاشت، شگفتگی۔ البشر: (باء کے نیچے زیر اور شین کے سکون کے ساتھ) خندہ روئی، خوشی۔ معروف: بھلائی، احسان، عطیہ، نیکی، نیک کام، ہر وہ عمل جسکی اچھائی وعمدگی شریعت اور عقل دونوں سے معلوم ہو۔ وجه طلق: ہنس مکھ اور کھلا ہوا چہرہ۔

خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے

ہر قسم کی بھلائی اور نیکی صدقہ ہے یعنی باعث اجر وثواب ہے، اپنے مسلمان بھائی سے مسکرا کر ملنا اور ضرورت کے وقت ڈول سے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا یہ بھی معروف اور نیکی ہے، اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر ہو سکے مخلوق خدا کو اپنے سے فائدہ پہونچانے کی کوشش کرنی چاہئے، یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۹۰/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الصِّدْقِ وَالْكَذِبِ

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جن میں سچ اور جھوٹ کا ذکر ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا.

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر سچائی لازم ہے، کیونکہ سچائی نیکی کا راستہ دکھاتی ہے، اور بیشک نیکی جنت تک پہونچا دیتی ہے، اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور اسے طلب کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو (اللہ کے نزدیک) صدیق لکھا جاتا ہے، اور تم جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ گناہ تک پہونچا دیتا ہے، اور بیشک گناہ جہنم تک لے جاتا ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور اسی کے درپے رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں وہ کذاب یعنی جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوسَى، قَالَ: قُلْتُ لِعَبْدِ الرَّحِيمِ بْنِ هَارُوْنَ الْغَسَّانِيِّ: حَدَّثَكُمْ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ اَبِيْ رَوَّادٍ، عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهِ قال يحيى: فَأَقَرَّ بِهِ عَبْدُ الرَّحِيمِ بْنُ هَارُوْنَ وَقَالَ: نَعَمْ.

یحیی بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحیم بن ہارون غسانی سے کہا: کیا تم سے عبد العزیز بن رواد نے، نافع سے، انہوں نے ابن عمر سے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس سے اس بدبو کی وجہ سے ایک میل دور ہو جاتا ہے جس کو وہ (جھوٹ بول کر) لایا ہے۔ یحیی کہتے ہیں کہ عبدالرحیم بن ہارون نے اسکا اقرار کیا اور فرمایا: جی ہاں (بیان کی ہے)

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- صدق: وہ خبر یا بات جو واقع کے مطابق ہو۔ علیکم بالصدق: تم پر سچائی لازم ہے۔ البر: (باء کے نیچے زیر) نیکی، احسان، اطاعت۔ یتحری الصدق: صدق کو طلب کرتا رہتا ہے، اسے کے درپے رہتا ہے۔ صدیقاً: انتہائی سچا، اپنے قول وفعل کا پکا، ہمیشہ تصدیق کرنے والا۔ الفجور: (فاء پر پیش کے ساتھ) فسق، گناہ، عمل بد۔ الکذب: وہ بات یا خبر جو واقع کے مطابق نہ ہو۔ کذابا: انتہائی جھوٹا، بہت جھوٹا۔ تباعد: دور ہو جاتے ہیں۔ نتن: (نون پر زبر اور تاء کے سکون کے ساتھ) بدبو، تعفن، سڑانگ

جھوٹ ایک بری خصلت

ان احادیث میں جھوٹ کی مذمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ جھوٹ خود گناہ ہے، گناہ کی طرف لے جاتا ہے، اور گناہ بالاخر آدمی کو جہنم میں پہونچا دیتا ہے، اور جو شخص جھوٹ بولنے کا خوگر ہو جائے تو پھر اکثر جھوٹ ہی بولتا ہے، یوں وہ اللہ کے ہاں ''کذاب'' یعنی انتہائی جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

جھوٹ کی ایک ایسی بدبو اور سڑانگ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک میل کی مسافت کے بقدر فرشتہ دور ہو جاتا ہے۔ لئے آدمی کو جھوٹ بولنے سے ہر موقع پر احتراز کرنا چاہئے، اور سچ کو اپنانا چاہئے، آج مسلم معاشرے میں دیگر برائیوں کیطرح یہ گناہ بھی ''عام وبا'' کیطرح پھیل چکا ہے، چھوٹا بڑا، نیک و بد، عالم و جاہل .... سب میں کسی نہ کسی طرح یہ گناہ ضرور پایا جاتا ہے الا ماشاء اللہ کچھ لوگ ضرور ایسے ہونگے جو سچ بولنے کا اہتمام کرتے ہونگے، لیکن مسلمانوں کی کثیر تعداد بہرحال جھوٹ کے گناہ میں ملوث ہے، اور جو شخص جتنا زیادہ جھوٹ بولتا ہے اس وجہ سے مال و دولت کماتا ہے، اسے ہمارے معاشرے میں ہوشیار اور چالاک سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ شاطر ہے، اللہ کے ہاں ناپسندیدہ شخص ہے، اس لئے اپنی زبان کو غلط استعمال کر کے اپنے مقاصد نکالنا، دوسروں کے بارے میں غلط بیانی کرنا، خلاف حقیقت کو حقیقت بنا کر پیش کرنا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ ہے، قول و فعل میں سچائی کے زیور سے آراستہ رہنا ایمان کے کامل ہونے کی علامات میں سے ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

بعض خاص حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت احادیث میں منقول ہے، جسکی تفصیل **باب ما جاء فی اصلاح ذات البین** میں گذر چکی ہے۔

سچائی ایک اچھی عادت

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں آداب زندگی سے متعلق احادیث بیان کی ہیں، جن میں سچائی کی فضیلت اور جھوٹ کی مذمت کا ذکر ہے، امام غزالی فرماتے ہیں کہ صدق کا لفظ چھ معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے:

(۱) **صدق فی القول**: بات چیت میں سچائی

(۲)......صدق في النية والإرادة: نیت میں صداقت

(۳)......صدق في العزم: ارادے اور عزم میں سچائی

(۴)......صدق في الوفاء بالعزم: اس عزم کو پورا کرنے میں سچائی

(۵)......صدق في العمل: عمل میں سچائی

(۶)......صدق في تحقيق مقامات الدين كلها: دین کے تمام مقامات اور امور میں سچائی۔ جس شخص میں صدق کے یہ تمام درجات پائے جائیں وہ "صدیق" کہلاتا ہے، پھر جس میں جتنا صدق ہوگا، اسی اعتبار سے اسے صادق اور سچا کہا جائیگا۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب البر والصلۃ، باب قبح الکذب ۴۲۱/۵۔

حتى يكتب صديقا.................كذابا،

اس کتابت سے مراد یہ ہے کہ اس کیلئے صدیق یا کذاب ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیا جاتا ہے، جس کا اظہار فرشتوں کے سامنے بھی کر دیا جاتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں بھی یہ بات ڈالدی جاتی ہے کہ یہ صدیق ہے یا کذاب جیسا کہ لوگوں کے دلوں میں کسی کیلئے ہر دلعزیزی یا نفرت ڈالی جاتی ہے، اس کتابت سے تقدیر لکھنا مراد نہیں، کیونکہ وہ تو پہلے لکھی جا چکی ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی مزید تفصیل یوں آئی ہے: آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے، تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اسکا دل پورا سیاہ ہو جاتا ہے، اور اللہ کے ہاں وہ جھوٹ بولنے والوں میں لکھدیا جاتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں سچائی کی تعریف اور جھوٹ کی مذمت ذکر کرکے اس بات کی ترغیب دی جارہی ہے کہ ہر موقع پر سچ بولنے کا اہتمام اور غلط بیانی اور جھوٹ سے گریز کیا جائے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب قول اللہ تعالیٰ: يا يها الذين امنوا اتقوا الله و كونوا مع الصادقين...... ۶۲۳/۱۰

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْفُحْشِ

یہ باب ان روایات میں ہے جن میں فحش بات یا فعل (کی مذمت) کا ذکر ہے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا كَانَ الْفُحْشُ فِيْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ، وَمَا

كَانَ الْحَيَاءُ فِيْ شَيْئٍ إِلَّا زَانَهُ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فحش اور برائی کسی بھی چیز میں ہو، اسے وہ عیب دار بنا دیتی ہے، اور شرم وحیا، کسی بھی چیز میں ہو، وہ اسے مزین بنا دیتا ہے۔

عَنْ عَبْدَ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خِيَارُكُمْ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا. وَلَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم فَاحِشاً وَلاَ مُتَفَحِّشاً.

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزاجاو اخلاقاً نہ فحش گو تھے اور نہ ہی آپ قصداً فحش گوئی کرتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی: - **فحش:** (فاء پر پیش کے ساتھ) برا، برا قول وفعل، بدکاری، بے حیائی کی بات۔ **شانہ:** یہ لفظ "شین" سے ہے: عیب دار بنایا۔ **زانہ:** اس کو مزین کر دیتا ہے۔ **فاحشا:** بے حیائی کی بات کرنیوالا، غیر سنجیدہ بات کرنے والا۔ **متفحشا:** قصد وارادے سے بتکلف بے حیائی کی بات کہنا۔ **خیار:** خیر کی جمع ہے: سب سے بہتر۔ **أحاسن:** احسن کی جمع ہے: سب سے افضل۔ **أخلاق:** "خُلُق" کی جمع ہے: عادت، خصلت۔

فحش گوئی ایک عیب

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ فحش گوئی اور گندی بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، انسان کی حیثیت اس سے گر جاتی ہے، شرم وحیا ایک زینت ہے، خوشبو ہے، جس سے دوسرے لوگ مستفید ہوتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عمدہ اخلاق کے حامل تھے، آپ نے طبعاً ومزاجاً بھی کبھی بے حیائی کی بات نہیں کی، اور نہ بتکلف قصد وارادے سے کوئی گندی بات کی، ہر وقت پیاری پیاری باتیں ارشاد فرماتے، جن سے دوسروں کے قلوب منور ہوتے اور جگمگا جاتے، یہی طریقہ ہر مسلمان کو اپنانا چاہئے، اپنی زبان کو ان چیزوں سے پاک صاف

رکھا جائے، اور اخلاق حسنہ کا دامن مضبوطی سے تھامنا چاہئے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان محترم ومعزز ہو جائے اور وہ فضیلت حاصل کرلے جو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو عطا فرماتے ہیں۔ تحفۃ الاحوذی، باب ھذا ۹۳/۶۱۔

بعض مسلمان اپنی گفتگو میں انتہائی گندی باتیں کرتے ہیں، ننگی گالیاں نکالتے ہیں، دوسروں کو بے حیا کرتے ہیں، اور انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں، اپنے محرم رشتہ داروں کا بھی انہیں کوئی لحاظ نہیں ہوتا، یہ طرز زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں ہے، اسے ترک کرنا چاہئے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ اللَّعْنَةِ

یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جن میں لعنت (کرنے کی مذمت) کا ذکر ہے۔

عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَـلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِهٖ وَلَا بِالنَّارِ.

سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم آپس میں ایک دوسرے پر لعنت نہ کیا کرو، نہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے ساتھ، نہ اس کے غضب سے، اور نہ جہنم سے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ.

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کامل ایمان والا نہ طعنہ دینے والا ہوتا ہے، نہ لعنت کرنے والا، نہ فحش گو اور نہ بیہودہ بکنے والا ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ رَجُلًا لَعَنَ الرِّيْحَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: لَا تَلْعَنِ الرِّيْحَ فَإِنَّهَا مَأْمُوْرَةٌ، وَإِنَّهُ مَنْ لَعَنَ شَيْئاً لَيْسَ لَهُ بِأَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا پر لعنت بھیجی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہوا کو لعنت طعن نہ کرو اسلئے کہ اسے تو

(مختلف انداز سے، آہستہ یا تیز وتند چلنے کا) حکم دیا گیا ہے، اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجے جو اس لعنت کی مستحق نہ ہو تو وہ اسی کیطرف لوٹ کر آجاتی ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- لعنة الله: اللہ تعالیٰ کا کسی کو اسکی بدعملی کی وجہ سے خیر سے دور اور محروم کرنا۔ لا تلاعنوا: تم ایک دوسرے پر لعنت نہ کرو۔ الطعان: یہ مبالغہ کا صیغہ ہے: بہت زیادہ عیب لگانے والا، طنز کا عادی۔ اللعان: بہت زیادہ لعنت کرنے والا۔ البذی: بدکلام، بداخلاق، بیہودہ بولنے والا۔

لعن طعن سے اجتناب کا حکم

ان احادیث میں اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے خلاف بد دعا کر کے یوں کہے کہ تجھ پہ اللہ کی لعنت ہو، تجھ پر اللہ کا غضب ہو، یا تیرا ٹھکانا جہنم ہے، .... کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کرنے کی بد دعا کرنا جائز نہیں ہے، ہاں عمومی انداز سے کسی پر لعنت کی جائے تو یہ جائز ہے مثلاً یہ کہا جائے کہ کافروں پر، بدعتیوں پر، فاسقوں پر، رشوت خوروں پر، سود کھانے والوں پر...... یا یوں کہے کہ اللہ کی لعنت ہو یہود ونصاری پر، آتش پرستوں پر، روافض پر........... ایسے ہی مردہ کافر جن پر شریعت میں لعنت کا ذکر آیا ہے ان کا نام لیکر لعنت کرنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً ابو جہل اور فرعون وغیرہ، مگر جو شخص زندہ ہو مسلمان ہو یا کافر، نیک وصالح ہو یا بدکار اسے متعین کر کے ملعون کہنا یا لعنۃ اللہ کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کافر مرنے سے پہلے کفر سے توبہ کرلے، وہ فاسق و بدکار موت سے پہلے اپنے گناہ سے تائب ہو جائے، یوں وہ اللہ کی رحمت کے قریب ہو جائیگا، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔

باب کی دوسری حدیث میں کمالِ ایمان کا ذکر ہے کہ جس مسلمان کا ایمان کامل ہوگا وہ دوسروں کی عیب جوئی بھی نہیں کریگا، نہ لعن طعن کرے گا، نہ بے حیائی اور بیہودہ گفتگو کرے گا، لہذا اگر کسی میں یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اسکا ایمان ناقص ہے، کامل نہیں ہے، اسے ان گناہوں سے تہ دل سے توبہ کرنی چاہئے، تاکہ کمال ایمان کی فضیلت اسے حاصل ہو جائے۔

"ولا الفاحش ولا البذی" بعض نے کہا کہ ان دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، یہ عطف تفسیری

ہے، جبکہ بعض نے یہ کہا ہے کہ "فاحش" سے فحش فی العمل اور "البذی" سے فحش فی القول مراد ہے، گویا عمل وکردار میں برائی ہوتو وہ فاحش ہے اور زبان درازی اور گفتگو میں بیہودہ پن ہوتو یہ البذی ہے۔

لفظ "لعان" مبالغہ کا صیغہ ذکر کر کے اسطرف اشارہ کردیا کہ تھوڑی بہت لعن طعن سے کوئی مؤمن نہیں بچ سکتا، چنانچہ ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ مذمت اور لعنت کرنے کی برائی اس شخص کیلئے نہیں ہے جس سے ایک یا دو مرتبہ لعنت کا صدور ہو جائے، بلکہ اس کے بارے میں ہے جو کثرت سے لعن طعن کرتا ہو۔

تیسری حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسطرح انسانوں اور حیوانات پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح جمادات پتھر، ہوا.......... پر بھی لعنت کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں لعنت کے قابل نہیں ہیں، انہیں اگر لعنت کی جائے تو وہ اسی کی طرف لوٹ کر آجاتی ہے اسلئے مستحق کے علاوہ کسی پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب حفظ اللسان ۵۶۴/۸ و ۵۹۱۰۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۹۵/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَعْلِيْمِ النَّسَبِ

یہ باب نسب سیکھنے اور جاننے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : تَعَلَّمُوْا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِهٖ أَرْحَامَكُمْ، فَإِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْأَهْلِ، مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ، مَنْسَأَةٌ فِي الْأَثَرِ.

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے نسبی رشتوں کو اس قدر ضرور جانا کرو جس سے تم اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرسکو کیونکہ صلہ رحمی اھل میں یعنی رشتہ داروں میں محبت کا ذریعہ، مال و دولت میں فراوانی کا سبب، اور موت میں تاخیر یعنی درازی عمر کا باعث ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- تعلّموا: تم سیکھو، جان لو۔ مثراۃ: (میم پر زبر اور ثاء کے سکون کے ساتھ) مال میں کثرت

اوراضافہ کاذریعہ۔مَنسأۃ:(میم پرزبر،نون کے سکون،سین اورہمزہ پرزبر کے ساتھ):تاخیر کاسبب۔الأثر :(ہمزے اور ثاء پرزبر کے ساتھ):موت،نشانات قدم،منساۃ فی الاثر سے عمر میں اضافہ اور برکت مراد ہے۔

نسب سیکھنے اور یادرکھنے کا حکم

اس حدیث میں اس چیز کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہرانسان کواپنا نسب ضروریادرکھنا چاہیئے تا کہ وہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کر سکے،نسب سے اسے معلوم ہوگا کہ یہ میرا چچا ہے یہ ماموں ہے، یہ والد کے رشتہ دار ہیں، یا والدہ کا خاندانی سلسلہ ہے،.......... جب اسے علم ہوگا کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں تو ان کے ساتھ صلہ رحمی، پیارومحبت اور حسن سلوک کرے گا، ہرممکن طریقے سے ان کا تعاون کرے گا،ان کی خوشی میں شریک ہوگا اورغم کے موقع پرانہیں تسلی دے گا............

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صلہ رحمی کی تین فضیلتیں ذکر فرمائی ہیں:

(۱)......صلہ رحمی رشتہ داروں میں پیارومحبت کا باعث ہوتی ہے۔

(۲)......اس سے مال ودولت میں اضافہ اورفراوانی ہوتی ہے۔

(۳)......اس سے موت میں تاخیر یعنی عمر دراز ہوتی ہے۔

ایک تعارض اوراس کے جوابات

اس حدیث میں اورقرآن مجید کی آیت میں بظاہر تعارض ہے،قرآن مجید میں ہے" **اذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعة و لا یستقدمون**"(جب ان کی میعاد یعنی عمر ختم ہوگی تو اس وقت وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر میں کوئی تبدیلی اور ردوبدل نہیں ہو سکتی،جبکہ حدیث باب میں ہے کہ صلہ رحمی کرنے میں عمر اوررزق دونوں میں اضافہ ہوجا تا ہے۔

ایسے ہی ایک اور حدیث میں ہے: **جف القلم بما ھو کائن** (تقدیر کا قلم سب کچھ لکھ کرخشک یعنی فارغ ہو چکا ہے)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرانسان کی تقدیر عمر، رزق......سب کچھ لکھی جا چکی ہے،اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی،جبکہ سورۃ رعد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **یمحو اللہ ما یشأ و یثبت و عندہ ام**

الکتاب ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے مناسب سمجھیں برقرار رکھتے ہیں،اور جسے چاہتے ہیں مٹادیتے ہیں،انہی کے پاس ام الکتاب ہے،بظاہر اس حدیث اور آیت میں تعارض سا ہے،حاصل یہ کہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ سب کچھ عمر،رزق،............وغیرہ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے،ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی جبکہ حدیث باب وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کرنے سے عمر اور رزق میں اضافہ ہوسکتا ہے اس تعارض کا کیا حل ہے؟

شارحین حدیث نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

(۱)......اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ آیت کریمہ(اذا جاء......)اور حدیث جف القلم میں "تقدیر مُبْرَم" کا ذکر ہے،اور حدیث باب اور یمحو اللہ ما یشا......میں تقدیر معلق کا،لہذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں، تقدیر کی دو قسمیں ہیں:تقدیر مبرم،تقدیر معلق۔

تقدیر مبرم:اس سے اللہ تعالیٰ کا وہ علم ازلی مراد ہے جو ہر چیز کا اللہ کو حاصل ہے،اس میں ردوبدل،زیادت و نقصان اور کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔

تقدیر معلّق:- اس سے وہ تحریر و کتابت مراد ہے جو کسی کے بارے میں لوح محفوظ میں معلق انداز سے لکھی جاتی ہے یا کسی فرشتے کو کسی امر پر مقرر کیا جاتا ہے کہ اس نے اگر فلاں کام کیا تو یہ ہوگا،نہ کیا تو یہ ہوگا،اس میں تقدیر کا حکم قطعی اور حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ اس میں دعا یا کسی اور سبب سے تغیر و تبدل ہوسکتا ہے۔ تکملۃ فتح الملھم،کتاب القدر،باب بیان ان الآجال والارزاق......۵/۵۰۶۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی اور تقدیر مبرم کے اعتبار سے جو رزق اور عمر مقرر ہے،اس میں کسی قسم کی ترمیم اور اضافہ نہیں ہوسکتا،چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت:اذا جاء اجلھم...........اور حدیث :جف القلم بما ھو کائن میں یہی معنیٰ مراد ہیں،البتہ لوح محفوظ میں فرشتوں کے سامنے ایک تقدیر معلق ہوتی ہے،مثلاً لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال ہوگی،لیکن اگر اس نے صلہ رحمی کی تو چالیس سال بڑھا دیے جائیں گے،اب اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ یہ شخص صلہ رحمی کرے گا یا نہیں،اسے ساٹھ سال زندہ رہنا ہے یا سو سال،تاہم فرشتوں کو نہیں معلوم،ان کے سامنے تو یہی بات ہے کہ اس نے اگر صلہ رحمی کی تو اس کی عمر میں

چالیس سال کا اضافہ ہو جائیگا یہ اضافہ تقدیر معلق میں فرشتوں کے سامنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہے، اللہ تعالیٰ کے علم ازلی اور تقدیر مبرم کے اعتبار سے نہیں۔ چنانچہ حدیثِ باب اور ''یمحو اللہ مایشآء'' میں اسی تقدیر معلق کا ذکر ہے۔　　فتح الباری، کتاب الادب، باب من بسط لہ فی الرزق بصلۃ الرحم ۱۰/۵۰۹۔

(۲)......دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ اسکی عمر میں اضافہ سے مراد مدت عمر میں اضافہ نہیں، بلکہ اسی عمر میں نیکیوں طاعات اور آثار صالحہ میں اضافہ مراد ہے، اسکی نیک اولاد ہوگی جو اس کیلئے دعائیں کرے گی، ایسے ہی رزق میں اضافہ سے مراد عدد اور تعداد میں اضافہ مراد نہیں بلکہ اس مال میں برکت مراد ہے کہ بڑے بڑے کام تھوڑے سے پیسے میں اسطرح حل ہو جاتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، چھوٹی عمر کے باوجود اتنے بڑے کام کر لیتا ہے جتنے کہ لمبی عمر والے کرتے ہیں۔　　فتح الباری، ۱۰/۵۰۹، ۵۱۰۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب البر والصلہ ۸/۶۵۵۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم ۵/۳۴۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ دَعْوَةِ الأَخِ لأَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ

یہ باب اس حدیث میں ہے جس میں ایک بھائی کا اپنے بھائی کیلئے پس پشت دعا کرنے کا ذکر ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا دَعْوَةٌ أَسْرَعَ إِجَابَةً مِنْ دَعْوَةِ غَائِبٍ لِغَائِبٍ.

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی دعا اس دعا سے زیادہ جلدی قبول نہیں ہوتی جو ایک غائب کی دوسرے غائب کیلئے ہو۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- ظهر الغيب: پس پشت، غیر موجودگی، اس میں لفظ ''ظہر'' زائد ہے محض تاکید کیلئے ہے۔ دعوۃ: دعا۔ أسرع: زیادہ جلدی۔

غائب کی دعا

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی غائب یا غیر حاضر شخص کیلئے دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی دعا کو

بہت جلد قبول فرماتا ہے، چونکہ حاضر شخص کیلئے دعا کرنے میں ریاکاری اور دکھلاوے کا احتمال ہوتا ہے، مگر غائب کیلئے دعا کرنے میں اخلاص اور صدق نیت ہوتی ہے، اس میں دکھلاوے کا احتمال نہیں ہوتا اس بناء پر یہ دعا جلد قبول ہوتی ہے، اس لئے غائب دوستوں کیلئے دعا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۹۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الشَّتْمِ

یہ باب گالی گلوچ اور برا بھلا کہنے کی مذمت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مِنْهُمَا مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ.

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے والے دو شخص جو کچھ کہیں (یعنی گالیاں دیں) تو ان کی ساری گالم گلوچ کا گناہ اس شخص پر ہوگا جس نے (گالیاں دینے میں) پہل کی ہے، جب تک کہ مظلوم تجاوز نہ کرے۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ يَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ.

مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم (مسلمان) مُردوں کو برا بھلا مت کہو کہ اس سے تم (ان کے) زندہ رشتہ داروں کو تکلیف پہونچاتے ہو۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ.

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے اور اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا کفر ہے (یعنی کفر تک پہونچا دینے والا عمل ہے)

قَالَ زُبَيْدٌ: قُلْتُ لِأَبِيْ وَائِلٍ: أَنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ.

زبید راوی کہتے ہیں کہ میں نے ابو وائل سے کہا کہ کیا آپ نے واقعی یہ روایت عبداللہ بن مسعودؓ سے سنی ہے، انہوں نے کہا: جی ہاں (سنی ہے)

مشکل الفاظ کی تشریح:- **الشتم:** برا بھلا کہنا، گالی گلوچ دینا۔ **المستبان:** آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے والے دوشخص۔ **البادی:** ابتدا اور پہل کرنے والا۔ **ما لم یعتد:** جب تک مظلوم حد سے تجاوز نہ کرے۔ **لا تسبوا:** تم برا بھلامت کہو۔ **فتؤذوا:** کہ تم تکلیف اور ایذاء پہونچاتے ہو۔ **الاموات:** میت کی جمع ہے: مردے۔ **الاحیاء:** حی کی جمع ہے: زندہ۔ **سباب:** برا بھلا کہنا، گالی گلوچ دینا۔ **فِسق:** شرعی حدود سے تجاوز یعنی معصیت، نافرمانی، گناہ

گالی دینے کا گناہ پہل کرنے والے پر ہے

اگر دوشخص بحث مباحثہ میں ایک دوسرے کو گالیاں دیں، برا بھلا کہیں، بدکلامی اور سخت گفتگو کریں تو اسکا گناہ ان میں سے اس شخص پر ہوگا جس نے گالی دینے کی ابتداء کی، اسے اپنی گالی کا گناہ تو ہوگا ہی، دوسرے شخص کی گالی کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائیگا، کیونکہ اس نے گالی دینے کی ابتدا کر کے گویا دوسرے شخص پر ظلم کیا ہے، یہ ظالم ہے اور دوسرا مظلوم، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب مظلوم آدمی جواب میں زیادتی نہ کرے، اگر مظلوم حد سے تجاوز کر گیا کہ اسکی گالیاں ظالم کی گالیوں سے بھی بڑھ گئیں، یا ابتدا کرنے والے نے جو ایذاء پہونچائی تھی اس کے جواب میں دوسرے شخص نے اس سے بھی زیادہ تکلیف پہونچادی، تو ایسی صورت میں ابتدا کرنے والے کی بجائے دوسرے پر زیادہ گناہ ہوگا۔　تکملة فتح الملھم، کتاب البر والصلة، باب النھی عن السباب ۳۹۶/۵۔

مسلم اموات کو برا بھلا نہ کہا جائے۔

اس حدیث میں ''اموات'' سے مسلم مردے مراد ہیں، کیونکہ ترمذی کی　ایک اور روایت میں ہے: ''تم اپنے مردوں کی خوبیاں ذکر کیا کرو، اور ان کی برائیوں کا ذکر نہ کرو'' اس سے معلوم ہوا کہ مردے اگر کافر ہوں، تو ان کو برا بھلا کہنا جائز ہے، بشرطیکہ اس سب وشتم سے اس مردہ کافر کے کسی مسلمان رشتہ دار کو تکلیف نہ ہو، اگر تکلیف ہوتی ہو تو پھر جائز نہیں، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردہ کفار ومشرکین کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے، کیونکہ اس سے ان کے مسلمان رشتہ داروں کو دکھ

پہونچتا تھا، مردہ کفار کو برا بھلا کہنا گو کہ شرعاً جائز ہے، لیکن چونکہ اس میں بہر حال وقت کا ضیاع ہے کوئی فائدہ بھی نہیں، اگر مردہ کفار کے ذکر بد میں کوئی شرعی وجہ نہ ہو تو ان کی برائی سے اجتناب ہی بہتر ہے، ہاں کوئی شرعی وجہ ہو تو پھر انہیں برا بھلا کہنے میں کوئی حرج نہیں تاہم مسلم اموات کی برائی کرنا، انہیں سب وشتم کرنا جائز نہیں ہے، ان کی صرف خوبیاں اور اچھے امور کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے برائیوں کا نہیں، بلکہ علامہ ابن بطال فرماتے ہیں کہ مسلم اموات کو اگر برا بھلا کہا گیا تو یہ غیبت میں داخل ہے، جس کا ازالہ بھی ممکن نہیں، اس لئے اس غیبت سے بہر حال اجتناب لازم اور ضروری ہے۔

فتح الباری، کتاب الجنائز، باب ما ینھی من سب الأموات ۳/۳۳۰، ۳۳۱۔

سب وشتم فسق ہے

کسی مسلمان کو گالی دینا اور لعن طعن کرنا ممنوع ہے، حدیث باب میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور گناہ ہے، اور اس کے ساتھ جنگ وجدال اور لڑائی کرنا (موجب) کفر ہے۔ اس ''کفر'' سے کیا مراد ہے کیونکہ قتال کرنے سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا، اس میں دو احتمال ہیں:

(۱)......اس سے یا تو کفران نعمت اور ناشکری مراد ہے کہ مسلمان کی شان کے مناسب نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے لڑائی کرے کیونکہ یہ گناہ بسا اوقات آدمی کو کفر تک پہونچا دیتا ہے اس گناہ کی شناعت وقباحت اور زیادہ گھناؤنے پن کو بیان کرنے کیلئے زجر اور توبیخ کے طور پر اسے ''کفر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) یا اس سے کفر حقیقی مراد ہے کہ جو شخص مسلمان کے ساتھ محض اسلام کی وجہ سے جنگ وجدال اور لڑائی کو حلال اور جائز سمجھتا ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج اور واقعی کافر ہو جاتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان ۸/۵۶۱۔

کسی کو کافر یا فاسق کہنے کا حکم

ایک شخص نے دوسرے کو فاسق یا کافر کہا، اور جس کو کہا ہے وہ حقیقت میں فاسق یا کافر ہے تو ایسی صورت میں کہنے والے کی نیت کو دیکھا جائیگا، اگر اس نے خیر خواہی کے جذبے سے یا لوگوں کو اسکی حالت سے

باخبر کرنے کیلئے یہ جملہ کہا ہے تو جائز ہے، اور اگر اس کا مقصد اس شخص پر محض طعنہ زنی اور بلا وجہ اسکے فسق یا کفر کی تشہیر ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اسلام نے برائیوں کے اچھالنے کا نہیں، ستر اور چھپانے کا حکم دیا ہے،

لیکن جس شخص کو فاسق یا کافر کہا، اگر وہ حقیقت میں فاسق یا کافر نہیں تو بخاری کی روایت میں ہے کہ ایسے میں وہ فسق یا کفر اس الزام لگانے والے کیطرف لوٹ آتا ہے، اس الزام کے لوٹ آنے کے مختلف مطلب بیان کیئے گئے ہیں:

(۱)......اس کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ وہ خود کافر ہو جائیگا، اسپر شبہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنے سے آدمی گنہگار تو ضرور ہوتا ہے لیکن کافر نہیں ہوتا، اس لئے اسکا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کو گالی دینا حلال اور جائز سمجھتا ہے، وہ کافر ہو جاتا ہے، اور اس کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

(۲)......اس سے زجر و توبیخ اور ڈرانا دھمکانا مقصود ہے، معنی حقیقی مراد نہیں۔

(۳)......اس جملے کا وبال الزام لگانے والے پر آئیگا، یعنی جس شخص کو کافر کہا گیا، وہ اگر واقعتاً کافر ہے، پھر تو کہنے والا سچا ہے، اور جس کے متعلق کہا گیا وہ اس کا مستحق ہے، لیکن اگر وہ کافر نہیں تو کہنے والے پر اس جملے کا وبال اور گناہ آئیگا، اس مطلب کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن ۱۰/۵۷۱۔

سباب کو فسق سے اور قتال کو کفر سے کیوں تعبیر کیا

سباب المسلم فسوق وقتاله کفر: مسلمان کو برا بھلا کہنا اور اس سے جنگ وقتال کرنا فسق ہے، اس سے لڑائی کرنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا، ہاں اگر حلال سمجھ کر کرے تو کافر ہو جاتا ہے، تو پھر سباب مسلم کو "فسق" سے اور قتال کو "کفر" سے کیوں تعبیر فرمایا؟

اسکی وجہ یہ ہے کہ قتال، سباب کے مقابلے میں بڑا گناہ ہے، اسکی برائی دلوں میں اتارنے کیلئے زجر کے طور پر اسے "کفر" سے تعبیر کیا ہے، یا اس وجہ سے کہ مسلمان سے لڑائی کرنا کافروں کا عمل ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کا، اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان، دوسرے مسلمان سے لڑائی کرتا ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کا عمل اور اخلاق کافروں کے زیادہ مشابہ ہے، اس لئے قتال کو "کفر" کے لفظ سے ذکر کیا ہے تاکہ مسلمان آپس

میں لڑائی سے ضرور اجتناب کریں۔ الکوکب الدری، ۳/۶۰

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ قَوْلِ الْمَعْرُوْفِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں اچھی باتوں اور نیک امور کا ذکر ہے

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ فِيْ الْجَنَّةِ غُرَفًا تُرَى ظُهُوْرُهَا مِنْ بُطُوْنِهَا، وَبُطُوْنُهَا مِنْ ظُهُوْرِهَا، فَقَامَ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: لِمَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: لِمَنْ أَطَابَ الْكَلَامَ، وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَأَدَامَ الصِّيَامَ، وَصَلَّى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ.

حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک جنت میں کچھ ایسے بالا خانے ہیں، جن کے باہر کے حصے اندر سے، اور اندر کے حصے باہر سے نظر آتے ہیں، اتنے میں ایک اعرابی کھڑے ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول یہ بالا خانے کس کیلئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس شخص کیلئے ہیں جو عمدہ اور شیریں کلام کرے، کھانا کھلائے، ہمیشہ (یعنی اکثر نفلی) روزے رکھے، اور رات میں نماز (تہجد) پڑھے جس وقت لوگ سو رہے ہوں۔

مشکل الفاظ کے معنی:- **قول المعروف**: نیکی کی بات، بھلی بات۔ **غرفا**: (غین پر پیش اور را پر زبر کے ساتھ) غرفۃ کی جمع ہے: بالا خانے۔ **ظھور**: "ظھر" کی جمع ہے: ظاہری حصہ۔ **أطاب الکلام**: عمدہ اور شیریں کلام کرے، جس سے دوسروں کا دل خوش ہو۔ **ادام الصیام**: دائما یعنی کثرت سے نفلی روزے رکھے۔ **نیام**: "نائم" کی جمع ہے: سویا ہوا آدمی۔

نیکی کے چند کام

حدیث باب میں نیکی کے چند امور ذکر کئے گئے ہیں، جن کو اگر آدمی بجالائے تو جنت میں اس کے عالیشان محلات ہونگے، جو اس قدر صاف وشفاف ہونگے کہ ان کا باہر اندر سے اور اندر باہر سے دکھائی دے

گا، وہ کام یہ ہیں:

(۱)...... عمدہ، نرم اور پیارے انداز سے گفتگو کرنا جس سے دوسرے شخص کا دل باغ باغ ہو جائے، جو آپکے اخلاق وکردار کا گرویدہ اور دلدادہ ہو جائے۔

(۲)...... اہل وعیال، غرباء ومساکین، مہمان اور دوستوں پر خرچ کرنا اور بخل سے کام نہ لینا۔

(۳)...... فرض روزوں کے بعد کثرت سے نفلی روزے رکھتا ہو، یہ نہ ہو کہ نفلی روزے بالکل ہی نہ رکھے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے ہر مہینے میں کم از کم تین روزے رکھنا مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت: **اولائک یجزون الغرفة بما صبروا** میں اسی کا ذکر فرمایا ہے، اس میں صبر سے مراد روزے ہیں۔

(۴)...... رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز تہجد پڑھنا، جس وقت تمام لوگ سو رہے ہوں، یا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل ہوں، اس وقت کی عبادت چونکہ ریاء ونمود سے پاک اور محض اخلاص کی بناء پر ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاماً**. (اور جو راتوں کو اپنے رب کے سامنے سجدہ اور قیام یعنی نماز میں لگے رہتے ہیں)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ نرم کلامی، سخاوت کا برتاؤ، نفلی روزے اور رات میں عبادت کرنا یہ سب وہ نیک اعمال ہیں جن کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جنت کے بالا خانوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۰۱۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ فَضْلِ الْمَمْلُوْكِ الصَّالِحِ

یہ باب نیک غلام کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِىْ هُرَيْـرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: نِعِمَ مَا لِأَحَدِهِمْ أَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ وَيُؤَدِّيَ حَقَّ سَيِّدِهٖ. يَعْنِي الْمَمْلُوْكَ، وَقَالَ كَعْبٌ: صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان میں سے ایک کیلئے کیا ہی خوب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، اور اپنے آقا کا حق پورا ادا کرے، بعض راوی کہتے ہیں کہ اس (یعنی ''احد'') سے غلام مراد ہے، کعب احبار کہتے

ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول نے سچ کہا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ثَلاثَةٌ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ، أُرَاهُ قَالَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: عَبْدٌ أَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ، وَرَجُلٌ أَمَّ قَوْمًا وَهُمْ بِهِ رَاضُوْنَ، وَرَجُلٌ يُنَادِي بِالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ.

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی مشک کے ٹیلوں پر ہونگے، زاذان راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ابن عمر نے فرمایا: قیامت کے دن (مشک کے ٹیلوں پر بیٹھے ہونگے): ایک وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق اور اپنے آقاوٴں کا حق ادا کیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی قوم کی امامت کی اور وہ قوم اس سے خوش رہی اور تیسرا وہ آدمی جو پانچوں نمازوں کیلئے ہر دن رات میں اذان دیتا رہا ہو۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- **نعم ما:** یہ "ما" "شی" کے معنی میں ہے: **نعم شیئا:** بہت ہی اچھی ہے وہ چیز، کیا خوب ہے۔ **کثبان:** (کاف پر پیش اور ثاء کے سکون کے ساتھ) کثیب کی جمع ہے: ٹیلے۔ **مسک:** (میم کی زیر اور سین کے سکون کے ساتھ) مشک، ہرن کے نافہ سے نکلنے والا خوشبودار مادہ۔ **موالی:** مولی کی جمع ہے: مالک، آقا، آزاد کرنے والا۔

نیک غلام کی فضیلت

وہ غلام جو محنت ومشقت کر کے اپنے مولی کے حقوق ادا کرتا ہے، اسکی خدمت کرتا ہے، اور ساتھ ہی اسلام کے فرائض وواجبات جو اسپر فرض کئے گئے ہیں، انہیں بھی بجالاتا ہے، تو وہ ایک بہترین غلام اور نیک مسلمان ہے۔

باب کی دوسری حدیث میں تین آدمیوں کا ذکر ہے جو قیامت کے دن بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ مشک کے ٹیلوں پر بیٹھے ہونگے، وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا رہا اور اپنے دنیوی آقاوٴں کے حقوق میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی، وہ امام مسجد جو مسلمانوں کو نمازیں پڑھاتا رہا اور اکثر لوگ اس سے خوش

بھی تھے، اور تیسرا وہ مؤذن جو اخلاص کے ساتھ پانچوں نمازوں کی اذان دیتا رہا اگرچہ وہ اسپر تنخواہ لیتا رہا ہو۔

رجل أم قوماً وهم به راضون.

اس سے وہ نیک وصالح امام مراد ہے جو شریعت کا پیروکار اور سنت کے مطابق زندگی گذارتا ہو، لوگوں کی صحیح دینی رہنمائی کرتا ہو، لیکن اگر کسی امام سے اکثر لوگ اسکی جہالت وہٹ دھرمی، اور برے چال چلن کی وجہ سے نالاں ہوں، تو ایسے امام کے بارے میں احادیث میں وعید آئی ہے، ہاں اگر بغیر کسی شرعی وجہ کے بعض لوگ امام کے خلاف باتیں کرتے ہوں، جبکہ وہ خرابیاں اس امام میں نہ پائی جاتی ہوں، تو پھر وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۰۲،۱۰۳۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلاۃ، باب فضل الاذان ۲/۳۶۱۔

ورجل ینادی............ اس سے اذان دینے والے مسلمان کی کس قدر عظیم فضیلت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ اللہ کی حمد وثناء اور بڑائی کا اعلان کرتا ہے، لیکن آج مسلم معاشرہ جو مغربی تہذیب وتمدن کی تقلید میں غرق ہو چکا ہے، کے نزدیک اذان دینا، العیاذ باللہ۔ ایک گھٹیا پیشہ شمار کیا جاتا ہے، ان کے ہاں مؤذن معاشرے کا ناکارہ انسان ہوتا ہے جو کسی اور میدان میں نہیں چل سکتا تو اس طرف آجاتا ہے یہ انتہائی غلط طرز فکر ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے۔

نعم ما لاحدهم ان يطيع الله...... کی ترکیب نحوی

"نعم" فعل مدح ہے، اس میں "هو" ضمیر فاعل ممیّز ہے اور "ما" بمعنی "شی" ہے، جو کہ تمیز ہے، ممیّز تمیز مل کر فاعل ہوا، "لاحدهم" یہ "نعم" سے متعلق ہے، جملہ فعلیہ ہو کر خبر مقدم، اور "ان يطيع" بتاویل مفرد ہو کر مخصوص بالمدح، مبتدا مؤخر، مبتدا اپنی خبر مقدم سے ملکر جملہ اسمیہ ہوا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مُعَاشَرَةِ النَّاسِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے (کے طریقے) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ، وَأَتْبِعِ

السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ.

ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور برائی کے بعد نیکی کر، یہ نیکی اس برائی کو مٹا دیگی، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آ۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- **معاشرة:** لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ **أتبع:** تو پیچھے لا۔ **تمحها:** یہ "محو" سے ہے: مٹانا: یہ نیکی اس برائی کو مٹا دے گی۔ **خالق الناس:** لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کر۔

لوگوں کے ساتھ رہن سہن کیسے رکھا جائے

حدیث باب میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے:

(۱)......زندگی کے تمام حالات میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور تقوی کی زندگی اختیار کرنا۔

(۲)......اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے بعد ضرور کوئی نیکی کی جائے، تا کہ وہ گناہ ختم ہو جائے، نیکی نہ کی گئی تو دل کی تختی گناہ کا داغ لگتے لگتے بالکل سیاہ ہو جاتی ہے، اسپر گناہوں کا ایسا زنگ چڑھ جاتا ہے کہ پھر آدمی گمراہی میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، ایسے میں نیکی کی توفیق پھر میسر نہیں ہوتی، قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إن الحسنات يذهبن السيئات**، بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں، اس لئے اگر خدانخواستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً دربار الٰہی میں حاضر ہو کر توبہ واستغفار کریں، نماز، صدقہ، تسبیحات............ان میں سے کوئی بھی عمل کر کے گناہ کے سیاہ نکتہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ نیکی سے گناہ ضرور مٹ جاتا ہے، لیکن اس سے صغیرہ گناہ مراد ہوتے ہیں، کبیرہ اور بڑے گناہ اگر سرزد ہو جائیں تو وہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک کہ باقاعدہ توبہ نہ کی جائے، اور صغیرہ گناہ بھی نیکیوں سے اس وقت معاف ہوتے ہیں جبکہ آدمی ان کے کرنے پر شرمندہ ہو، آئندہ نہ کرنے کا عزم رکھتا ہو، اور ان پر اصرار بھی نہ کرتا ہو، حدیث میں جہاں کہیں بھی نیکی سے گناہ معاف ہونے کا ذکر آیا ہے، ان تمام مقامات پر یہ شرائط لازم قرار دی گئی ہیں، ان کے بغیر صغیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔

(۳)......لوگوں کے ساتھ خوش اسلوبی اور حسن اخلاق سے پیش آیا جائے، خندہ پیشانی سے ملاقات، مسکرا کر گفتگو کرنا، پیار ومحبت کا معاملہ کرنا، ضرورت پڑے تو مالی امداد کرنا...... یہ تمام امور حسن اخلاق میں شامل ہیں، ان کا اہتمام کیا جائے تا کہ خالق ومخلوق دونوں ہی راضی رہیں، یہ چیز دنیا میں کامیابی، اور آخرت میں نجات کا باعث ہوتی ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۰۴۔ الکوکب الدری، ۳/۶۱، تکملۃ فتح الملھم، کتاب التوبۃ، باب ان الحسنات یذھبن السیئات ۶/۳۰۔

ہمارے معاشرے میں بعض دینداروں کا رویہ لوگوں کے ساتھ انتہائی سخت، نامناسب اور بداخلاقی پر مبنی ہوتا ہے، اس عمل سے گویا وہ اپنے کو اعلیٰ و برتر اور دوسرے کو حقیر سمجھ رہے ہوتے ہیں، یہ بہت بڑا گناہ ہے، اس طرز زندگی سے اگر توبہ نہ کی گئی تو دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا مخلوق خدا سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں، انہیں اپنے سے اچھا اور اپنے کو کمتر سمجھیں، یہ ہے سنت نبوی کا خاص طریق کار، جو دونوں جہانوں میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

تقویٰ سے کیا مراد ہے

''تقوی'' کے معنی ہیں: ڈرنا، بچنا، اور شریعت میں تقوی کے معنی ہوتے ہیں: اپنے آپ کو ہر قسم کے گناہوں سے بچانا، فرائض واجبات......کو بجالانا، ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں موجود رہے، کہ میرا خالق و مالک مجھے دیکھ رہا ہے، میری حرکات وسکنات اور تمام اعمال اسکی نظروں کے سامنے ہیں، ان کا آخر میں نے حساب دینا ہے۔

ایک حدیث میں تقوی کے معنی بیان کئے گئے ہیں جو زیادہ عام فہم ہیں، وہ یہ کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب سے تقوی کے معنی پوچھے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ تو ابی بن کعب نے فرمایا: اے امیر المؤمنین یہ بتائیے کہ کبھی آپ کا گذر ایسے راستہ سے ہوا ہے جس کے دونوں طرف جھاڑیاں ہوں، خاردار اور کانٹوں سے پر ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جی ہاں کئی دفعہ ایسے راستہ سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے، ابی بن کعب نے فرمایا: تو پھر آپ نے کیا کیا، ان کانٹوں سے اپنے آپکو کیسے بچایا؟ حضرت عمر فاروق

نے فرمایا: میں نے دامن سمیٹا، اور بڑے احتیاط کے ساتھ وہاں سے گذر گیا، حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: تقوی اسی کا نام ہے، اس دنیا میں طرح طرح کے کانٹے ہیں، نفس و شیطان کے کانٹے، برے معاشرے اور ماحول کے کانٹے، بے دینی کے کانٹے، برے دوستوں اور بے دین رشتہ داروں کے کانٹے، ہر طرف منکرات و معاصی اور گناہوں کے منتشر کانٹے............غرض ہر طرف کانٹوں کا راج ہے، انہی کے جال بچھے ہوئے ہیں، ان تمام کانٹوں سے اپنے دامن کو بچا کر زندگی گذارنے کا نام تقوی ہے، اگر کوئی شخص عبادات تو ادا کرتا ہے، لیکن اللہ کی نافرمانی نہیں چھوڑتا، دوسروں کو نیکی کا حکم، ترغیب اور گناہوں سے بچنے کا کہتا ہے، لیکن وہ خود نیکی سے تہی دامن اور گناہوں کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ''تقوی'' حاصل نہیں ہے، کیونکہ انسان کے دل میں جب خوف خدا رچ بس جائے تو پھر وہ کوئی نیکی چھوڑتا نہیں اور کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا، یہ سب نافرمانی اور غفلت اسی وجہ سے ہے کہ اس کے دل میں خدا کا خوف کارفرما نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جب مسلم معاشرہ میں تقوی کی فضا پیدا ہو جائے تو ہر قسم کے جرائم اور خرابیاں ختم ہو جائیگی، جن کے سد باب اور ازالے کیلئے آج کی مسلم حکومتیں کروڑوں روپے خرچ کرتی ہیں، اور نتیجہ پھر بھی صفر کا صفر ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو تقوی کی زندگی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے امین یارب العالمین۔ تفسیر ابن کثیر'' سورۃ بقرۃ، ۱/۴۰، ط: قدیمی کتب خانہ کراچی۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ ظَنِّ السُّوْءِ

یہ باب بدگمانی (کی مذمت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بدگمانی سے بچو، اسلئے کہ بدگمانی سب باتوں سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

ظن کی قسمیں اور ان کے احکام

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرنے سے بڑی

تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور اسے سب سے بڑا جھوٹ قرار دیا ہے، کونسا "ظن" حرام ہے، کونسا جائز......

......اس کی تفصیل میں امام ابوبکر جصاص نے "ظن" کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) "ظن حرام" اس سے مراد وہ بدگمانی ہے جو انسان اللہ تعالیٰ کے بارے میں دل میں جمالے کہ وہ مجھے تکلیف اور مصیبت میں ہی رکھتا ہے، مجھے مشکلات میں رکھتا ہے، گویا میرے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا، یوں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور مغفرت سے ناامید ہو جاتا ہے، یہ حرام ہے، اس میں بسا اوقات انسان کے ایمان کیلئے خطرہ ہو سکتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن قائم کرنیکا حکم دیا ہے ، اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِی بِی" یعنی اپنے بندوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے، اب اسے اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو بھی گمان رکھے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن فرض ہے، اور بدگمانی حرام ہے،

اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری لحاظ سے نیک ہوں ان کے متعلق کسی مضبوط دلیل کے بغیر بدگمانی کرنا حرام ہے، حدیث باب میں اسی طرح کی بدگمانی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ حدیث میں "ظن" سے مراد بالاتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بغیر کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور یہ حرام ہے۔

(۲)...... "ظن واجب"، جو کام ایسے ہیں کہ ان میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے، اور اس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل واجب ہوتا ہے، جیسے باہمی لڑائی جھگڑے اور مقدمات کے فیصلے میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیونکہ حاکم اور قاضی جسکی عدالت میں مقدمہ دائر ہے، اسپر اسکا فیصلہ دینا واجب اور ضروری ہے، اور اس خاص معاملے کیلئے کوئی نص قرآن و حدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کیلئے واجب ہے، اگرچہ یہ امکان واحتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اس وقت جھوٹ بولا ہو، اس لئے اسکا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے، اور اسی پر عمل واجب ہے۔

اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کیا جا سکے، وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے، ایسے ہی کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہو جائے تو اس ضائع شدہ چیز

کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے...........

(۳)...... ''ظن مباح و جائز'': جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار، تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے، اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دیکر چوتھی رکعت پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے۔

(۴)...... ''ظن مستحب'': ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن اور نیک گمان رکھے، کہ اسپر اللہ تعالیٰ کیطرف سے ثواب ملتا ہے، قرآن مجید میں بھی اسپر بڑی تاکید آئی ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ ''إنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءَ الظَّن'' یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھی جائے، اسکا مطلب یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی معاملہ کیا جائے تو خوب تحقیق کر کے کیا جائے جیسا کہ بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے، دوسرے کو چور یا غدار سمجھنا مراد نہیں ہے، اور جب سو فیصد اعتماد ہو جائے، تو اس وقت اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

بہر حال اس حدیث میں حسن ظن کی ترغیب اور بدگمانی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ وہ گمان جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، تحقیق کے بغیر کسی کے بارے میں حتمی رائے قائم کر کے بدگمانی کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

معارف القرآن، سورۃ حجرات، ۱۲۰،۱۱۹/۸

ارادے کے پانچ مراتب

نفس میں گناہ یا نیکی کا جو ارادہ پیدا ہوتا ہے، اسکے پانچ مراتب ہیں:

(۱)...... ھَاجِس: دل میں نیکی یا بدی کا خیال آئے اور پھر ختم ہو جائے۔

(۲)...... خَاطِر: وہ خیال جو دل میں بار بار پیدا ہو، ایک مرتبہ آ کر ختم نہ ہو بلکہ بار بار آئے۔

(۳)...... حدیث النفس: اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پیدا ہو، اور اس میں تردد ہے کہ کروں یا نہیں۔

(۴)...... ھَمّ: وہ خیال کہ جس میں تردد کے بعد یہ ارادہ کر لے کہ یہ کام کروں گا یا نہیں، ارادہ پختہ تو نہیں کیا لیکن کرنے کا کچھ نہ کچھ ارادہ کر لیا۔

(۵)...... عزم: یہ آخری درجہ ہے جس میں وہ پختہ ارادہ کر لیتا ہے کہ میں یہ کام سو فیصد کروں گا یا نہیں کروں گا۔

ان پانچ مراتب میں سے ہاجس، خاطر اور حدیث النفس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، کیونکہ ہاجس غیر اختیاری طور پر اس کے دل میں آکر ختم ہو گیا ہے، اور خاطر اور حدیث النفس ان دونوں سے باز پرس نہ ہونا حدیث سے ثابت ہے، ان تینوں میں اگر نیکی کا بھی ارادہ کیا جائے تو اسپر کوئی نیکی نہیں لکھی جاتی، اور "ھَمّ" میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یہ نیکی سے متعلق ہو تو اسپر ایک نیکی لکھی جاتی ہے، اور اگر برائی کے بارے میں ہو تو یہ معاف ہے، اسکی وہ برائی نہیں لکھی جاتی، البتہ "عزم" پر گرفت اور مواخذہ ہوتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ "عزم" پر گناہ ہے "ہم" پر نہیں ہے۔ الاشباہ والنظائر، الاول، القاعدۃ الثانیۃ: الامور بمقاصدھا ۱/۱۶۵۔ ط: ادارۃ القرآن کراتشی۔

بدگمانی اکذب الحدیث کیسے ہے

"فان الظن اکذب الحدیث" اس میں "ظن" کو سب سے زیادہ جھوٹی بات قرار دیا گیا، حالانکہ قصد وارادے اور یقین کے ساتھ جھوٹ بولنا بہر حال بدگمانی سے بڑا گناہ ہے اس لئے شارحین حدیث نے اسکی تین تشریحات ذکر کی ہیں:

(۱)......اس سے درحقیقت اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "ظن ممنوع" وہ بدگمانی ہے جو کسی مضبوط دلیل کے بغیر ہو، اور پھر اسکی وجہ سے انسان دوسرے پر کوئی الزام یا تہمت لگا دے، اسطرح کی بدگمانی جھوٹ سے زیادہ اسلئے سخت ہے کہ جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جو خود بھی قبیح ہے اور ہر شخص بھی اسے برا سمجھتا ہے، لیکن بدگمانی کرنے والا شخص کسی ایک چیز کا سہارا لیکر اپنے زعم میں اسے درست سمجھ رہا ہوتا ہے، اس لئے اس کی برائی کو زیادہ شدت کے ساتھ ثابت کرنے کیلئے اکذب الحدیث فرمایا، تاکہ خوب مبالغہ کے ساتھ اسکی قباحت واضح ہو جائے، نیز اس طرف اشارہ کرنا پیش نظر ہے کہ بدگمانی چونکہ عموماً پوشیدہ ہوتی ہے اسلئے اس سے آدمی زیادہ دھوکا کھا جاتا ہے، جبکہ جھوٹ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ نمایاں ہوتا ہے، اس میں کوئی خفا نہیں ہوتا، یہ چیز سمجھانے کیلئے بدگمانی کو اکذب الحدیث قرار دیا گیا ہے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ۱۰/۵۹۰۔

(۲)......یہ بھی ممکن ہے کہ اکذب الحدیث میں "حدیث" سے مراد "حدیث النفس" ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ بد

گمانی جس پر آدمی تحقیق کے بغیر ہی یقین کرلے اور اسکی بنیاد پر دوسروں پر تہمت لگادے، یہ بدگمانی اس " حدیث النفس " سے زیادہ سخت ہے جس پر کوئی اعتماد اور جزم نہ ہو، اس لحاظ سے اسے اکذب الحدیث کہا ہے۔

(۳)......بعض فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ اکذب الحدیث میں حدیث سے " کلام "اور " ظن " سے تہمت مراد ہو، گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: کسی مسلمان پر بغیر تحقیق کے کوئی الزام و تہمت لگانا اس جھوٹے کلام سے زیادہ سخت گناہ ہے جس میں کوئی تہمت نہ ہو، کیونکہ اس میں کسی مسلمان کیلئے کوئی ضرر نہیں، جبکہ تہمت میں جھوٹ بھی ہے اور اس میں دوسرے کو تکلیف پہونچانا بھی لازم آرہا ہے، اسلئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظن یعنی تہمت، جھوٹے کلام سے زیادہ سخت اور شدید گناہ ہے۔

تکملة فتح الملھم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظن والتجسس......۵/۳۵۷۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ سفیان فرماتے ہیں کہ ظن کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......ظن اثم (۲)......ظن لیس باثم

ظن اثم: اس سے وہ گمان مراد ہے جسکا انسان تکلم یعنی کلام کرلے، یہ گناہ ہے، لیکن اگر محض گمان ہی ہو، کوئی اس میں کلام نہ کیا ہو تو یہ گناہ نہیں ہے یہ " ظن لیس باثم " ہے، یہ نہایت اختصار کے ساتھ ہے اسے سمجھنے کیلئے اوپر ذکر کی گئی تفصیل کو سامنے رکھا جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُزَاحِ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزاح کا ذکر ہے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: إِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَيُخَالِطُنَا حَتّٰى إِنْ كَانَ لَيَقُوْلُ لِأَخٍ لِيْ صَغِيْرٍ: يَا أَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ؟

حضرت انس سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مل جل کر رہتے تھے، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے چھوٹے بھائی سے فرماتے: اے ابو عمیر: نغیر یعنی بلبل نے کیا کیا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّكَ تُدَاعِبُنَا؟ قَالَ: إِنِّيْ لَا أَقُوْلُ إِلَّا حَقًّا.

حضرت ابوھریرہ سے منقول ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول: کیا آپ بھی ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک میں ہمیشہ حق بات ہی کہتا ہوں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: يَا ذَا الْأُذُنَيْنِ. قَالَ مَحْمُوْدٌ: قَالَ اَبُوْ اُسَامَةَ: اِنَّمَا يَعْنِيْ بِهِ اَنَّهُ يُمَازِحُهُ.

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے دوکان والے، محمود راوی کہتے ہیں کہ ابواسامہ نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مزاح فرمائی ہے۔

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَجُلًا اسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ إِنِّيْ حَامِلُكَ عَلٰى وَلَدِ نَاقَةٍ، فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا أَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَهَلْ تَلِدُ الإِبِلَ إِلَّا النُّوْقُ؟

انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک میں تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا، اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اونٹنی کے بچہ سے کیا کروں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اونٹوں کو اونٹنیاں نہیں جنتیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:- مزاح: (میم پر پیش کے ساتھ) ہنسی مذاق، دل لگی۔ نغیر: (نون پر پیش اور غین پر زبر کے ساتھ) بلبل، چڑیا کا منا سا بچہ۔ تداعبنا: آپ ہم سے دل لگی اور مزاح کرتے ہیں۔ استحمل: سواری طلب کی۔ ما اصنعُ: میں کیا کروں گا۔ نوق: ناقہ کی جمع ہے: اونٹنیاں

مزاح کی حقیقت

مزاح کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی گفتگو کی جائے جس سے دوسرے کا دل خوش ہو، اس میں جھوٹ کی

آمیزش اور ذلیل ورسوا کرنے کا انداز نہ ہو، اپنی بڑائی اور غیبت شامل نہ ہو، ہنسی مزاح ہر وقت نہیں بلکہ کبھی کبھار کی جائے کیونکہ زیادہ ہنسی مذاق سے دل سخت اور وقار مجروح ہو جاتا ہے، لہذا شرعی دائرے میں رہتے ہوئے اس انداز سے دل لگی اور مزاح کی جائے تو یہ مسنون اور مستحب ہے، لیکن اگر مزاح ایسی ہو جس سے دوسرے کا دل خوش ہونے کی بجائے رنجیدہ ہو، ہر وقت ہنسی مذاق ہی کا ماحول ہو، اس میں تحقیر اور ایذاء کا عنصر کارفرما ہو، مزاح سے قرب کے بجائے دوری پیدا ہو رہی ہو، تو پھر یہ مزاح جائز نہیں ہے، کیونکہ اسطرح کی مزاح سے آپس میں دشمنیاں اور عداوتیں ہی پیدا ہوتی ہیں، خیر نام کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۰۶/۶۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مزاح فرماتے

احادیث میں ایک سے زیادہ واقعات موجود ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مزاح کا ذکر ہے لہذا اگر مزاح صحیح طریقے سے کی جائے تو یہ بلا شبہ جائز ہے۔

باب کی پہلی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس کے ماں شریک چھوٹے بھائی سے مزاح کی، جو ابوطلحہ زید بن سہل انصاری کے بیٹے تھے، ان کے چھوٹے بھائی نے ایک بلبل پال رکھی تھی، جس سے وہ کھیلتے تھے، اتفاقاً وہ مرگئی جس سے انہیں دکھ ہوا، تو اسکی تسلی کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوعمیر: نغیر کا کیا حال ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں حضرات محدثین نے کئی فوائد ذکر کئے ہیں، مشہور شافعی عالم ابوالعباس احمد بن ابی احمد طبری نے جو "ابن القاص" سے مشہور ہیں، اس حدیث کے فوائد کو ایک الگ رسالے میں جمع کیا ہے یہ اہتمام انہوں نے اس لئے کیا کہ بعض لوگوں نے محدثین پر اعتراض کیا کہ وہ ایسی احادیث بھی نقل کر دیتے ہیں، جن میں کوئی فائدہ نہیں، اور بطور مثال اس حدیث کو پیش کیا، چنانچہ محدثین نے ساٹھ کے قریب مختلف فوائد اس حدیث سے اخذ کیے، حافظ ابن حجر نے ان تمام کو اختصار کے ساتھ "فتح الباری" میں نقل کر کے اپنی طرف سے ان پر اضافہ بھی کیا ہے۔

اس بچے کے نام کے بارے میں بعضوں کا خیال ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام تھا، کوئی الگ دوسرا

نام نہیں تھا، لیکن بعض روایات میں ان کا نام ''حفص'' اور بعض میں ''عبداللہ'' آیا ہے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب الکنیۃ للصبی ۱۰/۱۳/۷۔

آپکی مزاح بھی حقیقت پر مبنی ہوتی

صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ بھی ہم سے ہنسی مذاق اور مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی مزاح کرتا ہوں لیکن مزاح میں بھی حق بات ہی کہتا ہوں، خلاف واقع کوئی بات نہیں کہتا۔

صحابہ کرام نے یہ سوال کس وجہ سے کیا، اس سوال کا منشا کیا تھا؟

شارحین حدیث نے اسکی تین وجہیں ذکر کی ہیں:

(۱)......حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو زیادہ ہنسی مذاق سے منع کیا تھا، اس کے بعد انہوں نے مذکورہ سوال کیا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب المزاح ۶۲۰/۸۔

(۲)......یا سوال اس وجہ سے کیا کہ ہنسی مذاق میں چونکہ عموماً غلط باتیں شامل ہوجاتی ہیں، اس لئے صحابہ کرام کو تعجب ہوا، اور پوچھا کہ کیا آپ بھی مزاح فرماتے ہیں؟

(۳)......یا سوال کا منشا یہ تھا کہ صحابہ کرام سمجھتے تھے کہ آپ اللہ تعالیٰ اور تمام لوگوں کے ہاں معزز و مکرم اور محترم ہیں، آپ کو عظیم مرتبہ اور شرف و فضیلت حاصل ہے تو کیا دل لگی اور ہنسی مذاق آپکی خصوصیت ہے، اس میں عام مسلمان اقتداء نہیں کرسکتا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہاں میں مذاق کرتا ہوں، مگر شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس میں خلاف واقع اور جھوٹ کی آمیزش نہیں ہوتی، خوش طبعی میں بھی حق بات ہی کہتا ہوں، اس میں کسی کا استہزاء، تحقیر اور ایذاء رسانی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا، اور وہ حد اعتدال سے متجاوز بھی نہیں ہوتی، ان شرائط کا لحاظ کر کے اگر مذاق کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے، ممانعت اس صورت میں ہے جب شرعی حدود کا لحاظ نہ رکھا جائے، اس میں ناجائز اور نامناسب چیزیں شامل ہوجائیں، تاہم شرعی حدود میں رہتے ہوئے بھی ہنسی مذاق اور مزاح کو اپنی عادت نہیں بنانا چاہئے، کیونکہ اسکی وجہ سے دبدبہ، وقار اور آدمی کی شخصیت مجروح ہو

جاتی ہے، ہاں کبھی کبھار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ الکوکب الدری، ۶۴/۳۔

یا ذا الاذنین، اے دو کانوں والے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ خوش طبعی اور مزاح کے طور پر ارشاد فرمایا، اور ساتھ ہی حضرت انس کی تعریف بھی فرمادی کہ وہ گویا بہت ذہین وفطین اور سمجھدار ہیں، جو بات کہی جاتی ہے، اسے خوب اچھی طرح سنتے ہیں اور اسپر عمل پیرا ہوجاتے ہیں۔

ھل تلد الابل الا النوق

اس صحابیؓ نے یہ سمجھا کہ اونٹنی کا بچہ تو سواری کے قابل نہیں ہوتا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ ارشاد فرمایا، جس میں ہنسی مذاق اور خوش طبعی بھی ہے اور حقیقت بھی، کیونکہ آپکی مراد یہ تھی کہ جو بھی اونٹ سواری کے قابل ہوتا ہے وہ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے جو اب بڑا ہوگیا ہے، اگر اس کلام میں تم تھوڑا سا بھی غور وفکر کرتے تو اسکی حقیقت تک پہنچ جاتے اور تمہیں حیرت نہ ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ کلام کو سمجھے بغیر کوئی جواب نہیں دینا چاہئے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب المزاح ۶۱۹/۸، ۶۲۰

ان احادیث سے چند امور کا ثبوت

ان تمام احادیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......چھوٹے بچہ کی کنیت رکھ سکتے ہیں۔

(۲)......اولاد نہ ہونے کی صورت میں بھی کنیت رکھی جاسکتی ہے، چنانچہ حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صہیب رومی کی کنیت "ابو یحیی" رکھی تھی، حالانکہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔

(۳)......آپس میں ہنسی مذاق اور مزاح کی جاسکتی ہے جبکہ وہ شرعی دائرے کے اندر ہو اور اسکا انداز اور طریقہ بھی درست ہو۔

(۴)......کوئی بات سنکر فوراً جواب نہ دیا جائے جب تک کہ اسے سمجھ نہ لیا جائے۔

(۵)......چھوٹا بچہ پرندے کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے تاکہ اس سے دل بہلا سکے۔

(۶)......مدینہ منورہ میں شکار کرنا جائز ہے اور اسپر کچھ واجب نہیں ہوتا۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب

الكذبة للصمی......۱۰/۱۲/۷

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْمِرَاءِ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں لڑائی جھگڑے (میں جھوٹ چھوڑنے کی فضیلت) کا ذکر ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِيَ لَهُ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسَطِهَا، وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ بُنِيَ لَهُ فِيْ أَعْلَاهَا.

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور وہ جھوٹ ناحق اور باطل ہو (یعنی جن مقامات پر جھوٹ بولنا جائز ہے، یہ ان میں سے نہ ہو) تو اس کیلئے جنت کے کنارے پر محل بنایا جاتا ہے، اور جو شخص حق پر ہونے کے باوجود لڑائی جھگڑا چھوڑ دے، تو اس کیلئے جنت کے درمیان میں گھر بنایا جاتا ہے، اور جو شخص اپنے اخلاق کو اچھا کرلے تو اس کیلئے جنت کے اعلیٰ مقام پر محل بنایا جائیگا۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَفٰى بِكَ إِثْمًا أَنْ لَا تَزَالَ مُخَاصِمًا.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے گنہگار ہونے کیلئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑالو بن کر رہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا تُمَارِ أَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کر، نہ اس سے ناشائستہ ہنسی مذاق کر، اور نہ ایسا وعدہ کر جسکی تو خلاف ورزی کرے یعنی اسے تو پورا نہ کرسکے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ـمراء: (میم کے نیچے زیر کے ساتھ) جنگ وجدال، لڑائی جھگڑا۔ ربض: (راء

اور باء پرزبر کے ساتھ) کنارہ، قریب۔ حسّن: اچھا کرلے۔ مخاصم: لڑائی جھگڑا اور بحث وتکرار کرنے والا۔ لا تمار: تو لڑائی جھگڑا نہ کر۔ فتخلفه: کہ تو اسکی خلاف ورزی کرے یعنی وعدہ پورا نہ کرسکے۔

لڑائی جھگڑا اور جھوٹ ترک کرنیکی فضیلت

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن میں لڑائی جھگڑا چھوڑنے کی فضیلت کا ذکر ہے، اور مختلف انداز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپس میں لڑنے جھگڑنے سے سختی سے منع فرمایا ہے، اور لڑائی کی مذمت فرمائی ہے، کہ آدمی کے گنہگار ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ جھگڑالو ہو، اکثر اسکا یہی مشغلہ رہتا ہو، کیونکہ لڑائی جھگڑے سے مسلمان کا دین تباہ ہو جاتا ہے، زندگی کا لطف وسرور اور سکون ختم ہو جاتا ہے، اسکا دل ہر وقت اسی کے منصوبے سوچتا رہتا ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسکی یہ صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں گذرتیں لیکن لڑائی کے بھنور میں پھنس جانے سے وہ اپنے اصل مقصد سے منحرف ہو جاتا ہے، ایسا شخص حسنِ کلام اور اخلاق کی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا ہے، اسلئے جس قدر ہو سکے انسان کو لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش ہی رہنا چاہئے۔

انسان حق پر ہو، پھر بھی دوسرے سے الجھنے اور جھگڑنے کو ترک کردے یہ کمزوری اور بزدلی نہیں بلکہ کمال ایمان اور اللہ کے ہاں قرب کا ذریعہ ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص لڑائی کے وقت اور اس کے بغیر بھی جھوٹ بالکل چھوڑ دے، اور وہ موقع ایسا بھی نہیں کہ وہاں شرعاً جھوٹ بولنا جائز ہو، کیونکہ شرعاً بعض مواقع مثلاً بیوی کو خوش کرنے کیلئے، اور حالت جنگ میں اور دو شخصوں میں اصلاح کی غرض سے جھوٹ بولنا جائز ہوتا ہے، تو ایسے شخص کیلئے جنت کے کنارے پر ایک محل بنایا جاتا ہے،

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ جنت کا ادنی درجہ ہوگا کیونکہ اس نے غلط جھگڑا شروع کردیا تھا گو اس نے اس میں جھوٹ نہیں بولا، اور تنبیہ کے بعد جھگڑا چھوڑ دیا لیکن چونکہ اس نے ناحق جھگڑا کیا تھا، اس لئے فضیلت میں کمی ہوگئی اور چھوڑ دینے کی وجہ سے جنت کے ادنی درجے میں اسکا گھر بنا دیا جاتا ہے۔

" وهو باطل " ضمیر " هو " کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(ا)...... یہ ضمیر " کذب " کیطرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہونگے کہ وہ شخص جھوٹ بولنا چھوڑ دے، اس حال

میں کہ وہ جھوٹ ناحق اور محض باطل ہو، یعنی ایسا موقع بھی نہیں کہ جہاں شریعت نے دینی مصلحت کی وجہ سے جھوٹ بولنے کو جائز قرار دیا ہے، جسکی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس احتمال کی رو سے یہ جملہ ''مفعول بہ'' یعنی '' الکذب'' سے حال واقع ہوگا۔

(۲)...... یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ضمیر '' مَـنْ '' کیطرف لوٹے، مراد یہ ہے کہ وہ شخص غلطی اور باطل پر ہو، اس لحاظ سے یہ جملہ '' ترک '' کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہوگا۔

و من ترک المراء وھو محق............

دوسرا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہونے کے باوجود جھگڑا کر رہا ہے، لیکن یہ شخص محض اللہ کی رضا کی خاطر جھگڑا چھوڑ دیتا ہے تو اس کیلئے جنت کے درمیان میں ایک محل تیار کیا جاتا ہے ، اور جو شخص اخلاق حسنہ کو اختیار کرلے، ہر شخص سے حسن اخلاق سے پیش آئے، اس کیلئے جنت کے اعلیٰ مقام پر محل بنایا جاتا ہے۔

بحث ومباحثہ اور تکرار اگر کسی دینی مسئلہ کی وجہ سے ہو تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اس مین ذاتیات اور نفسانی خواہشات کا کوئی اثر نہ ہو۔

'' مـــراء'' اور جھگڑے کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ انسان بلا وجہ دوسرے کے کلام یا تحریر میں غلطیاں نکالے، اسکے جملوں کی ساخت یا مفہوم پر اعتراض کرے، یا دوسرے کے مقصد کو بغیر کسی وجہ کے غلط قرار دیدے، ہاں اگر کوئی صحیح وجہ ہو تو پھر طریقے سے اسکی اصلاح کی جاسکتی ہے، اس لئے مسلمان کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ کوئی بات سنے اگر وہ درست ہو تو اسکی تصدیق کرے، اور اگر غلط ہو اور اسکا تعلق کسی دینی معاملے سے نہ ہو تو پھر خاموش رہے، یوں وہ آپس میں لڑائی جھگڑے اور الجھنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب حفظ اللسان ۵۷۶/۸

وعدہ پورا کرنے کا حکم

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں سے منع فرمایا:

(۱)..... آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، کیونکہ اس سے آدمی کی دینی زندگی متاثر ہوجاتی ہے۔

(۲)......ایسی مزاح نہ کرو جس سے دوسرے کی دل شکنی ہو اور اس کے لئے باعث تکلیف ہو لیکن اگر مزاح صحیح طریقے سے کیا جائے جسکی تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔

(۳)......ایسا وعدہ نہ کرو جسکو تم پورا نہ کرسکو، کیونکہ وعدہ پورا کرنا کمالِ ایمان کی علامت ہے، اور قصداً وعدہ خلافی کرنا نفاق کی علامت ہے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ جب انسان کسی ایسی چیز کا وعدہ کرے جو شرعی لحاظ سے درست ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ اس وعدے کو پورا کیا جائے،

وعدہ پورا کرنے کی حیثیت کیا ہے، آیا یہ واجب ہے یا مستحب؟

اس کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے:

امام شافعی، ابوحنیفہ اور جمہور کے نزدیک وعدہ کو نبھانا اور پورا کرنا مستحب ہے، جبکہ حضرت عمر بن عبد العزیز وغیرہ کے نزدیک واجب ہے لہذا بغیر کسی وجہ کے اگر وعدہ خلافی کی جائے تو یہ ناپسندیدہ بھی ہے اور خیر و برکت سے محرومی کا بھی باعث ہوتا ہے، اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی یہ ارادہ ہو کہ میں پورا نہیں کرونگا تو نفاق کی علامت ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں بیان فرمایا ہے، لیکن اگر وعدے کے وقت اسے پورا کرنے کا قصد ہو، بعد میں کسی وجہ سے اسے پورا نہ کرسکے تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے لکھا ہے کہ جب کسی کے ساتھ وعدہ کیا جائے تو اس میں جزم ویقین نہ ہو بلکہ اس میں "شاید" کا لفظ یا "ان شاء الله" کا اضافہ کردے تاکہ دوسرے کے ذہن میں یہ پہلو بھی ہو کہ اسکے خلاف بھی ہوسکتا ہے ۔مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب المزاح ۶۲۷/۸، تحفۃ الاحوذی، ۱۱۱/۶، الکوکب الدری، ۶۴/۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُدَارَاةِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں نرمی کا برتاؤ اور دل جوئی کرنے کا ذکر ہے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: اسْتَأْذَنَ رَجُلٌ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَأَنَا عِنْدَهُ، فَقَالَ: بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيْرَةِ ، ثُمَّ اَذِنَ لَهُ فَأَلَانَ لَهُ الْقَوْلَ ، فَلَمَّا خَرَجَ قُلْتُ لَهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ: قُلْتَ لَهُ مَا قُلْتَ ثُمَّ أَلَنْتَ لَهُ الْقَوْلَ؟ قَالَ يَا عَائِشَةُ إِنَّ

مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ أَوْ وَدَعَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِهِ.

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی جبکہ میں آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، تو آپ نے فرمایا: یہ خاندان کا برا بیٹا یا (فرمایا) برا بھائی ہے، اتنے میں آپ نے (اسے آنے کی) اجازت دیدی اور اس سے نرم گفتگو فرمائی، پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پہلے آپ نے اس کے بارے میں فرمایا جو کچھ کہ فرمایا (یعنی اسے برا کہا) پھر اس سے نرم گفتگو فرمائی؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ: بیشک لوگوں میں سب سے بدترین شخص وہ ہے جس کو لوگ اسکی فحش کلامی سے یا شر سے بچنے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

مشکل الفاظ کے معنی: — **المداراة:** نرمی کا برتاؤ کرنا، خوش طبعی سے پیش آنا، دل جوئی کرنا، پیار ومحبت سے پیش آنا۔ **العشيرة:** خاندان، قبیلہ۔ **ألان:** نرمی سے پیش آئے۔ **اتقاء فحشه:** اسکی فحش گفتگو یا شر سے بچنے کی خاطر۔

خاطر مدارات کا حکم

مدارات: لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے اور ظاہری خوش اخلاقی اور رکھ رکھاؤ کو کہا جاتا ہے، علامہ ابن بطال فرماتے ہیں:

" اَلْمُدَارَاةُ مِنْ اَخْلَاقِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَهِيَ خَفْضُ الْجَنَاحِ لِلنَّاسِ، وَلِيْنُ الْكَلِمَةِ، وتركُ الإغْلَاظِ لَهُمْ فِي الْقَوْلِ، و ذٰلِكَ مِنْ اَقْوَى أَسْبَابِ الْأُلْفَةِ.

''خاطر مدارات مومنین کے اخلاق میں سے ہے، اور مدارات لوگوں کے ساتھ عاجزی، گفتگو میں نرمی اختیار کرنے اور سختی چھوڑنے کو کہتے ہیں، جو بلاشبہ باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ایک قوی سبب ہے''

یہ مدارات جسطرح مسلمان کے ساتھ کی جاتی ہے، اسی طرح غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن اخلاق

سے پیش آنے کا حکم ہے، جبکہ ان کے ضرر سے بچنا مقصود ہو، یا انہیں مانوس کر کے دینی نفع پہونچانا پیش نظر ہو۔

حدیث باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کے ساتھ اسکے شر سے بچنے کیلئے نرمی اور خوش اخلاقی کا معاملہ فرمایا، اس سے مراد عیینہ بن حصن فزاری ہے، اس نے باقاعدہ اسلام قبول نہیں کیا تھا صرف ظاہراً مسلمان بنا ہوا تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے اسکے ساتھ مدارات کا برتاؤ کیا تا کہ اس کے قبیلہ کے لوگ مانوس ہوکر اسلام قبول کرلیں، اور مسلمان اس کے شر سے محفوظ رہ سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت صدیق اکبر کے زمانے میں یہ مرتد ہو گیا تھا جسے قید کر کے لایا گیا۔

اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱)......کافر اور فاسق مہمان کے ساتھ بھی نرمی اور پیار کا معاملہ کرنا چاہئے، ممکن ہے اس سے متاثر ہو کر وہ اسلام قبول کرلے اور گناہ چھوڑ دے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ ہر کسی کے ساتھ اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھکر خاطر مدارات کا ہوتا تھا۔

(۲)......اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص برا اور فاسق وفاجر ہو، لوگوں کو دھوکا دیتا ہو تو اسکی اصل حالت کو لوگوں کے سامنے ذکر کرنا جائز ہے، تا کہ لوگ اسکی شرارتوں اور حرکتوں سے ہوشیار رہیں، ایسے میں دوسروں کے سامنے اسکے عیب کا ذکر کرنا، چونکہ ایک اچھے مقصد کیلئے ہے، اسلئے درست ہے، اور غیبت میں داخل نہیں۔

مدارات اور مداہنت میں فرق

یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی ضد ہیں، مدارات مستحب جبکہ مداہنت حرام ہے، مدارات یہ ہے کہ دنیا کی بہتری، یا دین کی صلاح یا دین و دنیا دونوں کی بہتری کیلئے دنیا کو خرچ کرنا، اور مدارات نرم رویہ اور خوش اخلاقی اختیار کرنے کو بھی کہتے ہیں، اور دنیا کی خاطر دین چھوڑ دینے کو مداہنت کہتے ہیں، اور یہ بھی مداہنت ہے کہ کسی ایسے شخص سے ملنا جلنا رکھا جائے جو کھلم کھلا گناہ کرتا ہے، اور یہ شخص اس کے گناہ پر قدرت کے باوجود کوئی روک ٹوک نہیں کرتا، خاموشی اختیار کرتا ہے، اور اس قدر صرف نظر کرتا ہے کہ دل سے بھی اس کے گناہ کو برا نہیں سمجھتا، اور اگر دل سے برا سمجھے تو یہ مداہنت نہیں ہے۔ عمدة القاری، کتاب الادب، باب المداراة مع الناس ۲۲/۱۷۱، تکملة فتح الملهم، کتاب البر والصلة، باب مداراة من يتقى فحشه ۵/۴۰۰۔ تحفة الاحوذی، ۶/۱۱۲۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں

مسلمانوں کے تعلقات غیر مسلموں کے ساتھ کیسے ہوں، کس حد تک ہوں، اس کے بارے میں تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱)......موالات، اس سے دلی محبت مراد ہے، یہ صرف مؤمنین کے ساتھ خاص ہے، غیر مؤمن کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) مواسات: اسکے معنیٰ ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے ہیں، اس قسم کا معاملہ، ان کافروں کے ساتھ جائز نہیں، جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

(۳)......مدارات: اس سے ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ مراد ہے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، لیکن اگر کافروں کے ساتھ مدارات کرنے سے اسلام اور اہل اسلام کو نقصان پہونچے تو پھر ان کے ساتھ مدارات کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔

(۴)......معاملات: ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت مراد ہے یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہیں، البتہ اگر ایسی حالت ہو کہ کفار کے ساتھ معاملات کرنے سے عام مسلمانوں کو نقصان پہونچتا ہو تو پھر جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کا تعامل اسپر شاہد ہے فقہاء نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ساتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا، یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں محض ظاہری رکھ رکھاؤ اور دوستانہ برتاؤ حربی کافروں کے علاوہ دوسروں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے اسلام اور اہل اسلام کو کوئی نقصان پہونچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ معارف القرآن، سورۃ آل عمران ۲/۵۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الإِقْتِصَادِ فِيْ الْحُبِّ وَالْبُغْضِ

یہ باب محبت اورنفرت ودشمنی میں میانہ روی کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أُرَاهُ رَفَعَهُ قَالَ: أَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَا، عَسَى أَنْ يَكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَا، وَأَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَا، عَسَى أَنْ يَكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَا.

محمد بن سیرین حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرہ نے اس روایت کو مرفوعا نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے دوست سے اعتدال کے ساتھ محبت کر، ممکن ہے کہ وہ دوست ایک دن تیرا دشمن ہو جائے، اور (ایسے ہی) اپنے دشمن سے نفرت وعداوت (بھی) میانہ روی سے کر ،شاید کہ ایک دن وہ تیرا دوست ہو جائے۔

مشکل الفاظ کے معنی: -الاقتصاد: میانہ روی، اعتدال، کفایت شعاری۔ھوناً ما: قلیلا کے معنی میں ہے، اور ترکیب کے اعتبار سے یہ لفظ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ''حباً ھونا'' درمیانی درجہ کی محبت، اور حرف ''ما'' سے قلت کے معنی مراد ہیں۔حبیب: محبوب، دوست۔بغیض: ناپسندیدہ شخص، دشمن۔احبب: محبت کر۔أبغض: دشمنی اور نفرت کر۔

محبت وعداوت میں اعتدال ہونا چاہئے

اس حدیث سے معاشرت کا ایک اہم حکم ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمان کو ہر معاملے میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہئے، محبت وعداوت، دوستی اور دشمنی میں بھی افراط وتفریط نہ کی جائے، کوئی دوست ہے تو اسے اتنا قریب نہ کریں کہ گھر کے تمام راز اور خاص خاص باتیں اسے معلوم ہو جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایک دن دشمن ہو جائے تو پھر اس سے نقصان ہوسکتا ہے، ایسے ہی کوئی دشمن ہے تو اس کے ساتھ دشمنی میں بھی اعتدال رکھیں، دشمنی میں اتنا تجاوز اور غلو بھی نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی آپ کا دوست ہو جائے تو پھر

اس رویے پر شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۱۱۳/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْكِبْرِ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں تکبر (کی مذمت) کا ذکر ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ.

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر اور بڑائی ہوگی، اور وہ شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيْمَانٍ. قَالَ: فَقَالَ رَجُلٌ إِنَّهُ يُعْجِبُنِيْ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبِيْ حَسَنًا وَنَعْلِيْ حَسَنًا، قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْجَمَالَ، وَلٰكِنَّ الْكِبْرَ مَنْ بَطَرَ الْحَقَّ وَغَمَصَ النَّاسَ.

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر تکبر ہوگا، اور جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر ایمان ہوا، وہ جہنم میں داخل نہیں ہوگا، راوی کہتا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: مجھے یہ پسند ہے کہ میرے کپڑے اچھے ہوں اور میرے جوتے اچھے ہوں، (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ جمال (یعنی حسن افعال) کو پسند کرتا ہے، (یہ تکبر نہیں ہے جبکہ ان میں نیت درست ہو) لیکن تکبر یہ ہے کہ آدمی حق بات کو رد کردے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھے۔

عَنْ إِيَاسِ بْنِ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَزَالُ

الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتَّى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّارِيْنَ فَيُصِيْبُهُ مَا أَصَابَهُمْ.

سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی اپنے آپ کو بڑھاتا رہتا ہے (یعنی بلند و بالا سمجھتا ہے) یہاں تک کہ اسے سرکشوں یعنی متکبرین میں لکھ دیا جاتا ہے، پھر اسے (دنیا و آخرت میں) وہ (آفتیں و سزائیں) پہونچتی ہیں جو متکبر لوگوں کو پہونچا کرتی ہیں۔

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ: يَقُوْلُوْنَ لِيْ: فِيَّ التِّيْهُ وَقَدْ رَكِبْتُ الْحِمَارَ وَلَبِسْتُ الشَّمْلَةَ وَقَدْ حَلَبْتُ الشَّاةَ وَقَدْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ فَعَلَ هَذَا فَلَيْسَ فِيْهِ مِنَ الْكِبْرِ شَيْءٌ.

جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے، جبکہ میں گدھے پر سوار ہو جاتا ہوں، اور معمولی چادر اوڑھ لیتا ہوں، اور بکری (کا دودھ) خود دودھ لیتا ہوں، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ کام کر لے تو اس میں تکبر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی (اسلئے میرے اندر بھی تکبر نہیں ہے)

مشکل الفاظ کی تشریح:- الکبر: (کاف کے نیچے زیر اور باء کے سکون کے ساتھ) بڑائی، اپنے کو اعلی اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، لفظ "کبر" اور "تکبر" دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، البتہ امام غزالی نے یوں فرق کیا ہے کہ اگر بڑائی دل ہی دل میں ہو، اسکا اثر اعضاء اور چال چلن میں ظاہر نہ ہو تو یہ "کبر" ہے، اور اگر اسکا اثر اعضاء و جوارح اور بول چال وغیرہ میں ظاہر ہو جائے تو یہ "تکبر" ہے، تاہم مذموم دونوں ہیں۔ مثقال: وزن کا پیمانہ، وزن۔ حبة: (حاء پر زبر اور باء کی تشدید کے ساتھ) دانہ۔ خردل: (خاء پر زبر اور را کے سکون کے ساتھ) رائی۔ بَطَر: رد کردے۔ غمص: دوسروں کو حقیر سمجھے۔ یذھب بنفسه: اپنے نفس کو بڑھاتا رہتا ہے، بلند و بالا کرتا رہتا ہے، بنفسہ میں باء تعدیۃ کے لئے ہے۔ جبارین: جبار کی جمع ہے: سرکش، متکبر۔ التیه: غرور تکبر۔ الشملة: (شین پر زبر کے ساتھ) پورے جسم کو ڈھانکنے والی معمولی چادر، ج، شِمَال۔ حلبت: میں دودھ دوہتا ہوں۔

تکبر ایک بری خصلت

ان احادیث میں تکبر یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کی مذمت کا ذکر ہے، تکبر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان ایمان ہی قبول نہ کرے، اور ایمان ہوتے ہوئے بھی یہ خطرناک مرض بسا اوقات لگ جاتا ہے تکبر اور بڑائی صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے لائق ہے، وہی ذات اس قابل ہے کہ وہ تکبر کرے، اس ذات کے علاوہ کسی اور کیلئے کسی بھی وقت تکبر سزاوار اور مناسب نہیں، تکبر اللہ کی چادر ہے، جو اسے اپنے اوپر اوڑھنے کی کوشش کرتا ہے، اسے دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، قرآن و حدیث میں بار بار انسان کو مادہ تخلیق یاد دلایا جاتا ہے، کہ ذرا تم اپنی پیدائش میں تو غور کرو کہ تمہیں کس قدر گندے اور ناپاک پانی سے پیدا کیا گیا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسکی یہ تخلیق ہو، تو کیا اسے تکبر کرنا چاہئے، ہرگز نہیں۔

ان احادیث میں ہے کہ جس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوا تو وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا، جبکہ دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کے دل میں ایک رائی کے دانے برابر بھی ایمان ہوگا، وہ ضرور جنت میں جائیگا، بظاہر دونوں باتوں میں تعارض ہے؟۔

اس لئے شارحین نے اس قسم کی احادیث کی مختلف تاویلیں کی ہیں تاکہ تعارض نہ رہے، انکی تفصیل یہ ہے؟

(۱)......علامہ خطابی کے نزدیک اس سے ایمان قبول کرنے سے تکبر کرنا مراد ہے کہ ایمان نہ لائے اور اسی حال میں وہ مرجائے تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

(۲)......متکبر شخص حساب کے بعد فوراً ہی جنت میں نہیں جا سکے گا بلکہ سزا کے بعد اگر اللہ چاہیں تو پھر جائیگا لہٰذا حدیث میں " دخول اولی "یعنی ابتداء میں ہی داخل ہونے کی نفی کا ذکر ہے مطلق دخول کی نفی مراد نہیں ہے۔

(۳)......جب تک اس کے دل میں تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا، جب کبر سے پاک ہو جائیگا، خواہ عذاب کے ذریعہ یا عفو و درگذر کی وجہ سے تو پھر جنت میں داخل ہوگا۔

فقال رجل انه يعجبني............

علامہ نوویؒ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس رجل سے حضرت مالک بن مرارہ الرہاویؓ مراد ہیں، ورنہ اس کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں۔

اس صحابی کے سوال کا منشا یہ تھا کہ عموماً متکبر لوگ زرق برق اور خوبصورت لباس وغیرہ استعمال کرتے ہیں، تو کیا اگر کوئی شخص اس ارادے کے بغیر یہ چیزیں استعمال کرے، اسے اچھا لگتا ہے کہ میرے کپڑے، جوتے ......اور رہن سہن اچھا ہو، تو کیا یہ بھی تکبر میں آتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات سنکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل اور خوبصورت ہے وہ جمال کو یعنی اچھے اعمال کو پسند فرماتے ہیں، لہذا اگر یہ چیزیں صاف نیت سے استعمال کی جائیں، اپنی بڑائی جتانا پیش نظر نہ ہو تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں، یہ تکبر نہیں ہے، تکبر یہ ہے کہ انسان حق بات کو نظر انداز کردے، اپنے کو بڑا اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر، ۶۵/۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے، جوتے، مکان..........اور استعمال کی اشیاء اگر اپنی منشا کے مطابق اچھی اور صاف ستھری رکھی جائیں تو یہ تکبر نہیں ہے بشرطیکہ ان کے استعمال میں نیت خالص ہو، نام ونمود اور ریا کاری کی نیت نہ ہو۔

لا یزال الرجل یذھب بنفسہ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے کو اونچا اور بلند و بالا کرتا رہتا ہے، اپنے نفس کو بڑھاتا رہتا ہے، اور بڑائی جتانے میں اپنے نفس کی موافقت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسے اہل تکبر اور سرکشوں کے دیوان اور رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے جیسے فرعون، ہامان اور قارون......وغیرہ، پھر اس کو بھی دنیا وآخرت میں ذلت ورسوائی، آفات اور طرح طرح کے عذابوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے نفس پر کڑی نظر رکھنی چاہئے، تاکہ اس میں یہ جان لیوا مرض نہ پیدا ہو جائے، اگر کچھ جراثیم اسکے محسوس ہوں تو کسی اللہ والے نیک بزرگ سے نہایت جلد اسکی اصلاح کرانی چاہئے، تاخیر کی گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وعید میں داخل ہو جائیں۔

فلیس فیہ من الکبر شيء

گدھے پر سوار ہونا، معمولی چادر اور لباس استعمال کرنا اور بکری کا دودھ دوہنا چونکہ ان تینوں امور سے متکبر لوگ اعراض کرتے ہیں، ان میں وہ اپنی عار محسوس کرتے ہیں، اور جس میں تکبر نہ ہو وہ کسی تکلف کے

بغیر یہ سارے امور سرانجام دے لیتا ہے، اس لئے حضرت جبیر بن مطعم نے لوگوں سے کہا کہ میرے اندر تکبر نہیں ہے، کیونکہ میں یہ تینوں کام کرتا ہوں، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ امور سرانجام دے، اس میں تکبر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو متعلقہ امور خود سرانجام دینے چاہئیں، ان سے اعراض یا انہیں عار کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں ہے، کیونکہ اسطرح کے کام کرنے سے آدمی میں تواضع وانکساری اور عاجزی پیدا ہوتی ہے، جو بلا شبہ ایک پسندیدہ خصلت ہے، اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۶/۱۱۷/۱۱۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ حُسْنِ الْخُلُقِ

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جن میں اچھے اخلاق (کی فضیلت) کا ذکر ہے

عَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَا شَيْئٌ أَثْقَلُ فِيْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ لَيُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيئَ.

حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کے ترازو میں قیامت کے دن حسن خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ فحش اور بیہودہ کلام کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔

عَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ شَيْئٍ يُوْضَعُ فِيْ الْمِيْزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الْخُلُقِ لَيَبْلُغُ بِهِ دَرَجَةَ صَاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ.

ابو الدرداء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں رکھی جائیگی، اور بیشک خوش اخلاق، حسن خلق کی وجہ سے روزے دار اور نمازی کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ

الْجَنَّةَ، قَالَ: تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ، وَسُئِلَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ، قَالَ: الْفَمُ وَالْفَرْجُ.

ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان چیزوں کے بارے میں پوچھا گیا جو لوگوں کو جنت میں زیادہ داخل کرانے کا سبب بنیں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا خوف اور اچھے اخلاق، پھر ان چیزوں کے بارے میں سوال کیا گیا جو بکثرت لوگوں کو جہنم میں داخل کرانے کا ذریعہ بنیں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منہ اور شرمگاہ۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْمُبَارَكِ اَنَّهٗ وَصَفَ حُسْنَ الْخُلُقِ، فَقَالَ: هُوَ بَسْطُ الْوَجْهِ، وَبَذْلُ الْمَعْرُوْفِ وَكَفُّ الْاَذٰى.

عبداللہ بن مبارک نے حسن خلق کی یہ تعریف کی ہے کہ خندہ پیشانی سے ملنا، بھلائی کو پھیلانا (یا لوگوں پر نفع بخش چیز خواہ وہ مال ہو یا اور کوئی چیز، خرچ کرنا) اور تکلیف (یا تکلیف دہ چیز) کو دور کرنا حسن اخلاق کہلاتا ہے۔

حسن اخلاق کی فضیلت

''حسن خلق'' ایک جامع لفظ ہے، اسکے معنی ہیں: اچھی عادت، اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس طریقے سے زندگی گذارے کہ اسکی زبان، عمل اور معاملات سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے، ہر انسان سے اسکے مرتبہ کے مطابق عمدہ طریقے سے پیش آنا، خندہ پیشانی سے ملنا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ضرر رساں چیز سے لوگوں کو بچانا، پیار و محبت سے گفتگو کرنا، کسی پر غیظ و غضب اور غصہ نہ کرنا، حسد اور کینہ سے اپنے کو بچا کر رکھنا، .... یہ تمام امور اچھے اخلاق میں داخل ہیں

احادیث میں حسن اخلاق کی بہت فضیلت منقول ہے، اس باب میں بھی چند فضائل کا ذکر ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... حسن اخلاق چونکہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اسلئے اسپر بہت اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، قیامت کے

دن جب اعمال ترازو میں تولے جائیں گے تو تمام اعمال میں سب سے زیادہ وزنی چیز حسن اخلاق ہونگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اچھی بات کرنے والے کو پسند اور بے حیائی اور بیہودہ گفتگو کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ اصول ہے کہ جو چیز اللہ کو مبغوض اور ناپسند ہو، اسکا اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں ہوتا جیسا کہ کفار کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا: "فلا نقیم لهم یوم القیامة وزنا" اور جو چیز اللہ کو محبوب اور پسند ہوتی ہے ، اس کا وزن ہوگا، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: کلمتان خفیفتان علی اللسان، ثقیلتان فی المیزان، حبیبتان الی الرحمن: سبحان الله وبحمده سبحان الله العظیم (دو کلمے ایسے ہیں جنکی ادائیگی زبان پر بہت آسان ہے، لیکن ترازو میں ان کا وزن بہت ہوگا، اور وہ کلمے رحمٰن کو پسند بھی بہت ہیں، وہ کلمے یہ ہیں: سبحان الله و بحمده سبحان الله العظیم)۔

(۲)......خوش اخلاق آدمی اپنے اچھے اخلاق کے ذریعہ اس شخص کے درجہ تک پہونچ جاتا ہے جو دن کو روزہ اور رات کو اللہ کی عبادت کرتا ہے۔

جنت اور جہنم میں لے جانے کے اسباب

جنت میں داخل ہونے کا زیادہ باعث دو چیزیں ہیں تقویٰ اور حسن اخلاق، انسان کے دل میں جب اللہ کا خوف ہو تو وہ احکام کو بجالاتا ہے، اور ممنوع چیزوں سے اجتناب کرتا ہے، خوف خدا کے بغیر انسان کبھی راہ راست پر نہیں آسکتا، تقویٰ کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کفر و شرک کو چھوڑ دے اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان تمام امور کو بجالائے جنہیں کرنیکا حکم دیا گیا ہے، اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے ، قرآن وحدیث میں تقویٰ کی جو فضیلتیں بیان کی گئی ہیں وہ اسی درجے سے متعلق ہیں، حدیث میں درحقیقت "تقوی الله" سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسکا معاملہ اپنے خالق یعنی اللہ کے ساتھ درست اور بہترین ہے، اور "حسن الخلق" سے اسطرف اشارہ ہے کہ اسکا معاملہ مخلوق کے ساتھ صحیح ہے، ظاہر ہے جسکا معاملہ خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ درست ہو تو وہ جنت میں ضرور داخل ہوتا ہے۔

ان کے بالمقابل دو چیزیں ہیں جنکی وجہ سے اکثر لوگ جہنم میں جائیں گے وہ "منہ اور شرمگاہ" ہیں، منہ سے زبان مراد ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اسے اگر انسان اچھے امور میں استعمال کرے تو باعث

رحمت ہے، ناجائز چیزیں منہ سے نکالے تو دنیا وآخرت میں ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہیں، اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بے شمار احادیث میں زبان کی حفاظت کی بہت تاکید فرمائی ہے، اسکی جسامت تو بظاہر بہت معمولی ہے لیکن اس کا جرم بہت بھیانک اور بڑا ہوتا ہے، لہذا جب انسان کوئی کلام کرنا چاہے تو یہ سوچ لے کہ اسکا میں نے کسی نہ کسی عدالت میں ضرور جواب دینا ہے، دنیا کی عدالت سے اگر بچ گئے تو آخرت کی عدالت میں ضرور جواب دینا ہوگا، یہ تصور کیا جائے تو پھر انسان اچھی بات ہی منہ سے نکالے گا۔

دوسری چیز ''شرمگاہ'' ہے، اسکی حفاظت کا بڑی سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے، کیونکہ معاشرے میں زیادہ تر فساد اپنی خواہشات کو غلط مقامات پر استعمال کرنے کی وجہ سے ہے چنانچہ جو شخص گناہ کرنیکی طاقت رکھتا ہو، کوئی مانع بھی نہ ہو، طبیعت میں خواہشات کے جذبات بھی خوب ہوں، اس سب کے باوجود اگر گناہ سے اپنے کو بچاتا ہے، غلط راستہ محض اللہ کے ڈر کی وجہ سے اختیار نہیں کرتا، وہ صدیقین کا درجہ حاصل کرلیتا ہے، کیونکہ عالم شباب میں جب نفسانی خواہشات کے بھوت انسان پر سوار ہو جائیں تو بہت سے لوگ اپنے جذبات کی ندیوں میں بہہ جاتے ہیں، غلط مقام پر خواہشات کی تسکین کر بیٹھتے ہیں، ایسے میں وہی شخص بچ سکتا ہے جس کا دل اللہ کے خوف سے لبریز ہو، اس کے سامنے ہر وقت اللہ کے سامنے حاضری کا منظر ہو کہ میں نے اللہ کو تمام اعمال کا حساب دینا ہے، اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورہ نازعات میں یوں فرمایا: جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے، اور نفس کو خواہشات سے روکتا ہے تو جنت ہی اسکا ٹھکانا ہوگا۔

حاصل یہ کہ حدیث میں ''منہ اور شرمگاہ'' کو جہنم میں داخل ہونیکا سبب اکثر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ زیادہ تر گناہوں کا تعلق ان دو چیزوں سے ہی ہوتا ہے، اور یہی بالآخر جہنم میں لے جانیکا سبب بن جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو یہ نعمتیں صحیح جگہ پر ہی استعمال کرنیکی توفیق عطا فرمائے۔ امین۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ہذا، ۱۱۸/۶۔۱۲۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الإِحْسَانِ وَالْعَفْوِ

یہ باب ان احادیث کے بارے میں ہے جن میں نیکی کرنے اور عفو و درگذر کا ذکر ہے۔

عَنْ أَبِيْ الْأَحْوَصِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، الرَّجُلُ أَمُرُّ بِهِ فَلَا

يَقْرِيْنِيْ وَلَا يُضِيْفُنِيْ فَيَمُرُّ بِيْ أَفَأَجْزِيْهِ؟قَالَ:لَا،أَقْرِهٖ. قَالَ وَرَآنِيْ رَثَّ الثِّيَابِ فَقَالَ:هَلْ لَكَ مِنْ مَالٍ؟قَالَ قُلْتُ:مِنْ كُلِّ الْمَالِ قَدْ أَعْطَانِي اللّٰهُ مِنَ الْإِبِلِ وَالْغَنَمِ،قَالَ:فَلْيُرَ عَلَيْكَ.

ابو الاحوص اپنے والد مالک بن نضلہ سے روایت کرتے ہیں،وہ (مالک) کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں کسی آدمی کے پاس سے گذرتا ہوں،تو وہ میری ضیافت اور مہمان نوازی نہیں کرتا پھر وہ میرے پاس سے گذرتا ہے تو کیا میں بھی اسے ایسا ہی بدلہ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:نہیں (تو بدلہ نہ دے بلکہ) تو اسکی میزبانی کر،راوی نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرے کپڑے بوسیدہ ہیں،تو فرمایا: کیا تیرے پاس کوئی مال ہے؟ میں نے عرض کیا: ہر قسم کا مال اونٹ بکریاں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو پھر تجھ پر اسکا اثر دکھائی دینا چاہئے۔

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:لَا تَكُوْنُوْا إِمَّعَةً، تَقُوْلُوْنَ إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنَّا،وَإِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا،وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا أَنْفُسَكُمْ،إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوْا،وَإِنْ أَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا.

حذیفہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:تم ابن الوقت نہ بنو کہ یوں کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے،اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے،لیکن تم اپنے نفسوں کو اس بات کیلئے آمادہ اور تیار کرو کہ اگر لوگ احسان کریں تو تم بھی احسان کرو اور اگر وہ بدسلوکی سے پیش آئیں تو تم ان پر ظلم نہ کرو۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- لا یقرینی: وہ میری ضیافت اور مہمان نوازی نہیں کرتا۔أقرہ:(یہ امر کا صیغہ ہے):تم اسکی مہمان نوازی کرو۔رث الثیاب:(راء پر زبر اور ثاء کی تشدید کے ساتھ) بوسیدہ اور پھٹے ہوئے کپڑے۔فَلْيُرَ: یہ مجہول کا صیغہ ہے:اس مال کا اثر آپ پر دکھائی دینا چاہئے،نظر آنا چاہئے۔امعة:(ہمزہ

کے نیچے زیر اور میم پر زبر اور تشدید کے ساتھ) ابن الوقت، ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والا، کسی بات پر نہ جمنے والا، ضعیف الرأی، حالات کے ساتھ چلنے والا۔ وطّنوا: تم اپنے کو تیار اور آمادہ کرو۔ وانِ أساء وا: اور اگر وہ برائی کریں، بدسلوکی کا برتاؤ کریں۔

برائی کا بدلہ اچھائی سے

باب کی پہلی حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... اگر کوئی شخص برائی کرے تو اس کے ساتھ اچھائی کی جائے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیا جائے، جس طرح کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی سے فرمایا کہ جو شخص تمہاری ضیافت نہیں کرتا، خاطر مدارات سے پیش نہیں آتا جب وہی شخص کبھی تمہارا مہمان ہو جائے تو تم اس سے بے رخی نہ کرنا، جذبات میں آ کر اسکی ضیافت سے اعراض نہ کرنا بلکہ کھلے دل سے اسکی خدمت کرنا، کیونکہ اسلام نے ہمیں عفوو درگذر اور نیکی کرنیکا حکم دیا ہے، اور بدلہ لینے کو پسند نہیں کیا۔

(۲)...... اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسکا اثر انسان کے رہن سہن، لباس اور مکان وغیرہ میں نظر آنا چاہیے، ایسے میں اس نعمت کا اس انداز سے استعمال ہی گویا ایک قسم کا شکر ہوتا ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو، ریاء ونمود اور فخر وغرور کے طور پر استعمال نہ کیا جائے، نعمت ہونے کے باوجود اس مال کو گھٹ گھٹ کر رکھنا، اسی کو بڑھانے کی فکر میں رہنا، یہ طریقہ اسلامی تعلیمات کے مزاج کے خلاف ہے۔

ابن الوقت نہ بنو

دوسری حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تم امعہ یعنی ابن الوقت نہ ہو، " امعہ " کی تفسیر اسی حدیث میں مذکور ہے کہ انسان اپنا مزاج یوں بنالے کہ اگر میرے ساتھ کوئی احسان کریگا تو میں بھی نیکی کرونگا، زیادتی کریگا تو میں بھی زیادتی کرونگا، عموماً ایسے لوگ دین سے بہت دور ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ آج مسلم معاشرے کے تقریباً ہر خاندان میں یہی فضا بنی ہوئی ہے، کہ جو اچھا برتاؤ کرتا ہے تو اس سے اچھی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے، جو بے رخی کرتا ہے تو اس سے بے رخی کی جاتی ہے، یہ نفس وشیطان کا طریقہ ہے

، قرآن وسنت سے اسکا کوئی ثبوت نہیں، سنت یہ ہے کہ نفس کو اس بات کا عادی بنایا جائے، کہ جو نیکی کرے تو اس کے ساتھ بھی نیکی کرو، اور بدسلوکی کرے تو اسپر بھی زیادتی نہ کرو، اسلامی احکام کی رو سے اگرچہ مظلوم اپنے ظلم کا بدلہ لے سکتا ہے لیکن اتنا ہی جتنا کہ اسپر ظلم لیا گیا ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں، تاہم اگر یہ اسے معاف کر دے تو یہ عمل آخرت میں زیادہ باعث اجر وثواب ہوگا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الظلم، ۸/۸۵۳، ۸۵۴۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۲۲، ۱۲۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ زِيَارَةِ الإِخْوَانِ

یہ باب مسلمان بھائیوں کی زیارت وملاقات (کرنے کے فضائل) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ عَادَ مَرِيْضًا أَوْ زَارَ أَخًا لَهُ فِيْ اللّٰهِ نَادَاهُ مُنَادٍ أَنْ طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا.

حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ثواب کی نیت سے کسی مریض کی عیادت کرتا ہے یا اللہ کی رضا کی خاطر اپنے کسی دینی بھائی کی ملاقات کیلئے جاتا ہے، تو ایک ندا دینے والا اسے پکارتا ہے کہ: آپ اچھے رہیں، آپ کا یہ چلنا مبارک ہو، آپ نے جنت میں گھر بنالیا۔

مشکل الفاظ کے معنی: - الأخـوان: اُخ کی جمع ہے: مسلمان بھائی۔ مـنـادٍ: ندا دینے اور پکارنے والا۔ طبتَ: تم اچھے رہے۔ طاب: اچھا رہے، مبارک ہو۔ ممشاک: آپ کا چلنا۔ تبوأت: تو نے ٹھکانا بنالیا۔

مسلمان سے ملاقات کرنے کی فضیلت

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان بھائی سے ملنے جانا، یا کسی مریض کی عیادت کیلئے جانا بہت ہی خیر و برکت اور ثواب کا ذریعہ ہے جبکہ اس سے مقصود اللہ کی رضا ہو، کوئی اور غرض نہ ہو، منادی فرشتہ اس کیلئے دعا کرتا ہے اور اسے گویا اس بات کی اطلاع دیتا ہے کہ تم دنیا اور آخرت دونوں میں خوش رہو گے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو چکے ہوتے ہیں، اور جنت میں اس کیلئے محل تیار کیا جاتا ہے، اسلئے مسلمانوں کو یہ فضیلت حاصل کرنے کیلئے

خوب کوشش کرنی چاہئے، دینی بھائیوں سے ملاقات اور بیماروں کی عیادت کا اہتمام کرنا چاہئے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْحَيَاءِ

یہ باب شرم وحیا(کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْحَيَاءُ مِنَ الإِيْمَانِ، وَالإِيْمَانُ فِيْ الْجَنَّةِ، وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ، وَالْجَفَاءُ فِيْ النَّارِ.

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا ایمان کا ایک جزء ہے، اور ایمان جنت میں پہونچانے کا ذریعہ ہے، اور بیہودہ گوئی و بدکلامی، سخت دلی اور اکھڑپن کا جزء ہے (جو گناہ کی علامت ہے) اور یہ جہنم میں لے جانیکا باعث ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- الحیاء: وہ خاص صفت جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے، اور فرائض وحقوق ادا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ البذاء: (باء پر زبر کے ساتھ) بدکلامی، بدزبانی، بدخلقی۔ جفاء: سخت دلی، اکھڑپن، قساوت قلبی۔

حیاایک پسندیدہ صفت

اس حدیث میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں ایک حیا اور دوسرا بذاء، حیا ایک اچھی خصلت ہے جو انسان کو برائی سے روکتی اور نیکی پر ابھارتی ہے اور بذاء، یعنی بدکلامی اور بداخلاقی ایک بری عادت ہے جو سخت دلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو گناہوں کیطرف لے جاتی ہے، ایسا شخص جہنم میں داخل کیا جائیگا۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" الحیاء خیر کله" حیا سارے کا سارا خیر ہے، اسپر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات شرم وحیا کی وجہ سے بعض لوگ حق بات دوسروں تک نہیں پہونچا سکتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کر سکتے، اس لحاظ سے حیا خیر کیسے ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ شرم وحیا اس چیز سے مانع نہیں ہے، کیونکہ حیا گناہوں سے روکتا ہے اور نیکی پر ابھارتا ہے، حق بات کہنے.....وغیرہ سے مانع بزدلی ہوتی ہے، اس میں جرأت اور دلیری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے حق بات کر سکے، اسلئے یہ کہنا کہ

شرم وحیا اس چیز سے مانع ہوتی ہے، درست نہیں ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب الرفق و الحیاء ۸/۸۰۰، ۸۰۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ التَّأَنِّيْ وَالْعَجَلَةِ

یہ باب متانت وسنجیدگی اور بردباری (کی فضیلت) اور جلد بازی (کی مذمت) کے بارے میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجِسَ الْمُزَنِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: السَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَةُ وَالإِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ أَرْبَعَةٍ وَعِشْرِيْنَ جُزْءاً مِنَ النُّبُوَّةِ.

عبد اللہ بن سرجس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھی عادت، متانت وسنجیدگی اور میانہ روی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِأَشَجِّ عَبْدِ الْقَيْسِ: إِنَّ فِيْكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ: الْحِلْمُ وَالأَنَاةُ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: بیشک تمہارے اندر دو عادتیں ایسی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے: بردباری اور متانت وسنجیدگی۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الأَنَاةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ.

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وقار وسنجیدگی اور بردباری اللہ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔

مشکل الفاظ کے معنی: — التانی: وقار وسنجیدگی، تحمل وبردباری۔ العجلة: (عین اور جیم پر زبر) سرعت، جلد بازی۔ السمت: (سین پر زبر اور میم کے سکون کے ساتھ) نمایاں راستہ، طریقہ۔ التؤدة: (تاء پر پیش اور ہمزے

پرزبر) اطمینان وسکون سے کام کرنا، اس میں جلدی نہ کرنا۔ **الاقتصاد**: میانہ روی، راہ اعتدال۔ **الحلم**: (حاء کے نیچے زیر اور لام کے سکون کے ساتھ): بردباری۔ **أناة**: متانت وسنجیدگی اور وقار۔

بردباری کی تعریف اور جلد بازی کی مذمت

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو حلم و بردباری اور تحمل کی صفت سے مزین ہونا چاہئے، دینی امور میں نہیں، دنیاوی امور میں، کیونکہ عبادات اور امور آخرت میں سبقت کرنے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا حکم ہے، البتہ ایسی جلد بازی جس سے عبادات صحیح طریقے سے ادا نہ ہوسکیں، مذموم ہے، ہر کام میں جلد بازی اور عجلت شیطان کیطرف سے ہوتی ہے، شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے، جسکی وجہ سے انسان جلد بازی سے کام لیتا ہے، اور پھر بالآخر انجام بد اور ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حلیم اور بردبار تھے، اسلئے ہر مسلمان کو اس صفت سے ضرور متصف ہونا چاہئے، اس سے انسان کی زینت اور وقار میں کمی نہیں، اضافہ ہوتا ہے۔

جزء نبوت ہونے کا مطلب

پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں اچھا طریقہ، متانت وسنجیدگی اور میانہ روی ذکر فرمائی ہیں، اور انہیں نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء قرار دیا ہے، اور بعض روایات میں پچیس کا عدد مذکور ہے۔

اس میں دو باتیں قابل تشریح ہیں:

(۱)...... نبوت کے اجزاء کیلئے چوبیس یا پچیس کا عدد کیوں خاص کیا ہے؟

(۲)...... جزء نبوت ہونے کا مطلب؟

پہلی بات کے شارحین حدیث نے چار جواب دیئے ہیں:

(۱) اس عدد سے کثرت بیان کرنا مقصود ہے، اجزاء نبوت کو اس عدد میں منحصر کرنا مقصود نہیں ہے۔

مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الحذر والتأنی فی الامور ۸/۷۸۹

(۲)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اجزاء نبوت کے بیان کیلئے اس عدد کی تخصیص کی وجہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ہی کو معلوم ہے، اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں اسلئے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ الکوکب الدری، ۶۸/۳

(۳)...... بعض نے یہ کہا کہ پیغمبر کی زندگی جن محاسن اور کمالات سے مکمل اور مزین ہوتی ہے، یہ تینوں اوصاف ان کا چوبیسواں حصہ ہیں۔

(۴)...... یا یہ کہ انسانی سیرت کی تعمیر کے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام جن خصائل کی تعلیم دیتے اور تلقین فرماتے ہیں، ان کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ یہ تین چیزیں ہیں یعنی اچھی سیرت، اطمینان و وقار سے اپنے کام سرانجام دینے کی عادت اور میانہ روی۔ معارف الحدیث، (۲۳۵:۲)

''حدیث میں بیان کردہ تین امور نبوت کا جزء ہیں'' اس سے کیا مراد ہے، شارحین حدیث کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)...... علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہ تین امور درحقیقت انبیاء کے اوصاف، اخلاق اور عادات میں سے ہیں، اور ان کے فضائل کا جزء ہیں، لہذا تم بھی ان امور میں خاص طور پر انبیاء کی اقتداء کرو، اور ان کے نقش قدم پر چلو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبوت ایک ذی اجزاء چیز ہے، اور نہ یہ معنی ہیں کہ جس شخص میں یہ تین عادات پائی جائیں گی تو وہ نبی بن جائیگا، کیونکہ نبوت ایسی چیز نہیں جو انسان کو محض کسب ومحنت سے حاصل ہو جائے، یہ تو ایک خاص مقام اور اعزاز و اکرام ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتا ہے، اس میں کسی کی محنت ومجاہدہ یا استحقاق کا کوئی دخل نہیں۔

(۲)...... ان تین امور کی ہر زمانے میں انبیاء نے دعوت دی ہے، اور لوگوں کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دی ہے، لہذا ہر مسلمان کو ان سے خود بھی متصف ہونا چاہئے، اور دوسروں کو بھی ان اوصاف سے آراستہ ہونے کی دعوت وترغیب دینی چاہئے۔

(۳)...... بعض نے اسکے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جس میں یہ تین امور پائے جائیں گے، لوگوں کی نظر میں وہ نہایت محترم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ اسے تقوی کے لباس سے مزین فرمائیں گے جیسا کہ انبیاء کرام کو آراستہ فرمایا

ہے، اس لحاظ سے یہ امور گویا نبوت کا جزء ہیں۔

(۴)......علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ چیز علوم نبوت میں سے ہے، اس میں قیاس واجتہاد سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، اس لئے ان تین امور کے جزء نبوت ہونیکا مطلب کسی کو معلوم نہیں، اسکی مراد اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب جانتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآدب، باب الحذر والتأنی فی الامور ۸/۷۸۹۔

اشج عبدالقیس

''عبدالقیس'' ایک قبیلہ ہے، اشج اسکا سردار ہے، اسکا اصل نام منذر بن عائذ ہے، یہ قبیلہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو سب لوگ فرط محبت میں اپنے ساز وسامان اور سواریوں کو چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ملاقات کیلئے چلے گئے، مگر ان کے سردار اشج عبدالقیس نے ایسا نہ کیا، انہوں نے سب کے سامان کو ترتیب سے رکھا، سواریوں کو باندھا اور پھر سفر کے کپڑے تبدیل کر کے تیار ہو کر ملاقات کیلئے آئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں: بردباری اور متانت وسنجیدگی، اسپر اشج نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان دو خصلتوں سے میں متصف ہوں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فطرۃً میرے اندر یہ صفات رکھی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فطرۃً یہ عادتیں آپ کے اندر رکھی ہیں، یہ سنکر اشج نے کہا: تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا فرمایا جنہیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ پسند فرماتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب الحذر والتأنی فی الأمور ۸/۷۸۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرِّفْقِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں نرمی (کی فضیلت) کا ذکر ہے

عَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ فَقَدْ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنَ الْخَيْرِ، وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ فَقَدْ حُرِمَ حَظَّهُ مِنَ الْخَيْرِ.

ابوالدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو (اللہ تعالیٰ کیطرف سے) نرمی (کی خصلت) کا اپنا حصہ عطا کیا گیا اسکو (دنیا وآخرت کے) خیر میں سے حصہ مل گیا، اور جو شخص نرمی سے محروم کردیا گیا وہ (گویا دنیا وآخرت کی) بھلائی سے محروم کردیا گیا۔

مشکل الفاظ کے معنی:- الـرفق: (را کے نیچے زیر کے ساتھ) نرمی، نرم برتاؤ، مہربانی، رحم، ترس، حسن سلوک۔ أعطِي: جو شخص عطا کیا گیا۔ حـظه: اسکا حصہ اور نصیب۔ حُرِمَ: جو شخص محروم کردیا گیا، کسی چیز سے روک دیا گیا۔

نرم مزاجی کی فضیلت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اخلاق کو اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے، اور جنہیں خاص اہمیت حاصل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے، سختی کا رویہ اختیار نہ کرے، نرم مزاجی سے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں، نرم مزاج شخص جسطرح اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، اسی طرح لوگوں کو بھی محبوب ہوتا ہے، اس کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اگر وہ کسی ہنر کا مالک ہو تو لوگ اس سے بڑی آسانی سے استفادہ کرتے ہیں، سخت مزاج آدمی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، اور لوگ بھی اسے پیار کی نظر سے نہیں دیکھتے، اور دنیا وآخرت کی بہت سی بھلائیوں سے وہ محروم ہو جاتا ہے، اس لئے آدمی کو اپنے مزاج میں نرمی اختیار کرنی چاہئے، یہی کامیابی کا راز ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ دَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ

یہ باب مظلوم کی بددعا (سے بچنے) کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ: اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ.

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن

کیطرف (گورنر بنا کر) بھیجا تو فرمایا کہ مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہنا کیونکہ اسکی دعا اور اللہ تعالیٰ (کے قبول کرنے) کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے (یعنی وہ دعا فوراً ہی قبول ہو جاتی ہے)

مظلوم کی آہ سے بچو

''مظلوم'' سے ہر وہ شخص مراد ہے جس پر کوئی ظلم اور زیادتی ہوئی ہو، اسکی آہ اور بددعا سے بچنے کا حکم ہے، کیونکہ اسکی بددعا ضرور قبول ہوتی ہے، اللہ کی رحمت ہر دکھے دل کیطرف فوراً متوجہ ہوتی ہے، اس لئے زندگی اس انداز سے گذاری جائے کہ اس سے نہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہونچے، اور نہ کسی پر ظلم و زیادتی ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو انہیں خاص طور پر اسکی وصیت فرمائی کہ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرنا، کیونکہ عموماً حکمران دانستہ یا نادانستہ طور پر زیادتی کر جاتے ہیں

تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۳۱

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ خُلُقِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا ذکر ہے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَشْرَ سِنِيْنَ فَمَا قَالَ لِيْ أُفٍّ قَطُّ، وَمَا قَالَ لِشَيْءٍ صَنَعْتُهُ لِمَ صَنَعْتَهُ؟ وَلَا لِشَيْءٍ تَرَكْتُهُ لِمَ تَرَكْتَهُ؟ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا وَمَا مَسِسْتُ خَزًّا قَطُّ وَلَا حَرِيْرًا وَلَا شَيْئًا كَانَ أَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وَلَا شَمِمْتُ مِسْكًا قَطُّ وَلَا عِطْرًا كَانَ أَطْيَبَ مِنْ عَرَقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم.

حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کبھی اف تک بھی نہیں فرمایا، اور وہ کام جس کو میں نے کرلیا ہو، کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا؟ اور جس کام کو میں نے نہ کیا ہو، کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے، اور میں نے نہیں چھوا کسی نرم کپڑے کو، نہ ریشم کو اور نہ ہی کسی اور چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی مبارک ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو، اور میں نے نہیں سونگھا کسی مشک کو اور نہ ہی کسی عطر کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پسینہ سے زیادہ خوشبودار ہو۔

عَنْ أَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ الْجَدَلِيِّ يَقُوْلُ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ: لَمْ يَكُنْ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَلَا صَخَّابًا فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِيْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَصْفَحُ.

ابوعبداللہ جدلی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ فحش گوئی کی عادت تھی، اور نہ ہی آپ بتکلف اور بالقصد فحش گوئی کرتے تھے، اور نہ آپ بازاروں میں چیخنے اور شور مچانے والے تھے، اور آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ باطنا اور ظاہرا ہر طرح معاف فرمادیتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- خز: اون اور ریشم کا بنا ہوا کپڑا۔ حریر: ریشم، ریشمی کپڑا۔ ألین: زیادہ نرم۔ أطیب: زیادہ خوشبودار، زیادہ اچھا۔ عرق: (عین اور را پر زبر کے ساتھ) پسینہ۔ فاحش: بری بات یا برے فعل کا عادی۔ متفحش: بتکلف اور ارادے سے فحش بات کرنے والا۔ صخاب: بہت چیخنے اور شور مچانے والا۔ یعفو: وہ باطنا درگذر کردیتے، یعنی دل سے معاف کردیتے۔ یصفح: وہ ظاہراً معاف فرمادیتے۔ لا شممت: (میم پر زیر اور زبر دونوں پڑھ سکتے ہیں) میں نے نہیں سونگھا۔ ما مسست: (پہلی سین پر زیر اور زبر کے ساتھ) میں نے نہیں چھویا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق

ان احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اخلاق کا ذکر ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......ذاتی معاملات اور وہ امور جو خدمت وآداب سے متعلق ہیں ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم باز پرس نہیں فرماتے تھے، ان سے شرعی امور مراد نہیں ہیں، کیونکہ ان میں روک ٹوک ضروری ہوتی ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شئی کا حکم فرماتے یا اس سے منع فرماتے اور

میں اسے اپنے بچپن کی وجہ سے سرانجام نہ دیتا تو کبھی آپ باز پرس نہ فرماتے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیاوی امور میں کوئی خاص اہتمام اور دلچسپی نہیں تھی۔

"عشر سنین" اس روایت میں دس کا ذکر ہے، جبکہ مسلم کی روایت میں نو سال کا ذکر ہے، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی اصل مدت خدمت نو سال اور کچھ ماہ ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرمایا، اور حضرت انس پہلے سال کے درمیان میں حاضر خدمت ہوئے تھے، اسلئے جس روایت میں نو سال کا ذکر ہے اس میں اس مہینے کو شمار نہیں کیا گیا، اور جس روایت میں دس سال کا ذکر ہے اس میں اس مہینے کو شمار کیا گیا ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب الفضائل، باب حسن خلقہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲/۲۵۳۔

ولا شممت مسكا قط ولا عطراً كان اطيب من عرق رسول الله صلى الله عليه وسلم:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ کی خوشبو عطر و مشک سے بھی بڑھ کر تھی، اسپر یہ سوال ہوتا ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطر کیوں استعمال فرماتے تھے؟

شارحین حدیث نے اس کی مختلف وجوہ ذکر کی ہیں:

(۱)...... آپ کے پسینہ کی خوشبو خود آپ کو محسوس نہیں ہوتی تھی، اس لئے آپ خوشبو استعمال فرماتے۔

(۲)...... پسینہ چونکہ ہر وقت نہیں آتا، اسلئے جس وقت پسینہ نہیں آتا تھا تو آپ خوشبو استعمال فرماتے تھے، اور جب پسینہ آتا تو خوشبو محسوس ہوتی تھی۔

(۳)...... خوشبو استعمال کرنے کی سنت کو جاری کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو استعمال فرماتے تھے، تاکہ مسلمان اس سنت پر عمل کریں۔

(۴)...... خوشبو کا استعمال تمام انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے، اس لئے ان کے ساتھ موافقت کے طور پر آپ علیہ السلام خوشبو استعمال فرماتے تھے۔

(۵)...... گو کہ آپ کے پسینہ کی خوشبو بہت تھی، مگر چونکہ آپ کی ملاقات فرشتوں سے ہوتی تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبالغۃً مزید خوشبو استعمال فرماتے تھے۔

(۶)...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں سے دوسرا یہ ہے کہ آپ کو فحش گوئی کی بالکل عادت نہیں تھی۔

(۳)......بتکلف اور بالقصد بھی آپ بے حیائی اور بری بات یا عمل نہیں کرتے تھے۔

(۴)......عموماً لوگ بازار میں چیخ وپکار اور شور وغل کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں خرید و فروخت ضرور کرتے تھے لیکن شور وغل اور چیخ وپکار نہیں کرتے تھے،

(۵)......آپ کے ساتھ کوئی برا کرتا، غلط انداز سے پیش آتا، آپ اس سے بدلہ نہیں لیتے تھے، بلکہ اسکی غلطی کو دل سے بھی معاف فرمادیتے اور ظاہراً بھی درگذر فرمادیتے، اس سے کوئی گرفت نہیں فرماتے تھے، اور برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے تھے۔

ان روایات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اخلاق، حسن معاشرت، حلم و بردباری اور عفوو درگذر کی صفات معلوم اور ثابت ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سنتوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، امین، الکوکب الدری، ۶۸/۳، وتحفۃ الاحوذی، ۱۳۲/۶

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ حُسْنِ الْعَهْدِ

یہ باب حسن عہد کے بارے میں ہے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: مَاغِرْتُ عَلَى أَحَدٍ مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ مَا غِرْتُ عَلَى خَدِيْجَةَ وَمَا بِيْ أَنْ أَكُوْنَ أَدْرَكْتُهَا وَمَا ذَاكَ إِلَّا لِكَثْرَةِ ذِكْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَهَا، وَإِنْ كَانَ لَيَذْبَحُ الشَّاةَ فَيَتَتَبَّعُ بِهَا صَدَائِقَ خَدِيْجَةَ فَيُهْدِيْهَا لَهُنَّ.

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں کیا، جتنا رشک حضرت خدیجہ پر کیا، حالانکہ میں نے ان کو پایا نہیں (اور نہ ان کو دیکھا)، یہ رشک مجھے اس لئے ہوا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت ان کو یاد فرماتے، اور بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری ذبح فرماتے تو حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو تلاش کرتے اور انہیں بکری کا گوشت ہدیہ کرتے تھے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- حُسنُ العهد: ادب وحرمت کی رعایت، احترام وپاسداری، قدیم زمانے کو یاد کرتے ہوئے حسن سلوک کرنا۔ ما غرت: میں نے رشک نہیں کیا۔ يتتبع بها: آپ صلی اللہ علیہ

وسلم بکری کا گوشت دینے کیلئے تلاش اور جستجو فرماتے۔ صدائق: صدیقة کی جمع ہے: سہیلیاں

ادب وحرمت کا اسقدر لحاظ

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیوی تھیں، اس لئے ان کی وفات کے بعد بھی ان کا زیادہ ذکر کرتے، اور گاہے گاہے ان کی سہیلیوں کو تلاش کر کے گوشت یا اور کوئی چیز ہدیہ کرتے رہتے، یہ حسن عہد اوران کے تعلقات کی پاسداری کے طور پر تھا۔

امام حاکم نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں ایک بڑھیا آئی، آپ نے بڑے ادب اور توجہ سے اسکی خیریت دریافت کی، اس نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں ٹھیک ہوں، اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے جس پر آپ نے اتنی توجہ فرمائی آپ نے فرمایا: یہ عورت خدیجہؓ کے پاس آیا کرتی تھی، اس لئے میں اس کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آیا، کیونکہ حسن عہد اور ادب کا لحاظ کرنا ایمان کا حصہ ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۳۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ مَعَالِي الْأَخْلَاقِ

یہ باب اس روایت پر مشتمل ہے جس میں بلند اخلاق کا ذکر ہے

عَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا، وَإِنَّ مِنْ أَبْغَضِكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدِكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّدُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارِيْنَ وَالْمُتَشَدِّقِيْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ؟ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ.

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک (دنیا میں) تم میں سب سے زیادہ محبوب میرے نزدیک اور قیامت کے دن نشست کے اعتبار سے تم میں سب سے زیادہ قریب، میرے نزدیک وہ لوگ ہونگے جو تم میں اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہونگے، اور بلاشبہ دنیا میں تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ میرے نزدیک اور قیامت کے دن تم میں سب سے زیادہ دور مجھ سے، وہ لوگ ہونگے جو بتکلف زیادہ کلام کرنے والے

ہوں، غیر محتاط کلام یا لوگوں سے استہزاء کرنے والے ہوں، اور متکبر ہوں، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ہم لوگ ثر ثارین، اور متشدقین کے معنی تو جانتے ہیں، مگر متفیھقون سے کون لوگ مراد ہیں، آپ نے فرمایا: وہ متکبرین ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:- معالی: مَعْلاۃ کی جمع ہے: رفعت وعزت، بلند مرتبہ اور معالی الاخلاق سے بلند اخلاق مراد ہیں۔ احبکم: تم میں سب سے زیادہ محبوب۔ احاسنکم: یہ احسن کی جمع ہے: تم میں سب سے اچھے لوگ۔ الثرثارون: یہ ثرثار کی جمع ہے: باتونی، فضول بولنے والا، بتکلف بہت بولنے والا۔ المتشدقون: متشدق کی جمع ہے: غیر محتاط گفتگو کرنے والا، لوگوں سے استہزاء اور ٹھٹھا مارنے والا۔ المتفیھقون: متفیھق کی جمع ہے: متکبر لوگ، بڑھا چڑھا کر بات کرنے والا۔

بلند اخلاق کی فضیلت

روایت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے اخلاق بلند اور عمدہ ہوں، وہ دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ہوگا، اور آخرت میں اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب اسکو حاصل ہوگا، نیز یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ کثرت کلام، بڑھا چڑھا کر گفتگو، استہزاء اور تکبر، یہ تمام امور بداخلاقی کے زمرے میں آتے ہیں، لہٰذا ان سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے، تاکہ اخلاق حسنہ کی فضیلت حاصل ہو جائے۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۳۶/۶

علماء کرام نے لکھا ہے کہ تحریر وخطابت میں تکلف وتصنع اور عام بول چال میں تکلف کرنا، یہ تمام امور مذموم ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ

یہ باب لعن طعن (کی مذمت) کے بارے میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا.

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن بہت زیادہ لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- **لَعْن:** پھٹکار، خدا کی مار، اللہ کی رحمت سے دور ہونا۔ **طعن:** کسی کا عیب نکالنا، کوئی برائی بیان کرنا، اعتراض کرنا، تنقید کرنا، الزام لگانا۔ **لعانا:** یہ مبالغہ کا صیغہ ہے: بہت زیادہ لعنت کرنے والا۔

ایمان کامل کی ایک صفت

اس حدیث سے دوامر ثابت ہوتے ہیں:

(۱)...... جوشخص کامل مؤمن ہوتا ہے وہ کثرت سے دوسروں پر لعنت نہیں کرتا، اس سے اجتناب کرتا ہے، لیکن اگر کبھی کبھار اس سے لعنت کا کوئی کلمہ نکل جائے تو وہ ایمان کامل کے منافی نہیں، کیونکہ کسی مؤمن سے لعنت کا بالکل کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے، یہ بہت نادر ہے، یہ لعنت کرنے کی وعید میں نہیں آتا، البتہ لعنت کا وہ درجہ جو شرعاً مباح اور جائز ہے، اسکے کرنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً یوں کہا جائے: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ظالموں پر، یہود ونصاریٰ پر، شراب خوروں .... پر وغیرہ، جسکی مزید تفصیل باب ماجاء فی اللعنۃ میں گذر چکی ہے۔

(۲)...... کسی پر طعنہ زنی کرنا جائز نہیں، یہ بھی ممنوع ہے، کیونکہ انبیاء کے علاوہ کوئی شخص عیب سے خالی نہیں، کوئی نہ کوئی عیب کسی بھی شکل میں ہر انسان میں ضرور پایا جاتا ہے، اگر ایک شخص دوسرے کو کسی عیب کا طعنہ دے گا تو دوسرا بھی جواب میں ضرور کسی عیب کا طعنہ دے گا، اسطرح دونوں ایک دوسرے کی تذلیل کا ارتکاب کرتے ہیں، جو کہ جائز نہیں، لہذا انسان کی سعادت وخوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو پیش نظر رکھے، اپنے عیوب پر غور کرے اور ان کی اصلاح کی فکر کرے، اسطرح کرنے سے انسان دوسروں کے عیوب بھول جاتا ہے، دوسروں کے عیوب کے درپے وہی شخص رہتا ہے جو اپنی کوتاہیوں اور عیوب سے بے خبر ہو، ظفر شاہ نے کیا خوب کہا:

نہ تھی حال کی ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا

تنبیہ:- شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس سے پہلے لعنت کے بارے میں " باب

"ماجاء فی اللعنة" قائم کیا، اس سے متعلق وہاں احادیث ذکر کردیں، پھر دوبارہ لعنت پر یہ باب منعقد کردیا، یہ تو تکرار ہے، لہذا اگر امام ترمذی اس حدیث کو باب سابق کے ساتھ ذکر کردیتے تو بہتر ہوتا اور تکرار بھی لازم نہ آتا۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۳۸/۳۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ كَثْرَةِ الْغَضَبِ

یہ باب زیادہ غصہ کرنے (کی ممانعت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: عَلِّمْنِيْ شَيْئًا وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ، لَعَلِّيْ أَعِيْهِ. قَالَ: لَا تَغْضَبْ. فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا، كُلُّ ذٰلِكَ يَقُوْلُ: لَاتَغْضَبْ.

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: مجھے کچھ سکھا دیجئے، (لیکن تھوڑا اور مختصر ہو) اور مجھ پر کثرت نہ کیجئے (یعنی زیادہ امور بیان نہ کریں) شاید کہ میں اس (قلیل) کو محفوظ کرلوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسکے مزاج کو دیکھ کر) فرمایا: غصہ نہ کیا کر، اس نے یہ سوال بار بار دھرایا، ہر مرتبہ آپ اس سے فرماتے رہے کہ غصہ نہ کیا کر۔

زیادہ غصہ مذموم ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے جواب میں بار بار اسے غصہ نہ کرنے کا حکم دیا، ممکن ہے کہ آپ نے اسے دیکھ کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اس میں غصہ کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے، اگر یہ کثرتِ غصہ سے باز آجائے تو باقی گناہوں سے بچنا اس کیلئے آسان ہوجائیگا۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب (۶۳۷:۱۰)

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے چند گناہوں کا ذکر کیا، زنا، شراب خوری، جوا، اور جھوٹ وغیرہ بیان کئے، ساتھ ہی کہنے لگا کہ ان تمام گناہوں کو ایک ہی ساتھ چھوڑنا تو مشکل ہے، ہاں کوئی ایک گناہ چھوڑ سکتا ہوں، جسکی بھی آپ تعیین فرمادیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جھوٹ بولنا چھوڑ دو، اس نے عہد کیا کہ میں آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولوں گا، اس کے بعد وہ چلا

گیا، اب جب بھی کسی گناہ کا ارادہ کرتا، تو یہ خیال آتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھیں گے کہ فلاں گناہ کیا ہے تو جھوٹ بولنا پڑے گا، اس ڈر سے اس نے سارے گناہ چھوڑ دیے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سائل کی حالت دیکھ کر جواب ارشاد فرماتے تھے، تاکہ اسکی اصلاح ہو جائے، حدیث باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کی حالت کے اعتبار سے بار بار یہی جواب دیا کہ تم غصہ نہ کرنا، شاید سائل کا منشا بار بار سوال سے یہ ہو کہ غصہ کو چھوڑنا مشکل ہے، کوئی اور چیز بتا دیجئے، لیکن آپ نے اسے بہر حال یہی حکم دیا کہ تم غصہ نہ کیا کرو، اس سے تمہاری تمام روحانی امراض صحیح ہو جائیگی۔　　الکوکب الدری، ۲/۳۷۔

''غصہ'' کی صفت اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں پیدا کی ہے، اپنی ذات میں یہ مذموم نہیں، یہی وجہ ہے کہ جائز مقامات میں غصہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن بلا وجہ غصہ کرنا، بار بار غصہ کرنا یہ مذموم ہے اور یہ غصہ درحقیقت اپنے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا سمجھنے کی وجہ سے آتا ہے، اس لئے آدمی یہی کوشش کرے کہ غصہ سے بچ کر ہی رہے، اور اگر غصہ آجائے تو اسکے تقاضے کے مطابق کوئی عمل نہ کرے، بزرگوں نے غصہ کے علاج کے لئے چند چیزیں لکھی ہیں کہ اگر آدمی کو غصہ آجائے تو وہ ایسے اسباب اختیار کرے، جن سے غصہ ختم ہو جاتا ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائے کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتنی نافرمانیاں کرتا ہوں لیکن وہ مجھ سے درگذر ہی کا معاملہ کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ مجھ پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہے، جتنا میں اس شخص پر قادر ہوں جس پر کہ میں غصہ کر رہا ہوں، لہذا مجھے بھی درگذر سے کام لینا چاہئے۔

(۲)......اعوذ باللہ پڑھے، کیونکہ غصہ شیطان کیطرف سے ہوتا ہے، اسے دور کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے۔

(۳)......اپنی مجلس بدل دے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، اور زمین سے قریب تر ہو جائے، تاکہ یہ کیفیت ختم ہو، اور تواضع وسکون حاصل ہو۔

(۴)......ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل کرے۔

(۵)......نماز کیطرف متوجہ ہو جائے۔

(۲)......غصہ برداشت کرنے کے فضائل کا تصور کرے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب الغضب والکبر ۸/۸۲۴

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَظْمِ الْغَيْظِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں غصہ پینے اور برداشت کرنے (کی فضیلت کا) ذکر ہے۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ أَنَسٍ الْجُهَنِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُنَفِّذَهُ دَعَاهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ فِيْ أَيِّ الْحُوْرِ شَاءَ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص غصہ پی لے ،جبکہ وہ اسے نافذ کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے بلائیں گے، اور اسے اختیار دیں گے کہ جس حور کو چاہے، پسند کرلے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:- کظم الغیظ: غصہ ضبط کرنا، غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھنا۔ ینفذہ: اس غصہ کو نافذ کرے، غصہ کے مطابق فیصلہ صادر کرے۔ رؤس الخلائق: تمام مخلوق کے روبرو، سامنے۔

غصہ ضبط کرنے کی فضیلت

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص غصہ کرنے کی طاقت کے باوجود غصہ نہ کرے، اسے پی جائے تو اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی کہ قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے اللہ تعالیٰ اسے بلائیں گے اور حور پسند کرنے کا اسے اختیار دیں گے کہ جو چاہو تم پسند کرلو، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریں گے۔

چنانچہ قرآن مجید میں غصہ پی جانے اور اسے ضبط کرنے کو اہل تقوی کی صفات میں شمار کیا گیا ہے

امام بیہقیؒ نے والکاظمین الغیظ و العافین عن الناس کی تفسیر میں حضرت سیدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہما کا ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ آپ کی ایک کنیز (لونڈی) آپ کو وضو کرارہی تھی کہ اچانک پانی کا برتن اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت علی بن حسین کے اوپر گر پڑا، تمام کپڑے بھیگ گئے، اور سر پر کچھ زخم بھی آ گیا، غصہ آنا ایک طبعی امر تھا، لونڈی کو خطرہ ہوا، تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی، والکاظمین الغیظ (جو لوگوں کے غصے کو پی جاتے ہیں) یہ سنتے ہی خاندان نبوت کے اس بزرگ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، بالکل خاموش ہو گئے، اس کے بعد اس لونڈی نے آیت کا دوسرا جملہ والعافین عن الناس (اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں) پڑھ دیا، تو فرمایا کہ میں نے تجھے دل سے معاف کر دیا، لونڈی بھی ہوشیار تھی، اس کے بعد اس نے تیسرا جملہ بھی سنا دیا، واللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اور اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں) جس میں احسان اور حسن سلوک کی ہدایت ہے، حضرت علی نے یہ سن کر فرمایا کہ جا، میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ روح المعانی ۵۹/۴، معارف القرآن، سورۃ آل عمران ۱۸۹/۲۔

غصہ کو برداشت کرنے کے دنیا میں بھی بے شمار فائدے ہیں، اور آخرت میں بھی اس سے بلند درجات حاصل ہونگے، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۴۰/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ إِجْلَالِ الْكَبِيْرِ

یہ باب بڑے کے احترام (کی فضیلت) کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا لِسِنِّهٖ إِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَهُ مَنْ يُكْرِمُهُ عِنْدَ سِنِّهٖ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی نوجوان کسی بزرگ کا اسکی عمر کی وجہ سے احترام نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کیلئے اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو متعین فرما دیتے ہیں، جو اس کا اکرام واحترام کرتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- اجلال: اکرام، احترام۔ لسنه: اسکی عمر کی وجہ سے۔ قیض: متعین کر دیتے ہیں۔ عند سنه: اسکے بڑھاپے کے وقت۔

بڑوں کے ادب واحترام کی فضیلت

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جوشخص کسی بزرگ کا ادب واحترام محض اسکی زیادہ عمراور بڑھاپے کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے بڑھاپے کی عمر میں مخدوم بنائیں گے اور اس کے لئے خادم متعین کردیں گے، کیونکہ جوشخص خادم بن کر زندگی گذارتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے مخدوم بنادیتے ہیں، اس لئے آدمی کو چاہئے کہ اپنے سے بڑوں کا ادب واحترام کرے، ان کے ساتھ گستاخی اور توہین آمیز رویہ ہرگز اختیار نہ کرے۔ تحفۃ الاحوذی،۱۴۱/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْمُتَهَاجِرِيْنِ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں دو قطع تعلق کرنے والوں (کی مذمت) کا ذکر ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: تُفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الإِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ فِيْهِمَا لِمَنْ لَايُشْرِكُ بِاللّٰهِ إِلَّا الْمُتَهَاجِرَيْنَ يَقُوْلُ: رُدُّوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھول دیے جاتے ہیں، اور ان دونوں میں ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے، جو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراتا ہو مگر دو قطع تعلق کرنے والوں کی (مغفرت نہیں کی جاتی) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان دونوں کو لوٹا دو یہاں تک کہ وہ دونوں آپس میں صلح کرلیں۔

مشکل الفاظ کی تشریح: —متھاجرین: قطع تعلق کرنے والے دو شخص۔ ردّوا: تم ان کو واپس بھیج دو، لوٹا دو۔ حتی یصطلحا: یہاں تک وہ دونوں صلح وصفائی کرلیں۔

تعلق قطع کرنے کی مذمت

قطع تعلق اتنا بڑا گناہ ہے کہ ایسے لوگوں کی مغفرت بھی نہیں ہوتی، ہفتے میں پیر اور جمعرات کے دن

ایسے ایام ہیں کہ ان میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور مشرک کے علاوہ ہر گنہگار کی مغفرت کی جاتی ہے لیکن اگر دو آدمیوں نے آپس میں بغیر کسی شرعی وجہ کے قطع تعلق کر رکھا ہو تو ان کو واپس کر دیا جاتا ہے، تا کہ وہ آپس میں دل صاف کرلیں، اپنی دشمنی دور کرلیں، ان دو دنوں میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت خصوصی متوجہ ہوتی ہے اور اہل ایمان کی مغفرت کی جاتی ہے اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اس لئے ان ایام میں اعمال صالحہ اور عبادت کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، اور اگر کسی سے رنجش اور نا چاقی ہو بھی تو ان دنوں سے پہلے پہلے ہی اسے ختم کر لینا چاہیے تا کہ اللہ کی رحمتوں سے استفادہ کیا جا سکے۔

تفتح ابو اب الجنة: جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اس سے کیا مراد ہے، آیا حقیقت میں جنت اس وقت موجود ہے؟ شارحین حدیث نے اس سلسلے میں چار قول ذکر کئے ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......اس سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ جنت کے واقعی دروازے کھول دیے جاتے ہیں کیونکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جنت اس وقت بھی موجود ہے۔

(۲)......یا اس سے مراد یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے جو رکاوٹ ہو، اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔

(۳)......بعض نے کہا کہ اس سے عفو و درگذر، بخشش، درجات کی بلندی اور زیادہ ثواب دینا مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور، ان دو ایام میں اہل ایمان کے ساتھ خصوصی انداز سے ہوتا ہے۔

(۴)......قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ''فتح ابواب'' اپنے ظاہری معنی پر ہی محمول ہے، اور دروازوں کا کھلنا گویا جنت میں داخل ہونے اور مغفرت و بخشش کی ایک علامت ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۴۲/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الصَّبْرِ

یہ باب صبر کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِىْ سَعِيْدٍ: أَنَّ نَاسًا مِنَ الْأَنْصَارِ سَأَلُوْا النَّبِيَّ ﷺ فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوْا فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ قَالَ: مَا يَكُوْنُ عِنْدِيْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ، وَمَنْ يَسْتَعِفَّ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ شَيْئًا هُوَ خَيْرٌ وَأَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ (ایک دن) انصار میں سے چند لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (کچھ مال) مانگا، آپ نے انہیں عطا فرمادیا، انہوں نے پھر مانگا، تو آپ نے پھر عطا فرمادیا، (یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا، سب ختم ہوگیا) پھر آپ نے فرمایا کہ: میرے پاس جو کچھ بھی مال ہوگا میں اسے تم سے بچا کر ذخیرہ نہیں کروں گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے غنا طلب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو غنی بنادیتا ہے (یا جو شخص لوگوں سے استغناء اور بے پروائی ظاہر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بے پرواہ یعنی اسکے دل کو غنی کردیتے ہیں) اور جو شخص لوگوں سے سوال کرنے سے بچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بری اور ناجائز باتوں سے محفوظ رکھتا ہے، اور جو صبر کا طلبگار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے صابر بنادیتے ہیں، اور (یاد رکھو کہ) صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع کوئی چیز کسی کو عطا نہیں کی گئی (یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا میں صبر، سب سے بہتر عطیہ ہے)۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- **لن أدخره:** میں ہرگز اس مال کو ذخیرہ نہیں کرونگا۔ **من يستغن:** جو شخص اللہ تعالیٰ سے مالداری طلب کرتا ہے، جو شخص لوگوں سے استغفار اور بے پروائی ظاہر کرتا ہے۔ **يغنه الله:** اللہ تعالیٰ اس کو غنی بنادیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بے پروا یعنی اس کے دل کو غنی کردیتے ہیں۔ **من يستعف:** جو شخص لوگوں سے سوال کرنے سے بچتا ہے، پاکدامنی طلب کرتا ہے۔ **يعفه الله:** اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن بنادیتے ہیں، ناجائز اور بری باتوں سے اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ **من يتصبر:** جو شخص اللہ سے صبر کی توفیق مانگتا ہے **يصبره الله:** اللہ تعالیٰ اسے صابر بنادیتے ہیں۔

حدیث سے چند امور کا ثبوت

حدیث باب میں چار امور کا ذکر ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......ایک دن انصاری صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار سوال کرتے، آپ انہیں عطا فرماتے رہے جب موجود سارا مال ومتاع آپ کے پاس ختم ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ میرے پاس پھر کبھی مال آئے گا تو وہ بھی میں تقسیم کردونگا، ذخیرہ اندوزی نہیں کرونگا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں زیادہ سے زیادہ مال ودولت وغیرہ خرچ کرنا چاہئے۔

(۲)......جوشخص لوگوں سے استغنا اور بے نیازی سے پیش آتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے دل کا غنا اور بے نیاز کر دیتے ہیں، اس لئے انسان کی نظر صرف اللہ تعالیٰ کیطرف ہونی چاہئے، وہی سب کچھ عطا کرتے ہیں، اللہ کے علاوہ کسی اور سے امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہییں۔

(۳)......جوشخص لوگوں سے سوال کرنے سے پرہیز کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن بنادیتے ہیں اور ہر بری بات سے اسے محفوظ رکھتے ہیں، لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا اللہ کی نظر میں بہت ہی ناپسندیدہ ہے، لہذا مسلمان کو چاہئے کہ لوگوں سے مانگنے کے بجائے اللہ سے مانگنے کی عادت بنائے، یہی اسلام کا حکم ہے، اور اسی میں دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔

(۴)......جوشخص اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے صبر کرنے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں، پھر مشکلات ومصائب میں صبر کرنا اس کیلئے آسان ہو جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی عطا میں سب سے بہتر عطیہ، صبر ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۱۴۳/۶۔

جوشخص جس قدر لوگوں کی ایذاء پر صبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اتنا ہی ثواب عطا فرماتے ہیں، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جوشخص لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے، وہ اس آدمی کے مقابلہ میں اجر وثواب کے اعتبار سے بڑھ کر ہے، جو لوگوں کے ساتھ نہیں رہتا اور ان کی ایذاء رسانی پر صبر نہیں کرتا''۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الصبر علی البلاء (ص:۲۹۲)

صبر کے معنی اور اسکی اقسام

صبر کے لغوی معنی:۔ نفس کو روکنا اور اسپر قابو پانا۔ قرآن وسنت میں صبر کی تین قسمیں زیادہ مشہور ہیں:

(۱)......صبر عن المعصیہ: یعنی اپنے نفس کو حرام اور ناجائز امور سے روکنا، اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے نفس کو بچا کر رکھنا۔

(۲)......صبر علی الطاعۃ: طاعات وعبادات کی پابندی پر نفس کو مجبور کرنا، اور استقامت کے ساتھ تمام احکام بجالانا۔

(۳)......صبر علی المصیبہ: مصائب وآفات پر صبر کرنا یعنی جس آزمائش اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے، اسپر اللہ سے کسی قسم کا شکوہ وشکایت اور ناراضگی کا اظہار نہ کرے، اللہ کے فیصلے پر ہر طرح راضی رہے

یہ ذہن میں رہے کہ مصیبت کے وقت شکوہ وشکایت نہ کرنے کا اصل اعتبار ابتدائی وقت کا ہوتا ہے ابتداءِ وقت میں اگر انسان اس مصیبت پر صبر کرے تو اس وقت اسے صبر کرنے کا ثواب ملتا ہے، بعد میں صبر کرنیکا اعتبار نہیں، کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ تو صبر آ ہی جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صبر کرنے والوں کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور قرآن میں تقریباً پچانوے مقامات پر صبر کا ذکر آیا ہے۔ ارشاد الساری، ۱۲/۱۳،۱۱۲۔

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں صابرین انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم رہیں، بعض روایات میں ہے کہ محشر میں ندا دی جائیگی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گذرے ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں گے اور ان کو بغیر حساب کے جنت میں داخلہ کی اجازت دیدی جائیگی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ قرآن مجید کی آیت انما یوفی الصابرون اجرهم بغير حساب (بیشک صابرین کو بغیر کسی حساب کے اجر دیا جائیگا) سے بھی اسی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ معارف القرآن، سورہ البقرۃ، ۱/۳۹۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ ذِيْ الْوَجْهَيْنِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں دودرخے آدمی (کی مذمت) کا ذکر ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَاالْوَجْهَيْنِ.

حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک لوگوں میں سب سے برا اللہ کے نزدیک قیامت کے دن وہ شخص ہوگا جو دورخ والا ہو یعنی منافق ہو۔

ذی الوجهين کی مذمت

"ذی الوجهين" سے وہ شخص مراد ہے جو دوغلی پالیسی اختیار کرتا ہے، جس آدمی سے ملاقات کرتا ہے اس سے اس انداز سے پیش آتا ہے کہ وہ یقین کرلیتا ہے کہ یہ میرا بہت ہی مخلص دوست ہے، لیکن پیٹھ پیچھے یہ اس شخص کی برائی کرتا ہے، بعض نے کہا کہ جن دو شخصوں کے درمیان عداوت اور اختلاف ہو، ان میں سے

ہر ایک کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارا حامی ہوں، اور دوسروں کا مخالف ہوں، خوب چاپلوسی اور خوشامد کرتا ہے، پھر ان کے مخالفین کے پاس جا کر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے،......... یہ ہے دورخا آدمی، ہر آدمی کے سامنے دوسرے چہرے سے رونما ہوتا ہے، اسی کو نفاق کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ دورخا آدمی تمام لوگوں میں سب سے زیادہ برا اس لئے ہے کہ یہ دونوں طرف فساد برپا کرتا ہے، جبکہ چغلخوری میں صرف ایک شخص کی بات نقل کر کے فتنہ برپا کیا جاتا ہے، یہ دونوں طرف کی باتوں کو نقل کرتا ہے۔

حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں کہ دورخا شخص اللہ کے نزدیک امین نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی شخص دو مخالفین کے درمیان صلح کرانے کیلئے ہر ایک کے پاس جاتا ہے، کچھ تعریفی کلمات ذکر کرتا ہے، اور دوسروں کی طرف سے معذرت وغیرہ کرتا ہے تاکہ جھگڑا مٹ جائے، ہر فریق کی برائیاں نہیں، صرف خوبیاں ذکر کرتا ہے تاکہ ان کے درمیان کسی طرح صلح ہو جائے، تو یہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ انتہائی محبوب، پسندیدہ اور باعث اجر وثواب ہے۔ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما قیل فی الوجہین ۵۸۱/۱۰، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب حفظ اللسان والغیبۃ ۵۹۰/۸، تکملۃ فتح الملہم، کتاب البر والصلۃ، باب ذم ذی الوجہین وتحریم فعلہ، ۴۱۵/۵

آج مسلم معاشرے میں یہ برائی بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہے، اسکی وجہ سے دوستوں اور خاندانوں میں اختلاف بڑھتے چلے جارہے ہیں، بسا اوقات قتل وخونریزی تک نوبت پہونچ جاتی ہے، اس لئے اہل اسلام کو چاہئے کہ ہر آدمی کی بات پر کان نہ دھریں، اور بغیر تحقیق کے کسی کے بارے میں ذہن میں کوئی رائے قائم نہ کریں اور جو ان کے سامنے خوشامد کرے تو اسکی حوصلہ افزائی کے بجائے، حوصلہ شکنی کریں، اور دورُخے شخص کو اپنی مجلس میں ہرگز نہ بٹھائیں تاکہ کسی نہ کسی درجے میں اس برائی کا سد باب ہو سکے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ النَّمَّامِ

یہ باب چغلخور کی مذمت کے بارے میں ہے

عَنْ هَمَّامِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ: مَرَّ رَجُلٌ عَلٰى حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ فَقِيْلَ لَهُ هٰذَا

يُبَلِّغُ الْأُمَرَاءَ الْحَدِيْثَ عَنِ النَّاسِ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ.

ہمام بن حارث کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت حذیفہ بن یمان کے پاس سے گذرا، تو انہیں بتایا گیا کہ یہ آدمی لوگوں کی باتیں (فساد کی نیت سے) بادشاہوں تک پہونچاتا ہے، تو حضرت حذیفہ نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ چغلخور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

قَالَ سُفْيَانُ: وَالْقَتَّاتُ النَّمَّامُ، سفیان کہتے ہیں کہ "قتات" کے معنی "نمام" یعنی چغلخور کے ہیں۔

چغلخوری گناہ کبیرہ ہے

چغلخوری چونکہ آپس میں لڑائی جھگڑے اور فساد کا ذریعہ بنتی ہے، اس لئے یہ گناہ کبیرہ ہے ایسا آدمی اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اسے اس جرم کی سزا نہ مل جائے، لیکن اگر کسی شرعی عذر کے تحت دوسرے کی بات منتقل کی جائے مثلاً دشمن کی جاسوسی کی اطلاع وغیرہ تو یہ جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ چغلخوری اور غیبت میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، چغلخوری میں آدمی کسی شخص کی حالت یا اسکی کوئی بات فساد کی نیت سے اسکی رضامندی کے بغیر آگے منتقل کرتا ہے، خواہ اسکو معلوم ہو یا نہ ہو، اور غیبت کہتے ہیں کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کی جائے، اس میں فساد کی نیت ضروری نہیں ہے۔ فتح الباری، کتاب الأدب، باب النميمة من الكبائر، ۱۰/۵۸۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعِيِّ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں کم بولنے (کی فضیلت) کا ذکر ہے

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْحَيَاءُ وَالْعِيُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْإِيْمَانِ، وَالْبَذَاءُ وَالْبَيَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ.

حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا اور قلتِ کلام ایمان کے دو شعبے ہیں، اور بیہودہ گوئی اور کثرت کلام نفاق کے دو شعبے ہیں۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: — العـی: (عین کے نیچے زیر اور یاء کی تشدید کے ساتھ): کلام سے عاجز ہونا، اپنی مراد اور مقصد کو واضح نہ کر سکنا، یہاں اس کے معنی: قلت کلام کے ہیں۔ حیـــاء: شرم وحیا: وقار و سنجیدگی، انسانی مزاج میں وہ تغیر وتبدل، تواضع وانکساری جو عیب اور ملامت کے اندیشے سے پیدا ہو، اسے حیا کہا جاتا ہے۔ البـذاءُ: (با پر زبر کے ساتھ): بدکلامی، بیہودہ گفتگو، بے حیائی کی بات۔ البیـــان: بتکلف ضرورت سے زیادہ فصاحت کا اظہار کرنا، آزاد گفتگو کرنا جس میں غیبت، جھوٹ، الزام تراشی وغیرہ سے اجتناب نہ کیا جائے، ایسا آدمی چونکہ زیادہ گفتگو کرتا ہے، اس لئے یہاں ''البیان'' سے کثرت کلام مراد ہے۔

قلت کلام کی فضیلت

اس حدیث سے دوامر ثابت ہوتے ہیں:

(۱)..... شرم وحیا اور کم بولنا یہ ایمان کے دوشعبے ہیں، یعنی ان کا منشا اور بنیاد ایمان ہے، جس شخص کا ایمان جس قدر مضبوط اور مستحکم ہوگا اسی قدر وہ اللہ کی نافرمانی سے شرم وحیا کرے گا، اور زیادہ بولنے سے بھی پرہیز کرے گا، کیونکہ زیادہ بولنا بہت سے گناہوں کا سبب بن جاتا ہے، غیبت، جھوٹ، لعن وطعن اور بہتان وغیرہ یہ ساری برائیاں اس میں داخل ہو جاتی ہیں، ایسے میں خاموش رہنا اور بقدر ضرورت گفتگو کرنا ہی بہتر ہوتا ہے تاکہ انسان زبان کے گناہوں سے محفوظ رہے۔

(۲)..... بے حیائی، فحش گفتگو اور زیادہ فصاحت سے کلام کرنا یعنی زیادہ بولنا یہ نفاق کے دوشعبے ہیں، یہ چیزیں نفاق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ منافق آدمی ہی آخرت کے انجام سے بے خبر ہو کر فحش گفتگو اور بیہودہ کلام کرتا ہے، اس لئے بے ہودہ گوئی اور زیادہ بولنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۶/۱۴۷۔

بَابُ مَاجَاءَ إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں ہے کہ بلاشبہ بعض بیان جادو (کاسا اثر رکھتے) ہیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَجُلَيْنِ قَدِمَا فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَخَطَبَا فَعَجِبَ

النَّاسُ مِنْ كَلَامِهِمَا، فَالْتَفَتَ إِلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا، أَوْ إِنَّ بَعْضَ الْبَيَانِ سِحْرٌ.

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو شخص آئے، انہوں نے خطبہ دیا، لوگوں کو ان کا کلام اچھا لگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: بیشک بعض بیان جادو (کا سا اثر رکھتے) ہیں۔

بعض بیان جادو کی تاثیر رکھتے ہیں

یہ نو ہجری کا واقعہ ہے جب بنو تمیم کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس میں دو ایسے آدمی تھے جن کا کلام فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہوتا، ان میں سے ایک کا نام حصین بن بدر بن امرئ القیس ہے اور لقب ''زبرقان'' ہے، دوسرے کا نام عمرو بن اہیم تھا (فتح الباری میں اہتم ہے) ان دونوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فصیح گفتگو کی، تب آپ نے فرمایا: بے شک بعض بیان جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔

عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر ان دونوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

قَالَ الزِّبْرِقَانُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَا سَيِّدُ بَنِيْ تَمِيْمٍ، وَالْمُطَاعُ فِيْهِمْ وَالْمُجَابُ، أَمْنَعُهُمْ مِنَ الظُّلْمِ وَآخُذُ مِنْهُمْ بِحُقُوْقِهِمْ، وَهٰذَا يَعْلَمُ ذٰلِكَ يَعْنِيْ عَمْرَو بْنَ الأَهْيَمِ، فَقَالَ عَمْرٌو: إِنَّهُ لَشَدِيْدُ الْمُعَارَضَةِ، مَانِعٌ لِجَانِبِهِ مُطَاعٌ فِيْ إِذْنِهِ، فَقَالَ الزِّبْرِقَانُ: وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ: لَقَدْ عَلِمَ مِنْ غَيْرِ مَا قَالَ وَمَا مَنَعَهُ أَنْ يَتَكَلَّمَ إِلَّا الْحَسَدُ، فَقَالَ عُمَرُ: أَنَا أَحْسُدُكَ؟ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّهُ لَئِيْمُ الْخَالِ، حَدِيْثُ الْمَالِ، أَحْمَقُ الْوَالِدِ، مُضِيْعٌ فِي الْعَشِيْرَةِ، وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَقَدْ صَدَقْتُ فِي الْأُوْلٰى وَمَا كَذَبْتُ فِي الْآخِرَةِ وَلٰكِنِّيْ رَجُلٌ إِذَا رَضِيْتُ قُلْتُ: أَحْسَنَ مَا عَلِمْتُ، وَإِذَا غَضِبْتُ قُلْتُ: أَقْبَحَ مَا وَجَدْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْراً''

"زبرقان" نے کہا: میں بنی تمیم کا سردار ہوں، قبیلے میں میری اطاعت کی جاتی ہے، اور میری بات مانی جاتی ہے، میں انہیں ظلم سے روکتا ہوں اور ان میں سے بعض کو حقوق کی وجہ سے پکڑتا ہوں، میرے یہ کام عمرو بن اہیم بھی جانتا ہے، عمرو نے کہا: یہ مزاحمت اور مخالفت میں بہت سخت ہے، اپنا دفاع بڑی قوّت سے کرتا ہے، اس کے امر کی پیروی کی جاتی ہے (تاہم پورا قبیلہ اسکا مطیع نہیں ہے) زبرقان نے کہا: یا رسول اللہ، جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اسکی دل کی آواز یہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسکا دل میرے کارناموں کا معترف ہے، لیکن حسد کی وجہ سے میرے کارناموں کا یہ تذکرہ نہیں کرتا، عمرو نے کہا: کیا میں آپ سے خسد کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسول: یہ مامویاں کے اعتبار سے تنگ ظرف ہے، نیا نیا مالدار ہوا ہے، اسکا والد (یا بچہ) احمق ہے، اپنے خاندان میں اسکا کوئی وقار نہیں، بخدا یا رسول اللہ: میں شروع میں بھی سچ کہہ رہا تھا، اور اب بھی جھوٹ نہیں بول رہا، میرا مزاج یہ ہے کہ خوشی ہو تو اچھی اچھی باتیں کرتا ہوں، اور غصہ ہو تو بری بات نکل جاتی ہے، (ان کا کلام سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک بعض بیان جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔

"**ان من البیان سحرا**" بعض بیان جادو کا سا اثر رکھتے ہیں، جادو کے ساتھ تشبیہ جلدی اثر کرنے کے اعتبار سے ہے، کہ جس طرح جادو کا اثر جلدی ہوتا ہے، اسی طرح بعض بیان کا اثر بہت جلد ہوتا ہے، ایک شخص عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنی کسی ضرورت کا ذکر کیا کہ اسے پورا کیا جائے، لیکن خلیفہ اسے پورا کرنے سے معذور تھا، مگر اس نے ایسا فصیح و بلیغ کلام کیا کہ خلیفہ کے دل پر اسکا اتنا اثر ہوا کہ اسکا مطالبہ پورا کر دیا، تو اس سائل نے کہا: **ھذا ھو السحر الحلال** (یہ حلال جادو ہے)

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد (ان من البیان سحرا) بطور مدح کے ہے یا اسکی مذمت میں، اس پوری بحث کو سامنے رکھ کر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے بیان کی تعریف اور مذمت دونوں کا احتمال ہے، اگر اس فصیح و بلیغ اور پر کشش گفتگو سے دینی لحاظ سے کوئی فائدہ ہو، سچائی کو ثابت اور ظاہر کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں یہ کلام محمود اور پسندیدہ ہوگا، اور اگر نیت درست نہ ہو، ریا کاری

اور اپنی بڑائی جتانا پیش نظر ہو، یا اسکا مقصد صحیح نہ ہو، بلکہ اسکا تعلق کسی باطل اور فاسد امر سے ہو تو پھر یہ بیان مذموم ہوگا۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب: إن من البیان سحرا ۲۹۰/۱۰۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۱۴۸/۶، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الادب، باب البیان والشعر ۵۳۶/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ التَّوَاضُعِ

یہ باب تواضع کی فضیلت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی صدقہ کسی مال کو کم نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ عفو و درگذر کی وجہ سے آدمی کی عزت میں ہی اضافہ کرتے ہیں، اور نہیں تواضع کرتا کوئی مگر یہ کہ اللہ اسکو بلند فرماتا ہے۔

تواضع کی فضیلت

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین امور ذکر فرمائے ہیں، جو بلا شبہ مسلمان کی سر بلندی اور عزت و فلاح کا ذریعہ ہیں:

(۱)...... اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کیا جائے تو اس کے مال و دولت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اس سے بقیہ مال پاکیزہ ہو جاتا ہے، یوں وہ معنوی طور پر بڑھ جاتا ہے، اس میں ایسی برکت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے مال سے بسا اوقات بڑے بڑے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔

(۲)...... جس شخص پر کوئی ظلم اور زیادتی کی جائے تو وہ انتقام پر قدرت کے باوجود عفو و درگذر کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی عزت و آبرو میں اضافہ فرما دیتے ہیں، دنیا میں بھی اسکا ادب و احترام کیا جاتا ہے، دل سے اسے اچھا سمجھا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اسے عزت و عظمت اور کثیر ثواب عطا فرمائیں گے۔

(۳)...... تواضع کے معنی ہوتے ہیں اپنے کو دوسروں سے کم سمجھنا، لہذا جو شخص محض اللہ کی رضا کی خاطر اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں عزت عطا فرماتے ہیں، تواضع اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے

اور تکبر اسکی ضد ہے، جو اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے، دنیا کی ہر نعمت پر حسد کیا جاتا ہے لیکن تواضع ایک ایسی نعمت ہے جس پر حسد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے شب وروز کے معمولات اور طرز زندگی میں تکبر کی بجائے تواضع اختیار کی جائے تاکہ وہ تمام انوار وبرکات اور عزت وعظمت حاصل ہو سکے جو اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار کرنے پر رکھی ہے۔ تحفۃ الاحوذی،۱۴۹/۶

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الظُّلْمِ

یہ باب ظلم کی مذمت کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظلم کرنا قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہوگا۔

ظلم کے معنی:۔ظلم کے معنی ہیں زیادتی کرنا، ناانصافی کرنا، کسی چیز کا غلط جگہ استعمال کرنا، بے موقع استعمال کرنا، کسی کا حق مارنا، اس میں کمی کرنا۔

ظلم گناہ کبیرہ ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم کرنا قیامت کے دن مختلف تاریکیوں کا باعث ہوگا، ''الظلم ظلمات'' سے کیا مراد ہے، اس میں شارحین حدیث کے اقوال درج ذیل ہیں:

(۱)......ظلم کرنیوالا شخص قیامت کے دن مختلف تاریکیوں میں سرگرداں ہوگا، وہ اس نور سے محروم ہوگا جو مؤمن کیلئے آخرت میں اسکے آگے اور دائیں بائیں طرف ہوگا، جبکہ ظالم کے اردگرد مختلف حقوق ضائع کرنے کی وجہ سے طرح طرح کی تاریکیاں ہونگی۔

(۲)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ''ظلمات'' سے مراد قیامت کی شدائد ومصائب ہیں، ظالم کیلئے ظلم کی وجہ سے مختلف سختیاں اور مشکلات ہونگی جو اسے لوگوں کے حقوق پامال کرنے کی وجہ سے لاحق ہونگی، اور ''ظلمات''

کا لفظ ''شدائد'' کے معنی میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، قرآن میں ہے: قل من ینجیکم من ظلمات البر والبحر (آپ فرمادیجئے کہ تمہیں خشکی وتری کی تکالیف وشدائد سے کون نجات دیتا ہے)

(۳)...... بعض کی رائے یہ ہے کہ ظلمات سے وہ عبرت ناک سزائیں مراد ہیں جو ظالم کو ظلم کرنے کی وجہ سے دی جائیگی۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاداب، باب الظلم ۸۴۴۶/۸۔ وتحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۱۵۰/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَرْكِ الْعَيْبِ لِلنِّعْمَةِ

یہ باب نعمت میں عیب نہ نکالنے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: مَا عَابَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ، كَانَ إِذَا اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ وَإِلَّا تَرَكَهُ.

حضرت ابوھریرہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا، اگر آپ کو کھانے کی رغبت ہوتی تو اس کو تناول فرمالیتے، ورنہ اس کو چھوڑ دیتے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- ما عاب: عیب نہیں نکالا۔ اشتھاہ: آپ اس کھانے کو چاہتے، رغبت کرتے۔ اکلہ: تو اس کو کھالیتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کھانے کو برا نہیں کہتے تھے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ کسی حلال کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے، اگر رغبت ہوتی تو کھالیتے ورنہ چھوڑ دیتے، یوں نہ کہتے کہ اس میں زیادہ نمک ہے، یا زیادہ مرچ ہے، زیادہ ترش.............. اور اگر کھانا حلال نہ ہو تو اس میں عیب نکالنا اور اسکی برائی بیان کرنا جائز ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عیب دو طرح کا ہوتا ہے:

(۱)...... خلقت اور پیدائش کے اعتبار سے عیب نکالا جائے، جو اشیاء اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے حلال قرار دی ہیں، ان میں نکتہ چینی اور عیب نکالا جائے تو یہ ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر

اعتراض ہے جو ناجائز ہے۔

(۲)......اس کھانے میں بنانے اور تیار کرنے کے اعتبار سے عیب نکالا جائے، مثلاً یوں کہا جائے کہ اس میں فلاں چیز زیادہ ہے یا کم ہے، یا سالن جل گیا ہے، یا یہ کچا ہے.........اس طرح کہنے کی گنجائش ہے۔

مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روایت میں عیب نکالنے کی ممانعت چونکہ عام ہے، خواہ وہ خلقت کے اعتبار سے ہو یا بنانے اور تیار کرنے کے اعتبار سے، اس لئے کسی بھی طرح کھانے میں کوئی اعتراض اور عیب نہ نکالا جائے، کیونکہ اگر بنانے میں کوئی عیب نکالا گیا تو اس سے بنانے والے کی دل شکنی لازم آتی ہے، یہ بھی جائز نہیں، البتہ اگر باورچی کو صحیح بنانے کی وجہ سے تنبیہ کی جائے تا کہ اسکی اصلاح ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، بلکہ بسا اوقات یہ اصلاح ضروری ہوتی ہے جبکہ کھانا زیادہ مقدار میں بنایا جائے، ایسے میں اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اس میں لا پرواہی اور غفلت کر سکتا ہے جس سے سارا کھانا ہی ضائع ہو سکتا ہے، ہاں اس طریقے سے سمجھایا جائے جس سے اسکی دل شکنی نہ ہو۔ فتح الباری، کتاب الأطعمة، باب ماعاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم طعاماً ۶۸۳/۹۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ تَعْظِيْمِ الْمُؤْمِنِ

یہ باب اہل ایمان کی تعظیم و تکریم کے (حکم) کے بارے میں ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمِنبَرَ فَنَادَى بِصَوْتٍ رَفِيْعٍ قَالَ: يَا مَعْشَرَ مَنْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيْمَانُ إِلَى قَلْبِهِ، لَا تُؤْذُوْا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنْ يَتَّبِعُ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهِ. قَالَ: وَنَظَرَ ابْنُ عُمَرَ يَوْماً إِلَى الْبَيْتِ أَوْ إِلَى الْكَعْبَةِ فَقَالَ: مَا أَعْظَمَكِ وَأَعْظَمَ حُرْمَتَكِ، وَالْمُؤْمِنُ أَعْظَمُ حُرْمَةً عِنْدَ اللّٰهِ مِنْكِ.

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے، پھر بلند آواز سے پکار کر فرمایا: اے ان لوگوں کی جماعت جو صرف اپنی زبان سے اسلام لائے ہیں، اور ایمان ان کے

دلوں تک نہیں پہونچا: تم مسلمانوں کو تکلیف نہ پہونچاؤ، اور نہ تم انہیں (کسی سابقہ گناہ کی) عار دلاؤ اور نہ ان کی پوشیدہ باتوں کا پیچھا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی چھپی ہوئی باتوں کا پیچھا کرتا ہے (یعنی انہیں ظاہر کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اسکی چھپی ہوئی بات کا پیچھا کرتا ہے (یعنی اسکو ظاہر کر دیتا ہے) اور جس کی چھپی بات کا پیچھا اللہ تعالیٰ کرے تو اس کو رسوا کر دیتا ہے خواہ وہ اپنے گھر کے اندر کے حصے میں ہی کیوں نہ ہو۔

راوی نے کہا کہ ابن عمر نے بیت اللہ یا کعبہ کیطرف دیکھا اور فرمایا: تو کس قدر عظیم ہے اور تیری حرمت و عزت بھی کس قدر عظیم ہے لیکن مؤمن اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و احترام کے لحاظ سے تجھ سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- **صَعِدَ:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے۔ **بصوت رفیع:** بلند آواز سے۔ **ولم یفض:** نہیں پہونچا۔ **لا تؤذوا:** تم تکلیف اور ایذاء نہ پہونچاؤ۔ **لا تعیروھم:** مسلمانوں کو (کسی سابقہ غلطی پر) عار نہ دلاؤ، شرمندہ نہ کرو۔ **لا تتبعوا:** تم پیچھا نہ کرو، ٹوہ میں نہ لگو، تلاش میں نہ رہو۔ **عوراتھم:** عورة کی جمع ہے: ستر، پوشیدہ چیز، جسکا اظہار برا ہو۔ **یفضحه:** اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کر دیں گے۔ **جوف:** پیٹ، اندرونی حصہ۔ **رحله:** اپنے گھر، منزل۔ **ما اعظمک:** تو کس قدر عظیم ہے۔ **یا معشر من اسلم بلسانه:** اے ان لوگوں کی جماعت جو اپنی زبان سے اسلام لائے ہیں، اس میں مؤمن اور منافق دونوں داخل ہیں۔

اہل ایمان کی تعظیم وتکریم کا حکم

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چند ایسے امور کا ذکر فرمایا ہے، جن کے ذریعہ اہل ایمان کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا گیا ہے، اس خطاب میں مؤمن اور منافق دونوں داخل ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)......مسلمانوں کو ایذاء نہ پہونچاؤ، خواہ وہ کامل مسلمان ہوں یا منافق، اس طرح زندگی گذارو کہ آپ سے ہر مسلمان آرام وسکون میں ہو، آپکی زبان، ہاتھ، غرض جسم کے کسی بھی حصے سے، کسی بھی ذریعہ، کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہونچے، یہ ایمان کامل کی علامت ہے۔

(۲)......اگرکسی مسلمان سے عہد قدیم میں کوئی گناہ ہوگیا ہو یا اس میں کوئی عیب تھا تو اسلام قبول کرنے کے بعد اسے شرمندہ نہ کرو، عار نہ دلاؤ، خواہ اسکی توبہ کا علم ہو یا نہ ہو، یوں عار دلانا شرعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص فی الحال کسی گناہ میں مبتلا ہو تو توبہ سے پہلے پہلے اسے عار دلائی جاسکتی ہے جبکہ زجر وتنبیہ پر اسے قدرت ہو، جیسا کہ مسلم حکمران کو حدود وقصاص اور تعزیرات جاری کرنیکا اختیار اور قدرت ہوتی ہے، اس قسم کا آدمی گناہ پر شرمندہ کرسکتا ہے۔

(۳)......کسی مسلمان کی خفیہ بات یا عیب کی جستجو کرنا اور اسے لوگوں کے سامنے پھیلانا جائز نہیں ہے، ورنہ اسکی سزا یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عیوب کی جستجو فرمائیں گے اور لوگوں کے درمیان ظاہر کردیں گے، جس سے ذلت ورسوائی ہوگی البتہ اگر کسی سے کوئی خطرہ یا اندیشہ ہو تو اسکی خفیہ باتوں کو نقصان سے بچنے کیلئے معلوم کیا جاسکتا ہے، یہ ممانعت میں داخل نہیں۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فواحش ومنکرات اور بے حیائی کی باتیں کرنا اور انہیں پھیلانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے اس گناہ کی برائی اور قباحت دلوں سے نکل جاتی ہے، پھر انسان اس کے کرنے پر دلیر ہوجاتا ہے، آج اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور کیبل وغیرہ میں چونکہ ہر وقت فحش گفتگو اور عریاں تصاویر دیکھائی جاتی ہیں، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج معاشرے میں فحش گناہوں کی کثرت ہوگئی ہے، اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کسی سے خدانخواستہ بے حیائی کا کام ہوجائے اور وہ شرعی شرائط کی رو سے ثابت بھی ہوجائے تو اس گناہ کی تشہیر کی جائے اور سرعام اسلامی سزا اس پر نافذ کی جائے تاکہ وہ دوسروں کیلئے عبرت کا ذریعہ ہو، لیکن اگر شرعی اعتبار سے اسکا ثبوت نہ ہوسکے تو اسے لوگوں کے سامنے پھیلانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو بھی گناہ کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ وہ برائی جس کا ثبوت نہ ہو اور نہ اس پر سزا ہو تو ایسی خبروں کے پھیلانے کو قرآن کریم نے فواحش پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا ہے، سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إن الذين يحبون ان تشيع الفاحشة فى الذين امنوا، لهم عذاب اليم فى الدنيا والاخره والله يعلم وانتم لا تعلمون**، (جولوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو، ان کیلئے دنیا وآخرت میں سزائے دردناک ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔) معارف القرآن، سورۃ النور، ۳۸۰/۶

(۴)......حضرت عبداللہ بن عمر نے بیت اللہ کو دیکھ کر فرمایا کہ بلاشبہ تیری عظمت، تیراادب واحترام بہت زیادہ ہے، لیکن اللہ کی نظر میں ایک مؤمن کی عزت تیری عزت سے کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ بیت اللہ کی آبادی مؤمن سے ہوتی ہے، یہ بات ان لوگوں کیلئے باعث عبرت ہے جو نہ جانے دن میں بیسیوں بار کتنے مسلمانوں کی عزت وحرمت پر حملہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں، اسلام کامل کی علامت یہ ہے کہ مسلمان اپنے بھائی کی جان و مال اور عزت وآبرو کا لحاظ اپنے مال ومتاع، نفس اور عزت وآبرو سے زیادہ رکھے، یہ فکر اگر مسلم معاشرے میں بیدار ہوجائے تو ایک مثالی معاشرہ قائم ہوسکتا ہے۔

تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۱۵۲/۶۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ التَّجَارِبِ

یہ باب تجربات (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا حَلِيْمَ إِلَّا ذُوْعَثْرَةٍ، وَلَا حَكِيْمَ إِلَّا ذُوْ تَجْرِبَةٍ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص کامل بردبار نہیں ہوتا جب تک اس کو لغزش نہ ہوئی ہو، اور کوئی شخص کامل حکیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو تجربہ حاصل نہ ہو۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ التجارب: تجربۃ کی جمع ہے: آزمائش، کسی کام کو کر کے دیکھنا تاکہ اس میں کوئی نقص باقی نہ رہے۔ حلیم: بردبار، برداشت کرنے والا۔ ذو عثرۃ: لغزش والا۔ حکیم: دانا، عقلمند۔ ذو تجربۃ: تجربہ والا۔

تجربہ سب سے بڑی دانائی ہے

اس حدیث سے دوامر ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ حلم و بردباری اور لحاظ ومروت کا جوہر اسی شخص میں ہوتا ہے

جس نے دھوکا کھایا ہو، لغزشوں اور خطاؤں سے دو چار ہوا ہو، گناہ و معصیت کا مرتکب ہو چکا ہو، اپنے معاملات میں خلل اور نقصان برداشت کر چکا ہو، ایسا شخص عفو و درگذر کی اہمیت کو سمجھتا ہے، کیونکہ یہ خود ان تمام حالات سے گذرا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کرتا ہے، یا کسی سے کوئی خطا اور لغزش ہو جاتی ہے تو یہ برداشت کرتا ہے، اور اسے درگذر کر دیتا ہے۔

(۲)......اصل دانا اور عقلمند وہ شخص ہوتا ہے جو مختلف تجربات کی کسوٹی سے گذرا ہو، جسے دنیا اور دین دونوں کا تجربہ ہو، مصالح اور مفاسد سے واقف ہو، حالات کے اتار چڑھاؤ اور معاملات کی اچھائی اور برائی سے واقف ہو، ایسا شخص جب کوئی کام کرتا ہے تو وہ حکیمانہ ہوتا ہے، اس طرح کا آدمی ''حکیم'' اور دانا ہوتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حکیم سے مراد طبیب اور ڈاکٹر ہے، معنی یہ ہونگے کہ کوئی ڈاکٹر اس وقت تک ماہر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تجربہ اور ہاؤس جاب نہ کرے، کیوں کہ مہارت کیلئے ہاؤس جاب ضروری ہوتی ہے۔ مرقاة المفاتيح، كتاب الاداب، باب الحذر و التأنى فى الأمور ۸/۷۸۶، تحفة الاحوذی، ۶/۱۵۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُتَشَبِّعِ بِمَا لَمْ يُعْطَهُ

یہ باب اس شخص (کی مذمت) کے بارے میں ہے جو کسی ایسی چیز کے ساتھ شکم سیری کا اظہار کرے جو اس کو عطا نہیں کی گئی۔

عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهِ، وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ، فَإِنَّ مَنْ أَثْنَى فَقَدْ شَكَرَ، وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ، وَمَنْ تَحَلَّى بِمَا لَمْ يُعْطَهُ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ.

حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عطیہ دیا جائے، اور وہ شخص (اسکا بدلہ دینے پر) قادر ہو تو اسے چاہئے کہ اسکا بدلہ دے، اور اگر بدلہ دینے پر قدرت نہ ہو تو عطیہ دینے والے کی تعریف کرنی چاہئے، کیونکہ جس نے معطی کی تعریف کی تو اس نے گویا اس کا شکر ادا کر دیا، اور جس نے عطیہ کو چھپایا (یعنی نہ اسکا بدلہ دیا اور

نہ دینے والے کی تعریف کی) تو اس نے نعمت کی ناشکری کی، اور جو شخص اپنے کو کسی ایسی شی سے
آراستہ کرے جو اسکو عطا نہیں کی گئی تو وہ جھوٹ کا لباس پہننے والے کیطرح ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- المتشبع: وہ شخص جو شکم سیری کا اظہار کرے، اس سے وہ شخص مراد ہے جو اپنے لئے ایسا کوئی فضل وکمال اور فضیلت ظاہر کرے، جو اس کو حاصل نہ ہو، ایسی شکل وصورت بنالے کہ عام آدمی اس سے دھوکہ کھا جائے کہ یہ بہت نیک اور دیانتدار ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔ عطاء: عطیہ، بخشش۔ فوجد: وہ اس کا بدلہ دینے پر قادر ہو۔ فلیجز بہ: اسے چاہئے کہ وہ اسکا بدلہ دے۔ فلیثن: یہ اثناء سے ہے: اسکی تعریف کرنی چاہئے۔ ومن کتم: جس نے عطیہ کو چھپایا یعنی نہ تو اسکا بدلہ دیا اور نہ ہی دینے والے کی تعریف کی۔ فقد کفر: اس نے نعمت کی ناشکری کی، یعنی عطیہ دینے والے کا حق شکر ادا نہیں کیا۔ ومن تحلی: جو شخص مزین اور آراستہ ہو بما لم یعطه: ایسی چیز کے ساتھ جو اسے عطا نہیں کی گئی، یہ مجہول کا صیغہ ہے، اس کے نائب فاعل کی ضمیر "ھو" "من" کی طرف راجع ہے اور "ہ" ضمیر "ما" کیطرف لوٹ رہی ہے۔ کلا لبس ثوبی زور: جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کیطرح۔

من تحلی بما لم یعطه کا پس منظر

اس کے پس منظر میں شارحین حدیث نے دو واقعے نقل کئے ہیں:

۱......ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر پوچھنے لگی کہ میری ایک سوکن ہے، کیا اسے تنگ کرنے کیلئے میں ایسی چیز کا اظہار کرسکتی ہوں جس سے یہ معلوم ہو کہ میرا شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے، جبکہ ایسا ہے نہیں، تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تحلی بما لم یعطه............، یعنی اگر تو ایسا کریگی تو اس شخص کیطرح ہو جائیگی جس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہن رکھے ہوں، پہلا جھوٹ یہ ہوگا کہ میرا شوہر مجھے سوکن سے زیادہ دیتا ہے، اور دوسرا یہ کہ میرا شوہر سوکن سے زیادہ مجھ سے محبت کرتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس لئے اس طرح کرنا جائز نہیں۔

۲......علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اہل عرب میں ایک شخص ایسا لباس پہنتا تھا جیسا کہ نیک اور با اعتماد قسم کے لوگ پہنا کرتے تھے، جنکی امانت وصداقت پر لوگوں کو اعتماد ہوتا تھا، جن کے بارے میں جھوٹ اور جھوٹی شہادت کا

شبہ نہیں ہوتا تھا، یہ شخص بھی لوگوں کو اعتماد دلانے کیلئے ان کیطرح شریفانہ لباس پہن لیتا تھا تا کہ لوگ اسپر اعتماد کر لیں اور اسکی شہادت وغیرہ قبول کر لیں، حالانکہ یہ انتہائی جھوٹا آدمی تھا، اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **ومن تحلی بما لم یعطه** .... پھر یہ جملہ عرب کے محاورے میں ہر ایسے موقع کے لئے استعمال ہونے لگا جہاں دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے ایسی ہیئت اختیار کی جائے جو قابل اعتماد لوگوں کی ہوتی ہے۔

لہذا ہر وہ شخص جو اپنی ایسی کوئی فضیلت، ایسا کوئی فضل و کمال لوگوں کے سامنے ظاہر کرے جو درحقیقت اس میں نہیں، ایسا ریا کار شخص جو متقی اور پرہیزگار نہیں، لیکن زہد و تقوی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، ایسا مفلس و غریب جو گھر سے نکلتا ہے تو برتری جتانے کیلئے فاخرانہ لباس پہن لیتا ہے، ان تمام کا مقصد لوگوں کو دھوکا دینا ہوتا ہے، اسلئے ان سب کی ظاہری شکل و صورت اور لباس، جھوٹ کا لباس ہے، جسکی حدیث میں ممانعت کی گئی ہے۔

كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ (جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کیطرح)

اس میں جھوٹ کے دو کپڑے یعنی تثنیہ کا ذکر کیا ہے جسکی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱)......اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ایسا شخص جو اپنے لئے جھوٹا فضل و کمال ظاہر کر رہا ہے، یہ گویا سر سے ایڑی تک جھوٹ کے ساتھ متصف ہے، ایک جھوٹ کو اس نے چادر بنالیا، جس سے اوپر کا حصہ چھپ گیا، اور دوسرے جھوٹ کو تہبند بنالیا جس سے نیچے کا حصہ چھپالیا ہے۔

(۲)......یہ بھی ممکن ہے کہ تثنیہ کے لفظ سے اسکی دو بری خالتوں کیطرف اشارہ کرنا مقصود ہو ایک اس چیز کا اظہار جو حقیقت میں اسکو حاصل نہیں اور دوسرا جھوٹ کا اس طرح کھلم کھلا اظہار۔

حدیث باب سے امرین کا ثبوت

حدیث باب سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......ایک شخص اگر کسی کو کوئی چیز عطیہ دے، تو وہ شخص اگر طاقت رکھتا ہے تو اسکا بدلہ دے، اور اگر بدلہ نہیں دے سکتا تو کم از کم دینے والے کی مدح و ثناء کر دے، کیونکہ اس سے بھی شکر کا حق ادا ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص حیثیت کے باوجود نہ تو بدلہ دے اور نہ تعریف کرے تو اس نے اس نعمت کی ناشکری کی اور اس شخص کا حق

شکرادانہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہیے، اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ خوش ہوتے ہیں۔

(۲)......جس میں کوئی فضل وکمال اور کسی شی کی اہلیت نہ ہوتو بتکلف اپنے کو اسکا اہل ظاہر نہ کرے، یہ مکرو فریب، دھوکہ اور جھوٹ ہے، ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ الکوکب الدری، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۶/۳ ۷، تحفۃ الاحوذی ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۶/۴ ۱۵۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الثَّنَاءِ بِالْمَعْرُوْفِ

یہ باب احسان کے بدلے میں تعریف (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوْفًا فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ: جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ.

اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی بھلائی کی جائے پھر وہ نیکی کرنے والے سے کہے: جزاک اللہ خیرا (اللہ تعالیٰ تجھے بہتر بدلہ عطا فرمائے) تو اس نے (گویا) اعلیٰ درجہ کی تعریف کی۔

مشکل الفاظ کے معنی:- معروف: بھلائی، احسان، حسن سلوک، عطیہ، نیکی، بعض نسخوں میں یہ لفظ ''معروفاً'' زبر کے ساتھ ہے جبکہ بعض میں ''معروف'' پیش کے ساتھ ہے۔ صنع: مجہول کا صیغہ ہے: جس کے ساتھ (نیکی) کی گئی۔ فقد ابلغ فی الثناء: تحقیق اس نے اعلی درجہ کی تعریف کی۔

احسان کے بدلے جزاک اللہ کہنا

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی اور بھلائی کی جائے اور وہ نیکی کرنے والے سے جزاک اللہ خیرا کہدے تو اس نے اعلی درجہ کا شکرادا کردیا، اس نے گویا شکرادا کرنے سے اپنی بے بسی کو ظاہر کیا اور اسکا بدلہ اللہ کے حوالہ کردیا، اور جو دعا اپنی بے بسی اور تواضع کے ساتھ کی جائے، اللہ تعالیٰ اس کو ضرور قبول فرماتے ہیں، اور اسکا بہتر بدلہ عطا فرماتے ہیں، بعض حضرات کا مقولہ ہے:

اِذَا قَصُرَتْ يَدَاکَ بِالْمُكَافَاةِ فَلْيَطُلْ لِسَانُکَ بِالشُّكْرِ وَالدُّعَاءِ

”جب تمہارا ہاتھ احسان کا بدلہ دینے سے قاصر ہو تو پھر تمہاری زبان شکر اور دعا سے طویل (مشغول) ہو جانی چاہئے“

بہر حال روایتِ باب سے معلوم ہوا کہ احسان کے بدلے میں جزاک اللہ خیرا کہا جائے تو یہ شکر کی اعلیٰ قسم ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب البر والصلۃ، باب ھذا، ۱۵۶/۶۔

قد فرغت بتأليف "ابواب البر و الصلة" مساء الأحد لتسع خلت من شهر جمادى الثانية ۱۴۲۶ھ، الموافق ۸۱ يوليو، ۲۰۰۵ء والحمد الله على ذالک، وبعده" ابواب الطب"

ابواب الطب عن رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ سے طب سے متعلق ہدایات وغیرہ کے ابواب

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْحِمْيَةِ

یہ باب ان احادیث کے بارے میں ہے جن میں پرہیز کرنیکا ذکر ہے

عَنْ أُمِّ الْمُنْذِرِ، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَعَهُ عَلِيٌّ وَلَنَادَوَالِ مُعَلَّقَةٌ. قَالَتْ: فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْكُلُ، وَمَعَهُ عَلِيٌّ يَأْكُلُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَلِيٍّ: مَهْ مَهْ يَا عَلِيُّ فَإِنَّكَ نَاقِهٌ، قَالَ فَجَلَسَ عَلِيٌّ وَالنَّبِيُّ ﷺ يَأْكُلُ، قَالَتْ فَجَعَلَتُ لَهُمْ سِلْقًا وَشَعِيْرًا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: يَا عَلِيُّ مِنْ هَذَا فَأَصِبْ فَإِنَّهُ أَوْفَقُ لَكَ.

ام منذر کہتی ہیں کہ حضور ﷺ میرے ہاں تشریف لائے، اور حضرت علی آپ کے ساتھ تھے، ہمارے پاس کچی کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے تھے، کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے اس میں سے کھجور کھانی شروع فرمادی، آپکے ساتھ حضرت علی بھی کھانے لگے، تو حضور ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا: رک جا، رک جا اے علی، (یعنی کھجور نہ کھا) کیونکہ تم (بیماری سے ابھی ابھی صحت یاب ہوئے ہو، اسلئے) کمزور ہو، راوی کہتے ہیں کہ حضرت علی بیٹھ گئے اور آپ ﷺ تناول فرماتے رہے، ام منذر کہتی ہیں کہ میں نے آپ کیلئے چقندر اور جو بنائے، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے علی اس کو کھاؤ، کیونکہ یہ تمہارے لئے زیادہ موافق ہے۔

عَنْ قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمَانِ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا حَمَاهُ الدُّنْيَا كَمَا يَظَلُّ أَحَدُكُمْ يَحْمِي سَقِيْمَهُ الْمَاءَ.

قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو دنیا (کے مال ومتاع اور عہدوں) سے اسطرح بچاتے ہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ: ۔طب: (طا کے نیچے زیر): جسمانی وذہنی علاج، دوا، علم العلاج۔ام المنذر: یہ حضور ﷺ کی خالہ ہیں، ان کا نام سلمٰی بنت قیس ہے۔دوالٍ: دالیة کی جمع ہے: کچی کھجور کے خوشے، جنہیں پکنے کیلئے گھر میں لٹکا دیا جائے۔معلّقة: لٹکائے ہوئے۔مه مه: یہ اسم فعل ہے، اسکے معنی ہیں: رک جا، رک جا، ٹھہر، ٹھہر۔ناقهٌ: یہ نَقِہَ (باب سمع) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، وہ ضعف اور کمزوری جو بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد ہوتی ہے۔سلقا: (سین کے نیچے زیر اور لام کے سکون کے ساتھ) چقندر، ایک قسم کی سبزی جس کے پتے لمبے اور جڑ گہری ہوتی ہے، پکا کر کھائی جاتی ہے۔شعیر: جَو۔أصب: (ہمزے پر زبر اور صاد کے نیچے زیر کے ساتھ) صیغہ امر ہے: تم لے لو، کھالو۔حماه: اللہ تعالیٰ اس کو بچاتے ہیں، محفوظ رکھتے ہیں۔سقیم: مریض، بیمار۔

بیماری میں مضر اشیاء سے پرہیز کرنیکا حکم

ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص بیمار ہو، یا بیماری سے صحت کے بعد طبیعت میں نقاہت اور کمزوری ہو تو اسے ایسی تمام چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے، جو اس کیلئے نقصان دہ ہو سکتی ہیں، پرہیز نہ کرنا خلاف سنت عمل ہے، لہذا ایسی چیز کھانی چاہیے جو صحت کیلئے فائدہ مند ہو، نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کو نیم پختہ کھجور کھانے سے اس لئے منع کیا تھا کہ یہ ذرا ثقیل ہوتی ہے، اور حضرت علی ابھی ہی بیماری سے شفایاب ہوئے تھے، طبیعت میں کافی کمزوری تھی، خطرہ تھا کہ اگر کھجوریں کھالیں تو کہیں دوبارہ بیمار نہ ہو جائیں، اس لئے آپ ﷺ نے انہیں منع فرمایا، اور جب ام منذر نے چقندر اور جو تیار کر دیے تو پھر آپ ﷺ نے انہیں کھانے کا حکم دیا کہ یہ چیزیں تم کھالو، یہ خفیف اور ہلکی غذائیں ہیں، یہ تمہارے لئے زیادہ مناسب ہیں۔

بیماری میں پرہیز کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت: **وان کنتم مرضی او علی سفر** ......سے بھی ہوتا ہے کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو، بیماری میں پانی کا استعمال نقصان دہ ہو یا سفر میں پانی میسر نہ ہو تو تیمّم کیا جا سکتا ہے، اسلام نے یہ آسانی اسی لئے دی ہے، تاکہ انسان اپنی صحت کا خیال رکھے، اور ہر ایسی چیز سے پرہیز کرے جو صحت کیلئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ بذل المجہود، کتاب الطب، باب فی الحمیة، ۱۸۵/۱۶

باب کی دوسری حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱)...... جب اللہ تعالیٰ کسی سے پیار اور محبت کرتے ہیں تو اس کو عموماً دنیا کے ساز و سامان، مال و متاع اور عہدوں سے دور رکھتے ہیں، ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس کیلئے ان چیزوں کا حصول انتہائی مشکل اور ناممکن سا ہو جاتا ہے، تا کہ یہ بندہ دنیا کے بجائے آخرت کی تیاری میں مصروف رہے، کیونکہ دنیا کے دھندوں میں مشغولیت عموماً آخرت سے غافل کر دیتی ہے، اس لئے دنیا کے آرام و راحت اور عیش و عشرت کے بجائے آخرت کے کاموں پر توجہ دینی چاہیے۔

(۲)...... جب کوئی ماہر ڈاکٹر یہ بتادے کہ پانی یا فلاں چیز کا استعمال اس مرض میں مضر ہے، یا اس سے بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے، تا کہ جلد ہی صحت کی نعمت حاصل ہو جائے۔

تحفۃ الاحوذی، ابواب الطب، باب فی الحمیۃ ۶/۱۵۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الدَّوَاءِ وَالْحَثِّ عَلَيْهِ

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جن میں علاج اور اسکی ترغیب کا ذکر ہے

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ: قَالَتِ الْأَعْرَابُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَلَا نَتَدَاوَى؟ قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوَوْا، فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً أَوْ دَوَاءً، إِلَّا دَاءً وَاحِدًا، فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ: وَمَاهُوَ؟ قَالَ: الْهَرَمُ.

اسامہ بن شریک کہتے ہیں کہ کچھ دیہاتیوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول: کیا ہم علاج کرائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، اے اللہ کے بندو! علاج کراؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو بیماری بھی پیدا کی ہے تو اس کے لئے شفا کی کوئی چیز یا (فرمایا) کوئی دوا ضرور پیدا فرمائی ہے، سوائے ایک بیماری کے، انہوں نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول: وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ بڑھاپا ہے (کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے)

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔الحث علیہ: علاج کرانے کی ترغیب۔الا نتداوی: کیا ہم علاج نہ کرائیں۔تداووا: (یہ امر کا صیغہ ہے) تم علاج کراؤ۔لم یضع: نہیں پیدا کی نہیں اتاری۔الھرم: (ہاء اور

راء پرزبر کے ساتھ) بڑھاپا۔

بیماری میں علاج کرانے کا حکم

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......اگر انسان کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اپنی طاقت کے بقدر اسکا علاج ضروری کرانا چاہیے، آپ ﷺ نے علاج کرانیکا حکم دیا ہے، مرض کا علاج کرنا توکل کے خلاف نہیں، جسطرح بھوک کے ازالے کیلئے غذا اور پیاس مٹانے کیلئے پانی استعمال کرنا توکل کے منافی نہیں، اسی طرح دفع مرض کیلئے علاج کرنا بھی توکل کے منافی نہیں، اگر علاج کرنا توکل کے خلاف ہوتا تو حضور ﷺ ہرگز علاج نہ کراتے، کیونکہ آپ سید التوکلین ہیں، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ علاج بھی کرایا کرتے تھے، اور دوسرے ظاہری اسباب بھی اختیار فرمایا کرتے تھے، معلوم ہوا کہ علاج کرنا توکل کے خلاف نہیں، چنانچہ جمہور علماء کے نزدیک بیماری کا علاج کرانا مستحب ہے، اس سے ان حضرات کے نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے جو علاج معالجہ اور دوا کی افادیت و ضرورت سے انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہر چیز کیطرح مرض بھی قضاء وقدر کے زیر اثر ہے، اس لئے کسی بیماری کا علاج کرانا لا حاصل ہے۔

جمہور صحابہ و علماء کے دلائل حدیث باب وغیرہ ہیں، ان کا نظریہ یہ ہے کہ بے شک امراض کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، لیکن بیماریوں کے ازالے کے لئے دوا پیدا کرنے والا بھی اللہ پاک ہی ہے، جس طرح مرض و بیماری قضاء وقدر کے تابع ہے، اسی طرح علاج معالجہ کرنا بھی تقدیر الٰہی کا حصہ ہے، اس سے ثابت ہوا کہ علاج معالجہ توکل کے خلاف نہیں۔

(۲)......اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی شفاء اور اسکا علاج نازل فرمایا، اس لحاظ سے کوئی مرض لا علاج نہیں، بسا اوقات بعض بیماریوں کا علاج انسانوں کو معلوم نہیں ہوتا تو وہ انہیں لا علاج مرض قرار دیدیتے ہیں، حالانکہ وہ حقیقتاً لا علاج نہیں ہوتیں۔

(۳)......ظاہری اسباب کے اعتبار سے کسی بھی مرض کا علاج ضرور کرایا جائے لیکن ہر علاج سے ضروری نہیں کہ آدمی صحت مند بھی ہو جائے، صحت اس وقت ہوگی جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسکا حکم ہوگا، اس کے اذن

کے بغیر کوئی دوا کارگر نہیں ہوسکتی۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب ما انزل اللہ داءً الا أنزل لہ شفا ۱۰/۱۶۷۔

(۴)......علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بڑھاپے کو ایسا مرض قرار دیا جسکا کوئی علاج و دوا نہیں کیونکہ جسطرح امراض کیوجہ سے آدمی بسا اوقات اسقدر کمزور ہوجاتا ہے کہ موت تک پہونچ جاتا ہے ایسے ہی بڑھاپے کیوجہ سے بھی انسان موت کے دہانے تک پہونچ جاتا ہے، جسکا کوئی علاج نہیں، گویا بڑھاپا ایک اعلی قسم کا مرض ہے جسکا کوئی علاج نہیں۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۶۰

اسباب کی تین قسمیں

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ فائدہ ظاہر ہونے کے اعتبار سے اسباب کی تین قسمیں ہیں:

۱- سببِ یقینی، ۲-سببِ ظنی، ۳-سببِ وہمی

(۱)......سببِ یقینی: اس سے مراد وہ سبب ہے جسے اختیار کرنے پر نفع اور فائدہ عادۃً ضرور مرتب ہوتا ہے، مثلا کھانے کے بعد سیر ہوجانا، پانی پینے سے پیاس کا مٹ جانا، اسطرح کے اسباب کو اختیار کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے، اسکا ترک حرام ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی کھانا بالکل بند کردے اور اسی وجہ سے اسکی موت واقع ہوجائے تو وہ گنہگار ہوگا، یہ اسباب توکل کے منافی نہیں۔

(۲)......سببِ ظنی: اس سے مراد وہ اسباب ہیں جن کے اختیار کرنے پر اکثر نفع ہوجاتا ہے، مگر کبھی کبھار اسکا اثر ظاہر نہیں بھی ہوتا، جیسے علاج کے بعد صحت پانا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسے صحت حاصل ہوجائے، کیونکہ علاج سببِ یقینی نہیں کہ لازماً اس سے ضرور فائدہ ہو ہی جائے، چونکہ انسان سببِ یقینی اختیار کرنیکا مکلّف ہے نہ کہ سببِ ظنی کے اختیار کرنیکا، اس لئے علاج کرانا اس درجہ واجب نہ ہوگا کہ اگر کسی نے علاج نہیں کرایا اور موت واقع ہوگئی تو گنہگار ہوگا، یہ اسباب بھی توکل کے منافی نہیں ہیں۔

(۳)......وہمی سبب: ایسے اسباب جن کے اختیار کرنے پر نتیجہ ظاہر ہونیکا محض وہم ہو، یقین یا گمانِ غالب نہ ہو، تدبیر کے بعد مقصد کا حاصل ہونا محض وہمی ہو مثلا مال حاصل کرنے کی بڑی بڑی تدبیریں کی جاتی ہیں، وسیع پیمانے پر منصوبے بنائے جاتے ہیں، حالانکہ ان منصوبوں سے مال کا حصول یقینی اور ظنی نہیں بلکہ وہمی ہے، بسا اوقات تمام منصوبے بے کار ہوجاتے ہیں، ایسے ہی نقصان سے بچنے کیلئے منتر، اور تعویذ، جھاڑ

پھونک وغیرہ کہ ان کے فوائد موہوم ہوتے ہیں، ایسے اسباب کو اختیار کرنا گو شرعاً جائز ہے جبکہ وہ تعویذات وغیرہ شرکیہ اور کفریہ کلمات پر مشتمل نہ ہوں، اور ان کی وجہ سے عقیدے میں فساد کا اندیشہ نہ ہو لیکن ان اسباب کا ترک بہتر ہے کیونکہ یہ توکل کے منافی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے توکل کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں ہوگا۔

الفتاوی الھندیۃ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات ۳۵۵/۵، ط: رشیدیہ کوئٹہ، الکوکب الدری، ابواب الطب، باب ھذا، ۸/۳۔

بَابُ مَا جَاءَ مَا يُطْعَمُ الْمَرِيْضُ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں اس چیز کا ذکر ہے جو بیمار کو کھلائی جاتی ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أَخَذَ أَهْلَهُ الْوَعَكُ أَمَرَ بِالْحَسَاءِ فَصُنِعَ، ثُمَّ أَمَرَهُمْ فَحَسَوْا مِنْهُ، وَكَانَ يَقُوْلُ إِنَّهُ لَيَرْتُوْ فُؤَادَ الْحَزِيْنِ وَيَسْرُوْا عَنْ فُؤَادِ السَّقِيْمِ كَمَاتَسْرُوْا إِحْدَا كُنَّ الْوَسَخَ بِالْمَاءِ عَنْ وَجْهِهَا.

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کے گھر والوں کو بخار ہو جاتا تو آپ ﷺ انہیں ''حساء'' استعمال کرنیکا حکم دیتے، چنانچہ وہ تیار کیا جاتا، پھر (جب وہ تیار ہو جاتا تو) آپ انہیں حکم دیتے کہ وہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے پییں، اور آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ درحقیقت ''حساء'' غمزدہ آدمی کے دل کو طاقت پہونچاتا ہے اور بیمار کے دل سے رنج وغم کو اسطرح زائل کر دیتا ہے جسطرح تم (عورتوں) میں سے کوئی پانی کے ذریعہ اپنے چہرے سے میل دور کرتی ہے۔

مشکل الفاظ کی تشریح: ۔ **الـــوعک:** (واؤ پر زبر اور عین پر جزم کے ساتھ) بخار، شدید بخار، تپ۔ **حســاء:** (حاء پر زبر کے ساتھ) یہ کھانے کی ایک قسم ہے جو آٹے، دودھ یا پانی، اور گھی سے بنایا جاتا ہے، کبھی اسے میٹھا کرنے کیلئے شکر یا شہد بھی ملایا جاتا ہے، یعنی حلوا بنالیا جاتا ہے، اہل مکہ اسے ''حریرہ'' کہتے ہیں، بعض روایات میں اسے ''تلبینہ'' بھی کہا گیا ہے، گویا اس کھانے کے لئے تین لفظ حساء ''حریرہ'' اور ''تلبینہ'' استعمال کئے جاتے ہیں، معنی سب کے ایک ہی ہیں۔ **حسـوا منـه:** وہ اس حساء کو تھوڑا تھوڑا کر کے پیتے، چسکی لگا کر پیتے۔ **لیرتو:** قوت دیتا ہے، طاقت پہونچاتا ہے۔ **فواد:** دل۔ **الحزین:** غمزدہ، غمگین آدمی۔ **یسرو:** (بیمار

کے دل سے) غم دور کرتا ہے۔تسرو: وہ ہٹاتی اور زائل کرتی ہے (یعنی دھوتی ہے)۔الوسخ: (واؤ اور سین پر زبر کے ساتھ) میل۔

مریض کو ''حساء'' کھلایا جائے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ اس بات کی تعلیم دی ہے کہ مریض کو ہلکی غذاء کھلائی جائے تا کہ وہ اس کے معدے پر بوجھ نہ ہو، خاص طور پر جب بخار یا ایسا کوئی مرض ہو جس سے کمزوری زیادہ ہو جاتی ہے، ایسے میں ثقیل غذائیں عموماً نقصان پہونچاتی ہیں، اس لئے ایسی غذا استعمال کی جائے جو صحت کیلئے مفید ہو اور جس سے طبیعت پر بوجھ بھی نہ ہو، حدیث باب میں جس کھانے کا ذکر ہے، اسکی افادیت حضور اکرم ﷺ نے بتائی کہ یہ کھانا دل کو طاقت فراہم کرتا ہے، اور اس سے دل کے رنج وغم زائل ہو جاتے ہیں اور سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کھانے کے فائدے کو سمجھانے کیلئے عورتوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ جسطرح تم میں سے کوئی پانی سے اپنے چہرے کی میل کو دور کرتی ہے اسی طرح وہ کھانا آدمی کے غم کو دور کرتا ہے، اس میں خاص طور پر عورتوں سے خطاب یا تو اس وجہ سے کیا کہ عورتیں اپنے جسم کا میل دھونے اور اپنے چہرے کو صاف ستھرا رکھنے کی زیادہ کوشش کرتی ہیں یا اس وجہ سے کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت صرف عورتیں ہی موجود تھیں، اس لئے انہی کو خطاب کیا۔

تحفۃ الاحوذی، ۱۶۰/۶، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، الفصل الثانی، ۶۱/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ لَا تُكْرِهُوْا مَرْضَاكُمْ عَلَى الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ تم اپنے بیماروں کو کھانے پینے کیلئے مجبور نہ کرو

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاتُكْرِهُوْا مَرْضَاكُمْ عَلَى الطَّعَامِ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يُطْعِمُهُمْ وَيَسْقِيْهِمْ.

عقبہ بن عامر جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کیا کرو، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں کھلاتا اور پلاتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: لا تکرھوا: تم زبردستی اور جبر نہ کرو۔ مرضی: مریض کی جمع ہے :بیمار۔ تبارک و تعالیٰ: وہ بلند و برتر ہے۔

مریض کوزبردستی کوئی چیز نہیں کھلانی چاہیے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تیمارداری کا ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ مریضوں پر کھانے پینے کے معاملے میں زبردستی نہ کی جائے بلکہ ان کی منشا اور خواہش کے مطابق انہیں کھانے کی اشیاء دی جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ مریضوں کو ایسی قوت عطا فرماتے ہیں جو کھانے پینے کے قائم مقام ہوجاتی ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مریض کو بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کرنے پر صبر عطا فرماتے ہیں۔

موفق بن قدامہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اس ارشاد میں بڑا اہم ادب بیان فرمایا ہے جو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ جب کوئی مریض کھانے پینے سے گریز کرتا ہے تو اس وقت اسکی طبیعت مرض کے مقابلے میں مشغول ہوتی ہے، اگر اس وقت اس کو زبردستی غذا دی جائے تو مرض کے مقابلے سے طبیعت ہٹ جائیگی، فائدے کے بجائے نقصان ہوگا، یہی وجہ ہے کہ بعض بیماریوں میں مریضوں کو مخصوص ایام میں کھانے پینے سے منع کیا جاتا ہے، کیونکہ مریض کی طبیعت اس دن مرض کے مقابلے میں زیادہ مشغول ہوتی ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کیا کرو۔

الکوکب الدری، ۸۰/۳، تحفۃ الاحوذی، ۱۶۲/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ

یہ باب کلونجی (کے فوائد) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ النَّبِىَّ ﷺ قَالَ: عَلَيْكُمْ بِهَذِهِ الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ، فَإِنَّ فِيْهَا شِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلَّا السَّامَ، وَالسَّامُ: الْمَوْتُ.

حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر اس سیاہ دانے یعنی کلونجی کا

استعمال لازم ہے، کیونکہ اس میں ہر بیماری کا علاج ہے سوائے سام یعنی موت کے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:۔ الحبة السوداء/ الشونیز: کلونجی: یہ سیاہ دانہ ہوتا ہے، جو قدرے تلخ اور پھیکا ہوتا ہے۔

کیا کلونجی ہر بیماری کا علاج ہے

حدیثِ باب میں ہے کہ فان فیها شفاء ا من کل داء کلونجی میں ہر مرض کا علاج ہے، اس سے کیا مراد ہے، کیا اس میں عموم ہے کہ ہر مرض کا اس میں علاج ہے یا بعض کا، اس کے بارے میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... علامہ خطابی اور علامہ طیبی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم اگر چہ عام ہے لیکن یہ خاص طور پر انہی امراض میں زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے جو رطوبت اور بلغم سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ کلونجی کی تاثیر خشک اور گرم ہوتی ہے، اس لئے یہ ان بیماریوں کے علاج میں مفید ہوتی ہے جو اسکی ضد ہوں۔ شرح الطیبی، کتاب الطب والرقی، الفصل الاول ۲۸۶/۸۔

(۲)...... علامہ کرمانی، عینی اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں عموم ہی مراد ہے کہ کلونجی تمام بیماریوں کیلئے نفع بخش ہوتی ہے، کیونکہ حدیث میں موت کا استثناء کیا گیا ہے کہ کلونجی موت کے علاوہ تمام امراض کیلئے فائدہ مند ہوتی ہے اس سے عموم ثابت ہوتا ہے، چنانچہ کلونجی بعض امراض میں تنہا مفید ہوتی ہے جبکہ بعض میں کسی اور دوا کے ساتھ ملا کر، بشرطیکہ خاص مقدار اور مناسب ترکیب کے ساتھ اسے شامل کیا جائے۔

(۳)...... حافظ ابن عربی فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں گو کہ عموم ہے لیکن اس سے اکثر امراض مراد ہیں کہ کلونجی اکثر بیماریوں میں مفید ہوتی ہے، جسطرح کہ شہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فیه شفاء للناس (اس میں لوگوں کیلئے شفاء ہے) اس سے بظاہر عموم معلوم ہوتا ہے کہ شہد تمام امراض کا علاج ہے حالانکہ یہ مراد نہیں ہے کیونکہ تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ بعض بیماریوں میں شہد فائدے کے بجائے نقصان دہ ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ شہد تمام امراض کیلئے نہیں بلکہ اکثر امراض کیلئے مفید ہوتا ہے، ایسے ہی کلونجی بھی تمام امراض میں نہیں، بلکہ اکثر امراض میں فائدہ مند ہوتی ہے۔

(۴)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مریض کے حال کو دیکھ کر علاج تجویز فرماتے تھے، ممکن ہے جس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہو، اس وقت آپ کے سامنے ایسا کوئی مریض ہو جس کیلئے کلونجی ہی مفید تھی، آپ نے اس کے مزاج اور مرض کا اندازہ لگا کر فرمایا: فان فیھا شفاء من کل داء گویا یہ ارشاد اس مخصوص مریض کی حالت کے اعتبار سے ہے۔

کلونجی کے فوائد

کلونجی گرم اور خشک ہوتی ہے، بلغم اور رطوبت کو ختم کرتی ہے، پیٹ کی سوجن کیلئے مفید ہے، جسم پر نکلنے والے تل اور برص وغیرہ کو ختم کرتی ہے، دردسر کیلئے از حد مفید ہے، پیشاب اور حیض کو جاری کرتی ہے قوت باہ کو پختہ اور معتدل کرتی ہے، دانتوں کے درد اور بلڈ پریشر کیلئے بھی مفید ہوتی ہے .... فتح الباری، کتاب الطب، باب الحبۃ السوداء، ۱۰/۱۷۸، عمدۃ القاری ۲۱/۲۳۶، الکوکب الدری، ۳/۱۸۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، باب التداوی بالحبۃ السوداء ۴/۴۵۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ شُرْبِ أَبْوَالِ الإِبِلِ

عَنْ أَنَسٍ: أَنَّ نَاسًا مِنْ عُرَيْنَةَ قَدِمُوْا الْمَدِيْنَةَ فَاجْتَوَوْهَا، فَبَعَثَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ، وَقَالَ: اشْرَبُوْا مِنْ أَلْبَانِهَا وَأَبْوَالِهَا.

اس باب کی روایت کا ترجمہ اور مزید بحث کتاب الاطعمۃ کے باب ما جاء فی شرب أبوال الابل کے تحت گذر چکی ہے، یہاں ابواب الطب کی مناسبت سے تداوی بالحرام کا مسئلہ تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

حرام اشیاء سے علاج کرانیکا شرعی حکم

ضرورت کے وقت حرام اور نجس چیزوں کے ذریعہ علاج کرایا جاسکتا ہے یا نہیں، اس میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے:

(۱)......حضرات مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک حرام اشیاء سے علاج معالجہ مطلقاً ناجائز ہے۔

(۲)......حضرات شافعیہ کے نزدیک حدیث باب کی رو سے حرام اور نجس اشیاء سے علاج جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مسکر یعنی نشہ آور نہ ہوں، چنانچہ علامہ نووی شافعی فرماتے ہیں: مَذْهَبُنَا جَوَازُ التَّدَاوِیْ بِجَمِيْعِ النَّجَاسَاتِ سِوَى الْمُسْكِرِ (ہمارا مذہب یہ ہے کہ ہر قسم کی نجس چیز سے علاج جائز ہے جبکہ وہ نشہ آور نہ ہو)

(۳)......حنفیہ کے نزدیک فتوی اسپر ہے کہ حرام اور نجس اشیاء سے علاج اس وقت جائز ہے جب کوئی ماہر ڈاکٹر بتادے کہ اس مرض کا علاج حرام اور نجس دوا ہی سے ہوسکتا ہے، حلال اور پاک دوا اس کیلئے فائدہ مند نہیں ہے، لہذا اگر کسی مسلمان کو ایسا کوئی مرض لگ جائے جو حلال دوا سے نہیں بلکہ حرام سے درست ہوسکتا ہے تو اسے چاہیے کہ کسی مسلمان ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرے، اور حرام دوا اسی قدر استعمال کرے جس قدر اسے ضرورت ہو، ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب القسامۃ، حرمۃ التداوی، بالنجاسات ۳۰۱/۲۔

دلائل: — جو فقہاء حرام اشیاء سے تداوی اور علاج معالجہ کو ناجائز کہتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

(۱)......ابوالدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے مرض اور علاج دونوں کو نازل فرمایا ہے، ہر بیماری کیلئے دوا پیدا فرمائی ہے، لہذا تم علاج کرایا کرو لیکن حرام چیز سے علاج نہ کراؤ۔

(۲)......عبدالرحمٰن بن عثمان سے روایت ہے کہ ایک طبیب نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ مینڈک کو قتل کر کے دوا میں ڈالا جاسکتا ہے! حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ نہیں ڈال سکتے، کیونکہ وہ ناپاک ہے۔

(۳)......ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے شراب کے متعلق پوچھا؟ آپ نے اسے منع فرمایا، اس نے کہا: اے اللہ کے نبی: شراب تو ایک دوا ہے (لہذا اس سے علاج جائز ہونا چاہیے) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ وہ مرض ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب الادویۃ المکروھۃ ۱۵۸/۲۔

(۴)......حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيْ حَرَامٍ. (بے شک اللہ نے حرام چیز میں تمہارے لئے شفاء نہیں رکھی)۔ شرح معانی الآثار للطحاوی، کتاب الطھارۃ، باب بول ما یوکل لحمہ ۸۳/۱۔

(۵)......حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا کے ذریعہ علاج کرنے سے منع

فرمایا ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الادویة المکروهة، ۱۵۸/۲۔
مذکورہ روایات اور اس مفہوم کی دیگر احادیث سے یہ حضرات اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ حرام اور نجس چیز سے علاج کرنا بالکل ناجائز ہے، کسی حال میں جائز نہیں۔
لیکن جو حضرات ضرورت کے وقت حرام اور نجس اشیاء سے علاج کے جواز کے قائل ہیں وہ ان تمام احادیث کو اختیاری حالت پر محمول کرتے ہیں یعنی جب بیماری کا علاج کسی حلال اور پاک دوا سے ہوسکتا ہو تو اس وقت تداوی بالمحرمات ناجائز ہے، لیکن اگر حرام دواء کے علاوہ اور کوئی علاج ممکن یا فائدہ مند نہ ہو تو پھر بقدر ضرورت حرام اور نجس اشیاء کے ذریعہ علاج کرایا جاسکتا ہے، کیونکہ شدید ضرورت کے وقت ممنوع چیز کا استعمال جائز ہوتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الوضوء، باب الابل والدواب ۴۴۷/۱، عمدة القاری، ۲۹۰/۱۔

بَابُ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِسَمٍّ أَوْ غَيْرِهِ

یہ باب اس شخص (کی مذمت) کے بارے میں ہے جو اپنے نفس کو زہر وغیرہ سے قتل کر ڈالے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، أُرَاهُ رَفَعَهُ قَالَ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا بَطْنَهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا أَبَدًا، وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِسَمٍّ فَسَمُّهُ فِيْ يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا.

ابوصالح حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے آپ کو لوہے سے قتل کر ڈالا تو قیامت کے دن وہ اسطرح آئیگا کہ اسکا وہ لوہا اسکے ہاتھ میں ہوگا جہنم کے اندر، وہ اسے اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور ہمیشہ اسکی یہی حالت رہے گی، اور جس نے زہر پی کر اپنے کو مار ڈالا تو اسکا زہر (قیامت کے دن) اس کے ہاتھ میں ہوگا، جہنم کی آگ میں اسے گھونٹ گھونٹ کر پی رہا ہوگا، ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا. وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِسَمٍّ فَسَمُّهُ فِيْ يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا

أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدّٰی مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدّٰی فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے آپ کولوہے سے قتل کرڈالاتو (قیامت کے دن) اسکا لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا، جہنم کے اندر وہ اس سے اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا، اور ہمیشہ اسکی یہی حالت رہے گی، اور جس نے زہر پی کراپنے کو مار ڈالا تو اسکا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، جہنم کی آگ میں اسے گھونٹ گھونٹ کر پی رہا ہوگا، ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا، اور جو شخص پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو قتل کرڈالے تو وہ جہنم کی آگ میں گرتا رہے گا، ہمیشہ اسکی یہی حالت رہے گی۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِسَمٍّ عُذِّبَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص اپنے نفس کو زہر پی کر مار ڈالے، اسے عذاب جہنم دیا جائیگا۔

وَلَمْ يَذْكُرْ فِيْهِ: "خَالِداً مُخَلَّداً فِيْهَا اَبَداً" .... وَهٰذَا اَصَحُّ لِاَنَّ الرِّوَايَاتِ اِنَّمَا تَجِيْئُ بِاَنَّ اَهْلَ التَّوْحِيْدِ يُعَذَّبُوْنَ فِی النَّارِ ثُمَّ يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا يُذْكَرُ اَنَّهُمْ يُخَلَّدُوْنَ فِيْهَا.

امام ترمذی کہتے ہیں کہ اس روایت میں، "خالد مخلدافیها ابدا" (خودکشی کرنے والے کی جہنم میں ہمیشہ یہی حالت رہے گی) کے الفاظ نہیں ہیں، اس لئے یہ روایت صحیح ترین روایت ہے، کیونکہ دیگر روایات میں منقول ہے کہ اہل توحید کو (یعنی مؤمنین کو گناہ کے بقدر) جہنم میں عذاب دیا جائیگا اور پھر انہیں بالاخر وہاں سے نکال لیا جائیگا، ان روایات میں یہ مذکور نہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الدَّوَآءِ الْخَبِيْثِ يَعْنِی السَّمَّ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا یعنی زہر (کے استعمال) سے منع فرمایا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔یتوجّأ یجأ (یاء اور جیم پر زبر): چھری یا اور کوئی شئی مارتا ہے۔سم:(سین پر زبر، پیش اور زیر پڑھ سکتے ہیں) زہر۔یتحساہ: وہ اس کو گھونٹ گھونٹ کر پئے گا۔تردی: جو شخص پہاڑ سے گرا۔

خودکشی حرام ہے

مذکورہ احادیث سے یہ حکم معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے نفس کو قتل کردے خواہ زہر دے کر ہو یا گولی مار کر، پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر ہو یا کسی بھی ایسے طریقے سے جس سے انسان کی موت ہو جاتی ہے، یہ خودکشی ہے جو ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ انسان اپنے نفس کا مالک نہیں ہے، یہ نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے، اس میں ایسا کوئی تصرف نہیں کیا جاسکتا جس سے اس نفس کو تکلیف ہو یا وہ ہلاک ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ جب انسان کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اسے علاج کرانے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے۔

کیا خودکشی کرنیوالا ہمیشہ جہنم میں رہے گا

"خالداً مخلداً ابداً" اس جملے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن اگر خودکشی کرلے تو وہ ہمیشہ جہنم مین رہے گا، اسی سے استدلال کرکے معتزلہ (ایک گمراہ فرقہ) کہتے ہیں کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لے تو وہ دائما جہنم میں رہے گا، لیکن اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ مؤمن اپنے گناہوں کی سزا پاکر بالاخر ضرور جنت میں داخل کیا جائیگا، دائماً جہنم میں نہیں رہے گا۔

جمہور نے اس روایت کی متعدد تاویلیں کی ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں " خالداً مخلداً ابداً" کا اضافہ وہم کی وجہ سے ہو گیا ہے، یہ زیادتی ثابت نہیں ہے، کیونکہ دیگر روایات میں یہ لفظ نہیں ہے، کیونکہ مؤمن بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کئے جائیں گے۔

(۲)......یہ حکم اس آدمی سے متعلق ہے، جو اپنے نفس کو قتل کرنا جائز اور حلال سمجھتا ہے، ایسا شخص چونکہ کافر ہو جاتا ہے، اس لئے اسے ہمیشہ کیلئے جہنم میں رکھا جائیگا۔

(۳)...... یہ کلام محض زجر وتوبیخ اور ڈرانے دھمکانے کیلئے ہے، اس کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں۔

(۴)...... یا مطلب یہ ہے کہ اس جرم کی سزا تو یہی ہے کہ ایسے آدمی کو دائما جہنم میں ڈالا جائے لیکن اللہ تعالیٰ اس پر اہل توحید ہونے کی وجہ سے کرم فرمائیں گے اور بالآخر اسے جنت میں داخل کردیں گے۔

(۵)...... یا یہ کہ ''خلود'' کے معنی ''طویل ٹھہرنے'' کے ہیں، ''ابدا''، اسکی مزید تاکید ہے، ہمیشہ رہنا مراد نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ایک طویل عرصہ جہنم میں رہے گا۔

(۶)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حکم کسی خاص شخص کے بارے میں ہے جو آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ شخص ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گا۔ فتح الباری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی قاتل النفس ۲۹۱/۳، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء بہ ۳۰۴/۱۰۔

(۷)...... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''خلود'' سے وہ مدت مراد ہے جس میں اسے عذاب دیا جائیگا، عذاب جہنم میں ہمیشہ رہنا مراد نہیں ہے۔ الکوکب الدری ۸۳/۳

دواء خبیث سے کیا مراد ہے

حضور اکرم ﷺ نے ''خبیث دوا'' کے استعمال سے منع فرمایا ہے، ''خبیث دوا'' سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں شارحین حدیث کے اقوال درج ذیل ہیں:

(۱)...... اس سے حرام چیز مراد ہے کہ اس سے علاج جائز نہیں مثلاً زہر وغیرہ۔

(۲)...... ناپاک اور نجس چیز۔

(۳)...... وہ دوا جسے کھانے سے طبیعت گھن کرے اور کھانے پر مائل نہ ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ ''دواء خبیث'' سے زہر مراد لی جائے، کیونکہ بعض روایات میں اسکی تفسیر ''زہر'' سے کی گئی ہے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء، ۳۰۴/۱۰۔

زہر کا شرعی حکم

علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ زہر کے بارے میں تفصیل ہے، اسکی چار صورتیں ہیں، جن کے الگ

الگ احکام ہیں:

(۱)......ایسا تیز زہر جسکی تھوڑی سی مقدار بھی ہلاکت کا سبب بن جائے، اسکا استعمال علی الاطلاق حرام ہے، علاج کیلئے بھی اسکا استعمال جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة** (تم اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

(۲)......اگر زہر اس قسم کا ہو کہ اسکی کثیر مقدار تو یقیناً ہلاکت کا باعث ہو، لیکن اگر قلیل ہو تو اس میں ہلاکت کا خطرہ نہ ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ کثیر تو حرام ہے، البتہ قلیل مقدار کا استعمال اگر کسی دواء میں مفید ہو، ماہر مسلمان ڈاکٹر بتادے کہ اس کے بغیر دوا کارگر نہیں ہوگی، تو پھر اس قلیل مقدار کا استعمال دوا کے طور پر کیا جاسکتا ہے، تاہم زہر کے علاوہ اس کا اور کوئی متبادل تلاش کرتے رہنا چاہیے۔

(۳)......ایسا زہر جس کے بارے میں گمان غالب ہو کہ اس سے موت واقع ہو جائیگی، کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے موت واقع نہیں ہوتی، اس کا حکم بھی نمبر دو کی طرح ہے۔

(۴)......اگر زہر اس قسم کا ہو کہ اس کے استعمال سے غالب گمان ہے کہ موت واقع نہیں ہوگی، تاہم موت کا امکان ضرور ہے، یہ زہر اگر علاجاً مفید ہو تو دواء کے طور پر اسے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اسے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی، ۶/۱۶۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ التَّدَاوِيْ بِالْمُسْكِرِ

یہ باب اس بارے میں ہے کہ نشہ آور چیز سے علاج کرانا مکروہ ہے

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنَ وَائِلٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّهُ شَهِدَ النَّبِيَّ ﷺ وَسَأَلَهُ سُوَيْدُ بْنُ طَارِقٍ أَوْ طَارِقُ بْنُ سُوَيْدٍ عَنِ الْخَمْرِ، فَنَهَاهُ فَقَالَ: إِنَّا لَنَتَدَاوَى بِهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّهَا لَيْسَتْ بِدَوَاءٍ وَلٰكِنَّهَا دَاءٌ.

علقمہ بن وائل اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (اس وقت) سوید بن طارق نے حضور ﷺ سے شراب کے متعلق سوال کیا تو آپ نے اسے منع فرمایا، پھر انہوں نے معلوم کیا کہ ہم اسے دوا کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں تو حضور ﷺ نے

فرمایا: وہ دوا نہیں ہے بلکہ مرض اور بیماری ہے۔

نشہ آور چیز سے علاج کرانیکا حکم

حرام چیز خواہ وہ نشہ آور ہو یا نہ ہو، عام حالات میں اس سے علاج کرانا جائز نہیں ہے، لیکن اگر ایسی کوئی بیماری لگ جائے، جس میں حلال اور پاک دوا کارگر نہیں ہے، اور ماہر مسلمان ڈاکٹر کی رائے ہے کہ حرام دوا کے استعمال سے فائدہ یقینی ہے، تو پھر بقدر ضرورت اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس مسئلے کی مزید تفصیل ایک باب پہلے باب ما جاء فی شرب ابوال الابل میں "حرام اشیاء سے علاج کرانیکا شرعی حکم" کے تحت گذر چکی ہے، اسے دیکھ لیا جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السَّعُوْطِ وَغَيْرِهٖ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں سعوط وغیرہ کا ذکر ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ خَيْرَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ السَّعُوْطُ وَاللَّدُوْدُ وَالْحِجَامَةُ وَالْمَشِيُّ. فَلَمَّا اشْتَكَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَدَّهُ أَصْحَابُهُ. فَلَمَّا فَرَغُوْا قَالَ: لُدُّوْهُمْ. قَالَ: فَلُدُّوْا كُلُّهُمْ غَيْرَ الْعَبَّاسِ.

عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک سب سے بہتر دوا جن سے تم علاج کرتے ہو سعوط، لدود، حجامہ اور مشی ہیں، جب آپ ﷺ بیمار ہوئے تو آپ کے صحابہ نے آپ کے منہ میں دوا ٹپکائی، جب (دوا ٹپکانے سے) وہ فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: ان سب کے منہ میں دوا ٹپکا دو، ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت عباس کے علاوہ سب کے منہ میں دوا ٹپکائی گئی۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ خَيْرَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ اللَّدُوْدُ وَالسَّعُوْطُ وَالْحِجَامَةُ وَالْمَشِيُّ، وَخَيْرُ مَا اكْتَحَلْتُمْ بِهِ الْإِثْمِدُ. فَإِنَّهُ يَجْلُوْ الْبَصَرَ وَيُنْبِتُ الشَّعْرَ. قَالَ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَهٗ مُكْحُلَةٌ يَكْتَحِلُ بِهَا عِنْدَ النَّوْمِ ثَلَاثًا فِيْ كُلِّ عَيْنٍ.

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک سب سے بہتر دوا جس سے تم علاج کرتے ہو لدود، سعوط، حجامہ اور مشی ہیں، اور بہترین سرمہ جس کو تم استعمال کرتے ہو، اثمد ہے، کیونکہ وہ نگاہ کو تیز کرتا ہے اور پلکوں کے بال اگاتا ہے، ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ایک سرمہ دانی تھی، جس سے آپ سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ لگاتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ سعوط: (سین پر زبر اور عین کے اوپر پیش کے ساتھ): ناک میں ڈالنے یا ٹپکانے کی دوا۔ لدود: (لام پر زبر اور دال پر پیش کے ساتھ) وہ دوا جو منہ کے ایک طرف ڈالی جائے۔ حجامة: (حاء کے نیچے زیر) سینگی لگوانا یعنی سینگی کے ذریعہ خراب خون چوسنا۔ مشی: (میم پر زبر اور شین کے نیچے زیر کے ساتھ) دست آور دوا۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس دواء کو مشی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دوا استعمال کرنے کے بعد بار بار بیت الخلاء جانا پڑتا ہے۔ اشتکی: بیمار ہوئے۔ لَدَّہ: آپ ﷺ کے منہ میں (صحابہؓ نے) دوا ڈالی۔ لدوھم: (لام پر پیش اور دال پر پیش وتشدید) یہ امر کا صیغہ ہے: ان تمام کے منہ میں دوا ٹپکاؤ۔ فلدوا: چنانچہ ان سب کے منہ میں دوا ٹپکائی گئی، یہ ماضی مجہول جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اثمد: (ہمزے کے نیچے زیر کے ساتھ) یہ ایک قسم کا پتھر ہے، جو سرخی کیطرف مائل ہوتا ہے، عرب ممالک میں بکثرت پایا جاتا ہے، البتہ سب سے بہتر وہ پتھر ہے جو اصفہان سے لایا جاتا ہے، اس سے سرمہ بنتا ہے۔ مکحلة: (میم پر پیش، کاف کے سکون اور حاء کے پیش کے ساتھ) سرمہ دانی۔ یجلو: (نگاہ کو) تیز کرتا ہے۔ ینبت: اگاتا ہے۔ الشَعر: (شین اور عین پر زبر کے ساتھ) بال، اس سے آنکھوں کی پلکیں مراد ہیں، جن سے آنکھوں کی حفاظت ہوتی ہے۔

سعوط وغیرہ سے علاج کرانیکا ذکر

ان احادیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانے کے اعتبار سے چار دواؤں یعنی سعوط، لدود، حجامہ اور مشی کا ذکر فرمایا ہے کہ یہ بہترین علاج ہیں، لہذا مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اگر ماہر ڈاکٹر بتادے کہ اس مرض کیلئے فلاں دوا مفید ہے، تو پھر اسے سنت سمجھ کر ضرور علاج کرانا چاہیے، کسی ڈاکٹر کو مرض دکھائے بغیر اندازے سے کسی بیماری کا از خود علاج کرنا مناسب نہیں ہے، اس سے بسا اوقات بہت نقصان پہونچتا ہے۔

آپ ﷺ کے منہ میں دوا ٹپکانے کا واقعہ

نبی کریم ﷺ اپنی وفات کے قریب جب شدید بیمار ہوئے تو اہل بیت نے آپس میں علاج کے بارے میں مشورہ کیا کہ کیا جائے، آپ پر بیماری کی وجہ سے بیہوشی سی کیفیت طاری تھی، بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پہلی بار بیمار ہوئے اور پھر مرض شدید ہوگیا، صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ ذات الجنب یعنی نمونیہ میں مبتلا ہو گئے ہیں، جسکا علاج یہ ہے کہ آپ کو لدود یعنی منہ کی ایک جانب دوا ٹپکائی جائے، تا کہ اس سے شفا ہو جائے، نبی کریم ﷺ ان کی گفتگو سن رہے تھے، آپ نے اشارے سے منع فرما دیا کہ لدود نہ کیا جائے، کیونکہ یہ اس مرض کیلئے مفید نہیں ہے، آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس مرض میں آپکی وفات ہو جائیگی، لیکن اہل بیت نے یہ سوچ کر کہ عموماً مریض دوا کو پسند نہیں کرتا اس لئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے منہ میں دوا ٹپکا دی۔

آپ ﷺ کی طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی تو اسپر سخت ناگواری کا اظہار فرمایا اور سزا کے طور پر حکم دیا کہ جو حضرات لدود کے وقت یہاں موجود تھے، ان سب کے منہ میں دوا ٹپکائی جائے، اس سزا کا منشا قصاص یا ذاتی انتقام نہیں تھا کیونکہ آپ علیہ السلام ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے بلکہ مقصد ان کی تادیب و اصلاح اور تربیت تھی تا کہ آئندہ وہ اسطرح کبھی نہ کریں اور آخرت کی گرفت سے بھی بچ جائیں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم یہ سمجھے کہ آپ کو ذات الجنب ہے، اس لئے ہم نے لدود کیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نمونیہ تو عذاب کی ایک قسم ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اس میں مبتلا نہیں کرتے۔

چنانچہ سب کے منہ میں دوا ٹپکائی گئی، حضرت میمونہ روزے میں تھیں اس کے باوجود ان کے منہ میں لدود کیا گیا، کیونکہ آپ ﷺ کا حکم تھا، البتہ حضرت عباسؓ گو کہ وہ بھی لدود کے حق میں تھے لیکن چونکہ اس وقت جب آپ کے منہ میں دوا ٹپکائی گئی، موجود نہیں تھے اس لئے ان کے منہ میں دوا نہیں ڈالی گئی۔ تکملہ فتح الملہم ۴/۳۴۷، فتح الباری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ووفاتہ ﷺ ۱۸۶/۸، الکوکب الدری ۸۴/۳۔

سرمہ کے فوائد اور اس کے استعمال کی تاکید

نبی کریم ﷺ نے سرمہ استعمال کرنے کی تاکید فرمائی ہے، کیونکہ اس سے آنکھوں کی بیماری دور ہوتی ہے، بینائی میں اضافہ اور پلکوں کے بال بڑے ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ بڑے اہتمام کے ساتھ سرمہ لگاتے تھے اور تین تین بار ہر آنکھ میں سرمہ لگاتے تھے، اس لئے جب انسان رات کو سوئے تو اس سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرے، مقصد سنت کی اتباع ہو، زیب وزینت اور نمائش پیش نظر نہ ہو۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۷۱/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ الْكَيِّ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں آگ سے داغ کے (ذریعہ علاج کرانیکی) کراہت کا ذکر ہے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْكَيِّ. قَالَ: فَابْتُلِيْنَا فَاكْتَوَيْنَا فَمَا أَفْلَحْنَا وَلَا أَنْجَحْنَا.

عمران بن حصین سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آگ کے ذریعہ داغ دینے سے منع فرمایا، کہتے ہیں پھر ہم مبتلا ہوگئے (یعنی بیمار ہوگئے) تو ہم نے آگ کا داغ لگایا لیکن ہم کامیاب نہیں ہوئے اور اپنا مقصد ہم حاصل نہ کرسکے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: نُهِيْنَا عَنِ الْكَيِّ.

عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہمیں آگ کے ذریعہ داغ (لگا کر علاج کرانے) سے منع کیا گیا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرُّخْصَةِ فِيْ ذٰلِكَ

یہ باب اس حدیث کے بارے میں ہے جس میں آگ کے ذریعہ داغ لگانیکی اجازت کا ذکر ہے۔

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَوَى أَسْعَدَ بْنَ زُرَارَةَ مِنَ الشَّوْكَةِ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سعد بن زرارہ کو سرخ پھنسی کی وجہ سے داغ لگایا۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ الـکـیّ :(کاف پر زبر اور یاء کی تشدید کے ساتھ) لوہا تپا کر کھال کو داغ دینا، آگ یا لوہے سے جلانا۔ ابتـلـینا: یہ مجہول کا صیغہ ہے: ہم مبتلا ہو گئے یعنی ہم بیمار ہو گئے۔ اکتـوینا: ہم نے داغ لگایا۔ مـا أفـلـحـنـا: ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ ولا أنـجـحـنـا: اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کَوی: نبی کریم ﷺ نے داغ لگایا۔ الشوکۃ: (شین پر زبر کے ساتھ) وہ تکلیف دہ سرخ پھنسی جو منہ اور بدن پر نکلتی ہے۔

داغ لگا کر علاج کرانیکا شرعی حکم

آگ کے ذریعہ داغ لگا کر علاج کرانے میں چونکہ شدید تکلیف ہوتی ہے، جسم خراب ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات جسم کے دوسرے حصوں کیطرف بھی پھیل سکتے ہیں، اس لئے اگر اس مرض کا اس کے علاوہ اور کوئی بہتر علاج ممکن ہو تو ایسی صورت میں ”داغ“ کے ذریعہ علاج کرنا مکروہ اور خلاف اولیٰ ہوگا، لیکن اگر کسی مرض کا اور کوئی علاج مفید نہ ہو اور ماہر مسلمان ڈاکٹر یہ کہدے کہ اس مرض کا آخری علاج صرف ”داغنا“ ہی ہے، اور اس سے فائدہ بظاہر یقینی ہے تو پھر داغنے کا علاج بغیر کسی کراہت کے درست ہوگا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”کی“ کے بارے میں دو باب قائم کئے ہیں پہلے باب میں اسے استعمال کرنے کی کراہت کا ذکر ہے، جبکہ دوسرے باب میں علاج کے اس طریقے کی رخصت اور اجازت کا بیان ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں روایات دونوں طرح کی ہیں، بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے داغ کے ذریعہ علاج کرانے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے پہلے باب میں روایات ذکر فرمائی ہیں، آپ نے یہ طریقہ علاج پسند نہیں فرمایا، اسطرح کی روایات سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، دوسری طرف وہ روایات ہیں جن میں داغ کے ذریعے علاج کی اجازت کا ذکر ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے دوسرے باب میں روایت ذکر کی ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوہ احزاب کے موقع پر حضرت جابر کو داغ لگایا تھا، ایسے ہی ابوطلحہ کو عہد رسالت میں نمونیہ کی وجہ سے داغ لگایا گیا، دیگر بہت سے واقعات ہیں، جن میں بیشتر صحابہ کرام کے داغ لگانے کا ذکر ہے، ان تمام روایات سے اباحت اور جواز معلوم ہوتا ہے، بظاہر دونوں قسم کی روایات

میں تعارض ہے، اس لئے شارحین حدیث نے اسے حل کرنے کیلئے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں:

(۱)......ممانعت کی احادیث سے خلاف اولیٰ اور مکروہ مراد ہے جبکہ اس مرض کا اور کوئی بہتر علاج موجود ہو، کیونکہ اس طریقہ علاج میں مریض کو شدید تکلیف پہونچتی ہے، گویا وہ آگ کے ذریعہ اپنے کو عذاب دیتا ہے، اور بسا اوقات اس سے فائدے کے بجائے بہت زیادہ نقصان ہو جاتا ہے، اور جواز کی احادیث سے چونکہ اسکی اجازت معلوم ہوتی ہے اس لئے اگر اس مرض کا اور کوئی علاج فائدہ مند نہ ہو، اور ماہر ڈاکٹر اسی کا مشورہ دے، تو پھر اس سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں، بغیر کسی کراہت کے درست ہوگا۔

(۲)......ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ کسی کو واقعی کوئی مرض نہ ہو، محض حفاظتی نقطہ نظر سے پیشگی داغ لگوا لے لیکن اگر ایسی کوئی بیماری ہو، جسکا اور کوئی علاج فائدہ مند نہ ہو، تو پھر اس سے علاج کرانا درست ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''داغ لگانا'' دو طرح کا ہوتا ہے:

(*)......کی الصحیح: تندرست آدمی جسے کوئی مرض نہ ہو، حفاظت کے طور پر پیشگی ''داغ'' لگوائے تو یہ ممنوع ہے، اسی کے بارے میں کہا گیا ہے: لم یتوکل من اکتوی (جو داغ لگوائے، وہ متوکل نہیں)۔

(*)......کی الجرح: وہ شخص جو واقعی کسی مرض میں مبتلا ہو یا کسی زخم سے دوچار ہو، جس کا علاج ''داغ'' کے بغیر ممکن نہ ہو تو پھر اس میں کوئی ممانعت اور کراہت نہیں ہے۔

(*)......ممانعت کا حکم اس رسم سے متعلق ہے، جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھی، اہل عرب داغنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس میں اس قدر مبالغہ تھا کہ کسی ڈاکٹر اور طبیب سے مشورہ کے بغیر ہر مرض کیلئے داغنے کو ضروری قرار دیتے تھے، اسی وجہ سے یہ محاورہ کہا جانے لگا: أخر الدواء الکی (آخری علاج داغنا ہے) لیکن ان کا یہ طریقہ درست نہیں تھا کیونکہ ہر مرض کیلئے یہ طریقہ علاج مفید نہیں، نیز اہل عرب اس طریقے سے داغتے تھے کہ بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا تھا، یوں اس مریض کو گویا عذاب دیا جاتا تھا، اس طریقہ کار سے اسلام نے منع کیا۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، حقیقۃ الکی وحکمہ ۴/۳۳۷۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الطب، الفصل الاول ۸/۲۹۰۔

(۴)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے حضرت عمران بن حصین کو خاص طور پر داغ لگوانے سے منع کیا تھا، کیونکہ انہیں بواسیر کی بیماری تھی، جس میں داغنا انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے، لیکن جب مرض شدید ہوگیا تو صحابہ نے مجبوراً انہیں داغ لگوایا، مگر شفاء پھر بھی نہ ہوئی، کیونکہ اس کیلئے داغنا مفید نہیں تھا۔

فتح الباری، کتاب الطب، باب من اکتوی اوکوی غیرہ ۱۰/۱۹۱۔

حاصل یہ کہ ''داغنا'' مخصوص امراض میں اگرچہ مفید ہوتا ہے، لیکن چونکہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے، اسلئے اگر اس مرض کیلئے اور کوئی بہتر علاج ممکن ہو تو اسے اختیار کرلیا جائے، اور اگر دوسرا کوئی علاج ممکن یا فائدہ مند نہ ہو، تو پھر اس طریقے سے علاج کرایا جاسکتا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْحِجَامَةِ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں پچھنے لگانے (کی ترغیب) کا ذکر ہے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَحْتَجِمُ فِيْ الْأَخْدَعَيْنِ وَالْكَاهِلِ، وَكَانَ يَحْتَجِمُ لِسَبْعَ عَشْرَةَ وَتِسْعَ عَشْرَةَ وَإِحْدَى وَعِشْرِيْنَ.

حضرت انس سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ گردن کی دونوں جانب کی پوشیدہ رگوں اور کندھے پر پچھنے لگواتے تھے، اور آپ ﷺ سترہ، انیس اور اکیسویں تاریخوں میں پچھنے لگواتے تھے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ لَيْلَةِ أُسْرِيَ بِهٖ أَنَّهُ لَمْ يَمُرَّ عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا أَمَرُوْهُ: أَنْ مُرْ أُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ.

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اس رات کے بارے میں، جس میں رات کے وقت آپکو (معراج پر) لے جایا گیا، فرمایا کہ میں فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گذرا تو انہوں نے مجھے کہا: اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم فرمادیجئے۔

أَخْبَرَنَا عَبَّادُ بْنُ مَنْصُوْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ عِكْرِمَةَ قَالَ: كَانَ لِإِبْنِ عَبَّاسٍ غِلْمَةٌ ثَلَاثَةٌ حَجَّامُوْنَ، فَكَانَ اثْنَانِ يُغِلَّانِ عَلَيْهِ وَعَلٰى أَهْلِهٖ، وَوَاحِدٌ يَحْجِمُهُ

وَيَحْجِمُ أَهْلَهُ. قَالَ: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ: نِعْمَ الْعَبْدُ الْحَجَّامُ يَذْهَبُ بِالدَّمِ، وَيُخِفُّ الصُّلْبَ وَيَجْلُوْ عَنِ الْبَصَرِ. وَقَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَيْثُ عُرِجَ بِهِ مَا مَرَّ عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوْا عَلَيْكَ بِالْحِجَامَةِ. وَقَالَ إِنَّ خَيْرَ مَا تَحْتَجِمُوْنَ فِيْهِ يَوْمُ سَبْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ تِسْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ إِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ. وَقَالَ: إِنَّ خَيْرَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ السَّعُوْطُ وَاللَّدُوْدُ وَالْحِجَامَةُ وَالْمَشِيُّ. وَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَدَّهُ الْعَبَّاسُ وَأَصْحَابُهُ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لَدَّنِيْ؟ فَكُلُّهُمْ أَمْسَكُوْا فَقَالَ: لَا يَبْقٰى أَحَدٌ مِمَّنْ فِي الْبَيْتِ إِلَّا لُدَّ غَيْرُ عَمِّهِ الْعَبَّاسِ.

عباد بن مقصود کہتے ہیں کہ میں نے عکرمہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عبداللہ بن عباس کے تین غلام تھے جو پچھنے لگاتے تھے، دوغلام، ابن عباس اوران کے اہل وعیال کیلئے (اجرت پر سینگی لگا کر) آمدنی لاتے تھے، اور ایک غلام ابن عباس اوران کے گھر والوں کی سینگی لگاتا تھا، عکرمہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کس قدر اچھا ہے پچھنے لگانے والا غلام، جوزائد خون کو لے جاتا ہے، پیٹھ کے بوجھ کو ہلکا اور نگاہ کو تیز کرتا ہے اور عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ شب معراج میں فرشتوں کی کسی جماعت پر نہیں گذرے مگر یہ کہ انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ پر پچھنے لگوانا لازم ہے، اور فرمایا کہ وہ تاریخ جس میں تمہارا سینگی لگوانا بہتر ہے وہ سترہ، انیس اور اکیسویں تاریخیں ہیں، اور فرمایا: بیشک بہترین طریقہ علاج جو تم اختیار کرو وہ ناک کے ذریعہ دوا ٹپکانا، منہ کی ایک جانب دوا ٹپکانا، سینگی لگوانا اور دست آور دوا ہے، اور بیشک رسول اللہ ﷺ کے منہ میں حضرت عباس اور آپ کے صحابہ نے دوا ٹپکائی، تو آپ ﷺ نے معلوم کیا کہ کس نے میرے منہ میں دوا ٹپکائی ہے؟ سب خاموش رہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: گھر میں موجود کوئی بندہ باقی نہ رہے مگر یہ کہ اسکے منہ میں دوا ٹپکائی جائے سوائے آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس کے۔

نضر راوی کہتے ہیں کہ ''الدود'' کے معنی ''وجور'' کے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ الحجامة: (حاء کے نیچے زیر کے ساتھ) پچھنے لگانا یعنی سینگی کے ذریعہ خراب خون چوسنا۔ یحتجم: آپ ﷺ پچھنے لگواتے تھے۔ أخدعین: یہ تثنیہ ہے أخدع کا: گردن کے دونوں طرف دو پوشیدہ رگیں۔ الکاهل: کندھا۔ اسری به: (ماضی مجہول کا صیغہ ہے) آپ ﷺ کو رات کے وقت لے جایا گیا۔ حجامون: حجام کی جمع ہے: پچھنے لگانے والے۔ یغلان: (یاء پر پیش اور غین کے نیچے زیر) وہ دونوں غلام پچھنے لگا کر (حضرت عباس اور ان کے اہل وعیال کے پاس) آمدنی لاتے ہیں۔ یحتجم: وہ پچھنے لگاتا ہے۔

نضر کہتے ہیں کہ لدود اور وجور دونوں ہم معنی ہیں یعنی منہ کی ایک جانب دواڈالنا جبکہ بعض حضرات نے ان میں فرق بیان کیا ہے کہ لدود کے معنی تو یہی ہیں اور ''وجور'' اس دوا کو کہا جاتا ہے جو گلے میں ڈالی جائے۔ عارضۃ الاحوذی، کتاب الطب، باب السعوط ۲۰۳/۸۔

پچھنے لگانے کی ترغیب اور اس کے مناسب اوقات

اس باب کی احادیث میں پچھنے لگانے کی ترغیب کو بیان کیا گیا ہے اور اس کا کہ سینگی کس دن اور کن اوقات میں لگانا زیادہ موزوں اور فائدہ مند ہوتا ہے۔

پہلے زمانے میں جسم سے زائد خون نکالنے کا یہی طریقہ رائج تھا، عرب کا علاقہ چونکہ آب وہوا کے لحاظ سے گرم ہے، وہاں کے لوگوں کی غذا بہت مقوی ہوتی، جسکی وجہ سے ان کے بدن میں خون کی فراوانی ہو جاتی، پھر سینگی کے ذریعہ اس خون کو نکالا جاتا، تاکہ جسم سے بھاری پن، سستی اور مختلف امراض سے بچاؤ ہو سکے، کیوں کہ اطباء نے اپنے تجربات کی روشنی میں لکھا ہے کہ بدن کے مختلف حصوں پر مختلف بیماریوں کیلئے پچھنے لگانا نہایت ہی مفید ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے بھی ایک سے زیادہ بار جسم کے مختلف مقامات پر سینگی لگوائی ہے، آپ کے صحابہ کے ہاں بھی یہ طریقہ علاج عام تھا، اس لئے کسی ماہر مسلمان ڈاکٹر سے مشورہ کے بعد آج بھی اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو بہر حال مفید ہوگا۔

یوں تو یہ سینگی ضرورت کے وقت کسی بھی وقت اور کسی بھی دن اور تاریخ میں لگائی جاسکتی ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ سے رات کے وقت اور روزے کی حالت میں بھی پچھنے لگوانا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سینگی

کسی بھی وقت لگوائی جاسکتی ہے تاہم احادیث میں خاص طور پر ان اوقات اور ایام کو بھی ذکر کیا گیا ہے جن میں اگر سینگی لگائی جائے تو اس کا فائدہ عام اوقات اور ایام کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ حدیث میں مہینے کی سترہ، انیس اور اکیس تاریخ کو پچھنے لگانا زیادہ بہتر قرار دیا ہے، اسی طرح جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار اور پیر کے دن پچھنے لگوانے چاہئیں، بدھ اور ایک روایت میں منگل کے دن میں اسکی ممانعت آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: منگل کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جاری ہونے والا خون بند نہیں ہوتا۔

''حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اطباء کے ہاں دن کے دوسرے تیسرے حصے میں پچھنے لگانا زیادہ بہتر اور فائدہ مند ہوتا ہے، غسل اور ہمبستری کے بعد پچھنے لگانا درست نہیں، ایسے ہی زیادہ بھوک یا زیادہ شکم سیری کی حالت میں بھی ٹھیک نہیں، مہینہ کے آخری پندرہ دنوں میں یہ لگائے جائیں، چودہ تاریخ سے ۲۳ تاریخ تک کے دن اس کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہوتے ہیں، کیونکہ جسم کے اخلاط (خون، سودا، صفرا اور بلغم) میں مہینے کی ابتداء میں ہیجان اور جوش ہوتا ہے جبکہ مہینے کے آخر میں یہ پر سکون ہوتے ہیں، اس لئے درمیان کا عرصہ بہتر ہے، کیونکہ وہ اخلاط کے اعتدال کا زمانہ ہوتا ہے۔

فتح الباری، کتاب الطب، باب ای ساعۃ یحتجم ۱۰/۱۸۴

باب کی پہلی حدیث میں نبی کریم ﷺ کے پچھنے لگوانے کا ذکر ہے کہ آپ نے گردن کی دونوں طرف کی پوشیدہ رگوں اور کندھے پر پچھنے لگوائے، اور آپ ﷺ سترہ، انیس اور اکیس تاریخ میں یہ لگواتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے آپ کا گذر ہوتا تو وہ آپ سے گذارش کرتے کہ اپنی امت کو پچھنے لگانے کا حکم دیدیجئے۔

اس میں لفظ ''مُر'' گو کہ صیغہ امر ہے، لیکن اس سے وجوب مراد نہیں بلکہ استحباب مراد ہے کہ سینگی کے ذریعہ خون نکالنا بہتر اور مستحب ہے، ضروری نہیں، البتہ اگر کوئی مرض ایسا ہو کہ اسکا علاج سینگی لگائے بغیر نہ ہو سکتا ہو تو پھر پچھنے لگوانا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے۔

پچھنے لگوانا ان لوگوں کیلئے مفید ہوتا ہے، جن کے مزاج میں حرارت ہو، برودت نہ ہو، لہذا جن لوگوں کے مزاج میں ٹھنڈک زیادہ ہو، حرارت نہ ہو، ان کیلئے پچھنے لگوانا زیادہ مفید نہیں رہتا، چنانچہ امام طبری نے سند

صحیح کے ساتھ ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ: ''جب آدمی کی عمر چالیس سال کو پہونچ جائے تو پچھنے نہ لگائے جائیں'' کیونکہ اسکی طبیعت میں کمزوری اور ضعف شروع ہو چکا ہے، اب ہر دن اسکا قدم مزید بڑھاپے کیطرف بڑھ رہا ہے، اب اگر اسے سینگی لگائی گئی تو اسکا ضعف اور بڑھ جائیگا، اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس عمر میں اسے پچھنا نہ لگایا جائے۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب الطب، باب لکل داء دواء ۳۴۴/۴۔

تیسری روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... سینگی لگانے کا پیشہ اور اسکی آمدن درست ہے، نبی کریم ﷺ نے پچھنے لگانے والے آدمی کو بہترین انسان قرار دیا ہے، کیونکہ وہ فاسد اور زائد خون کو ختم کرتا ہے، پیٹھ کو ہلکا کرتا ہے، اور بینائی کو تیز کرتا ہے، یہ تمام اس کے فوائد اور منافع ہیں، پچھنے لگانے کے بے شمار فوائد کی وجہ سے ہی معراج کے موقع پر تمام فرشتے نبی کریم ﷺ کو یکے بعد دیگرے اسکی ترغیب دیتے رہے، عہدِ رسالت اور عہد صحابہ میں یہی طریقہ علاج رائج تھا، حضرت عبداللہ بن عباس کے تین غلام تھے، ان میں دو کا یہی مشغلہ تھا کہ لوگوں کو پچھنے لگا کر آمدنی حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے اہل وعیال کیلئے لاتے تھے، اور ایک غلام آل عباس کو سینگی لگانے کیلئے مامور تھا۔

(۲)...... پچھنے لگانے کی سب سے مناسب تاریخ سترہ، انیس اور اکیس ہے، ان میں اگر سینگی لگوائی جائے تو اس کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے، اور آپ ﷺ نے سعوط، لدود، حجامہ اور مشی کو بہترین طریقہ علاج قرار دیا۔

''وان رسول اللہ ﷺ لدہ العباس وأصحابہ''

اس جملے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عباس اور آپ کے صحابہ نے نبی کریم ﷺ کے منہ میں دوا ٹپکائی ہے، جبکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات میں اسکی تصریح ہے کہ حضرت عباس لدود کے وقت موجود نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے بعد میں حضرت عباس کے علاوہ گھر میں موجود دوسرے افراد کو لدود کرنے کا حکم دیا، اس لئے اس جملے کے بارے میں شارحین کے دو قول ہیں:

(۱)...... یہ جملہ چونکہ صحیحین کی روایات کے مخالف ہے، اس لئے اسکا اعتبار نہیں۔ تحفۃ الأحوذی، ۱۷۷/۶۔

(۲)...... یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے میں حضرت عباس کے مشورے کو بیان کرنا پیش نظر ہو، کیونکہ حضرت عباس اگر چہ لدود کے وقت تو موجود نہیں تھے، لیکن ابتداء میں صحابہ کے ساتھ اس مشورے میں شریک تھے کہ نبی کریم

ﷺ کے منہ میں دوا ٹپکائی جائے، لدود کے وقت موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان کے منہ میں دوا نہیں ٹپکائی گئی۔ الکوکب الدری ۳/۸۵۔

غیر عمہ العباس (سوائے آپ کے چچا عباس کے، باقی سب کے منہ میں دوا ڈالی گئی)

بعض نے کہا کہ حضرت عباس روزے میں تھے یا چچا ہونے کی وجہ سے ادب واحترام کی بناء پر انہیں لدود نہیں کیا گیا، لیکن یہ وجہیں درست نہیں، صحیح یہی ہے کہ لدود کے وقت وہ موجود نہیں تھے، اس لئے سزا کے طور پر ان کے منہ میں دوا نہیں ڈالی گئی، چنانچہ صحیحین کی روایات میں اسکی تصریح ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۱۷۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّدَاوِيْ بِالْحِنَّاءِ

یہ باب مہندی سے علاج کے بارے میں ہے

عَنْ عَلِيِّ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ جَدَّتِهٖ، كَانَتْ تَخْدِمُ النَّبِيَّ ﷺ قَالَتْ: مَا كَانَ يَكُوْنُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَرْحَةٌ وَلَا نَكْبَةٌ إِلَّا أَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ أَضَعَ عَلَيْهَا الْحِنَّاءَ.

علی بن عبید اللہ اپنی دادی سلمٰی سے روایت کرتے ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی خدمت کرتی تھیں، وہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب بھی کوئی زخم ہو جاتا (خواہ وہ تلوار یا چھری وغیرہ سے ہو) اور (یا) پتھر اور کانٹے سے، تو آپ ﷺ مجھے حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی لگاؤں۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔الحناء: (حاء کے نیچے زیر اور نون کی تشدید کے ساتھ) مہندی، مہندی کے پتے۔ قرحة: (قاف پر زبر اور پیش دونوں طرح استعمال ہے) زخم جو تلوار اور چھری سے ہو۔ نکبة: (نون پر زبر کے ساتھ) وہ زخم جو پتھر یا کانٹے کی وجہ سے ہو۔ جدته: علی بن عبید اللہ کی دادی جنکا نام سلمٰی ہے، یہ صحابیہ ہیں اور ابو رافع کی اہلیہ ہیں۔

مہندی سے زخموں کا علاج

مہندی کی تاثیر چونکہ ٹھنڈی ہوتی ہے، اس لئے یہ زخم کی حرارت اور درد کو کم کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ

نبی کریم ﷺ زخم کے علاج کیلئے مہندی کا استعمال فرماتے تھے، مہندی خارش، بدن کی سوزش اور پیروں کے تلووں کیلئے بھی نافع ہوتی ہے، اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان کی خارش کیلئے فائدہ مند ہوتی ہے، بسا اوقات انگلیوں کے درمیان جو کھال گلنے لگتی ہے، اس کیلئے بھی یہ مفید ہوتی ہے۔

"ما کان یکون" اس جملے میں دو فعل اکٹھے جمع ہو گئے ہیں جو عربی قواعد کے اعتبار سے بظاہر صحیح نہیں، اس لئے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں "یکون" یا تو زائد ہے اور "قرحۃ" "کان" کا اسم ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ زائد نہ ہو، بلکہ تاویل کر کے یہاں لفظ "قرحۃ" محذوف مانا جائے، اصل عبارت یوں ہوگی ما کان قرحۃ تکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ شرح الطیبی، کتاب الطب والرقی، الفصل الثانی ۲۹۷/۸، مرقاۃ المفاتیح ۳۱۲/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ کَرَاهِیَةِ الرُّقْیَةِ

یہ باب دم اور جھاڑ پھونک کی کراہت کے بارے میں ہے

عَنْ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ اکْتَوَی أَوِ اسْتَرْقَی فَهُوَ بَرِیْءٌ مِنَ التَّوَکُّلِ.

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص داغ لگوائے یا دم اور جھاڑ پھونک کرائے تو وہ توکل سے بری ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی الرُّخْصَةِ فِیْ ذٰلِکَ.

یہ باب ان روایات پر مشتمل ہے جو دم اور جھاڑ پھونک کی اجازت کے بارے میں ہیں

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَخَّصَ فِی الرُّقْیَةِ مِنَ الْحُمَةِ وَالْعَیْنِ وَالنَّمْلَةِ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی زہریلے جانور (مثلاً بچھو، سانپ وغیرہ) کے ڈسنے، نظر بد اور پہلو کی پھنسیوں کیلئے جھاڑ پھونک کرنے کی اجازت دی ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِکٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَخَّصَ فِی الرُّقْیَةِ مِنَ الْحُمَةِ

وَالنَّمْلَةِ.

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی زہریلے جانور کے ڈسنے اور پہلو کی پھنسیوں کیلئے دم کرانے کی اجازت دی ہے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ.

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دم اور جھاڑ پھونک کا زیادہ اثر اور فائدہ نہیں ہوتا مگر نظر بد یا کسی بھی زہریلے جانور کے کاٹنے (کی صورت) میں (یعنی ان دو صورتوں میں دم کا اثر اور نفع زیادہ ہوتا ہے)

مشکل الفاظ کے معنی:۔ رقية: (راء پر پیش اور قاف کے سکون کے ساتھ) دم، جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، وہ کلام جسے پڑھ کر دم کیا جاتا ہے جیسے قرآن مجید کی آیت۔ اکتوی: اس نے داغ لگوایا۔ استرقی: اس نے دم اور جھاڑ پھونک کرائی۔ حمة: (حاء پر پیش میم پر زبر اور میم کی تخفیف کے ساتھ) کسی بھی زہریلے جانور مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کا ڈس جانا، ڈنگ۔ تکملة فتح الملهم ۳۲۲/۴۔ عين: انسان یا جنات کی نظر بد۔ نملة: (نون پر زبر اور میم کے سکون کے ساتھ) اس کے اصلی معنی ''چیونٹی'' کے ہیں، لیکن حدیث میں اس سے وہ پھنسیاں مراد ہیں جو پہلو اور پسلیوں پر نکلتی ہیں، بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں، اور جو شخص ان پھنسیوں میں مبتلا ہو جائے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان پھنسیوں کی جگہ چیونٹیاں رینگ رہی ہوں، اور غالباً اسی مناسبت سے ان پھنسیوں کو ''نملہ'' (چیونٹی) کہا جاتا ہے۔ مرقاة المفاتيح، كتاب الطب ۳۰۲/۸۔

جھاڑ پھونک کا شرعی حکم

دم اور جھاڑ پھونک شرعاً جائز ہے، جبکہ اس میں تین شرطیں پائی جائیں:

(۱)...... یہ جھاڑ پھونک قرآن مجید کی کسی آیت یا اللہ تعالیٰ کے اسماء یا صفات میں سے کسی سے کیا جائے۔

(۲)...... یہ کلمات عربی زبان میں ہوں، جنکے معنی معلوم اور شریعت کے موافق ہوں، یا عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہوں، لیکن ان کا مفہوم واضح ہو، اور شریعت کے خلاف نہ ہو، لہذا ایسے کلمات جو کفر و شرک کے معنی پر مشتمل ہوں یا جو بے معنی اور غیر واضح ہوں ان سے دم کرنا جائز نہیں البتہ بعض ایسے دم اور منتر جن کے الفاظ و

کلمات صحیح احادیث میں منقول ہیں، لیکن ان کے معنی اور مفہوم معلوم نہیں ہیں تو ان کے ذریعہ دم اور جھاڑ پھونک کرنا شرعا جائز ہے۔

(۳)......جھاڑ پھونک کو مؤثر بالذات اور سبب حقیقی نہ سمجھا جائے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب الرقی بالقرآن ۱۰/۲۴۰، تکملۃ فتح الملھم ۴/۲۹۵

دم اور جھاڑ پھونک کے بارے میں روایات چونکہ دونوں طرح کی ہیں، بعض سے اسکا جواز جبکہ دوسری بعض سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے، اس لئے امام ترمذی نے یہاں دو باب قائم کئے ہیں، پہلے باب میں ان روایات کا ذکر ہے جن سے جھاڑ پھونک کی کراہت اور دوسرے باب کی احادیث سے اسکی اجازت ثابت ہوتی ہے، بظاہر ان روایات میں تعارض ہے، شارحین حدیث نے اس تعارض کے حل کیلئے تین قول ذکر کئے ہیں:

(۱)......ممانعت کی روایات اس جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں جس کے الفاظ غیر عربی ہوں، اور ان کے معنی معلوم نہ ہوں، کیونکہ اس میں بسا اوقات کفر کا اندیشہ ہوتا ہے، اور جواز والی احادیث سے وہ دم مراد ہے جو قرآنی آیات یا منقول کلمات اور اذکار سے کیا گیا ہو۔

(۲)......جھاڑ پھونک کی حرمت ان لوگوں سے متعلق ہے جو اسے مؤثر بالذات اور سبب حقیقی سمجھتے ہوں جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا نظریہ تھا، لیکن اگر اسے مؤثر بالذات نہ سمجھا جائے، صرف ظاہری اسباب کی حد تک سنت سمجھ کر اسے اختیار کر لیا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ جسمانی علاج کیلئے دوا ایک سبب ظاہری ہے سبب حقیقی نہیں، لہذا جواز کی روایات اس صورت کے بارے میں ہیں۔

(۳)......زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جن الفاظ وکلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے وہ یا تو کفر و شرک کے مفہوم پر مشتمل ہوتے، یا مہمل اور بے معنی ہوتے اور بہر صورت اسے وہ سبب حقیقی کے طور پر اثر انداز سمجھتے تھے، ان غلط نظریات کو ختم کرنے کیلئے نبی کریم ﷺ نے ابتداءِ اسلام میں دم اور جھاڑ پھونک سے منع فرمایا تھا یا ان لوگوں کی تعریف فرمائی تھی جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے تھے، پھر جب لوگوں کے ذہن رسمِ جاہلیت سے صاف ہو گئے تو پھر آپ ﷺ نے ممانعت کا حکم منسوخ کر دیا اور اس کی اجازت دیدی، لہذا ممانعت کی

روایات ابتداءِ اسلام کے زمانے سے متعلق ہیں اور جواز کی روایات اس زمانے سے متعلق ہیں جس میں ممانعت کا حکم منسوخ ہوگیا تھا۔ تحفۃ الاحوذی، ۱۸۲/۶۔

اسباب وذرائع اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں

من اکتوی.........من التوکل

شارحین حدیث نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں:

۱)...... جو شخص بغیر کسی ضرورت اور مجبوری کے اسباب صحت میں خوب مبالغہ کرتا ہے یا وہ جو اپنی بیماریوں کو جھاڑ پھونک کے ایسے کلمات سے دور کرنے میں مبالغہ کرتا ہے جو کلمات نہ تو کتاب اللہ کے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کے اسماء یا صفات میں سے ہیں، اور نہ ہی مسنون اذکار ہیں، تو ایسا شخص توکل کے مقام سے گرجاتا ہے، کیونکہ اسکی نظر اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے اسباب پر جمی ہوئی ہے، وہ اسباب وذرائع اختیار کرنے میں زیادہ منہمک ہے، حالانکہ مؤمن کے ایمان کامل کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسکی نظر ہر معاملے میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو، اور اسباب پر صرف ذرائع کی حد تک ہو، اسی لئے امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر سے نکلتے وقت دروازے پر تالہ لگائے، اور اس کے باوجود پڑوسی کو بھی خیال رکھنے کی تاکید کرے تو ایسا شخص متوکل لوگوں کی فہرست سے نکل جاتا ہے، کیونکہ اسکی نظر اسباب پر مبالغہ کی حد تک پہونچ چکی ہے جو مقامِ توکل کے بہر حال منافی ہے۔ مرقاۃ المفاتیح کتاب الطب والرقی، ۳۲۲/۸۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کو امراض وآفات کے دفعیہ کیلئے اسباب وذرائع اختیار کرنے چاہئیں، یہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکل کے منافی نہیں جبکہ انہیں مؤثر بالذات نہ سمجھا جائے، ہاں اگر کوئی شخص ولایت اور بزرگی کے بلند مقام پر اسطرح پہونچ جائے کہ دنیا کے ساز وسامان اور اسباب سے بالکل اعراض کرتا ہو، دنیا کی کسی چیز کے ساتھ اسکا لگاؤ نہ ہو تو ایسا شخص اسباب وذرائع اختیار کرنے سے مستثنیٰ ہوجاتا ہے، یہ توکل کا سب سے اعلیٰ مقام ہوتا ہے جو ہر شخص کو حاصل بھی نہیں ہوتا، ایک روایت کے مطابق ایسے ستر ہزار لوگوں کے بارے میں ہی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انہیں بغیر حساب کے جنت میں داخل کیا جائیگا، یہ لوگ امراض کے علاج کیلئے نہ تو داغ لگواتے تھے اور نہ جھاڑ پھونک کراتے، محض اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد

اور توکل کرتے رہے۔

لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اس مقام کو حاصل کرنیکا انسان مکلّف نہیں ہے اور ویسے بھی اس زمانے میں امراض وغیرہ میں ترک اسباب کیا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ طبیعتوں میں کمزوری اور ضعف غالب ہے، اسلئے احکام شریعت پر اعتدال کے ساتھ عمل کرتے رہنا چاہیے، اور امراض وغیرہ سے دفاع کیلئے اسباب کی حد تک علاج وغیرہ ضرور کرایا جائے، لیکن نظر ہر موقع پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی رہے، کیونکہ وہی ہر مرض سے شفا اور ہر غم سے نجات دینے والے ہیں، ہر موقع پر اسی کو پکارا جائے اور اسی سے مانگا جائے، یہی چیز دنیا اور آخرت میں کامیابی کا باعث ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۱۸۲/۶

(۲)......بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص یہ نظریہ رکھے کہ بیماری سے شفا اور صحت ان دو چیزوں یعنی داغنے اور جھاڑ پھونک کرانے میں ہی منحصر ہے، صرف انہی سے ہی شفا حاصل ہوتی ہے، تو ایسا شخص توکل سے بری ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی سبب کے بغیر بھی شفا دینے پر قادر ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۲۲۳/۸

لا رقية الا من عين او حمة

اس حدیث میں جھاڑ پھونک کا ذکر اگرچہ دو چیزوں میں ہے، لیکن اس سے حصر مراد نہیں ہے، ایسے ہی پہلی حدیث میں تین چیزیں یعنی حمہ، عین اور نملہ کا ذکر فرمایا، اس سے دوسرے امراض وغیرہ میں جھاڑ پھونک اور دم کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، ان چیزوں میں چونکہ دم اور جھاڑ پھونک کا اثر زیادہ مفید اور زیادہ بہتر ہوتا ہے، اس لئے ان احادیث میں خاص طور پر انہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۱۸۱/۶۔

زہریلے جانور یعنی سانپ بچھو وغیرہ کے ڈسنے کا دم

جب کوئی زہریلا جانور ڈس لے تو احادیث میں اسپر دم کرنے کے مختلف اذکار منقول ہیں، ان میں سے کوئی بھی کیا جا سکتا ہے، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)......سانپ وغیرہ ڈس لے تو اسپر سات مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر لیا جائے۔

(۲)......ایک دفعہ دوران نماز بچھو نے نبی کریم ﷺ کو ڈس لیا، آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ بچھو پر خدا

کی لعنت ہو، نہ نماز پڑھنے والے کو چھوڑتا ہے نہ کسی دوسرے کو، اس کے بعد پانی اور نمک منگایا، اور نمک کو پانی میں گھول کر ڈسنے کی جگہ پر پھیرتے رہے، ساتھ ساتھ سورۃ کافرون اور معوذتین یعنی آخری دوسورتیں پڑھتے رہے۔ حصن حصین مترجم، ص:۳۱۴، پانچویں منزل بروز پیر، ط: مکتبہ مدینہ لاہور۔

(۴)......حضرت عبداللہ بن زید کہتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں زہریلے جانور کے کاٹنے کا دم پیش کیا (کہ یہ صحیح ہے یا نہیں) آپ نے اسے سن کر اجازت دی اور فرمایا کہ یہ جنات کے معاہدے کی چیزوں میں ہے، اسے سن کر وہ دور چلے جاتے ہیں اور فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کلمات زہریلے جانوروں سے عہد کے طور پر لئے تھے، اس لئے ان کلمات کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ دم یہ ہے:

" بسم اللہ، شَجَّةٌ، قَرْنِيَّةٌ، مِلْحَةُ بَحْرٍ قَفْطاً. تکملۃ فتح الملہم، کتاب الطب، باب استحباب الرقیۃ من العین......۳۱۹/۴۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ ہم نے اپنے مشائخ سے اسی طرح سنے ہیں، اور کتابوں میں بھی اسی طرح منقول چلے آرہے ہیں، ان کے معنی معلوم نہیں ہیں، لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کلمات سے دم کرنیکی اجازت دی ہے اس لئے ان سے دم کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۳۰۲/۸

جبکہ بعض حضرات نے اسکا یوں ترجمہ کیا:

"میں اللہ تعالیٰ کا نام لیکر زہر اتارتا ہوں، یہ ایک زخم ہے، سینگ یعنی ڈنک والا، اور (زہر اتارنے کیلئے) اچھے بدلے کے طور پر یہ سمندری نمک ہے"

اس دم کا طریقہ یہ ہے کہ پانی میں نمک ملا لیا جائے، پھر اس نمکین پانی کو ڈسی ہوئی جگہ پر ڈالتے رہیں اور مذکورہ کلمات پڑھتے رہیں۔ حصن حصین (ص:۳۱۵)۔

زخم اور پھوڑے پھنسی کا دم

نبی کریم ﷺ زخم اور پھوڑے پھنسی پر ان کلمات سے دم فرماتے:

بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا، بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا، لِيُشْفٰى بِهٖ سَقِيْمُنَا، بِاِذْنِ رَبِّنَا.

میں اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتا ہوں، یہ ہماری زمین کی مٹی ہے، جو ہم میں سے بعض

کے لعاب دہن سے ملی ہوئی ہے، تا کہ اس کے ذریعے ہمارا مریض ہمارے رب کے حکم سے شفایاب ہو جائے۔

اس دم کا طریقہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ شہادت کی انگلی سے لعاب مبارک لیتے، پھر اسے مٹی میں رکھتے، اور مٹی لگ جانے کے بعد اس انگلی کو مریض کے زخم یا پھنسی پر رکھ کر مذکورہ کلمات ارشاد فرماتے، اس لئے جب کبھی دم کرنا ہو، تو اسی مسنون طریقے کے مطابق کرنا چاہیے۔

مٹی کی تاثیر چونکہ ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے، اس لئے اس سے زخم کی جگہ اور پھوڑے پھنسی ٹھیک ہو جاتے ہیں، اور زخم خشک ہونے لگتا ہے، اسی طرح لعاب میں بھی یہ خصوصیت ہے۔

لیکن امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان طبی توجیہات اور تاویلات کی سرے سے ضرورت نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت کا اثر ہوتا ہے کہ مریض کا زخم اور پھوڑے پھنسی درست ہو جاتے ہیں۔ تکملة فتح الملهم، کتاب الطب، باب استحباب الرقیہ ۴/۳۲۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرُّقْيَةِ بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ

یہ باب معوذتین یعنی آخری دو سورتوں سے دم اور جھاڑ پھونک کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ مِنَ الْجَانِّ وَعَيْنِ الْإِنْسَانِ حَتَّى نَزَلَتِ الْمُعَوِّذَتَانِ، فَلَمَّا نَزَلَتْ أَخَذَ بِهِمَا وَتَرَكَ مَا سِوَاهُمَا.

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جنات اور انسان کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، یہاں تک کہ معوذتین نازل ہو گئیں، جب یہ دو سورتیں نازل ہو گئیں تو آپ ﷺ نے (دم کیلئے) انہیں اختیار فرمالیا اور ان کے علاوہ (پناہ مانگنے کے دوسرے کلمات) کو چھوڑ دیا۔

معوذتین سے جھاڑ پھونک کا ذکر

نبی کریم ﷺ ان دو سورتوں کے نزول سے پہلے ان کلمات سے پناہ مانگتے: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْجَانِّ وَعَيْنِ الْإِنْسَانِ (میں جنات اور انسان کی نظر بد سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں) پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ پر معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس نازل فرمائیں تو پھر آپ اکثر انہی کے

ذریعہ پناہ مانگتے تھے اور دوسرے کلمات سے بہت کم پناہ مانگتے تھے۔

ان میں سے پہلی سورت یعنی سورۃ فلق میں دیناوی آفات سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے، اور دوسری سورت یعنی سورہ ناس میں اخروی آفات سے بچنے کیلئے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ بہت سی مستند احادیث میں ان دونوں سورتوں کے بڑے فضائل اور برکات منقول ہیں، چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)......حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی بیماری پیش آتی تو یہ دونوں سورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کر کے سارے بدن پر پھیرتے تھے، پھر جب مرض وفات میں آپکی بیماری میں شدت آگئی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپ کے ہاتھوں پر دم کر دیتی تھی، آپ اپنے تمام بدن پر پھیر لیتے تھے، میں یہ کام اس لئے کرتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں کا بدل میرے ہاتھ نہیں ہو سکتے تھے۔ صحیح مسلم، کتاب الطب، باب استحباب رقیۃ المریض ۲/۲۲۳۔

(۲)......ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

(۳)......عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے معوذتین پڑھائیں، پھر انہیں مغرب کی نماز میں بھی پڑھا، اور پھر فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کو سوتے وقت بھی پڑھا کرو اور اٹھتے وقت بھی۔

سنن النسائی، کتاب الاستعاذۃ ۲/۳۱۲۔

حاصل یہ کہ ان دونوں سورتوں میں بے شمار انوار و برکات اور منافع ہیں، نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام بڑے اہتمام سے انہیں پڑھا کرتے، اس لئے تمام مسلمانوں کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے، کیونکہ ان دونوں سورتوں کی جادو کے توڑ، نظر بد اور تمام روحانی اور جسمانی آفات کو دور کرنے میں بڑی تاثیر ہے، ہو سکے تو ہر نماز کے بعد، ورنہ صبح و شام تو انہیں ضرور پڑھنا چاہئے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرُّقْيَةِ مِنَ الْعَيْنِ

یہ باب نظرِ بد کے دم اور جھاڑ پھونک کے بارے میں ہے

عَنْ عُبَيْدِ بْنِ رِفَاعَةَ الزُّرَقِيِّ أَنَّ أَسْمَاءَ بِنْتَ عُمَيْسٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ

وُلْدَ جَعْفَرٍ تُسْرِعُ إِلَيْهِمُ الْعَيْنُ أَفَأَسْتَرْقِيْ لَهُمْ؟قَالَ: نَعَمْ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ.

اسماء بنت عمیس نے عرض کیا یا رسول اللہ: بیشک جعفر طیار کی اولاد (جو مجھ سے ہے، وہ چونکہ زیادہ خوبصورت وخوب سیرت ہے اس لئے ان) کو بہت جلد نظر لگتی ہے، تو کیا میں ان کیلئے جھاڑ پھونک کرا سکتی ہوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں، کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھنے والی ہوتی تو نظر بد، اس سے آگے بڑھ جاتی، (یعنی نظر کا اثر یقیناً ایک سخت چیز ہے، لہذا اس کے دفعیہ کے لئے جھاڑ پھونک کرانا جائز ہے)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ يَقُوْلُ: أُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ. وَيَقُوْلُ: هٰكَذَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يُعَوِّذُ إِسْحَاقَ وَإِسْمَاعِيْلَ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کیلئے پناہ کی دعا فرماتے اور ان الفاظ سے دم فرماتے: ''اعیذ کما بکلمات اللہ التامۃ، من کل شیطان وھامۃ، ومن کل عین لامۃ'' (میں تم دونوں کیلئے اللہ کے ان کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں جو مکمل ہیں، ہر شیطان اور زہریلے جانور (کے شر) سے، اور ہر اس نظرِ بد سے جو جنون پیدا کر دے) اور نبی کریم ﷺ فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت اسحاق اور اسماعیل علیہما السلام کیلئے اسی طرح پناہ کی دعا کرتے تھے۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ العین: نظر بد خواہ دشمنی یا حسد کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے ہو۔ نظر لگانے والے کو ''عائن'' اور جس شخص کو نظر لگتی ہے اسے ''معیون'' اور ''مَعِین'' کہتے ہیں۔ **ولد**: (واؤ پر پیش اور لام کے سکون کے ساتھ): اولاد۔ **تسرع**: نظر جلدی لگ جاتی ہے۔ **أفأسترقی**: تو کیا میں جھاڑ پھونک کرا سکتی ہوں۔ **سابق القدر**: تقدیر سے سبقت کرنے والی۔ **کلمات اللہ**: اس سے قرآن مجید مراد ہے، بعض نے کہا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی اسماء اور صفات مراد ہیں۔ **التامۃ**: علامہ جزری فرماتے ہیں کہ اللہ کے کلمات کو''

تامہ" اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ نقص اور عیب سے پاک ہیں۔ بعض نے کہا کہ " تـامـه " کے معنی یہ ہیں کہ وہ کلمات پناہ مانگنے والے کیلئے نافع اور مصائب وآفات سے حفاظت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ هـــامة: (میم کی تشدید کے ساتھ) ایسا زہریلا جانور جس کے کاٹنے سے انسان ہلاک ہوجائے جیسے سانپ اسکی جمع " هوام " ہے، اور جو جانور زہریلا ہو لیکن اس کے کاٹنے سے عام طور پر ہلاکت نہ ہوتی ہو تو اسے " سـامـة" کہا جاتا ہے مثلاً بچھو بھڑ وغیرہ، اور کبھی " هـامـة" کا لفظ ہر اس جانور کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو زمین پر چلتا ہے جیسے حشرات الارض وغیرہ۔ کـل عين لامة: اس سے ہر وہ بدنظری مراد ہے جو باعث ضرر اور تکلیف ہو۔ "نہایہ" میں ہے کہ " لـمـم" جنون اور پاگل پن کی ایک قسم ہے جو انسان کو عارض ہوتی ہے، ترجمہ یہ ہوگا: ہر اس نظر بد سے پناہ مانگتا ہوں جو جنون پیدا کردے۔

نظر بد کا علاج قرآن وحدیث سے

امام ترمذی رحمہ اللہ اس باب کی احادیث سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نظر بد لگ جائے تو قرآن و حدیث کے کلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کر کے اسے ختم کرنا جائز ہے، پہلی حدیث میں حضرت اسماء کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ نظر کا دم ضرور کرانا چاہیے، یہ انتہائی سخت چیز ہے، اور فرمایا کہ اگر تقدیر سے کوئی شی سبقت کرسکتی تو وہ نظر بد ہوتی، لیکن چونکہ تقدیر سے کوئی چیز سابق نہیں ہوسکتی اس لئے نظر بد بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اس سے نظر کی سختی اور اسکی جلد تاثیر کو بیان کرنا مقصود ہے، اور دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ کے عمل کا ذکر ہے کہ آپ حضرت حسن وحسین کو نظر بد کا دم فرماتے تھے، قرآن وحدیث سے نظر بد کے علاج کی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... سورۃ اخلاص، سورہ فلق اور سورہ ناس پڑھ کر اسپر دم کیا جائے۔

(۲)...... سورہ قلم کی آخری آیات: وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ، وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ، پڑھ کر اس آدمی پر دم کیا جائے تو نظر بد کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الطب ۳۰۳/۸، معارف القرآن ۵۳۹/۸۔

(۳)...... نظر لگانے والا اگر " مَاشَآءَ اللّٰهُ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ " کہدے تو اسکی وجہ سے بھی نظر بد

کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ فتح الباری ۲۵۲/۱۰

(۴)...... باب کی دوسری روایت میں ہے: أُعِیْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ...... الخ یہ پڑھکر اسپر دم کیا جائے۔

(۵)...... بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْکَ مِنْ کُلِّ شَيْئٍ يُؤْذِيْکَ، وَمِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْکَ، بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْکَ۔ تکملۃ فتح الملہم ۲۹۶/۴

''میں اللہ کے نام سے تیرا علاج کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو تجھے تکلیف پہونچائے، ہر نفس کے شر اور حاسد نظر سے، اللہ ہی تجھے شفا دے گا، میں اللہ کے نام سے آپ پر دم کر رہا ہوں'' یہ ذکر پڑھکر اسپر دم کیا جائے

(۶)...... بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْکَ، وَاللّٰهُ يَشْفِيْکَ مِنْ کُلِّ دَآءٍ فِيْکَ، مِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ

''میں اللہ کے نام سے آپ پر جھاڑ پھونک کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بیماری سے شفا دے گا، اور گرہوں پر پڑھ پڑھکر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے (ان تمام شرور وآفات سے محفوظ رکھے گا)۔

(۷)...... بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْکَ مِنْ کُلِّ دَآءٍ يَّشْفِيْکَ، مِنْ شَرِّ کُلِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ وَ مِنْ شَرِّ کُلِّ عَيْنٍ۔

''میں اللہ تعالیٰ کے نام سے آپ کی ہر قسم کی بیماری کا علاج کرتا ہوں، اللہ ہی آپ کو شفا دے گا، ہر حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے اور ہر نظر کے شر سے (محفوظ رکھے گا) مرقاۃ المفاتیح ۳۰۱/۸۔

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ وَالْغُسْلُ لَهَا

یہ باب اس بیان میں ہے کہ نظرِ بد ثابت ہے اور اس کے لئے (یعنی اسے دور کرنیکا ایک طریقہ) غسل ہے۔

عَنْ حَيَّةَ بْنِ حَابِسٍ التَّمِيْمِيِّ، حَدَّثَنِيْ أَبِيْ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَا شَيَّ فِي الْهَامِ وَالْعَيْنُ حَقٌّ.

حیہ بن حابس اپنے والد حابس تمیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا: ''ہام'' کی کوئی حقیقت نہیں، اور نظر بد ثابت ہے ۔(یعنی نظر لگنا ایک حقیقت ہے، اسکا انکار نہیں کیا جاسکتا)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ، وَإِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تقدیر پر کوئی چیز غالب آسکتی ہوتی تو نظر بد اسپر غالب آجاتی (لیکن تقدیر پر چونکہ کوئی چیز غالب نہیں آسکتی اسلئے نظر بھی اسپر غالب نہیں آسکتی، کیونکہ اللہ نے پیدائش سے پہلے ہی ہر چیز کی تقدیر لکھدی ہے) اور جب تم سے (نظر بد کے علاج کیلئے) غسل کا مطالبہ کیا جائے تو غسل کرلیا کرو۔

''ھام'' کی تین تفسیریں

اہل عرب میں اسلام سے پہلے طرح طرح کی رسمیں رائج تھیں، ایسے ہی ان کے ہاں ''ھـام'' کے بارے میں بھی کچھ فاسد خیالات پائے جاتے تھے، نبی کریم ﷺ نے '' **لا شـی فـی الھام** '' سے ان کے اعتقادات کی نفی فرمادی کہ شرعاً '' **ھام** '' کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں ہے۔

ھام (میم کی تخفیف اور تشدید کے ساتھ) کی تین تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱)......زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا خیال تھا کہ جو آدمی قتل کیا جائے، اور اسکا بدلہ نہ لیا جائے تو اس مقتول کے سر سے '' **ھـامـہ** '' یعنی ایک کیڑا نکلتا ہے جو اسکی قبر پر گردش کرتا رہتا ہے، اور کہتا ہے: **اسـقـونـی اسقونی** (مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ یعنی میرا بدلہ لو) اگر اسکا انتقام لے لیا جائے تو چلا جاتا ہے، ورنہ اوپر ہی رہتا ہے، اسی کے بارے میں ایک عرب شاعر نے کہا:

يَا عَمْرو! إلَّا تَدَعْ شَتْمِيْ وَ مَنْقَصَتِيْ أَضْرِبْكَ حَتّٰى تَقُوْلَ الْهَامَّةُ اسْقُوْنِيْ

اے عمرو! اگر تم نے میری مذمت اور عیب جوئی ترک نہ کی تو میں آپکو قتل کردونگا، یہاں تک کہ '' **ھـامہ** '' کہے گا **اسقونی** (یعنی میرا انتقام لو)

اس تفسیر کے اعتبار سے '' **لا شیئ فی الھام** '' کے معنی ہونگے: ''اس عقیدے کی کوئی اصل نہیں کہ مقتول کے

سر سے ھامہ یعنی کیڑا نکلتا ہے“

(۲)......ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ ”ھـام“ سے ایک پرندہ مراد ہے ”جسے اردو میں ”الو“ کہتے ہیں، اہل عرب اس سے بدشگونی لیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ الو جس گھر پر آکر بیٹھ جائے تو اس میں کوئی موت ضرور واقع ہوتی ہے اور اس میں غم وحزن اور تباہی آجاتی ہے۔

اس تفسیر کی رو سے ”لا شیئ فی الھام“ کے معنی ہونگے: لا شؤم بالبومة (الو میں کوئی بدشگونی اور نحوست نہیں)، اسلئے عربوں کا خیال غلط ہے۔

(۳)......ابوعبید کہتے ہیں کہ عرب یہ سمجھتے تھے کہ میت کی ہڈیاں یا اسکی روح ” ھام“ یعنی ایک پرندے کی شکل اختیار کرلیتی تھی، اس پرندے کو ”صَدیٰ“ کہا جاتا تھا، پھر یہ پرندہ اڑتا رہتا تھا۔

اس معنی کے اعتبار سے ”لا شی فی الھام“ کے معنی ہونگے: لا حیاۃ لھامة المیت (میت کے ہامہ یعنی پرندے کی کوئی زندگی نہیں ہوتی)، لہذا یہ بے اصل بات ہے، جسکا کوئی اعتبار نہیں۔ فتح الباری ۲۹۵/۱۰، تکملۃ فتح الملہم ۳۷۲/۴

نبی کریم ﷺ نے ان تمام خیالات اور مفروضوں کی نفی فرمادی کہ ان کی شرعاً کوئی حقیقت نہیں ہے۔

نظر کی تاثیر ایک حقیقت ہے

”والعین حق“ اس سے دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ نظر بد کا لگ جانا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، یہ زمانہ جاہلیت کے دوسرے باطل اوہام ونظریات کیطرح کوئی باطل چیز نہیں بلکہ حق اور ثابت ہے، بعض لوگ یہ کہہ کر اسکا انکار کر دیتے ہیں کہ ”سب کچھ تقدیر سے ہوتا ہے، نظر بد کچھ نہیں کرسکتی“ ان کی یہ بات دو وجہ سے درست نہیں:

(۱)......ایک تو اس وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ نے جب فرمادیا ”والـعـیـن حق“ کہ نظر کی تاثیر ثابت اور حق ہے، تو پھر اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۲)......دوسرا اس وجہ سے کہ نظر بد کی تاثیر اور اس کے نتیجے میں فساد و بگاڑ اور تباہی یہ بھی تقدیر ہی کا ایک حصہ ہے کیونکہ ”نظر بد“ مؤثر بالذات نہیں، اللہ ہی نے اس نظر میں یہ تاثیر پیدا فرمائی ہے اور اس کے ردِعمل میں جو کچھ رونما ہوا، وہ بھی اسی کی قدرت سے ہوا، لہذا نظر بد کی تاثیر اور اس کے برے نتائج بھی تقدیر ہی کا حصہ

ہیں، اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں ایسا ہی لکھا ہوا تھا، کیوں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تقدیر کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، کوئی چیز تقدیر کے دائرے سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر بالفرض کوئی چیز ایسی طاقت رکھ سکتی کہ وہ تقدیر کے دائرے کو توڑ کر نکل جائے تو وہ نظر بد ہوتی کہ وہ تقدیر کو بھی پلٹ دیتی اور اسپر غالب آجاتی، لیکن چونکہ تقدیر پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی اسلئے نظر بد بھی غالب نہیں آسکتی، یہ بھی تقدیر کے تحت ہی ہے، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظر بد کی تاثیر انتہائی سخت اور جلد اثر کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعضوں کی نظر میں اللہ تعالیٰ نے جادو کیطرح تاثیر رکھی ہے کہ جس چیز کو لگ جاتی ہے تو اسکی ہلاکت وتباہی اور نقصان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

نظر بد کی وجہ سے فساد کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اسپر علماء کرام نے بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، جسکا حاصل یہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر سے غیر محسوس انداز سے ایسی تباہ کن اور زہریلی شعاعیں نکلتی ہیں، جو معیون (جس کو نظر لگی ہے) کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں، اور فساد وتباہی کا ذریعہ بنتی ہیں، یہ زہریلی شعاعیں بعض لوگوں میں زیادہ اور بعض میں کم ہوتی ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے اجسام وارواح میں مختلف خصوصیتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں، جن کا مختلف انداز سے ظہور ہوتا ہے، ایک شخص کا چہرہ شرم کی وجہ سے سرخ ہو جاتا ہے، خوف کے وقت چہرہ زرد پڑ جاتا ہے، مریض کو دیکھ کر بعض لوگ بیمار ہو جاتے ہیں، یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روحوں میں بہت سی تاثیرات رکھی ہیں، لیکن چونکہ نظر کا تعلق روح کے ساتھ انتہائی گہرا ہوتا ہے تو فعل کی نسبت روح کی بجائے نظر کی طرف کر دی جاتی ہے، اس وجہ سے نہیں کہ نظر مؤثر بالذات ہے بلکہ صرف اتصال اور قرب کی وجہ سے ورنہ تاثیر تو روح کی وجہ سے ہوتی ہے اور ارواح اپنی طبائع، قوی، کیفیات اور خواص کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں، بعض روحیں بغیر کسی اتصال کے اپنی شرانگیزی کی وجہ سے محض دیکھنے سے ہی دوسرے کے بدن پر اثر انداز ہو جاتی ہیں''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالٰی کیطرف سے تاثیر جسمانی اتصال پر منحصر نہیں ہے، کبھی تو اسکی وجہ سے ہوتی ہے، کبھی آمنے سامنے ملاقات سے، کبھی محض دیکھنے سے، کبھی روح کی توجہ ڈالنے سے، اور بسا اوقات یہ تاثیر محض توہم اور خیالات کی وجہ سے بھی واقع ہو جاتی ہے، گویا نظر لگانے والے کی آنکھ سے معنوی طور پر ایک تیر نکلتا ہے، جو دوسرے کے بدن پر لگ کر اثر انداز ہو جاتا ہے، اور تباہی پھیلا دیتا ہے'' فتح الباری، کتاب الطب، باب رقیۃ العین ۱۰/۲۴۵۔

حقیقت یہ ہے کہ نظر کی تاثیر اور اسکے برے اثرات کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے نظر کا لگ جانا ایک ثابت شدہ امر ہے، اس سے انکار کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

نظر بد دور کرنے کا ایک طریقہ

اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کی نظر لگتی تھی اس کے ہاتھ، پاؤں اور زیر ناف حصے کو دھو کر وہ پانی اس شخص پر ڈالتے تھے جسے نظر لگ جاتی تھی، اور اس چیز کو شفا کا ذریعہ سمجھتے تھے، اسکا سب سے ادنی فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اسکی وجہ سے مریض کا وہم دور ہو جاتا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسکی اجازت دی اور فرمایا کہ اگر تمہاری نظر کسی کو لگ جائے اور تم سے تمہارے اعضاء دھو کر مریض پر ڈالنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس کو منظور کر لو۔

حضرت سہیل بن حنیف کو حضرت عامر بن ربیعہ کی نظر لگ گئی تھی، جسکی وجہ سے وہ سخت بیمار ہو گئے تھے، حضور اکرم ﷺ کو معلوم ہوا تو انہیں غسل کرنیکا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے اپنا چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے، پاؤں کے اطراف اور تہ بند کا اندرونی حصہ ایک ٹب میں دھویا اور پھر وہ پانی حضرت سہیل پر ڈالا گیا تو وہ ٹھیک ہو گئے۔ مؤطا للامام مالک، کتاب العین، باب الوضوء من العین۔

اسپر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر اس نظر کی وجہ سے نظر زدہ (جس کو نظر لگی ہے) آدمی کے ہلاک ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو پھر نظر لگانے والے پر یہ غسل کرنا واجب ہو جاتا ہے، کیونکہ اپنی طاقت کے بقدر ایک انسان کی جان بچانے کی کوشش کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے، لیکن اگر خطرہ اس درجہ کا نہ ہو تو پھر یہ غسل کرنا بہتر اور مستحب ہے، ضروری نہیں ہے۔

نظر بد کیوجہ سے ہلاکت کا حکم

نظر بد کی وجہ سے اگر دوسرا شخص مر جائے یا اسکا کوئی عضو شل ہو جائے تو کیا اسکی وجہ سے قصاص اور دیت واجب ہوتی ہے یا نہیں، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، تاہم راجح یہی ہے کہ نظر بد سے ہلاکت کے نتیجے میں نہ قصاص واجب ہوتا ہے اور نہ ہی دیت اور کفارہ، کیونکہ اس میں ہلاکت کا بظاہر کوئی آلہ استعمال نہیں ہوا، بس معنوی طور پر غیر محسوس اثرات سے یہ سب تباہی ہوئی ہے، لہذا نظر بد لگانے والا اگر یہ سمجھتا ہے کہ میری نظر بڑی تباہ کن ہے، اور پھر قصداً تباہی کے ارادے سے ہی کسی پر نظر بد لگائے تو شرعاً وہ بہت گنہگار ہوگا، تاہم دنیاوی احکام کے اعتبار سے اسپر کچھ لازم نہیں ہوگا۔ تکملۃ فتح الملہم ۲۹۹/۴۔

نظر بد لگانے کے عادی کو محبوس کیا جا سکتا ہے

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جو شخص نظر بد لگانے میں مشہور و معروف ہو، تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اور نہ ہی اس کے سامنے آنا چاہیے، اور اسلامی حکومت کے سربراہ کیلئے مناسب ہے کہ وہ ایسے شخص پر گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادے تاکہ وہ لوگوں کے آمنے سامنے نہ آئے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ کر سکے، اور اگر وہ شخص غریب و فقیر ہو تو بیت المال سے اسکے اخراجات کے بقدر وظیفہ مقرر کردے تاکہ وہ اس سے گذر اوقات کر سکے، کیونکہ اسکا ضرر بہت سخت ہے، اس سے لوگوں کو بچانا چاہیے، اسکا ضرر پیاز وتھوم کھانے کی بدبو سے، جذامی اور موذی جانوروں کے ضرر سے کہیں زیادہ ہے، جسطرح شریعت میں یہ ضرر قابل برداشت نہیں، ان کے ازالے کیلئے تدابیر اختیار کی گئیں ہیں، ایسے ہی اس ضرر کے ازالے کے لئے بھی تدبیر اختیار کرنی چاہیے، اور وہ یہی ہے کہ اسے حتی الامکان لوگوں سے دور رکھا جائے، تاکہ لوگ اسکی نظر بد کے ضرر سے محفوظ رہ سکیں۔ شرح مسلم للنووی ۲۲۰/۲، مرقاۃ المفاتیح ۳۲۹/۸

عائن کیلئے خاص ذکر

جس شخص کی نظر اکثر لگ جاتی ہو، اسے ان امور کا اہتمام کرنا چاہیے:

(۱)...... برکت کی دعا دیدے، یوں کہے: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلَیْہِ (اے اللہ اس میں برکت عطا فرما)

(۲)......یایوں کہے: مَاشَاءَ اللّٰهُ، لاقُوَّةَ اِلَّا باللّٰهِ۔ زادالمعاد، فصل فیما یفعله العائن ۳/۸۴۴۔
ان اذکار کا فائدہ یہ ہے کہ پھر اسکی نظر بد کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَخْذِ الأَجْرِ عَلَى التَّعْوِيْذِ

یہ باب تعویذ پر اجرت لینے کے جواز کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ سَرِيَّةٍ فَنَزَلْنَا بِقَوْمٍ فَسَأَلْنَاهُمُ الْقِرَى فَلَمْ يَقْرُوْنَا، فَلُدِغَ سَيِّدُهُمْ فَأَتَوْنَا فَقَالُوْا: هَلْ فِيْكُمْ مَنْ يَرْقِي مِنَ الْعَقْرَبِ؟ قُلْتُ: نَعَمْ أَنَا، وَلَكِنْ لا أَرْقِيْهِ حَتَّى تُعْطُوْنَا غَنَمًا، قَالُوْا فَإِنَّا نُعْطِيْكُمْ ثَلاثِيْنَ شَاةً فَقَبِلْنَا، فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ الْحَمْدَ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَبَرَأَ وَقَبَضْنَا الْغَنَمَ. قَالَ فَعَرَضَ فِيْ أَنْفُسِنَا مِنْهَا شَيْءٌ، فَقُلْنَا لا تَعْجَلُوْا حَتَّى تَأْتُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، قَالَ: فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَيْهِ ذَكَرْتُ لَهُ الَّذِيْ صَنَعْتُ، قَالَ: وَمَا عَلِمْتَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟ اقْبِضُوْا الْغَنَمَ وَاضْرِبُوْا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک فوجی دستہ میں بھیجا، ہم نے ایک قوم کے پاس پڑاؤ ڈالا اوران سے طعامِ ضیافت کا کہا مگر انہوں نے ہماری مہمان نوازی نہیں کی، اتنے میں ان کے سردار کو کسی زہریلے جانور سانپ یا بچھو نے کاٹ لیا، وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے: کیا تم میں ایسا کوئی ہے جو بچھو کے ڈسے ہوئے پر دم اور جھاڑ پھونک کر سکے؟ میں (حضرت ابوسعید خدریؓ) نے کہا: جی ہاں میں ہوں، لیکن میں اس وقت تک جھاڑ پھونک نہیں کروں گا جب تک تم لوگ ہمیں بکریاں نہیں دو گے، اسپر وہ کہنے لگے کہ ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے، ہم نے قبول کرلیا، چنانچہ میں نے اس ڈسے ہوئے پر سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھی تو وہ ٹھیک ہوگیا، اور ہم نے بکریاں اپنے قبضے میں لے لیں، ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ پھر ہمارے دلوں میں کھٹکا اور شبہہ سا پیدا ہوگیا تو ہم نے کہا کہ تم (بکریاں ذبح کرنے میں) جلدی نہ کرو، یہاں تک تم رسول اللہ ﷺ کے پاس پہونچ جاؤ، ابوسعید خدری کہتے ہیں

کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو میں نے حضورا کرم ﷺ کے سامنے اپنے عمل کا ذکر کیا جو میں نے کیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو کیسے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ دم اور منتر ہے، تم ان بکریوں کو لے لو اور میرا حصہ بھی اپنے ساتھ رکھ لینا۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ مَرُّوْا بِحَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَلَمْ يَقْرُوْهُمْ وَلَمْ يُضِيْفُوْهُمْ، فَاشْتَكٰى سَيِّدُهُمْ فَأَتَوْنَا فَقَالُوْا: هَلْ عِنْدَكُمْ دَوَاءٌ؟ قُلْنَا نَعَمْ وَلٰكِنَّكُمْ لَمْ تَقْرُوْنَا وَلَمْ تُضَيِّفُوْنَا فَلَا نَفْعَلُ حَتّٰى تَجْعَلُوْا لَنَا جُعْلًا، فَجَعَلُوْا عَلٰى ذٰلِكَ قَطِيْعاً مِنْ غَنَمٍ، فَجَعَلَ رَجُلٌ مِّنَّا يَقْرَأُ عَلَيْهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَبَرَأَ، فَلَمَّا أَتَيْنَا النَّبِيَّ ﷺ ذَكَرْنَا ذٰلِكَ لَهُ، قَالَ: وَمَا يُدْرِيْكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟ وَلَمْ يَذْكُرْ نَهْياً مِنْهُ، وَقَالَ: كُلُوْا وَاضْرِبُوْا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ.

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ چند صحابہ کرام عرب کے کسی قبیلے کے پاس سے گذرے، قبیلے کے لوگوں نے ان کی نہ مہمان نوازی کی اور نہ ضیافت، اسی دوران ان کا سردار بیمار ہوگیا، وہ ہمارے پاس آئے اور ہم سے پوچھنے لگے: کیا تمہارے پاس کوئی دواء ہے؟ ہم نے کہا جی ہاں ہے، لیکن تم لوگوں نے (چونکہ) ہماری مہمان نوازی اور ضیافت نہیں کی، اس لئے ہم اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک تم ہمارے لئے کوئی معاوضہ متعین نہیں کرو گے، اسپر انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ دینا منظور کیا، پھر ہم میں سے ایک آدمی سورہ فاتحہ پڑھکر اسپر دم کرنے لگا، تو (دیکھتے ہی دیکھتے) وہ ٹھیک ہوگیا، پھر جب ہم حضور ﷺ کے پاس آئے تو ہم نے سارا قصہ آپ کے سامنے ذکر کیا آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو کیسے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ دم اور منتر ہے؟ اور فرمایا: (بکریاں ذبح کر کے) کھاؤ اور میرا حصہ بھی اپنے ساتھ لے لینا۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔تعویذ: وہ کاغذ یا تختی جسپر اعداد یا اسماء الٰہی یا قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی ذکر لکھکر گلے میں ڈالدیا جاتا ہے، تاکہ بیماری سے شفاء، جادو سے نجات، مقصد کا حصول اور شرور وآفات سے حفاظت رہے۔ سریة: (سین پر زبر اور را کے زیر کے ساتھ) فوجی دستہ جس میں نبی کریم ﷺ شریک نہ

ہوں۔قری: (قاف کے زیراورراکے زبر کے ساتھ) طعام ضیافت۔فلم یقرونا: انہوں نے ہماری مہمان نوازی نہیں کی۔لدغ: (مجہول کا صیغہ ہے) زہریلے جانور سے وہ ڈسا گیا، خواہ وہ سانپ ہو یا بچھو وغیرہ تاہم لدغ کا اکثر استعمال بچھو کے کاٹنے پر ہوتا ہے۔برأ: وہ ٹھیک ہوگئے، صحت یاب ہوگئے۔اشتکی: بیمار ہوگیا (یعنی اسے کسی چیز نے ڈس لیا)۔جعل: (جیم کے پیش اور عین کے سکون کے ساتھ) اجر، معاوضہ۔ قطیعا من الغنم: بکریوں کا ریوڑ، گلہ۔ما علمت انها رقیة؟ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ سورہ فاتحہ دم اور منتر ہے۔وما یدریک انها رقیة: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ دم اور منتر ہے۔

عربی زبان میں یہ لفظ تعجب اور تعظیم دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تعظیم کے معنی مراد لینا یہاں مناسب ہے، بعض روایات میں اسکا جواب بھی مذکور ہے: قلت: ألقی فی روعی میں نے کہا کہ میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ سورہ فاتحہ دم اور منتر ہے، یہ سنکر آپ ﷺ نے انہیں منع نہیں فرمایا۔

تعویذ، دم اور جھاڑ پھونک کرنے پر اجرت لینے کا حکم

حدیث باب سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دم اور منتر کرے یا تعویذ لکھے، اور اسپر معاوضہ لے تو یہ جائز ہے، جسطرح کہ صحابہ کرام نے سورہ فاتحہ سے دم کر کے ان لوگوں سے بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک روایت میں ہے کہ تیس بکریاں وصول کیں اور آپ ﷺ نے بھی اسے درست قرار دیا، البتہ اس چیز کا خیال رکھا جائے کہ دم اور تعویذ کے کلمات کفریہ یا شرکیہ نہ ہوں، ان کے معنی واضح اور شریعت کے موافق ہوں، اور دم وغیرہ کو مؤثر بالذات نہ سمجھا جائے۔

واضربوا لی معکم بسهم "اور میرا حصہ بھی اپنے ساتھ رکھ لینا" اس جملے سے درحقیقت نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو تسلی دے رہے ہیں کہ ان بکریوں کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، انہیں مانوس اور خوش کیا جارہا ہے کہ تم نے درست کیا، لہذا میرا بھی اس میں حصہ رکھنا۔ تحفۃ الاحوذی ۱۹۱/۶،

تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں دو روایتیں ذکر کی ہیں، ان دونوں میں واقعہ ایک ہی ہے، ان

احادیث سے اور اس مفہوم کی بعض دیگر احادیث سے استدلال کر کے مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ طاعات پر اجرت یعنی کتاب اللہ کی تعلیم، اذان اور امامت وغیرہ پر اجرت اور تنخواہ لینا جائز ہے، جبکہ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک کتاب اللہ کی تعلیم وغیرہ پر اجرت لینا جائز نہیں، یہ حضرات مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

(۱)......عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ ''میں نے اصحاب صفہ میں سے کچھ لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دی تو ان میں سے ایک نے مجھے کمان ہدیہ میں دی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کمان کے متعلق پوچھا (کہ میرے لیے اسکا لینا صحیح ہے یا نہیں) تو آپ نے فرمایا: اگر تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تمہارے گلے میں آگ کا طوق ڈالا جائے تو پھر اسے قبول کرلو'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''اگر آپ اس کمان کو لے لیتے تو اپنے دو کاندھوں کے درمیان آگ کا انگارہ باندھ لیتے۔ سنن ابی داود، کتاب الاجارہ، باب کسب المعلم ۲/۱۲۸

اس حدیث پر اگرچہ اہل جرح نے کلام کیا ہے لیکن علامہ ابن عبد البر نے فرمایا کہ یہ حدیث چونکہ عبادہ بن صامت سے دو طریق سے مروی ہے، اس لئے محدثین کے نزدیک یہ حدیث مشہور ہے، جس سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ إعلاء السنن، کتاب الاجارۃ، باب الاجرۃ علی تعلیم القرآن ۱۶/۱۷۱۔

(۲)......حضرت ابی بن کعب کہتے ہیں کہ ''میں نے ایک آدمی کو قرآن کریم کی تعلیم دی، اس نے بطور ہدیہ مجھے کمان دی، میں نے نبی کریم ﷺ سے اسکا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا: اگر تم اسے لوگے تو گویا جہنم کی آگ کا کمان لوگے، چنانچہ میں نے وہ کمان واپس کر دی۔ سنن ابن ماجۃ، ابواب التجارات، باب الأجر علی تعلیم القرآن (ص:۱۵۶)۔

(۳)......امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایک روایت عبد الرحمٰن بن شبل سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن پڑھو لیکن اس کے ذریعہ کھاؤ مت۔

(۴)......حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تعلیم قرآن پر ایک کمان (بھی) لی تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ کا قلادہ یعنی ہار پہنائیں گے۔

حنفیہ اور حنابلہ کیطرف سے حدیثِ باب کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱)......حدیث باب، ممانعت کی احادیث سے منسوخ ہے، لیکن نسخ کیلئے ان احادیث کی حتمی تاریخ کا جاننا

ضروری ہے، اور یہاں کوئی ایسی دلیل نہیں جو احادیث نہی کے مؤخر ہونے کو بتلائے، اس لئے یہ جواب کمزور معلوم ہوتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الإجارۃ، باب ما یعطی فی الرقیۃ .... ۵۷۲/۴۔

(۲)...... حدیث باب میں دم کرانے والے چونکہ غیر مسلم تھے، اس لئے ان سے دم کے عوض معاوضہ لینا درست ہے۔

(۳)...... حدیث باب میں جو واقعہ ہے، اس میں معاہدے کے تحت اس قبیلے کے ذمے مہمان نوازی واجب تھی، اس کے باوجود انہوں نے مہمان نوازی نہیں کی، اس لئے حضور ﷺ نے انہیں وہ بکریاں لینے کی اجازت دی۔

(۴)...... منتر اور دم چونکہ عبادت مقصودہ اور قربت محضہ نہیں ہے بلکہ وہ علاج کے قبیل سے ہے، لہذا اسپر اجرت لینا جائز ہے، لیکن قرآن کریم کی تعلیم خالص قربت اور نزدیکی حاصل کرنیکا ذریعہ ہے، اس لئے اسپر اجرت لینا جائز نہیں، یعنی قرآن مجید سے پڑھکر اگر کسی کو دم کیا جائے تو اسپر اجرت لے سکتے ہیں لیکن تعلیم قرآن پر نہیں لے سکتے۔

لیکن متأخرین حنفیہ نے اجرت علی الطاعات یعنی تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت کے جواز کا فتوی دیا ہے، خیر القرون میں چونکہ معلمین و اساتذہ کیلئے سرکاری وظائف مقرر ہوتے تھے، اس لئے متقدمین نے اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا تھا، لیکن اب چونکہ سرکاری عطیات اور وظائف کا وہ سلسلہ نہیں رہا، ایسے میں اگر عدمِ جواز کو باقی رکھا جائے تو اس میں دین کے ضیاع کا خطرہ ہے، اس لئے ضرورت کی وجہ سے متاخرین نے جواز کا فتوی دیا ہے۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب الطب، مسئلۃ الأجرۃ علی تعلیم القرآن والرقیۃ بہ ۳۳۰/۴۔

علاقہ بن صحار تمیمی کے دم کا واقعہ

دم اور جھاڑ پھونک کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ سنن ابی داؤد میں حضرت خارجہ کے چچا علاقہ بن صحار تمیمی سے بھی منقول ہے:

''وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے، اسلام قبول کیا، صحبت نبوی سے استفادہ کر کے گھر کا سفر شروع کر دیا، راستے میں ایک ایسی قوم پر گذر ہوا جنہوں نے ایک مجنون آدمی کو لوہے سے باندھا ہوا تھا، ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا، بے بس اور انتہائی تنگ تھے، وہ لوگ

حضرت علاقہ سے کہنے لگے کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ تمہارے ساتھی یعنی نبی کریم ﷺ خیر لیکر مبعوث ہوئے ہیں، تم بھی ان کی صحبت پا کر آرہے ہو، تو کیا تمہارے پاس کوئی دم، کوئی منتر ہے، جس سے تم ہمارے اس مریض کا علاج کرسکو؟ حضرت علاقہ کہتے ہیں، میں نے سورہ فاتحہ سے اسپر دم کیا تو وہ ٹھیک ہوگیا، اسپر انہوں نے مجھے ایک سو بکری دی، میں حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور یہ سارا واقعہ بتایا تو آپ نے فرمایا کہ واقعی تم نے اسپر سورہ فاتحہ سے ہی دم کیا ہے، میں نے کہا جی ہاں اسی سے کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ناجائز دم اور جھاڑ پھونک سے اجرت حاصل کرتا ہے وہ اسپر وبال اور عذاب ہوتا ہے اور جو جائز طریقے سے یعنی قرآن وسنت سے دم اور منتر کرے تو اسپر اجرت لینا جائز ہے''۔ سنن ابی داوٗد، کتاب الطب، باب کیف الرقی ۲/۱۸۸

یہ واقعہ اور حضرت ابوسعید خدری کا واقعہ جسے حدیث باب میں بیان کیا گیا ہے، یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں، اس واقعہ میں وہ مریض مجنون ہے جبکہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں بچھو سے ڈسے ہوئے پر دم کرنیکا ذکر ہے، اس لئے یہ دونوں قصے جدا جدا ہیں۔ فتح الباری، کتاب الاجارۃ، باب ما یعطی فی الرقیۃ.....۴/۴۵۷۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الرُّقَى وَالأَدْوِيَةِ

یہ باب دم، جھاڑ پھونک اور دواؤں کے استعمال کے جواز کے بارے میں ہے۔

عَنْ أَبِيْ خِزَامَةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوَى بِهِ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قَالَ: هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ.

ابوخزامہ اپنے والد یعمر سعدی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ آپ ہمیں بتائیں گے کہ یہ جھاڑ پھونک جو ہم کراتے ہیں، اور دوا جس کے ذریعے ہم علاج کراتے ہیں اور بچاؤ کا سامان جس سے ہم بچاؤ کرسکیں، کیا یہ چیزیں اللہ کی قدر

وقضا اور تقدیر کورد کرسکتی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بھی تو اللہ کی قضاء وقدر کا حصہ ہیں۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔الرقی: (را کے پیش اور قاف پر زبر الف مقصورہ کے ساتھ) رقیۃ کی جمع ہے: دم، جھاڑ پھونک، تعویذ، وہ مؤثر کلام جسے پڑھکر دم کیا جائے۔ الأدویۃ: دواء کی جمع ہے: دوا۔ نسترقیھا: جن کے ذریعے ہم جھاڑ پھونک کراتے ہیں۔ تقاۃ: (تا پر پیش کے ساتھ) بچاؤ کا سامان، خوف خدا ج: تُقیً۔ نتقیھا: جس سے ہم بچاؤ اور حفاظت کرسکیں۔

دم اور علاج کرانا بھی تقدیر کا حصہ ہے

اس حدیث میں صحابی کے سوال کا منشا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی تقدیر میں لکھدیا ہے کہ فلاں کام ایسا ہوگا نہیں ہوگا، فلاں مریض ہوگا، .... جب سب کچھ طے شدہ امر ہے تو پھر دم اور جھاڑ پھونک، علاج معالجہ اور دفاع کیلئے اسلحہ بنانے کا کیا فائدہ؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمام امور بھی تقدیر ہی کا حصہ ہیں، جسطرح اللہ نے مرض لکھا ہے ایسے ہی اس نے تقدیر میں یہ بھی لکھدیا ہے کہ یہ مرض فلاں دوا یا فلاں دم کے ذریعہ زائل ہو جائیگا، یہی صورت دوسری تمام چیزوں میں ہے، اس لئے ان امور کا اختیار کرنا قضاء وقدر کے منافی نہیں بلکہ عین مطابق ہے، اور ظاہری اسباب کی حد تک انہیں ضرور اختیار کرنا چاہیے، اسکی مزید تفصیل پیچھے گذر چکی ہے اور تقدیر سے متعلق مزید بحث انشاء اللہ ابواب القدر میں کی جائیگی۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْكَمْأَةِ وَالْعَجْوَةِ

یہ باب کھنبی اور عجوہ کھجور (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَفِيْهَا شِفَاءٌ مِنَ السَّمِّ. وَالْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ.

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عجوہ کھجور جنت کے پھلوں میں سے ہے، اور اس میں زہر سے شفاء ہے، اور کھنبی ''من'' کی ایک قسم ہے، اور اسکا پانی آنکھ کیلئے شفاء ہے۔

عَنْ سَعِيْدِبْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ.

سعید بن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کھنبی من میں سے ہے، اور اسکا پانی آنکھ کیلئے شفاء ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا: اَلْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْأَرْضِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ، وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ، وَالْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهِيَ شِفَاءٌ مِنَ السَّمِّ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ کچھ صحابہ کرام نے کہا: کھنبی زمین کی چیچک ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: (نہیں بلکہ) کھنبی ''من'' کی قسم سے ہے، اور اس کا پانی آنکھ کیلئے شفاء ہے، اور عجوہ جنت کی کھجور ہے، اور وہ زہر سے شفاء کا باعث ہے۔

عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: حُدِّثْتُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: أَخَذْتُ ثَلَاثَةَ أَكْمُؤٍ أَوْ خَمْسًا أَوْ سَبْعًا فَعَصَرْتُهُنَّ فَجَعَلْتُ مَاءَ هُنَّ فِيْ قَارُوْرَةٍ فَكَحَلْتُ بِهِ جَارِيَةً لِيْ فَبَرَأَتْ.

قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے بتایا گیا کہ انہوں نے (حضور کا یہ ارشاد سنکر) فرمایا: میں نے تین یا پانچ یا سات کھنبیاں لیں اور ان کو نچوڑ لیا (یعنی انہیں پیس کر عرق نکال لیا) اور اس پانی (یعنی عرق) کو ایک شیشی میں بھر کر رکھ دیا، پھر میں اسے اپنی باندی کی آنکھوں میں بطور سرمہ کے ڈالنے لگا تو اسکی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔

عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: حُدِّثْتُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ الشُّوْنِيْزُ دَوَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلَّا السَّامَ. قَالَ قَتَادَةُ: يَأْخُذُ كُلَّ يَوْمٍ إِحْدَى وَعِشْرِيْنَ حَبَّةً فَيَجْعَلُهُنَّ فِيْ خِرْقَةٍ فَيَنْقَعُهُ فَيَسْتَعِطُ بِهِ كُلَّ يَوْمٍ فِيْ مَنْخَرِهِ الْأَيْمَنِ قَطْرَتَيْنِ وَالْأَيْسَرِ قَطْرَةً، وَالثَّانِيْ فِي الْأَيْسَرِ قَطْرَتَيْنِ وَفِي الْأَيْمَنِ قَطْرَةً، وَالثَّالِثُ فِي الْأَيْمَنِ قَطْرَتَيْنِ وَفِي الْأَيْسَرِ قَطْرَةً.

حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے بتایا گیا کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: کلونجی موت کے علاوہ ہر مرض کی دوا ہے، قتادہ (کلونجی کے استعمال کا طریقہ) بیان کرتے ہیں کہ آدمی ہر دن کلونجی کے

اکیس دانے لے، پھران کو کسی کپڑے میں کر کے پانی میں بھگودے، پھراس کے پانی سے ہر دن ناک کے دائیں سوراخ میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ٹپکائے، اور دوسرے دن بائیں سوراخ میں دو قطرے اور دائیں میں ایک قطرہ، اور تیسرے دن دائیں میں دو اور بائیں میں ایک قطرہ ٹپکائے۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ کمأة: (کاف کی زبر، میم کے سکون اور ہمزے کی زبر کے ساتھ) یہ مفرد ہے، اسکی جمع کمأ (بروزن قلب) ہے، ابن اعرابی نے اس کے برعکس کہا ہے کہ کمأ واحد ہے، اور کمأة خلاف قیاس جمع ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ کمأة کا لفظ واحد اور جمع دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور اسکی جمع اکموٴ بھی آتی ہے۔

یہ ایک گھاس اور پودا ہے جس کا پتہ اور تنہ نہیں ہوتا، زمین سے بغیر کسی محنت اور کاشت کے نکلتا ہے، اسے اردو میں ''کھنبی''، ''سانپ کی چھتری'' اور انگریزی میں **Mushroom** کہا جاتا ہے، یہ کھنبی برسات کے موسم میں اگتی ہے اور انڈے کیطرح سفید ہوتی ہے۔ اہل عرب اسے "نبات الرعد" (کڑک اور بجلی کا پودا) بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بادل کی گرج اور کڑک کی وجہ سے زمین سے نکلتی ہے۔ تکملة فتح الملھم، کتاب الأطعمة، باب فضل الکمأة ۴/۵۴۔ عجوة: (عین کی زبر اور جیم کے سکون کے ساتھ) مدینہ کی عمدہ قسم کی ایک کھجور۔ من: (میم کی زبر اور نون کی تشدید کے ساتھ) ترنجبین، وہ چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور غذا بنی اسرائیل پر نازل کیا تھا۔ جدری: (جیم کے پیش، دال کی زبر، راء کی زیر اور یاء کی تشدید کے ساتھ) چیچک، یہ ایک مرض ہے جس میں انسان کے جسم پر دانے نکل آتے ہیں، جو انتہائی تکلیف دہ اور ضرر رساں ہوتے ہیں یہ دراصل بدن کے اندر مضر فضلہ ہوتا ہے، جو دانوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ عصرتھن: میں نے ان کھنبیوں کو نچوڑا یعنی انہیں پیس کر ان کا عرق نکالا۔ حدثت: (مجہول کا صیغہ ہے) مجھے حدیث بیان کی گئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے۔ قارورة: شیشی، بوتل ج قواریر۔ کحلت به: میں نے وہ عرق سرمہ کے طور پر لگایا۔ برأت: اسکی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ شونیز: (شین پر پیش، واؤ کے سکون، اور نون کی زیر کے ساتھ) کالا دانہ، کلونجی۔ خرقة: (خاء کی زیر اور راء کے سکون کے ساتھ) پرانے

پھٹے ہوئے کپڑے کا ٹکڑا جمع خرق۔ **ینقعہ**: وہ اس کلونجی کو پانی میں بھگو دے۔ **یستعط** : وہ ناک میں دوا ڈالے، ٹپکائے۔ **منخر** : (میم اور خاء کی زبر کے ساتھ اور خاء کی زیر کے ساتھ بھی درست ہے) نتھنا، ناک کا سوراخ، اسکی جمع مناخر ہے۔

عجوہ کھجور کی فضیلت

عجوہ مدینہ منورہ کی عمدہ اور مشہور کھجور ہے، اس کا درخت نبی کریم ﷺ نے خود لگایا تھا، بہت سی احادیث میں اسکی فضیلت کا ذکر ہے، اور کئی امراض کیلئے انتہائی مفید ہوتی ہے، حدیث باب میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''عجوہ جنت کی کھجور ہے اور اس میں زہر سے شفاء ہے''

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جنت سے دنیا میں بھیجا تو ان کے ساتھ دنیا کے پھلوں کے ایک ہزار بیج تھے، چنانچہ ''جمع الفوائد'' میں حضرت ابو سعید خدری سے مرفوعا روایت ہے کہ ''جب حضرت آدم کو جنت سے بھیجا گیا تو جنت کے پھلوں کا انہیں توشہ دیا گیا، اور ہر ایک کو لگانے کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھا دیا، لہذا تمہارے یہ پھل جنت کے پھلوں میں سے ہیں، مگر دنیا کے پھل متغیر ہوتے رہتے ہیں جب کہ جنت کے پھلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عجوہ کھجور کیطرح تمام پھلوں کی اصل جنت سے ہے، اس معنی کے اعتبار سے عجوہ کھجور کی کوئی امتیازی صفت ثابت نہیں ہوگی، ہاں اگر یوں کہا جائے کہ دیگر تمام پھلوں میں دنیا میں آنے کے بعد تغیر ہو گیا ہے، اور اس میں تبدیلی کم ہوئی ہے تو پھر اس سے عجوہ کھجور کی فضیلت ثابت ہوگی۔ الکوکب الدری ۹۱/۳۔

علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ العجوۃ من الجنۃ کے معنی یہ ہیں کہ عجوہ کھجور جنت کی عجوہ کھجور کے رنگ و شکل اور نام میں صرف مشابہ ہے، لذت اور ذائقہ میں نہیں، مقصود اس سے اس کھجور کی فضیلت کو بیان کرنا ہے کہ یہ کھجور حجاز کی تمام کھجوروں سے عمدہ، لذیذ اور مفید ترین کھجور ہے، اور کھجور کی سب سے اعلیٰ قسم ہے، جو جسم کی طاقت کیلئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۱۹۶/۶۔

''وفیھا شفا من السم'' (اور اس میں زہر سے شفا ہے)

حضور اکرم ﷺ کی دعا کی برکت سے اسے کھانے سے زہر سے شفا اور جادو سے نجات حاصل ہوتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیں تو اس کو کوئی زہر اور جادو رات تک نقصان نہیں پہونچائیگا''

کیا عجوہ کھجور کی یہ خصوصیت اب بھی باقی ہے؟ اس میں شارحین حدیث کی مختلف آراء ہیں، کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ خصوصیت عہد نبوی کے ساتھ خاص تھی، اور کچھ کی رائے ہے کہ یہ خاصیت مدینہ منورہ کے ساتھ خاص ہے کہ وہاں اسے کھانے سے مذکورہ اثر ہوگا، کسی اور جگہ نہیں، لیکن چونکہ حدیث کے الفاظ اس بارے میں عام ہیں، اس لئے جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ عجوہ کھجور کی یہ خصوصیت اب بھی ہے، اور صرف مدینہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ مدینہ منورہ سے باہر لے جاکر بھی کوئی کھائے گا تو بھی اسکی یہی خاصیت رہے گی، کیونکہ حدیث کے الفاظ میں کسی زمانے یا مدینہ منورہ کی تعیین وتخصیص نہیں ہے۔

البتہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد عموم اور غالب حالات کے اعتبار سے ہے کہ عجوہ کھجور کھانے سے عموماً مذکورہ فوائد ضرور حاصل ہوتے ہیں، اور کبھی اسکا کوئی اثر ظاہر نہیں بھی ہوتا، اس لئے اگر کبھی ایک آدھ آدمی اسکا تجربہ کرے اور اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو اسکی وجہ سے حدیث کو خلاف واقع نہیں سمجھا جائیگا، کیونکہ اسکی مثال دوا کی سی ہے، جسطرح بعض دوائیں کچھ امراض کیلئے متعین ہوتی ہیں، عموماً ان کے استعمال سے امراض سے شفا حاصل ہو جاتی ہے، لیکن بسا اوقات انسان بیماری کیلئے دوا کھاتا ہے لیکن شفا نہیں ہوتی، اور بیماری برقرار رہتی ہے، ایسی صورت میں کوئی یہ اشکال نہیں کرسکتا کہ یہ دوا، اس مرض کیلئے مفید نہیں کیونکہ دوا کا اس مرض کیلئے مفید ہونا عموم اور غالب احوال کے اعتبار سے ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک بھی غالب احوال اور عموم کے اعتبار سے ہے، کہ عجوہ کھجور کھانے سے فائدہ ہوتا ہے لیکن کبھی اس کے خلاف بھی ہوسکتا ہے جو اس حدیث کے منافی نہیں۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب الدواء بالعجوۃ للسحر ۲۹۴/۱۰، ۲۹۵۔

کھنبی ''من'' کی ایک قسم ہے

اس باب کی احادیث میں ''سانپ کی چھتری'' کی کچھ خصوصیات کا ذکر ہے، حضور اکرم ﷺ نے

فرمایا: "الکمأة من المن" کھنبی من کی ایک قسم ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ شارحین حدیث نے اس کے تین معنیٰ بیان کئے ہیں:

(ا)......الکمأة من المن اس سے وہ "من" مراد ہے جو عہد موسیٰ میں بنی اسرائیل پر نازل کیا گیا تھا، معنی یہ ہیں کہ سانپ کی چھتری' اس "من" کی جزء ہے جو بنی اسرائیل پر نازل کیا گیا تھا، کیونکہ "من بنی اسرائیل" کی مختلف انواع و اقسام اور صورتیں تھیں، بعض شبنم کی صورت میں، بعض سبزیوں کی صورت میں، بعض شکار کی صورت میں، اور کھنبی بھی اسی میں سے تھی، اللہ تعالیٰ نے میدان تیہ میں بنی اسرائیل کی غذا کماہ یعنی کھنبی بنائی، جو روٹی کے قائم مقام تھی، ان کا سالن سلوی بنایا جو گوشت کے قائم مقام تھا اور ان کا حلوی اس شبنم کو بنایا جو درختوں پر نازل ہوتی تھی، یوں ان کی معیشت کی تکمیل فرمائی، چونکہ اس "من" کے مختلف اجزاء اور اقسام تھیں جن میں سے ایک کھنبی بھی ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے الکمأة من المن فرمایا کہ سانپ کی چھتری "من" کی ایک قسم ہے، اور ترنجبین جو درختوں پر گرتی تھی، وہ بھی "من" ہی کی ایک قسم ہے، اگرچہ عرف میں اب "من" کا لفظ صرف ترنجبین کیلئے ہی استعمال ہونے لگا ہے۔

(۲)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس جملے کے ذریعے کھنبی کو اس "من" کے مشابہ قرار دیا جو بنی اسرائیل پر اترتا تھا، معنی یہ ہیں کہ جسطرح بنی اسرائیل کو یہ "من" بغیر کسی محنت ومشقت اور بغیر کاشت کے حاصل ہوتا تھا، اسی طرح سانپ کی چھتری برسات کے موسم میں بغیر کسی محنت ومشقت کے زمین سے نکلتی ہے۔

(۳)......ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ حدیث میں "من" سے لغوی معنی یعنی احسان اور نعمت مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ "کھنبی" اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو انسان کو بغیر کسی محنت ومشقت کے حاصل ہو جاتی ہے، گویا حدیث میں لفظ "من" مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے یعنی ممنون بہ، یوں تو تمام نعمتیں اور احسانات اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہی ہیں لیکن اس حدیث میں خاص طور پر "کھنبی" کو اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ بغیر کسی محنت و مشقت کے حاصل ہو جاتی ہے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب المن شفاء للعین ۱۰/۲۰۲، تکملة فتح الملهم کتاب الاطعمة، باب فضل الکمأة، ۴/۵۴۴۔

وماءها شفاء للعين کا مطلب

کھنبی دو طرح کی ہوتی ہے:

(۱)...... بالکل سیاہ یا سفید و سرخ، یہ دونوں صحت کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔

(۲)...... خالص سفید، یہ صحت کیلئے اور بالخصوص آنکھوں کیلئے اسکا پانی بہت نفع بخش ہوتا ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ایک طبی نسخہ بیان فرمایا کہ ''کھنبی کا پانی آنکھ کیلئے باعث شفا ہوتا ہے'' اس جملے کی تفسیر میں شارحین حدیث کے پانچ قول ہیں:

(۱)...... علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھنبی کا پانی تنہا آنکھ میں استعمال نہ کیا جائے کیونکہ یہ نقصان پہونچاتا ہے، اس سے سرمہ یا ایسی کوئی چیز تیار کر لی جائے جس میں اس پانی کو ڈالا جائے، اور پھر اسے بطور سرمہ کے استعمال کیا جائے تو وہ مفید ہوگا۔ تکملۃ فتح الملھم ۵۵/۴۔

(۲)...... امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محض کھنبی کا پانی آنکھ کو شفا بخشتا ہے، اور فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک دیندار عالم نابینا ہو گئے تھے، انہوں نے سانپ کی چھتری کو علاج کے طور پر استعمال کیا، اللہ نے ان کی بینائی واپس عطا فرمادی تھی، لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بعض دوسرے مشائخ نے اس پانی کو استعمال کیا تو آنکھیں ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہو گئیں، اسلئے امام نووی کا قول ایسے آدمی سے متعلق ہے جو حدیث پر پورا اعتقاد کر کے یہ علاج کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات اسے شفاء عطا فرماتی ہے۔

(۳)...... ابن عربی کے نزدیک اس میں تفصیل ہے کہ اگر آنکھ میں حرارت کی وجہ سے تکلیف ہو تو اس کیلئے کھنبی کا خالص پانی شفا ہوتا ہے، اور اگر صرف حرارت کی وجہ سے تکلیف نہ ہو بلکہ دوسرے اسباب مرض بھی ہوں تو پھر دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر اس کا پانی مفید رہتا ہے۔ فتح الباری ۲۰۳/۱۰، تکملۃ فتح الملھم ۵۶/۴۔

(۴)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کے خالص پانی کو نچوڑ کر پکا لیا جائے تو پھر اسے آنکھ میں ڈالا جا سکتا ہے، کیونکہ آگ پر پکانے کی وجہ سے اس کے فضلات، رطوبتیں اور فاسد مادے ختم ہو جاتے ہیں اور اس میں صرف نفع بخش اجزاء باقی رہ جاتے ہیں۔

(۵)...... بعض حضرات کے نزدیک اس ''پانی'' سے وہ پانی مراد نہیں جو سانپ کی چھتری سے نچوڑا جاتا ہے

بلکہ اس سے بارش کا وہ پہلا قطرہ مراد ہے جو زمین پر گرتا ہے اور جس سے یہ کھنمی پیدا ہوتی ہے، زاد المعاد لابن القیم، فصل فی ھدیہ ﷺ فی حفظ صحۃ العین ۹۴۲/۴۔

ان اقوال میں سے پانچواں قول انتہائی ضعیف ہے، البتہ پہلے چار اقوال میں اسکا امکان ہے کہ وہ اس جملے کی تفسیر ہوں، کیونکہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صرف یہ بتایا کہ کھنمی کا پانی آنکھ کیلئے مفید ہوتا ہے، اسے کیسے استعمال کیا جائے، کیا تنہا آنکھ میں ڈالا جائے، یا کسی اور چیز کے ساتھ ملا کر، ان طبی تفصیلات کو آپ نے بیان نہیں فرمایا اور ان کا بیان کرنا آپکی شرعی ذمہ داری بھی نہیں، کیونکہ یہ امور نبوت میں سے نہیں، اس لئے مذکورہ چار اقوال میں سے کوئی قول قطعی اور یقینی طور پر نبی کریم ﷺ کیطرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، بسا اوقات اس کا استعمال تنہا مفید ہوتا ہے، اور کبھی مرکب کر کے، بعض امراض کیلئے نفع بخش ہوتا ہے اور بعض کیلئے مضر، مختلف افراد کے اعتبار سے اس کا اثر بھی مختلف ہوسکتا ہے، لہذا اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کھنمی کا ہر پودا، ہر مرض کیلئے، ہر وقت، ہر جگہ اور ہر انسان کیلئے فائدہ مند ہوتا ہے، اس لئے ہر بیماری میں از خود اسے استعمال کرنے کے بجائے کسی طبیب سے رجوع کر کے علاج تجویز کرانا چاہیے، تاہم اگر کوئی مسلمان حضور ﷺ کے اس ارشاد پر کامل یقین رکھتے ہوئے سانپ کی چھتری کو ہر مرض کے علاج کیلئے استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ اسے شفاء عطا فرمائیں گے، تکملۃ فتح الملھم ۵۶/۴، فتح الباری ۲۰۳/۱۰۔

سانپ کی چھتری زمین کی چیچک نہیں

بعض اہل عرب ''سانپ کی چھتری'' کو ''زمین کی چیچک'' کہتے تھے، اس وجہ سے کہ جسطرح چیچک کے دانے جسم میں مضر فضلے اور فاسد رطوبت کی وجہ سے نکلتے ہیں اسی طرح زمین کے اندر زائد فضلات ہوتے ہیں جو کھنمی کی شکل میں زمین پر ظاہر ہوتے ہیں، صحابہ کرام نے بھی اسی اعتبار سے کھنمی کو ''زمین کی چیچک'' سے تعبیر فرمایا۔

طبرانی نے حضرت جابر سے روایت نقل کی ہے کہ ''عہد رسالت میں کھنمی کی پیداوار بڑھ گئی تو لوگوں نے اسکا کھانا یہ کہکر ترک کر دیا کہ یہ زمین کی چیچک ہے، نبی کریم ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو

آپ نے فرمایا: کھنبی زمین کی چیچک نہیں ہے، وہ ''من'' کی ایک قسم ہے۔ فتح الباری ۱۰/۱۰۲۰۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ نے کھنبی کو زائد فضلات اور فاسد رطوبتوں کی وجہ سے گویا مذمت کے طور پر ''زمین کی چیچک'' قرار دیا، اسپر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ زمین کا فاسد مادہ یعنی چیچک نہیں بلکہ وہ ''من'' کی ایک قسم ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت اور بغیر کاشت کے پیدا فرمایا، جسطرح کہ بنی اسرائیل پر یہ ''من'' بغیر کسی محنت و تکلیف کے ان پر نازل ہوتا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، جس پر اسکا شکر ادا کرنا چاہیے۔ شرح الطیبی، کتاب الطب والرقی ۸/۳۱۰، اشعۃ اللمعات ۳/۶۱۷۔

کھنبی اور کلونجی کو استعمال کرنیکا ایک ایک طریقہ

امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب کے آخر میں حضرت قتادہ کی دو روایتیں ذکر کی ہیں، جو حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہیں، پہلی حدیث میں کھنبی کے استعمال کا ایک طریقہ مذکور ہے، کہ حضرت ابو ہریرۃ نے تین، پانچ یا سات کھنبیاں لیکر ان کا پانی نچوڑا، پھر وہ عرق باندی کی آنکھ میں ڈالا تو اسکی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔

دوسری حدیث میں فرمایا کہ کلونجی موت کے علاوہ ہر بیماری کی دواء ہے، اسے استعمال کرنیکا یہ طریقہ ہے کہ کلونجی کے اکیس دانے لیکر کسی کپڑے میں کر کے بھگو دے، ساری رات بھیگے رہیں، پھر اس کے پانی سے پہلے دن ناک کے دائیں سوراخ میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ٹپکائے، دوسرے دن صبح بائیں سوراخ میں دو اور دائیں میں ایک قطرہ ٹپکائے، اور تیسرے دن دائیں میں دو اور بائیں میں ایک قطرہ ٹپکائے، فتح الباری، کتاب الطب، باب الحبۃ السوداء ۱۰/۱۷۸۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ دونوں طریقے درست ہیں، اور ان کی افادیت میں بھی کوئی شبہہ نہیں لیکن چونکہ ہر شخص کا مزاج، مرض اور اسباب مرض مختلف ہوتے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ کسی ماہر ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر ان چیزوں کا استعمال اپنی طرف سے نہ کیا جائے۔ تکملۃ فتح الملہم ۴/۵۵۔

یہاں ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس باب کی آخری حدیث کو جس میں کلونجی کا ذکر ہے، اس باب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، کیونکہ اس باب میں کھنبی اور عجوہ کھجور کا ذکر ہے، جبکہ اس روایت میں ان دو چیزوں

میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں، تو پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ روایت اس باب میں کس وجہ سے ذکر کی ہے؟

الکوکب الدری ۹۲/۳۔

یہ درست ہے کہ ظاہراً اس حدیث کو باب سے مناسبت نہیں ہے، البتہ یوں تاویل کی جاسکتی ہے کہ امام ترمذی نے حضرت قتادہ سے کھنبی کے استعمال کے بارے میں حضرت ابو ہریرۃ کی روایت ذکر کی تو پھر ضمناً ابوقتادہ عن ابی ہریرہ والی روایت بھی ذکر کردی جس میں کلونجی کے استعمال کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اگر چہ اس میں کھنبی اور عجوہ کھجور کا ذکر نہیں ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ أَجْرِ الْكَاهِنِ

یہ باب کاہن کی اجرت (کی حرمت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ قَالَ: نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ، وَمَهْرِ الْبَغِيِّ، وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ.

ابو مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت لینے، زنا کار عورت کو اجرت دینے اور کاہن کو رقم دینے سے منع فرمایا ہے۔

کاہن کی اجرت کا شرعی حکم

حلوان (حاء کے پیش اور لام کے سکون کے ساتھ غفران کیطرح) اس کے لفظی معنی شیرینی اور مٹھائی کے ہیں، مراد اس سے کاہن کی اجرت اور معاوضہ ہوتا ہے، خواہ رقم کی صورت میں ہو یا ساز وسامان کی صورت میں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کاہن کی اجرت کو مٹھائی کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ کاہن وہ مال بڑی آسانی کے ساتھ بغیر کسی محنت ومشقت کے حاصل کر لیتا ہے،

کاھن: اہل عرب ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو غیب کی خبریں دینے کا دعوی کرے۔ فتح الباری، کتاب البیوع، باب ثمن الکلب ۵۳۷/۴۔

اور کھانہ (کاف کی زبر اور زیر کے ساتھ) غیب کی خبریں بتانے کے پیشہ کو کہتے ہیں، اس پیشہ کو

اختیار کرنے والا "کاھن" کہلاتا ہے، علامہ نووی نے "کاھن" اور "عراف" کے درمیان یہ فرق بتایا ہے کہ کاہن اس کو کہتے ہیں جو مستقبل کی خبریں بتاتا ہے، اور "عـرّاف" اسے کہتے ہیں کہ جو پوشیدہ باتیں بتاتا ہے، جیسے گمشدہ سامان یا چوری کی ہوئی چیز کے بارے میں کوئی بتادے، کبھی بول چال میں عراف کو بھی کاہن کہہ دیا جاتا ہے۔

کاہن کے پاس جانا، اسے اجرت دینا اور اسکی باتوں پر اعتماد کرنا تمام فقہاء کے نزدیک اس حدیث کی رو سے حرام ہے، اسی طرح پوشیدہ باتوں کو معلوم کرنے کیلئے، نجومی اور پامسٹ وغیرہ کے پاس جانا اور ان کی بات پر یقین کر لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے اور کاہنوں کو اجرت دینا جائز نہیں، کیونکہ اس میں "امر باطل" پر معاوضہ لیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم ثمن الکلب وحلوان الکاھن ۲/۱۹، تکملۃ فتح الملھم ۱/۵۳۲۔

کہانت کی قسمیں

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہانت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں:

(۱)..... بعض لوگ غیب کی خبریں شیاطین اور جنات سے حاصل کرتے ہیں، یہ عالم بالا کی غیبی خبریں سننے کیلئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انہیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا، کوئی شیطان اگر کبھی کوئی آدھی بات سنکر بھاگتا ہے تو اسے دھکتے ہوئے شعلے سے مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہونچ کر اپنے مرید کاہنوں اور نجومیوں کو کچھ نہ بتا سکے، اسی دھکتے ہوئے شعلے کو "شہاب ثاقب" کہا گیا ہے، قرآن کریم میں سورہ صافات کے پہلے رکوع میں اسے بیان کیا گیا ہے۔

(۲)..... بعض جنات کے ساتھ لوگوں کا رابطہ ہوتا ہے، وہ جن انہیں دور کی خبریں بتادیتے ہیں، جن پر عام طور پر انسان مطلع نہیں ہوسکتا، اور بعض اوقات ان کی کچھ خبریں درست بھی ثابت ہوجاتی ہیں۔

(۳)..... بعض لوگ اپنی دانائی، سمجھ، گمان، اندازے اور اٹکل سے غیب کی خبریں بتاتے ہیں، اور اس میں انہیں کافی مہارت ہوتی ہے۔

(۴)..... تجربے اور عرف وعادت کی بنیاد پر بعض لوگ غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔

ان تمام صورتوں میں چونکہ جھوٹ شامل ہوتا ہے، محض ظن اور وہم کی بناء پر لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے، اس لئے شرعاً یہ تمام اقسام درست نہیں ہیں، سب مذموم ہیں، جن سے اجتناب ضروری ہے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب الکھانۃ ۲۶۶/۱۰۔

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کاہن یا عراف کے پاس آئے، اور اسکی باتوں کی تصدیق کردے تو اس نے آپ ﷺ پر نازل کی گئی تعلیمات کو جھٹلا دیا۔ سنن الترمذی کتاب الطھارۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ اتیان الحائض ۳۵/۱، سنن ابی داود، کتاب الطب، باب فی الکھان ۱۸۹/۲۔

مہر البغی کا حکم

"بغی" (باء کی زبر، غین کی زیر اور یاء کی تشدید کے ساتھ "قوی" کی طرح) زنا کار عورت کو کہتے ہیں اسکی جمع بغایا ہے۔

اور "بغی" (غین کے سکون کے ساتھ، اور بغاء (باء کی زیر کیساتھ) زنا کے معنی میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء۔ سورۃ النور، آیت نمبر ۳۳۔

"مھر البغی" سے وہ مال مراد ہے جو زنا کار عورت کو بدکاری کی اجرت کے طور پر دیا جاتا ہے، اور یہ اجرت تمام فقہاء کے نزدیک حرام ہے، یہ معاوضہ چونکہ ایک "مخصوص عضو" کو استعمال کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے مجازاً اس کو مہر کہا گیا ہے۔ شرح مسلم للنووی ۱۹/۲، فتح الباری ۵۳۷/۴۔

کتے کی خرید وفروخت کا حکم

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتے کی خرید وفروخت بالکل جائز نہیں، خواہ اس کتے کو رکھنا شرعاً جائز ہو یا نہ ہو، خواہ وہ سدھایا ہوا ہو یا نہ ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص کتا بیچ دے تو اس کیلئے اس حدیث کی رو سے قیمت لینا حرام ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کا قول مختار یہ ہے کہ جس کتے کو پالنا جائز ہے، اسکی خرید وفروخت بھی جائز ہے اور

جس کو پالنا جائز نہیں تو اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں، اور خنزیر کے علاوہ ہر اس جانور کی خرید وفروخت جائز ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہو، البتہ ''کلب عقور'' یعنی ہڑکایا کتا، باولا کتا چونکہ نفع بخش نہیں ہے، محض ضرر کیلئے ہے، اسلئے اسکی خرید وفروخت جائز نہیں۔

حنفیہ اور مالکیہ نے مندرجہ ذیل احادیث اور آثار سے استدلال کیا ہے:

(۱)......جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت لینے سے منع کیا سوائے شکاری کتے کے (کہ اسکی قیمت لینا جائز ہے)۔

(۲)......امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا عمل نقل کیا ہے کہ انہوں نے شکاری کتا قتل کرنے کی وجہ سے ایک آدمی پر چالیس درہم اور جانوروں کے حفاظتی کتے کو مارنے پر ایک مینڈھے کے تاوان کا فیصلہ فرمایا۔

(۳)......حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی پر کتا قتل کرنیکا تاوان بیس اونٹ مقرر کیا۔

(۴)......ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص سکھائے ہوئے کتے کو قتل کردے، تو اسکی قیمت کا تاوان مارنے والے پر لازم ہوگا۔

(۵)......شکاری کتے اور مویشی و زراعت کی حفاظت کرنے والے کتے کا پالنا صحیح احادیث سے ثابت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جب ان احادیث سے کتے کا قابل انتفاع مال ہونا ثابت ہے، تو پھر کتے کی قیمت اور اسکی خرید وفروخت کیسے حرام قرار دی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ متعدد صحابہ کرام اور تابعین سے ایسے فتاوی منقول ہیں، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کے کتے کو ہلاک کردے تو اسکا تاوان اس کے ذمے لازم آئیگا، اور تاوان اسی چیز کا لازم آسکتا ہے جسکی خرید وفروخت ہوسکتی ہو اور جو چیز خریدی اور بیچی نہیں جاسکتی، اس کا تاوان لازم نہیں آتا۔

لہٰذا مذکورہ احادیث اور صحابہ وتابعین کے فتاوی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کتے کا پالنا جائز ہے تو اسکی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

حدیث باب کی توجیہ

حنفیہ اور مالکیہ کیطرف سے حدیث باب کی تین توجیہات ہوسکتی ہیں:

(۱)......حدیثِ باب ابتداء اسلام کے زمانے سے متعلق ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے مطلقاً ہر قسم کے کتے کو مارنے کا حکم دیا تھا، اس زمانے میں کتے کی خرید وفروخت جائز نہیں تھی، پھر جب کتوں کو قتل کرنیکا حکم منسوخ ہوگیا تو اسکی خرید وفروخت کی ممانعت کا حکم بھی منسوخ ہوگیا، چنانچہ حدیث میں ہے: ''کتے کی قیمت اور پچھنے لگانے والے کی اجرت حرام ہے پھر پچھنے لگانے والے کی اجرت کو آپ نے جائز قرار دیا'' تو جسطرح پچھنے لگانے کی اجرت کی ممانعت منسوخ ہوگئی اسی طرح کتے کی قیمت دینے کی ممانعت بھی منسوخ ہوگئی، جسکی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد صحابہ اور تابعین نے کتا مارنے پر تاوان مقرر فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کتوں کے احکام تشدید سے تخفیف کیطرف منتقل ہوتے رہے ہیں چنانچہ ابتدا میں حکم یہ تھا کہ کتوں کو قتل کردیا جائے، پھر بعد میں صرف کالے کتے کو مارنے کا حکم آیا، پھر بعد میں کتے کو پالنے کی مطلق ممانعت کا حکم آیا، پھر اس کے بعد شکار اور مویشی کے حفاظتی کتے کا استثناء آیا، اس سے معلوم ہوا کہ ابتداء میں حکم سخت تھا، تاکہ لوگوں کے دلوں سے جاہلیت کے اثرات مکمل طور پر ختم ہوجائیں، یہ مقصد جب پورا ہوگیا تو حکم میں بھی نرمی اور رخصت آگئی، چنانچہ وہ صحابہ اور تابعین جو ممانعت کی احادیث کے راوی ہیں، ان کا اپنا عمل رخصت پر تھا، یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ ممانعت کا حکم منسوخ ہوگیا۔

(۲)......ممانعت کی احادیث اس کتے سے متعلق ہیں جسکا شرعاً پالنا جائز نہیں اور جو فائدہ مند بھی نہیں، اور جواز کی احادیث اس کتے کے بارے میں ہیں جسکا پالنا جائز ہے اور جو ضرر رساں نہیں بلکہ نافع ہے۔

(۳)......ممانعت والی احادیث میں ''نہی'' سے تحریمی نہیں بلکہ نہی تنزیہی مراد ہے، اور اس سے مقصود کتے فروخت کرنے کے پیشے کی دنـــاءت اور گھٹیا پن کو ظاہر کرنا ہے، تاکہ لوگ اسے اختیار نہ کریں، اس نہی کے تنزیہی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے کتے کے ساتھ بلی کی قیمت دینے سے بھی منع فرمایا، حالانکہ بلی کی خرید وفروخت کسی کے نزدیک بھی حرام نہیں، لہذا اس حدیث میں بھی ''نہی'' سے کراہت تنزیہی ہی مراد ہوگی۔

اور اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں "ثمن کلب" کو "اجرت حجام" (پچھنا لگانے والے کی اجرت) کے ساتھ ملا کر منع کیا گیا ہے، حالانکہ پچھنے لگانے کی اجرت بالا جماع جائز ہے، اور خود حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے حجام (پچھنے لگانے والا) کو اجرت عطا فرمائی، لہٰذا اس حدیث میں بھی ممانعت سے کراہت تنزیہی ہی مراد ہوگی۔ اور جن روایات میں کتے کی خرید وفروخت سے "نہی" آئی ہے یا "ثمن کلب" کو "مال خبیث" کہا گیا ہے، اس سے حرمت مراد نہیں ہے بلکہ صرف کراہت تنزیہی مراد ہے کہ یہ پیشہ پسندیدہ نہیں ہے۔ شرح مسلم للنووی، کتاب المساقاۃ ۲/۱۹، ۲۰، تکملۃ فتح الملھم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم ثمن الکلب ۱/۵۲۶۔۵۳۱۔ فتح الباری، کتاب البیوع، باب ثمن الکلب ۴/۵۳۶، تقریر ترمذی ۱/۲۱۱۔

کن مقاصد کیلئے کتا پالا جا سکتا ہے

چند مواقع پر کتا رکھنے اور پالنے کی شرعاً اجازت ہے، جبکہ اسکی "حاجت" اور ضرورت ہو، شکار کیلئے کھیتی اور جانوروں کی حفاظت کیلئے، اور گھر کی چوکیداری کیلئے کتا پالنا اور رکھنا جائز ہے، تاہم اگر کتا رکھے بغیر کسی اور طریقے سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہو تو کتا رکھنے سے احتراز کرنا بہتر ہے، گو کہ مذکورہ مقاصد کیلئے کتا رکھا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے لعاب وغیرہ کے جراثیم انتہائی زہریلے ہوتے ہیں، عموماً طرح طرح کی امراض کا وہ شکار ہوتا ہے، اس کے مزاج میں لہو ولعب اس انداز کا ہوتا ہے کہ شیطان کی بات کو قبول کرتا ہے نجاست سے پرہیز نہیں کرتا اور دوسرے لوگوں کو اس سے تکلیف پہونچتی ہے، اس لئے کتا پالنے سے اجتناب کرنا زیادہ مناسب ہے، مذکورہ مقاصد کے علاوہ محض اپنے شوق کو پورا کرنے کیلئے کتا پالنا، جیسا کہ اس زمانے میں عموماً شہروں میں لوگ شوقیہ طور پر کتے پالتے ہیں، شرعاً یہ جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں ان کے گھر میں رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہوتے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اس گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا ہو، اور ضرورت کی بنیاد پر جب مذکورہ مقاصد کیلئے کتا رکھا جائے تو پھر وہ اس وعید میں نہیں آتا۔ شرح مسلم للنووی، کتاب المساقاۃ باب الامر بقتل الکلاب ۲/۲۰، ۲۱۔ تکملۃ فتح الملھم ۱/۵۴۰، ۵۴۱، مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصید والذبائح ۷/۶۹۸۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ التَّعْلِيْقِ

یہ باب گلے میں تعویذ یا گنڈہ لٹکانے کی کراہت کے بیان میں ہے

عَنْ عِيْسَى وَهُوَ ابْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِيْ لَيْلٰى قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُكَيْمٍ أَبِيْ مَعْبَدٍ الْجُهَنِيِّ أَعُوْدُهُ وَبِهٖ حُمْرَةٌ، فَقُلْتُ: أَلَا تُعَلِّقُ شَيْئًا؟ قَالَ: الْمَوْتُ أَقْرَبُ مِنْ ذٰلِكَ، قَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ إِلَيْهِ.

عیسیٰ بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عکیم ابومعبد جہنی کے پاس ان کی بیمار پرسی کیلئے گیا، انہیں خسرہ نکل آیا تھا، میں نے ان سے کہا: آپ کچھ تعویذ کیوں نہیں لٹکا لیتے، تو انہوں نے فرمایا: موت اس سے زیادہ قریب ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے اوپر کسی تعویذ کو لٹکائے (یہ سمجھ کر کہ تعویذ نفع پہونچاتے ہیں اور نقصان کو دور کرتے ہیں) تو وہ اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے (پھر اس کے ساتھ کوئی تائید غیبی نہیں ہوتی)

مشکل الفاظ کے معنی:۔ تعلیق: لٹکانا، گلے میں تعویذ لٹکانا۔ حمرۃ: (حاء پر پیش اور میم کے سکون کے ساتھ) خسرہ، ایک جلدی بیماری جس میں بدن سرخ یا اسپر دانے نکل آتے ہیں، اور اس میں بخار بھی شدید ہوتا ہے۔ الا تعلق شیئاً: تم کچھ تعویذ کیوں نہیں لٹکاتے۔ ''تعلق'' باب تفعیل سے ہے، بعض حضرات نے اسے باب تفعّل سے قرار دیا ہے، اس صورت میں اس کے شروع سے ایک تاء حذف ہوگی، اصل میں یوں ہوگا الا تتعلق شیئاً۔ ترجمہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ وکل الیہ: (باب ضرب سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے) اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، یعنی اگر ان تعویذات وغیرہ کو مؤثر حقیقی سمجھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی، اسے بس ان تعویذات کے ہی سپرد کر دیا جاتا ہے۔

تعویذ کا شرعی حکم

دم اور جھاڑ پھونک چند شرائط کے ساتھ بالاتفاق جائز ہے، جنکی تفصیل باب ما جاء فی کراھیة الرقیة کے تحت گذر چکی ہے، البتہ بعض حضرات تعویذ لکھنے، پلانے اور گلے میں لٹکانے کو جائز نہیں سمجھتے، وہ حضرات اسے شرک قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

(۱)......حدیث باب جس میں عبداللہ بن عکیم نے گلے میں تعویذ نہیں لٹکائے اور کہا کہ موت اس سے زیادہ قریب ہے، حضورﷺ نے فرمایا: جو شخص کچھ تعویذ لٹکالے تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، پھر اس کے ساتھ تائید غیبی اور مدد و نصرت نہیں ہوتی۔

(۲)......سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور اکرمﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ" بیشک جھاڑ پھونک، تعویذات اور تولہ شرک ہے"

تمائم، تمیمۃ کی جمع ہے، تعویذ کو کہتے ہیں، جسے اس حدیث میں شرک کہا گیا ہے۔

لیکن جمہور صحابہ، تابعین اور علماء امت کے نزدیک تعویذ لکھنا، پینا، پلانا اور گلے میں باندھنا جائز ہے بشرطیکہ قرآنی آیات یا احادیث میں منقول کلمات سے تعویذ لکھا جائے اگر چہ ان کے معنی معلوم نہ ہوں، یا ایسے الفاظ و کلمات سے تعویذ لکھا جائے جو کفر و شرک کے معنی پر مشتمل نہ ہوں، معنی واضح اور شریعت کے موافق ہوں، مہمل اور بے معنی الفاظ نہ ہوں، اور تعویذات کو نفع و نقصان وغیرہ پہونچانے میں مؤثر حقیقی نہ سمجھا جائے۔

جمہور کا استدلال: (۱)......ابن ابی شیبہ اور امام ابوداؤد نے عمرو بن شعیب کے طریق سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت نقل کی ہے کہ جو شخص خواب میں ڈرتا ہو، حضور اکرمﷺ نے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ یہ کلمات پڑھ لیا کرے:

"بِسْمِ اللّٰهِ" أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ، وَسُوْءِ عِقَابِهٖ، وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ، وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ"

"میں اللہ تعالیٰ کے نام سے دم کرتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کے پورے کلمات کے واسطے سے پناہ مانگتا ہوں اسکے غضب اور برے عذاب سے، اس کے بندوں کے شر اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے سمجھ دار بچوں کو یہ کلمات سکھا دیتے تھے، اور جو بچے سیکھنے کے قابل نہ ہوتے تو یہ کلمات لکھ کر ان کے گلے میں تعویذ بنا کر لٹکا دیتے۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹/۸، بذل المجہود، کتاب الطب، باب کیف الرقی ۲۲۲/۱۶، سنن ابی داؤد ۱۸۷/۲۔

(۲)......حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ وہ دردزہ میں مبتلا عورت کیلئے ان کلمات کومفید سمجھتے تھے:

لاَ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا، كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلاَّ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ، بَلاَغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلاَّ الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ"

''اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی بردبار اور مہربان ہے، میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں جو عرش عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، جس روز یہ اس (قیامت) کو دیکھیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دنیا میں) صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی رہے ہیں، جس دن یہ لوگ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، تو (ایسا معلوم ہوگا کہ) گویا دن کی ایک گھڑی ہی (دنیا میں) ٹھہرے تھے، یہ ہے پیغام پہونچا دینا، پس نافرمانوں کے سوا کوئی ہلاک نہ کیا جائیگا۔

اسی روایت میں ہے کہ ان کلمات کو پکی سیاہ روشنائی سے لکھ کر عورت کو پلا دیا جائے یا وہ دم کیا ہوا پانی اسکی ناف کے نچلے حصے پر چھڑک دیا جائے اور یا تعویذ بنا کر عورت کے بازو پر باندھ دیا جائے۔

اس حدیث کے راوی علی بن الحسن فرماتے ہیں کہ ہمیں اس مقصد کیلئے اس تعویذ سے بڑھکر کوئی اور نافع چیز نہیں ملی یعنی یہ بہت ہی مفید ہے۔ فتاوی ابن تیمیۃ، فصل ویجوزان یکتب للمصاب وغیرہ من المرض......۱۹/۶۴۔

(۳)......تابعین میں سے سعید بن المسیب، عطاء، مجاہد، محمد بن سیرین، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر، اور امام ضحاک رحمہم اللہ سے تعویذات کا جواز منقول ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، کتابۃ التعویذات ۴/۳۱۷۔

(۴)......علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنے فتاوی میں تعویذات کے جواز کی تصریح فرمائی ہے۔ فتاوی ابن تیمیۃ ۱۹/۶۴۔

جمہور کیطرف سے حدیث باب کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میں ان تعویذات کا ذکر ہے جو شرکیہ الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے، اور انہی کو نفع ونقصان پہونچانے کا سبب حقیقی سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے اسطرح کے

تعویذات کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں "رقی" اور "تمائم" کو جو شرک کہا ہے، اس سے وہی دم اور تعویذ مراد ہیں جو خلاف شرع کلمات پر مشتمل ہوں ان میں شرکیہ کلمات ہوں، اور یا اسے کوئی مؤثر حقیقی سمجھتا ہو، اسکی تائید اس روایت کے باقی حصے سے بھی ہوتی ہے، اس میں ہے کہ "عبداللہ بن مسعود کی اہلیہ نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں کہ تعویذ اور جھاڑ پھونک شرک ہے، واقعہ یہ ہے کہ میری آنکھ آشوب چشم میں مبتلا تھی، میں فلاں یہودی سے دم کراتی تو میری آنکھ ٹھیک ہو جاتی، اس پر عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: یہ سب کچھ شیطانی عمل ہے، وہ یہودی شیطان سے مدد لیکر دم کرتا ہے، تھوڑی دیر کیلئے وہ آنکھ درست ہو جاتی ہے، آپ وہ کلمات پڑھا کریں جو نبی کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے:

أَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاءُ كَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَماً.

تکلیف کو دور فرما اے لوگوں کے رب، تو اسے شفا دے، تو ہی شفاء دینے والا ہے، آپکی شفا کے علاوہ اور کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے جو ذرا سا مرض بھی نہ چھوڑے"

اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ وہ ممنوع ہے جو اہل شرک کے ہاں رائج تھا جس میں وہ شیاطین اور جنات سے مدد مانگتے تھے، لیکن اگر دم اور تعویذات قرآنی آیات اور احادیث میں منقول کلمات سے ہوں، یا ایسے الفاظ سے جنکا مفہوم واضح اور شریعت کے موافق ہو تو ان میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ جائز ہیں بلکہ بعض علماء نے ایسے تعویذات اور دم جو قرآنی آیات و حدیث کے منقول کلمات سے ہوں، انہیں مستحب قرار دیا ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، کتابۃ التعویذات ۳۱۷/۴۔ فتح الباری کتاب الطب، باب الرقی بالقرآن ۲۴۰/۱۰ بذل المجھود ۲۱۲/۱۶۔

عام عملیات کا حکم

دم، منتر، جھاڑ پھونک اور تعویذات ذکر کردہ شرائط کے ساتھ جائز ہیں، یہی حکم عام عملیات کا ہے مختلف کلمات، مختلف وظائف کو بعض لوگ مخصوص تعداد اور خاص پابندیوں کے ساتھ پڑھتے ہیں، شرعاً ایسے

عملیات کا حکم یہی ہے کہ اگر ان میں کوئی شرکیہ کلمہ اور غیر واضح لفظ نہ ہو، تو جائز ہے۔

یہ دراصل لوگوں کے اپنے اپنے تجربات ہوتے ہیں، کسی نے خاص مقصد کیلئے کوئی کلمہ ایک لاکھ مرتبہ رات کے وقت پڑھ لیا اور اس کا کام ہوگیا، اس نے پھر تجربہ کیا اور کامیاب رہا، اس طرح وہ شخص اس کو باقاعدہ ایک وظیفے اور ایک عمل کی شکل دیدیتا ہے، اسے کوئی شرعی حکم نہیں سمجھنا چاہیے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مختلف جڑی بوٹیوں کی تاثیر لوگوں نے تجربات کر کے معلوم کی ہے، اور مختلف امراض میں ان کا انفراداً یا ترکیباً استعمال مفید رہتا ہے۔

لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ عملیات سے کوئی قطعی حکم ثابت نہیں ہوتا مثلاً بعض لوگ چور معلوم کرنے کیلئے عمل کرتے ہیں، تو صرف اس عمل کی وجہ سے کسی شخص کو واقعتاً چور سمجھ لینا اور اسپر چوری کے احکام لاگو کرنا جائز نہیں۔ فتح الباری، ۱۰/۲۴۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَبْرِيْدِ الْحُمَّى بِالْمَاءِ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں بخار کو پانی سے ٹھنڈا کرنیکا ذکر ہے

عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْحُمَّى فَوْرٌ مِنَ النَّارِ فَابْرُدُوْهَا بِالْمَاءِ.

رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بخار جہنم کا شعلہ اور لپٹ ہے، اس لئے تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔

عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ الْحُمَّى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَابْرُدُوْهَا بِالْمَاءِ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک بخار دوزخ کی تپش اور بھڑک ہے اس لئے تم اسکی (گرمی کو) پانی سے ٹھنڈا کرلیا کرو۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعَلِّمُهُمْ مِنَ الْحُمَّى وَمِنَ الْأَوْجَاعِ كُلِّهَا أَنْ يَقُوْلَ: بِسْمِ اللّٰهِ الْكَبِيْرِ، أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ مِنْ شَرِّ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ، وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ.

عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ بخار اور تمام دردوں کیلئے صحابہ کرام کو یہ دعا سکھاتے تھے کہ (بیمار یا اسکا تیماردار یا بیمار پرسی کرنے والا) کہے: **بسم اللہ الکبیر، اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرق نعار، و من شر حر النار** ''میں اللہ کے نام سے شفا چاہتا ہوں جو بڑا ہے، میں عظمت والے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ہر جوش مارنے والی رگ کی شر سے اور آگ کی گرمی کی شر سے'' اور ایک روایت میں: عرق یعار ہے: بہت زیادہ آواز نکالنے والی رگ۔

مشکل الفاظ کے معانی: ۔ **تبرید**: ٹھنڈا کرنا۔ **حمی**: (حاء پر پیش اور میم کی تشدید اور الف مقصورہ کے ساتھ) بخار۔ **فور**: (فاء پر زبر اور واؤ کے سکون کے ساتھ) تپش، شعلہ، لپٹ، بھڑک۔ **فابردوھا**: (ہمزہ وصلی اور را کے پیش کے ساتھ) باب نصر سے صیغہ امر ہے،: تم اس بخار کو ٹھنڈا کرو۔ حافظ ابن حجر، امام نووی، قاضی عیاض اور امام قرطبی کے نزدیک یہی تلفظ راجح ہے، جبکہ بعض حضرات نے اسے باب افعال سے قرار دیا ہے یعنی ہمزہ قطعی اور را کے نیچے زیر کے ساتھ، لیکن پہلے قول کو فصاحت کے لحاظ سے راجح قرار دیا گیا ہے، اور شعراء بھی عموماً اسے ثلاثی مجرد باب نصر سے ہی استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حماسی شاعر نے کہا:

اِذَا وَجَدْتُ لَهِيبَ الْحُبِّ فِیْ كَبِدِیْ
اَقْبَلْتُ نَحْوَ سِقَاءِ الْقَوْمِ اَبْتَرِدِ
هَبْنِیْ بَرَدْتُ بِبَرْدِ الْمَاءِ ظَاهِرَهٗ
فَمَنْ لِنَارٍ عَلَى الْاَحْشَاءِ تَتَّقِدِ

''جب میں اپنے جگر میں عشق ومحبت کا شعلہ پاؤں تو ٹھنڈا ہونے کیلئے قوم کے مشکیزے کی طرف آگے بڑھتا ہوں، میں کہتا ہوں مجھے چھوڑو، جانے دو تا کہ میں پانی کی ٹھنڈک سے اپنے کو ٹھنڈا کروں کیونکہ کوئی بھی شخص اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اسکی آنتیں آگ میں جلیں۔

ان اشعار میں لفظ ''برد'' ثلاثی مجرد باب نصر سے استعمال ہوا ہے۔ فتح الباری ۲۱۵/۱۰، تکملۃ فتح

تکملہ ۴/۳۴۲۔

فیح: (فاء پر زبر اور یاء کے سکون کے ساتھ) تپش، شعلہ، لپٹ، بھڑک۔ أوجاع: وجع کی جمع ہے: درد۔ ان یقول: اسکا قائل بیمار ہے یا تیماردار یا بیمار پرسی کرنے والا۔ عرق: (عین کے نیچے زبر اور راکے سکون کے ساتھ) رگ۔ نعار: (نون کے زبر اور عین کی تشدید کے ساتھ) یہ اسم مبالغہ ہے: بہت چیخ و پکار کرنے والا۔ اور ''عرق نعار'' سے وہ رگ مراد ہے جس سے خون نکلتے وقت آواز ہوتی ہے، جوش مارنے والی رگ۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۰۶۔

الحمی فور من النار کے معنی

شارحین حدیث نے اس کے تین معنی بیان کئے ہیں:

(۱)...... بعض کے نزدیک الحمی فور من النار کے حقیقی معنی مراد ہیں کہ بخار کی تپش دوزخ کا ایک حصہ اور شعلہ ہے، تاکہ اسکی تپش کو محسوس کر کے لوگ اس دنیا میں جہنم کی گرمی اور عذاب کا کچھ اندازہ کر سکیں، جس طرح کہ خوشی اور لذت و سرور دراصل جنت کی نعمتوں میں سے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو عبرت کے طور پر دنیا میں بھی یہ نعمتیں عطا فرما دیتے ہیں۔

(۲)...... بعض محدثین کے نزدیک اس سے حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ یہ مجاز اور بطور تشبیہ کہا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ بخار کی گرمی جہنم کی گرمی اور تپش کے مشابہ ہے، اس سے دوزخ کی آگ کی شدت اور سختی کو بیان کرنا مقصود ہے تاکہ لوگوں کو تنبیہ اور عبرت ہو جائے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب الحمی من فیح جھنم ۱۰/۲۱۵۔

(۳)...... بعض شارحین حدیث نے اس کے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ بخار درحقیقت انسان کی غلطیوں کی دنیا میں ہی پیشگی سزا ہے اور یہ اس لئے ہے تاکہ دنیا میں ہی اس کے گناہ دھل جائیں اور آخرت کے عذاب سے وہ محفوظ رہے، اسکی تائید حضرت ابو ریحانہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بخار جہنم کا شعلہ ہے اور یہ مومن کا دوزخ سے حصہ اور نصیب ہے''۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، باب لکل داء دواء، ۴/۳۴۲۔

اور حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بخار کا ذکر ہوا تو ایک شخص نے اسے

برا بھلا کہا، اسپر حضور ﷺ نے فرمایا: تم اس بخار کو برا بھلا مت کہو، کیونکہ یہ گناہوں کو یوں ختم کرتا ہے جیسا کہ آگ لوہے کے میل کو ختم کر دیتی ہے"۔ زاد المعاد، فصل فی ھدیہ ﷺ فی علاج الحمی ۳ر۷۷۔

بخار کو پانی سے ٹھنڈا کیا جائے

احادیث باب میں ہے کہ جب بخار ہو جائے تو اسکی تپش اور تیزی کو پانی سے ٹھنڈا کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: فأبردوھا بالماء، یہاں تو مطلقاً "ماء" کا ذکر ہے، کہ کسی بھی پاک پانی سے بخار کو ٹھنڈا کیا جائے، بعض روایات میں "ماء زمزم" کے الفاظ آئے ہیں کہ زمزم کے پانی سے بخار کی تپش کو دور کیا جائے، اسی وجہ سے بعض کے نزدیک بخار کی حرارت کو آب زمزم سے ہی دور کیا جائیگا، لیکن جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ اہل مکہ کیلئے تو یہی بہتر ہے کہ وہ آب زمزم استعمال کریں، کیونکہ وہ انہیں ہر وقت آسانی سے میسر ہے، اور باقی لوگوں کیلئے عام پانی کا استعمال بھی درست اور مفید ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ حدیث میں لفظ "ماء" سے پانی کا استعمال مراد ہے، صدقہ کرنا مراد نہیں، یہ درحقیقت ان لوگوں پر رد کرنا مقصود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جسطرح پیاس کی شدت اور تپش کو پانی کے ذریعہ بجھایا جاتا ہے، اسی طرح بخار جو جہنم کی آگ کا ایک خاص اثر ہے، اسکی شدت کو صدقہ کر کے دور کیا جائے، یہ حضرات لفظ "ماء" سے گویا صدقہ کرنا مراد لیتے ہیں، لیکن جمہور کے نزدیک اس سے پانی کا استعمال کرنا ہی مراد ہے اسکی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں دوران بخار پانی استعمال کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں، جنکی تفصیل آگے آرہی ہے، ہاں اگر کوئی صدقہ کرنا چاہے تو وہ عام ایام کیطرح بیماری کے زمانے میں بھی جائز ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اس حدیث میں لفظ "ماء" سے صدقہ کرنا مراد ہے، بلکہ دیگر آیات اور احادیث کی وجہ سے جو مطلقاً صدقہ کی فضیلت کے بارے میں منقول ہیں۔ زاد المعاد، فصل فی ھدیہ ﷺ فی علاج الحمی ۳ر۷۷۔

کونسے بخار میں پانی کا استعمال مفید ہوتا ہے

یہاں کسی کو یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بخار کی بعض قسموں میں ٹھنڈا پانی جسم میں استعمال کرنا مفید نہیں

ہوتا، خاص کر سردی لگنے کی وجہ سے جو بخار آتا ہے اس میں پانی کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے، تو پھر حضور ﷺ نے مطلقاً یہ کیسے ارشاد فرمایا کہ بخار میں پانی استعمال کرو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد مطلقاً ہر بخار کیلئے نہیں، بلکہ یہ بخار کی ان قسموں سے متعلق ہے، جن میں پانی سے جسم کو ٹھنڈا کرنا مفید ہوتا ہے، عموماً جو بخار گرمی اور گرم لو لگنے کی وجہ سے ہوتا ہے اس میں پانی کا استعمال بہت مفید رہتا ہے، اور چونکہ حجاز گرم علاقہ ہے تو وہاں لوگوں کو عموماً گرمی اور تپش کی وجہ سے بخار ہو جاتا تھا، اس لئے حضور ﷺ کا یہ ارشاد اس سے متعلق ہے، ہر قسم کے بخار کے بارے میں نہیں۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب الحمی من فیح جہنم ۱۰/ ۲۱۷۔

بخار میں ٹھنڈا پانی کیسے استعمال کیا جائے

حدیث میں بخار کو ٹھنڈا کرنیکا حکم دیا گیا ہے، تو کیا اس ٹھنڈک پہونچانے کا کوئی مخصوص طریقہ ہے یا کسی بھی طرح پانی استعمال کیا جاسکتا ہے؟

مختلف احادیث میں بخار ٹھنڈا کرنے کے چند طریقے منقول ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... اس کا ایک طریقہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ وہ بخار والے شخص کے سینے پر پانی چھڑک دیا کرتی تھیں۔ فتح الباری ۱۰/ ۲۱۴۔

(۲)...... امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے، اس میں ایک اور طریقہ بیان کیا گیا ہے، اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ بخار میں مبتلی شخص صبح کی نماز کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے کسی نہر میں اتر جائے اور جس طرف سے پانی بہہ کر آرہا ہے، ادہر چہرہ اور سینہ کردے، اور بِسۡمِ اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ اشۡفِ عَبۡدَکَ وَ صَدِّقۡ رَسُوۡلَکَ" (میں اللہ کے نام سے شفاء طلب کرتا ہوں، اے اللہ تو اپنے بندے کو شفاء دے اور اپنے رسول کی بات سچ کر دکھا) کہکر اس میں تین ڈبکیاں لگائے، تین دن یہ عمل کرے، ٹھیک ہو جائیگا، ورنہ پانچ دن یا پھر سات دن اور یا پھر نو دن یہ عمل دہرائے، نو دن کے اندر اندر یہ بخار ان شاء اللہ ضرور جاتا رہیگا۔ جامع ترمذی، ابواب الطب، باب، ۲/ ۲۸۔

(۳)...... حضرت سمرہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ بخار میں پانی کا مشکیزہ منگواتے، اور اسے اپنے سر کے

بالوں پر ڈال کر غسل فرماتے۔ فتح الباری ۲۱۸/۱۰۔

(۴)......حضرت انس کی روایت میں ہے کہ بخار زدہ شخص پر صبح کے وقت ٹھنڈا پانی تین دن تک چھڑکا جائے۔

(۵)......طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مغرب وعشاء کے درمیان کسی وقت بخار زدہ آدمی پر پانی بہادیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیث کی رو سے بخار میں پانی کا استعمال مفید ہوتا ہے تاہم علم طب چونکہ ایک پیچیدہ اور مشکل علم ہے، بسا اوقات ایک دواء ایک مریض کیلئے ایک وقت میں فائدہ مند ہوتی ہے، اور دوسرے وقت میں اس کیلئے وہی دوا نقصان دہ ہو جاتی ہے، اور اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک ہی مرض کا علاج عمر، وقت، جگہ، موسم، عادت، غذا، تاثیر اور طبیعت ومزاج کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے، اس لئے بخار زدہ شخص کو از خود پانی کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، جب تک کہ وہ کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ نہ کر لے، کیونکہ حالات اور اشخاص کے لحاظ سے دواء کی تجویز میں فرق آسکتا ہے، ڈاکٹر کو معائنہ کرانے سے اگر پانی کا استعمال تجویز ہو تو پھر پانی ضرور استعمال کرنا چاہیے، جیسا کہ اب بھی بعض دفعہ جب بخار زدہ شخص کا بخار ایک سو چار سے بڑھ جائے تو ٹھنڈے پانی سے بھگو کر کپڑے کے ٹکڑے اس مریض کے جسم پر لگائے جاتے ہیں، تاکہ اسکی بخار کی گرمی اور تپش ختم ہو جائے، لیکن ماہر ڈاکٹر کو دکھائے بغیر از خود اسطرح کا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، باب لکل داء دواء ۳۴۳/۴، ۳۴۶۔ فتح الباری ۲۱۸/۱۰، زاد المعاد ۷۷/۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْغِيْلَةِ

یہ باب دودھ پلانے والی عورت سے جماع کے (جواز کے) بارے میں ہے

عَنْ بِنْتِ وَهْبٍ وَهِيَ جُدَامَةُ، قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: أَرَدْتُ أَنْ أَنْهَى عَنِ الْغِيَالِ فَإِذَا فَارِسُ وَالرُّوْمُ يَفْعَلُوْنَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ أَوْلَادَهُمْ.

جدامہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت سے جماع کرنے پر پابندی لگا دوں، مگر فارس وروم کے

بارے میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ ایسا کرتے ہیں، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرتے (یعنی اس دودھ سے ان کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں ہوتا)

عَنْ جُدَامَةَ بِنْتِ وَهْبِ الْأَسَدِيَّةِ: أَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَنْهٰى عَنِ الْغِيْلَةِ حَتّٰى ذُكِّرْتُ أَنَّ فَارِسَ وَالرُّوْمَ يَصْنَعُوْنَ ذٰلِكَ وَلَا يَضُرُّ أَوْلَادَهُمْ.

جدامہ بنت وہب سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تحقیق میں نے غیلہ سے منع کرنیکا ارادہ کیا مگر مجھے بتایا گیا کہ فارس وروم کے لوگ دودھ پلانے کے زمانے میں عورت سے جماع کرتے رہتے ہیں اور یہ چیز ان کی اولاد کو ضرر نہیں پہونچاتی (تو پھر میں نے اس سے منع نہیں کیا)

غیلہ کے معنی: -غیلہ، غیال: (غین کی زیر کے ساتھ) اور غیل (غین کی زبر کے ساتھ) کے دو معنی ہیں:

(۱)......امام مالک نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ چھوٹے بچے کو دودھ پلانے کے زمانے میں اس عورت سے جماع کرنا۔

(۲)......ابن سکیت کہتے ہیں کہ حمل کی حالت میں بچے کو دودھ پلانا غیلہ کہلاتا ہے۔ شرح مسلم للنووی، **کتاب النکاح، باب جواز الغیلۃ ۱/۴۶۶۔**

حالت حمل اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران جماع کرنے کا حکم

زمانہ جاہلیت میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ حالت حمل یا بچے کو دودھ پلانے کے دوران بیوی سے تعلقات قائم کرنے سے احتراز کرتے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس دوران جماع کیا جائے تو پھر یہ دودھ بچے کو نقصان دیتا ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے بھی ارادہ فرمالیا کہ ایسی حالت میں بیوی کے پاس جانے سے روک دیا جائے لیکن جب آپ کو پتہ چلا کہ فارس وروم کے لوگ اس حالت میں بیوی سے تعلقات قائم کرتے رہتے ہیں اور اس سے ان کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، تو آپ ﷺ نے ممانعت کا ارادہ ترک فرمادیا، اس سے معلوم ہوا کہ حالت حمل اور شیر خوار بچے کو دودھ پلانے کے دوران بیوی سے تعلقات قائم کئے جاسکتے

ہیں، جب تک کہ صحبت کے نتیجے میں بچے کو کوئی تکلیف نہ پہونچے، اور اگر اس حالت میں بچے کو کوئی ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہو تو پھر تعلقات قائم کرنے سے احتراز کرنا ضروری ہوگا، لیکن یہ معاملہ چونکہ انتہائی نازک ہے، اس لئے ایسی صورتحال میں کسی ماہر ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کیا جائے، مشورہ اور اسکی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے کیونکہ تھوڑی دیر کی غفلت اور لاپرواہی بسا اوقات بڑی حسرت اور افسوس کا سبب بن جاتی ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۰۷۔

حدیث میں فارس وروم کو ذکر کرنیکی وجہ

شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں نبی کریم ﷺ نے فارس وروم کا ذکر خاص طور پر یا تو اس وجہ سے کیا کہ ان کی تعداد اور آبادی زیادہ تھی، یا اس لئے کہ ان کی اولاد عموماً بیماریوں سے محفوظ تھی اور یا اس وجہ سے کہ فارس وروم کے اکثر لوگ حکیم وطبیب تھے، اگر حالت حمل یا بچے کو دودھ پلانے کے دوران جماع کرنا بچے کی صحت کیلئے نقصان دہ ہوتا تو وہ لوگ کبھی بھی بچے کی جان کو خطرے میں ڈال کر اس دوران جماع نہ کرتے، کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اطباء اپنے طرز زندگی میں صحت کے اصول وضوابط کو نظر انداز نہیں کرتے، ورنہ تو لوگوں کا اعتماد ان سے اٹھ جائیگا۔ بذل المجهود، کتاب الطب، باب فی الغیل ۱۶/۲۱۱۔

احادیث جدامہ واسماء میں تعارض کا حل

حضرت جدامہ کی روایات باب سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غیلہ سے منع کرنیکا صرف ارادہ فرمایا تھا، مگر منع نہیں فرمایا کیونکہ اس سے بچے کو کوئی نقصان نہیں ہوتا

جبکہ سنن ابی داؤد میں حضرت اسماء کی روایت میں غیلہ سے ممانعت کا ذکر ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم اپنی اولاد کو مخفی طور پر قتل نہ کرو، کیونکہ غیل کا اثر سوار کو بھی پہونچ جاتا ہے اور اسے گھوڑے سے گرا دیتا ہے''۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الغیل ۲/۱۸۶۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ غیل کی وجہ سے بچے کے مزاج میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، اس کے قوی ضعیف ہو جاتے ہیں، پھر اس خرابی اور کمزوری کا اثر صرف بچپن ہی تک نہیں بلکہ بالغ ہونے کے بعد تک

رہتا ہے، جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بچہ بڑا ہونے کے بعد جب میدانِ کارزار میں جاتا ہے تو دشمن کے مقابلے میں سست اور کمزور پڑ جاتا ہے اور گھوڑے سے گر پڑتا ہے، اور یہ چیز اس بچے کے حق میں ایسی ہی ہے جیسا کہ اسے مقابلے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا ہو، اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم غیلہ نہ کرو تاکہ اسکی وجہ سے تم اپنے بچے کے قتل کا سبب نہ بن جاؤ۔

خلاصہ یہ کہ حدیث اسماء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچہ پر غیلہ کا اثر پڑتا ہے جبکہ حدیث جدامہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی صحت پر غیلہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض پیدا ہو گیا؟ علماء کرام نے اسکے حل کیلئے چار جواب ذکر کئے ہیں:

(۱)...... علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ غیلہ کو نقصان پہونچانے میں مؤثر حقیقی سمجھتے تھے، اسلئے حدیث جدامہ میں نبی کریم ﷺ نے اس نظریے کی تردید فرمائی کہ حالت حمل یا بچے کو دودھ پلانے کے دوران جماع کرنے سے کوئی ضرر نہیں ہوتا، لیکن چونکہ غیلہ سے کسی قدر طبیعت میں فساد اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے، جو ظاہری سبب کے اعتبار سے بچے کی صحت کیلئے نقصان دہ ہو سکتی ہے، اگرچہ مؤثر حقیقی اور صحت و مرض لگانے والے صرف اللہ جل جلالہ ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے حدیث اسماء میں غیلہ کے اثر انداز ہونے کا ذکر فرمایا، اور احتیاطاً اس سے بچنے کا حکم دیا۔ شرح الطیبی، کتاب النکاح باب المباشرہ ۶/ ۲۸۱، ۲۸۲۔

(۲)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "حدیث اسماء" میں نہی سے مکروہ تنزیہی مراد ہے، اور حدیث جدامہ میں **لقد هممت ان انهى عن الغيال** میں نہی سے تحریم مراد ہے یعنی حرام ہونے کی نفی کرنا مقصود ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۳۵۰۔

(۳)...... بعض نے ان احادیث میں یوں تطبیق دی ہے کہ حدیث جدامہ مقدم ہے اور حدیث اسماء مؤخر ہے نبی کریم ﷺ نے اولاً اہل عرب کی عادت اور خیالات کے مطابق غیلہ سے منع کرنیکا ارادہ فرمایا، پھر جب آپ نے اہل فارس اور روم کا عمل دیکھا تو آپ کو ظن غالب ہو گیا کہ غیلہ نقصان دہ نہیں تو آپ ﷺ نے ممانعت کا ارادہ ترک فرمادیا، پھر اللہ تعالیٰ کیطرف سے آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ حالت حمل اور دودھ پلانے

کے دوران بیوی سے صحبت کرنا مضر ہوتا ہے، یہ اگر چہ زیادہ نہیں ہوتا لیکن ضرر قلیل بھی بعض دفعہ طبیعتوں میں اثر انداز ہو جاتا ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے حدیث اسماء میں کراہت تنزیہی کے طور پر غیلہ سے منع فرمادیا۔ بذل المجهود ۱۶/۲۱۱

(۴)......بعض حضرات کے نزدیک حدیث نہی اس پر محمول ہے کہ حالت حمل یا دودھ پلانے کے دوران عورت سے کثرت سے جماع کیا جائے، کیونکہ اس سے بچے کو یقیناً ضرر پہونچتا ہے اور حدیث جدامہ اس پر محمول ہے کہ کثرت سے جماع نہ کیا جائے بلکہ کبھی کبھار کیا جائے جبکہ اس سے بچے کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ إعلاء السنن، باب ماورد فی الغیلۃ ۱۱/۲۶۱۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ دَوَاءِ ذَاتِ الْجَنْب

یہ باب نمونیا کے علاج کے بارے میں ہے

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْعَتُ الزَّيْتَ وَالْوَرْسَ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ. قَالَ قَتَادَةُ وَيُلَدُّ مِنَ الْجَانِبِ الَّذِيْ يَشْتَكِيْهِ.

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ذات الجنب یعنی نمونیے کے (علاج) کے لئے روغنِ زیتون اور ورس بتلاتے تھے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ دوا منہ میں اس جانب ٹپکائی جائے جس طرف اسے مرض لاحق ہو۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَتَدَاوى مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقُسْطِ الْبَحْرِيِّ وَالزَّيْتِ.

زید بن ارقم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ نمونیے کا علاج ہم قسط بحری اور روغن زیتون کے ذریعہ کریں۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ذات الجنب: ہر اس درد کو کہتے ہیں جو انسان کے پہلو میں اٹھے، یہ درد بسا اوقات گیس کے جمع ہونے سے پیدا ہوتا ہے، یہ ایک مرض ہے جس میں پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں، ان میں پانی پڑ جاتا ہے، نمونیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے "ذات الجنب" کی تفسیر "سل" سے کی ہے

سل: (سین کی زیر اور لام کی تشدید کے ساتھ) کے معنی انتہائی ضعف اور کمزوری کے ہیں، اور اصطلاح میں "سل" اس خاص بیماری کو کہا جاتا ہے جس میں پھیپھڑوں میں زخم ہو جاتے ہیں، اسکی وجہ سے شدید بخار رہتا ہے، اور مریض بہت ہی ناتواں اور کمزور ہو جاتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد اس تفسیر سے یہ نہیں کہ ذات الجنب بعینہ "سل" ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب قسط بحری اور روغن زیتون کے ذریعہ مرض سل سے شفاء ہو جاتی ہے، جو کہ ایک سخت مرض ہے، تو ذات الجنب میں بھی یہ دونوں ضرور نافع ہونگی کیونکہ یہ تو مرض سل کے مقابلے میں ذرا کم درجے کا مرض ہے۔ الکوکب الدری، ابواب الطب، باب ھذا، ۹۵/۳۔ تحفۃ الاحوذی ۲۱۱/۶۔

زیت: (زاء پر زبر اور یا کے سکون کے ساتھ) روغنِ زیتون۔ ورس: (واؤ کی زبر اور راء کے سکون کے ساتھ) ایک قسم کا زرد رنگ کا پودا جو زعفران کیطرح ہوتا ہے اور رنگائی کے کام میں لایا جاتا ہے، اور ہندوستان وعرب اور ملک حبشہ میں پیدا ہوتا ہے، اسکی تاثیر گرم اور خشک ہوتی ہے، داغ، کھجلی اور پھنسیوں کیلئے جسم پر لگانا اور برص کی بیماری کیلئے اسے پینا مفید ہوتا ہے، یہ اپنے خواص اور منافع کے اعتبار سے عود ہندی کے قریب قریب ہے۔ یلد: (یاء پر پیش اور لام کی زبر کے ساتھ) منہ کی ایک جانب دوا ٹپکائی جائے۔ یشتکیہ: وہ مرض اس کو لاحق ہے۔

ذات الجنب کا علاج

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس بات کے تحت جو احادیث ذکر کی ہیں، ان میں نبی کریم ﷺ نے مرض ذات الجنب کیلئے دو علاج ذکر فرمائے ہیں:

(۱)......روغن زیتون اور ورس گھاس کے ذریعہ اسکا علاج کیا جائے، اور جس پہلو میں درد ہو، اسی طرف منہ میں انہیں ٹپکایا جائے، روغن زیتون اور ورس کو ایک ساتھ تیار کر کے اکٹھا بھی لدود کیا جا سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کو الگ الگ منہ میں ٹپکایا جائے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الطب، ۳۰۸/۸۔

(۲)......عود ہندی اور روغن زیتون سے علاج کیا جائے جسکا طریقہ یہ ہے کہ عود ہندی کو پیس کر بالکل باریک کر کے زیتون کے گرم تیل میں ملا لیا جائے، اور درد کی جگہ مالش کی جائے، یا اسکا لعوق یعنی چاٹنے کی دوا بنا کر

چاٹا جائے تو ان شاء الله ذات الجنب کی مرض سے شفا ہو جائیگی۔تحفۃ الاحوذی ۲۱۲/۶۔

ذات الجنب کی قسمیں

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ذات الجنب کی دو قسمیں ذکر کی ہیں:

ذات الجنب حقیقی: یہ قسم ورم یعنی سوجن کی شکل میں ہوتی ہے، انسان کی پسلیوں کے اندرونی پٹھوں میں ورم آجاتا ہے، جسکی وجہ سے مریض پانچ تکلیفوں میں مبتلا ہوتا ہے، شدید بخار، کھانسی، نخس (دباؤ)، سانس کی تنگی و تکلیف اور نبض منشاری (آرے کی طرح چلنے والی تیز نبض)، یہ ذات الجنب کی خطرناک قسم ہے، اس سے نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر پناہ مانگی ہے۔

(۲)......ذات الجنب غیر حقیقی: اس سے وہ درد مراد ہے جو گیس کی وجہ سے آدمی کے پہلو میں اٹھتا ہے۔

حدیث میں ذات الجنب سے یہی دوسری قسم مراد ہے، اس کے علاج میں عود ہندی مفید ہوتا ہے کیونکہ وہ گیس کو رفع کرتا ہے، اور باطنی اعضاء کو تقویت دیتا ہے، البتہ اگر پہلی قسم بلغم کی وجہ سے پیدا ہو تو ایسی صورت میں عود ہندی اس کے علاج کیلئے بھی مفید ہوگا۔ زاد المعاد، فصل فی هدیہ فی علاج ذات الجنب ۹۹/۳-۷، فتح الباری ۲۱۲/۱۰۔

قسط بحری اور عود ہندی سے کیا مراد ہے

قسط بحری کو عود ہندی، عود بحری، قسط (قاف پر پیش کے ساتھ) اور کست (کاف کے پیش کے ساتھ) بھی کہتے ہیں۔

یہ ذہن میں رہے کہ ایک عود ہندی مشہور لکڑی ہے، جس کو اردو میں "اگر" کہتے ہیں، جو خوشبو اور دھونی وغیرہ کیلئے استعمال کی جاتی ہے، اور جس کا عطرِ عود مشہور ہے، یہاں حدیث میں قسط بحری اور عود ہندی سے یہ خوشبودار لکڑی مراد نہیں۔

اسی طرح خوشبو کی ایک اور قسم ہے، جس کو عربی میں "قسط اظفار" "اظفار الطیب" "کست" اور اردو میں "نخ" کہتے ہیں، اس کا استعمال عموماً عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب وہ ماہواری اور

نفاس سے پاک ہو جائیں، تاکہ جسم سے خون اور بدبو وغیرہ کے اثرات ختم ہو جائیں، یہاں حدیث میں **قسط سے قسط اظفار بھی مراد نہیں۔**

تو پھر حدیث میں قسط بحری اور عود ہندی سے کیا مراد ہے؟

عود ھندی: ایک مفید جڑی بوٹی ہے، جسکی خوشبودار لکڑی دوا اور دھونی کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، اس کو اردو میں ''کوٹ'' یا ''کوٹھ'' فارسی میں ''کوشنہ'' اور انگریزی میں **COSTUS** کہتے ہیں۔

اسکی پیداوار ملک چین اور برصغیر میں کشمیر کے علاقے میں زیادہ ہوتی ہے، اسکی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک سفید اور دوسری سیاہ، سفید کو عود بحری یا قسط بحری یا قسط عربی کہتے ہیں اور سیاہ کو قسط ہندی یا عود ہندی کہتے ہیں، ان دونوں کی تاثیر گرم وخشک ہے، البتہ عود ہندی کی تاثیر، عود بحری کے مقابلے میں زیادہ گرم ہوتی ہے۔

''قسط بحری'' (سمندری عود) میں قسط کی نسبت ''بحر'' (سمندر) کیطرف اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ لکڑی دوسرے ممالک اور علاقوں سے سمندری راستے سے عرب پہونچتی تھی، اس لئے بحر کیطرف اسکی نسبت کی جانے لگی۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الطب، باب التداوی بالعود الھندی ۴/۲۴۹،۲۵۰۔

عود ہندی کے فوائد:-

عود ہندی چونکہ عموماً دوا کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، اس لئے اطباء نے اس کے بہت فوائد لکھے ہیں مثلاً نفاس والی عورتیں اسکی دھونی لیں تو رکا ہوا فاسد خون جاری ہو جاتا ہے، مضر اور زہریلے جراثیم کو یہ دور کرتی ہے، دماغ، گردے اور جگر کو قوت دیتی ہے، گیس کو ختم کرتی ہے، دماغی بیماریوں جیسے فالج، لقوہ اور رعشہ کیلئے مفید ہے، پیٹ کے کیڑے باہر نکالتی ہے، متأثرہ جگہ پر اسکو ملنے سے چھائیاں اور داغ دھبے جاتے رہتے ہیں، زکام کی حالت میں اسکی دھونی لینا بہترین علاج ہے، نیز اسکی دھونی سے سحر وجادو کے اثرات بھی جاتے رہتے ہیں،.........یہی وجہ ہے کہ علم طب کی کتابوں میں اس کے بہت زیادہ فوائد لکھے ہیں، اسی لئے ایک حدیث میں اسے ''سب سے بہتر دوا'' فرمایا گیا ہے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب السعوط بالقسط الھندی۔ ۱۰/۱۸۳۔ مرقاۃ المفاتیح ۸/۲۹۸۔

بَابٌ

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ أَنَّهُ قَالَ: أَتَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَبِي وَجَعٌ قَدْ كَادَ يُهْلِكُنِيْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: امْسَحْ بِيَمِيْنِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَقُلْ: أَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ وَ سُلْطَانِهِ، مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ. قَالَ فَفَعَلْتُ فَأَذْهَبَ اللّٰهُ مَا كَانَ بِيْ، فَلَمْ أَزَلْ آمُرُ بِهِ أَهْلِي وَغَيْرَهُمْ.

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی کریم ﷺ تشریف لائے، اس وقت مجھے ایسا درد تھا جو مجھے مار ڈالنے والا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا دایاں ہاتھ (اس درد کی جگہ پر) سات بار پھیرو اور کہو" **أعوذ بعزة الله و قدرته وسلطانه من شر ما اجد**" (میں اللہ تعالیٰ کی عزت، قدرت اور اسکی بادشاہت کے واسطے سے ہر اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو میں پاتا ہوں) عثمان کہتے ہیں میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے میرا وہ درد، دور فرما دیا، اس کے بعد میں اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو ہمیشہ یہ عمل بتاتا رہا۔

درد دور کرنیکی دعا

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو جسم کے کسی حصے پر درد ہو تو درد کی جگہ پر دایاں ہاتھ سات دفعہ پھیر کر یہ دعا پڑھے: **اعوذ بعزة الله وقدرته وسلطانه من شر ما اجد**، تو اس سے اسکا درد ان شاءاللہ ختم ہو جائیگا، اس حدیث کے راوی حضرت عثمان بن ابی العاص فرماتے ہیں کہ پھر میں یہ دعا اپنے اہل وعیال اور دیگر لوگوں کو سکھاتا اور بتاتا رہا، کیونکہ اس دعا میں اللہ کی عظمت و بڑائی اور شرور وآفات سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، پھر جس طرح بیماری میں بار بار دوا کھائی جاتی ہے، اسی طرح دعا میں بھی تکرار ہوتا ہے، اور سات کا عدد چونکہ طاق ہے اور بہت ہی خصوصیات کا حامل ہے، اس لئے اس حدیث میں سات کا عدد ذکر کیا ہے۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے: تین دفعہ بسم اللہ پڑھے، اور سات دفعہ یہ دعا پڑھے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۱۲

امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ حدیث کتاب الطب میں اس لئے ذکر کی ہے کہ اس میں دعا کے ذریعہ درد کا علاج بیان کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس حدیث کو کتاب الطب سے مناسبت ہو جاتی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ السَّنَا

یہ باب ''سنا'' کے بیان میں ہے۔

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَأَلَهَا بِمَا تَسْتَمْشِيْنَ؟قَالَتْ: بِالشُّبْرُمِ،قَالَ حَارٌّ جَارٌّ،قَالَتْ: ثُمَّ اسْتَمْشَيْتُ بِالسَّنَا،فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَوْ أَنَّ شَيْئاً كَانَ فِيْهِ شِفَاءٌ مِنَ الْمَوْتِ لَكَانَ فِيْ السَّنَا.

حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کس چیز سے جلاب (دست آور) لیتی ہو،تو انہوں نے عرض کیا ''شبرم'' سے،آپ نے فرمایا: شبرم تو بہت سخت گرم ہے،اسماء کہتی ہیں کہ پھر میں نے ''سنا'' سے جلاب لیا (پھر حضور ﷺ نے مجھ سے دوبارہ پوچھا یا میں نے خود ہی بتادیا) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہوتی (یعنی موت کا علاج کسی دوا میں ہوتا) تو وہ ''سنا'' ہوتی۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔**سنا**: (سین کی زبر کے ساتھ) ایک پودا جو دواؤں میں استعمال ہوتا ہے،اور مسہل اور دست آور ہے،یہ گھاس زیادہ تر حجاز میں ہوتا ہے،اور ''سنائے مکی'' فائدے اور نفع بخش ہونے میں زیادہ مشہور ہے۔ **بما تستمشین**: تم کس چیز سے جلاب لیتی ہو،کونسی دست آور دوا پیتی ہو۔اور دست آور دوا کو مشی (بروزن فعیل) کہتے ہیں،کیونکہ اس میں وہ مریض ہر وقت بیت الخلا کیطرف آتا جاتا رہتا ہے۔**شبرم**: (شین پر پیش،باء ساکن اور را پر پیش) یہ ایک گھاس اور پودا ہے جو دست آور ہے،اس کا درخت چھوٹا اور بڑا دونوں قسم کا ہوتا ہے،بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ''شبرم'' سے اس گھاس کے دانے مراد ہیں جو چنے کے برابر ہوتے ہیں،اور اسہال کیلئے ان دانوں کو پانی میں جوش دیکر اسکو پیا جاتا ہے،اور بعض یہ فرماتے ہیں کہ شبرم کسی درخت کی جڑ کا چھلکا ہے جو گرم خشک ہوتا ہے۔ زاد المعاد،حرف الشین ۹۲۳/۴،تحفۃ الاحوذی ۲۱۳/۶۔**حار**: (حاء پر زبر اور راء کی تشدید کے ساتھ) گرم۔**جار**: (راء پر تشدید کے ساتھ) یہ ''جَرٌّ'' سے ہے کھینچنے والا،حدیث کے معنی یہ ہونگے کہ: شبرم تو گرم ہے جو فاسد مادے کے ساتھ زائد مادہ بھی نکال دیتا ہے جس سے نقصان کا اندیشہ ہے،بعض نے یہ کہا کہ ''حار جار'' میں دوسرا لفظ خواہ جیم کے ساتھ ہو یا حاء کے ساتھ،یہ

مہمل لفظ ہے جو پہلے کی تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ہے، جیسے کہتے ہیں شیطان ویطان، پانی وانی، روٹی ووٹی، اور بعض نسخوں میں دوسرا لفظ "یاء" ہے یعنی "حار یار" یہ مہمل لفظ ہے، جو پہلے کی مزید تاکید کیلئے لایا گیا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۳۰۹/۸، تحفۃ الاحوذی ۲۱۴/۶۔ استمشیت: میں نے دست آور دوا پی، جلاب لیا۔

"سنا" ایک دست آور پودا

حدیث باب سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱)...... پیٹ کی صفائی اور جلاب کیلئے "شبرم" کو نہیں استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ یہ شدید گرم ہوتا ہے، اسکی وجہ سے جسم سے فاسد مادے کے ساتھ ساتھ مفید اجزاء اور ضروری مادے بھی نکل جاتے ہیں، جسم سے پانی بھی ختم ہو جاتا ہے، جس سے انسان انتہائی کمزور، ناتواں اور دبلا ہو جاتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے "حار جار" سے اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے، اس لئے اسہال کیلئے اسے استعمال کرنا مناسب نہیں ہے، اگر کبھی اس مقصد کیلئے اسے استعمال کرنا پڑ جائے تو بہت ہی حکمت اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

(۲)......اسہال اور جلاب کیلئے "سنا" کا استعمال بہت ہی مفید ہوتا ہے، کیونکہ اس میں حرارت مناسب ہوتی ہے، اور اسکی تاثیر میں اعتدال ہوتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے حدیث کے آخری جملے میں اسکی تعریف بیان فرما کر اسکے نافع اور مفید ہونے کو بیان فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ اطباء اپنے تمام نسخوں میں "سنا" کو ضرور شامل کرتے ہیں، اور اسے امراض میں شفا کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "سنا" موت کے علاوہ ہر مرض کی دوا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۳۱۰/۸۔

سنا کے فوائد

اطباء نے "سنا" کے بہت سے فوائد لکھے ہیں مثلاً پیٹ کی صفائی کیلئے نہایت معتدل گھاس ہے صفرا، سودا اور بلغم کے اسہال کیلئے بہت مفید ہے، دماغ اور جلد کو صاف کرتی ہے، اور دل کو بہت ہی طاقت فراہم کرتی ہے، سوداوی اور بلغمی امراض کے لئے فائدہ مند ہے، جنون کو ختم کرتی ہے اور مرگی سے شفا کا ذریعہ ہے، خارش، پھوڑا پھنسی کیلئے، اور سب سے اہم یہ کہ "وسواس سوداوی" کیلئے اسکا استعمال بہت ہی نافع اور

مفید ہوتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۱۳، مرقاۃ المفاتیح ۸/۳۱۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الْعَسَلِ

یہ باب شہد (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ أَخِيْ اسْتُطْلِقَ بَطْنُهُ؟ فَقَالَ: اسْقِهِ عَسَلًا، فَسَقَاهُ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ سَقَيْتُهُ عَسَلًا فَلَمْ يَزِدْهُ إِلَّا اسْتِطْلَاقًا؟ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اسْقِهِ عَسَلًا، قَالَ فَسَقَاهُ، ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ قَدْ سَقَيْتُهُ فَلَمْ يَزِدْهُ إِلَّا اسْتِطْلَاقًا؟ قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: صَدَقَ اللّٰهُ وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيْكَ. اسْقِهِ عَسَلًا، فَسَقَاهُ فَبَرَأَ.

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ جاری ہے (یعنی اسکو مسلسل دست آرہے ہیں، تو آپ اسکا علاج بتادیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: اسے شہد پلاؤ، اس شخص نے جا کر اپنے بھائی کو شہد پلایا، (کچھ دیر کے بعد) پھر وہ آیا، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اسے شہد پلایا، لیکن شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا مگر یہ کہ اس نے پیٹ کو مزید جاری کردیا، راوی کہتے ہیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اور شہد پلاؤ، راوی کہتے ہیں: اس نے پھر بھائی کو شہد پلایا، پھر وہ آیا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ: میں نے اسے شہد پلایا لیکن شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا مگر یہ کہ اس نے پیٹ کو مزید جاری کردیا (یعنی شہد پلانے کے بعد دستوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے) راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اسے پھر شہد پلاؤ، چنانچہ اس نے پھر بھائی کو شہد پلایا، پھر حاضر خدمت ہوکر کہنے لگا: یا رسول اللہ! بیشک میں نے (تین بار) اسکو شہد پلایا، مگر شہد نے اسکے پیٹ کو مزید جاری کردیا، راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تو سچ فرمایا ہے مگر تمہارے بھائی کے پیٹ نے غلطی کی ہے (لہٰذا) تم اس کو (پھر) شہد پلاؤ، آخر کار اس شخص نے اپنے بھائی کو پھر شہد (خالص یا پانی میں

ملا کر) پلایا تو وہ اچھا ہو گیا۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:۔ استطلق: (تاء پر پیش، طاء ساکن اور لام کے زیر کے ساتھ) ماضی مجہول کا صیغہ ہے، اسکا پیٹ جاری ہو گیا۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب دواء المبطون ۱۰/۲۰۷۔ **فلم یزدہ الا استطلاقا:** شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا مگر یہ کہ اس نے پیٹ کو مزید جاری کر دیا۔ **اسقہ:** (ہمزے کی زیر کے ساتھ) تم اس کو پلاؤ۔ **برأ:** (راء پر زبر کے ساتھ لغت اہل حجاز کے مطابق، ''قرأ'' کیطرح، اور دیگر عرب راء کی زیر کے ساتھ ''علم'' کیطرح پڑھتے ہیں) ٹھیک اور تندرست ہو گیا۔ **کذب بطن اخیک:** تیرے بھائی کے پیٹ نے غلطی کی، یہاں ''کذب'' ''خطا اور غلطی'' کے معنی میں ہے، اہل حجاز لفظ ''کذب'' کو اس معنی میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

کیا شہد میں ہر بیماری کی شفا ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فیہ شفاء للناس شہد میں شفا ہے، کیا شہد میں ہر بیماری کی شفا ہے، اس میں دو قول ہیں:

(۱)...... بعض حضرات کے نزدیک اس میں عموم مراد نہیں بلکہ بعض امراض کیلئے شہد شفا کا باعث ہوتا ہے، اور بعض میں اسکا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے، اس لئے ''فیہ شفاء للناس'' عام نہیں بلکہ دو وجہ سے مخصوص ہے، ایک اس وجہ سے کہ ''للناس'' سے بعض لوگ مراد ہیں، اور دوسرا اس وجہ سے کہ آیت میں ''شفا'' نکرہ ہے، اور موضع اثبات میں واقع ہے، اور قاعدہ ہے کہ نکرہ جب موضع اثبات میں واقع ہو تو وہ عموم پر دلالت نہیں کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ شہد تمام امراض کیلئے نہیں بلکہ بعض کیلئے شفا کا ذریعہ ہوتا ہے۔ روح المعانی، سورہ النحل ۸/۱۸۵، فتح الباری ۱۰/۱۷۲۔ عمدۃ القاری ۲۱/۲۳۲۔

(۲)...... دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کے الفاظ عام ہیں اور واقعتاً شہد اصلاً تمام امراض کیلئے باعث شفاء ہے تاہم اگر کسی عارض کی وجہ سے شہد نقصان دہ ثابت ہوتا ہے تو اسکا اعتبار نہیں۔ فتح الباری ۱۰/۱۷۲۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بعض اہل دل بندے ایسے بھی ہیں جنکو شہد کے کسی بھی مرض کیلئے شفا ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، ان کو اپنے رب کے قول کے اس ظاہر ہی پر اس قدر مستحکم یقین اور مضبوط اعتقاد ہے کہ وہ

پھوڑے اور آنکھ کا علاج بھی شہد سے کرتے ہیں اور جسم کے دوسرے امراض کا بھی، حضرت ابن عمر کے متعلق روایت میں ہے کہ ان کے بدن پر اگر پھوڑا بھی نکل آتا تو وہ اسپر شہد کا لیپ کر کے علاج کرتے، بعض لوگوں نے ان سے اسکی وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں **فیہ شفاء للناس** نہیں فرمایا۔ معارف القرآن، سورۃ النحل ۳۶۵/۵۔ عمدۃ القاری، کتاب الطب، باب الدواء بالعسل ۲۳۲/۲۱۔

شہد کے منافع

لفظ ''عسل'' مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اور عربی زبان میں اس کے سو سے زیادہ نام ہیں، شہد کے فوائد اور منافع بہت زیادہ ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے چند فوائد کی تفصیل اسطرح بیان کی ہے: ''شہد آنتوں، رگوں اور جسم کے زائد فضلات کو صاف کرتا ہے، رگیں کھولتا ہے، معدہ، جگر، گردوں اور مثانہ کو قوت بخشتا ہے، جگر اور سینے کو صاف کرتا ہے، بلغمی کھانسی اور بلغمی مزاج رکھنے والوں کیلئے فائدہ مند ہے، شہد دوا بھی ہے اور غذا بھی، شہد میں گوشت اور میواجات رکھے جائیں تو ان کی تازگی تین ماہ تک برقرار رہتی ہے، جسم پر ملا جائے تو جوؤں کو مار دیتا ہے، بالوں میں لگایا جائے تو انہیں خوبصورت اور ملائم بنا دیتا ہے آنکھوں میں لگایا جائے تو بینائی کو جلا بخشتا ہے، دانتوں کو چمکاتا ہے، اور ان کیلئے مفید ہے، اطباء اپنی مرکب دواؤں اور معجونوں میں اسے ملاتے ہیں تاکہ وہ خراب نہ ہوں۔ فتح الباری ۱۷۲/۱۰۔

استطلاق بطن کا علاج شہد کے ذریعہ کیسے؟

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دست کے علاج کیلئے شہد پینے کا فرمایا، اسپر طبی لحاظ سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوا کہ شہد خود مسہل یعنی پیٹ کو جاری کرتا ہے، اور یہاں جب اس شخص کا پیٹ پہلے سے جاری تھا، تو پھر اس کے علاج کیلئے شہد کیونکر تجویز کیا گیا؟

اس اشکال کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)...... بعض حضرات نے کہا کہ یہ شبہہ محض جہالت پر مبنی ہے، کیونکہ اطباء کا اسپر اتفاق ہے کہ ایک ہی مرض کا علاج عمر، عادت، وقت، جگہ، غذاء، تدبیر اور مزاج وطبیعت کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے، اور دست اور اسہال

کا مرض بھی مختلف اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی اعتبار سے ان کے علاج کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں، اور جو جلاب اور دست بدہضمی اور آنتوں کی خرابی کی وجہ سے جاری ہوں، ان کے علاج میں شہد مفید ہوتا ہے، مذکورہ شخص کو اسہال چونکہ بدہضمی اور آنتوں میں خرابی کیوجہ سے تھا اس لئے حضور اکرم ﷺ اس کو شہد پلانے کا حکم دیتے رہے، یہاں تک کہ جب اسکا معدہ فاسد مادے سے بالکل صاف ہوگیا تو وہ تندرست ہوگیا، لہذا حضور اکرم ﷺ کا اسے شہد پلانے کا حکم دینا اصول طب کے عین مطابق تھا۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب دواء المبطون ۲۰۹/۱۰۔

(۲)...... دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ اس شخص کو شہد ہی سے شفا ملے گی، اس لئے اسہال میں اضافے کے باوجود آپ اسے شہد پلانے ہی کا حکم دیتے رہے، لہذا طب کے عام اصولوں سے ہٹ کر یہ ایک مخصوص معاملہ تھا، جو شہد عموماً اسہال اور جلاب میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے حضور اکرم ﷺ کے اعجاز اور دعا کی برکت سے وہی شہد اس کے حق میں شفایابی کا ذریعہ بن گیا اور وہ تندرست ہوگیا۔

(۳)...... بعض ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسہال کے علاج کیلئے جو شہد پلانے کا علاج تجویز فرمایا، یہ علاج بالمثل کے طور پر تھا کہ ایک مرض کا علاج اسی کے مثل سے کیا گیا، یہ طب کے اصول کے بالکل مطابق ہے، کیونکہ ہومیو پیتھک میں علاج بالمثل ہی اساس اور بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے، تکملۃ فتح الملهم، کتاب الطب، باب التداوی بسقی العسل ۳۵۶/۴۔

فلم یزده الا استطلاقا:

اس شخص نے بھائی کو شہد پلایا تو دست مزید جاری ہوگئے اسپر کہنے لگا کہ شہد سے تو اسہال مزید جاری ہوگیا، لیکن اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ اسے شہد پلانے کا حکم دیتے رہے، کیونکہ اس کے پیٹ میں فاسد مادے اس قدر زیادہ جمع تھے کہ ایک دو دفعہ شہد پلانے سے وہ نکل نہیں پائے تھے، بار بار شہد پلانا علاج کا حصہ تھا، اور اسہال کی شکل میں اسکی بیماری نکل رہی تھی، اور آپ ﷺ اسے مسلسل شہد پلانے کا حکم، اس لئے دیتے رہے کہ آپ کو علم ہوگیا تھا کہ اس کے علاج کیلئے شہد کا پلانا ہی فائدہ مند ہے۔ تکملہ ۴/ ۳۵۸

صدق الله و كذب بطن اخيك کے معنی

"صدق الله" اسکی تشریح میں دو احتمال ہیں:

(۱)......ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے قول: "فيه شفاء للناس" کیطرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شہد میں لوگوں کیلئے شفاء ہے، لہذا اس خاص واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا قول صادق ہوگا کہ اس شخص کا پیٹ شہد کے استعمال سے درست ہو جائیگا۔

(۲)......دوسرا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بذریعہ وحی بتادیا تھا کہ اس مریض کے پیٹ کی شفا شہد میں ہے، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا "صدق الله" کہ جب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بتادیا ہے کہ شہد پینے سے اس کو نفع ہوگا، تو تم اسے شہد پلاتے رہو، یقیناً اسکو نفع ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی۔

وكذب بطن اخيك: آپکے بھائی کا پیٹ غلط کہتا ہے یعنی وہ ظاہر کررہا ہے کہ مرض بڑھ رہا ہے لیکن حقیقت میں اس کو شفا ہو رہی ہے۔

اس جملے کے ذریعہ نبی کریم ﷺ درحقیقت صحت میں تاخیر کی وجہ بیان فرمارہے ہیں کہ تمہارے بھائی کے پیٹ میں فاسد مادہ بہت زیادہ جمع ہے، جسکی وجہ سے شہد کی تھوڑی مقدار کارگر نہیں ہورہی، جب تک وہ مادہ باہر نہیں آجاتا تب تک اسے آرام نہیں آئیگا، لہذا شفاء میں تاخیر اس وجہ سے نہیں کہ شہد نفع نہیں پہونچا رہا، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ مرض شدید ہے، اس لحاظ سے دوا کا استعمال تھوڑی مقدار میں ہوا ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے بار بار اسے شہد پلانے کا حکم دیا۔ مرقاۃ المفاتیح ۲۹۴/۸، تکملۃ فتح الملہم ۳۵۷/۴۔

بَابٌ

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مَرِيْضًا لَمْ يَحْضُرْ أَجَلُهُ فَيَقُوْلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ: أَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ، رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ أَنْ يَشْفِيَكَ إِلَّا عُوْفِيَ.

عبداللہ بن عباس نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان کسی

ایسے مریض کی عیادت کو جائے جسکی موت ابھی نہیں آئی، اور سات بار یہ دعا پڑھے: ''اسأل اللہ العظیم، رب العرش العظیم ان یشفیک'' (میں عظمت والے اللہ اور عرش عظیم کے رب سے یہ دعا مانگتا ہوں کہ وہ آپ کو شفا دے) مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے تندرست کردے گا۔

عیادت کی دعا

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے عیادت کی دعا کی تعلیم دی ہے کہ جو شخص مریض پر سات مرتبہ یہ دعا پڑھے **أسأل الله العظيم، رب العرش العظيم أن يشفيك** تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور شفاعطا فرماتے ہیں بشرطیکہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے وہ اس مرض کا علاج معالجہ بھی کرے۔ تحفۃ الأحوذی ۶/۲۱۶۔

بَابٌ

حَدَّثَنَا ثَوْبَانُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا أَصَابَ أَحَدَكُمُ الْحُمَّى، فَإِنَّ الْحُمَّى قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ، فَلْيُطْفِئْهَا عَنْهُ بِالْمَاءِ فَلْيَسْتَنْقِعْ فِيْ نَهْرٍ جَارٍ فَلْيَسْتَقْبِلْ جِرْيَتَهُ فَيَقُوْلُ: بِسْمِ اللّٰهِ اللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ وَصَدِّقْ رَسُوْلَكَ؛ بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ، وَقَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ، وَلْيَغْمِسْ فِيْهِ ثَلَاثَ غَمَسَاتٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، فَإِنْ لَمْ يَبْرَأْ فِيْ ثَلَاثٍ فَخَمْسٌ، فَإِنْ لَمْ يَبْرَأْ فِيْ خَمْسٍ فَسَبْعٌ، فَإِنْ لَمْ يَبْرَأْ فِيْ سَبْعٍ، فَتِسْعٌ، فَإِنَّهَا لَا تَكَادُ تُجَاوِزُ تِسْعاً بِإِذْنِ اللّٰهِ.

حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو بخار ہو جائے اور بخار جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے، تو اسے چاہیے کہ بخار کو ٹھنڈے پانی سے بجھائے، اس طور پر کہ کسی چلتے دریا میں (غسل کیلئے) اتر جائے، اور اپنا رخ پانی کے بہاؤ کیطرف کر کے یہ کہے: بسم اللہ اللھم اشف عبدک وصدق رسولک، (میں اللہ کے نام سے شفا طلب کرتا ہوں، اے اللہ تو اپنے بندے کو شفا دے اور اپنے رسول کی بات سچ کر دکھا (یعنی مجھے شفا دیدے)) (اور نہر میں) نماز فجر کے بعد، طلوع آفتاب سے پہلے (اترے) اور تین دن تک اس میں تین غوطے لگائے، اور اگر تین دن میں صحیح نہ ہو تو پانچ دن ایسا کرے، اور اگر پانچ دن میں اچھا نہ ہو تو سات دن ایسا

کرے، اور اگر سات دن میں ٹھیک نہ ہو تو نو دن ایسا ہی کرے، کیونکہ یہ بخار اللہ کے حکم سے نو دن سے آگے نہیں بڑھے گا (یعنی اسکو ضرور شفا ہو جائیگی)

مشکل الفاظ کی وضاحت: ۔فلیطفئھا: چاہیے کہ وہ اس بخار کی آگ کو (ٹھنڈے پانی سے) بجھائے۔ فلیستنقع: چاہیے کہ وہ ٹھنڈا ہونے کیلئے پانی میں اتر کر ٹھہرا رہے۔فلیستقبل: چاہیے کہ وہ اپنا رخ کرلے، سامنے ہو جائے۔جریتہ: (جیم کی زیر اور را کے سکون کے ساتھ) پانی کا بہاؤ، رخ۔لیغمس: چاہیے کہ وہ غوطہ لگائے۔فان لم یبرأ: اور اگر وہ بری اور ٹھیک نہ ہو۔فانھا لا تکاد تجاوز: قریب نہیں کہ یہ بخار (نو دن سے) متجاوز ہو، آگے بڑھے۔

بخار کو ٹھنڈا کرنیکا ایک طریقہ

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بخار کو ٹھنڈا کرنیکا ایک طریقہ ذکر فرمایا ہے کہ بخار میں مبتلی شخص نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے کسی دریا میں اتر جائے اور جدھر سے پانی بہ کر آرہا ہے، اسطرف کا رخ کرکے یہ کہے: بسم اللہ، اللھم اشف عبدک وصدق رسولک، تین دن تک تین غوطے لگائے، ٹھیک ہو جائیگا، ورنہ پانچ دن یا پھر سات دن اور یا پھر نو دن یہ عمل دہرائے، نو دن کے اندر یہ بخار ضرور اللہ کے حکم سے جاتا رہے گا۔

یہ طریقہ کس قسم کے بخار میں اختیار کیا جائے؟.................اسکی پوری تفصیل ''باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء'' کے تحت گذر چکی ہے، اسے دیکھ لیا جائے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۱۶/۶۔

بَابُ التَّدَاوِیْ بِالرَّمَادِ

یہ باب راکھ سے علاج کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِیْ حَازِمٍ، قَالَ: سُئِلَ سَهْلُ بْنُ سَعْدٍ وَأَنَا أَسْمَعُ: بِأَیِّ شَیْءٍ دُووِیَ جُرْحُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ: مَا بَقِیَ أَحَدٌ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ؛ كَانَ عَلِیٌّ يَأْتِیْ بِالْمَاءِ فِیْ تُرْسِهِ وَفَاطِمَةُ تَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ، وَأُحْرِقَ لَهُ حَصِيْرٌ فَحُشِیَ بِهِ جُرْحُهُ.

ابو حازم کہتے ہیں کہ حضرت سہل بن سعد سے پوچھا گیا، اور میں سن رہا تھا، کہ (غزوہ احد کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ کے زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا؟ تو سہل نے فرمایا: اس بارے میں مجھ سے زیادہ جاننے والا اب کوئی (صحابی) باقی نہیں رہا، (واقعہ یہ ہے کہ) حضرت علی اپنی ڈھال میں پانی لاتے تھے، اور حضرت فاطمہ نبی کریم ﷺ (کے چہرہ انور) سے خون دھوتی تھیں، اور آپ کے (زخم کے) لئے چٹائی کو جلایا گیا، پھر اسکی (راکھ کے) ذریعہ آپ ﷺ کا زخم بھر دیا گیا۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔ **رماد:** (را پر زبر کے ساتھ) راکھ۔ **دووی:** باب مفاعلہ مداواۃ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے: علاج کیا گیا۔ **تُرس:** (تاء پر پیش اور را کے سکون کے ساتھ) ڈھال۔ **حصیر:** چٹائی۔ **اعلم به منی:** مجھ سے زیادہ اس واقعہ کو جاننے والا۔ **حشی:** ماضی مجہول کا صیغہ ہے، بھر دیا گیا۔

زخم کا علاج راکھ کے ذریعہ

زخم اگر معمولی قسم کا ہو تو پانی سے دھو لینے سے بھی درست ہو جاتا ہے، لیکن اگر زخم گہرا ہو، خون اس سے ابل رہا ہو تو پھر اسے پانی سے دھونا کافی نہیں ہوتا، اس کے علاج کیلئے کسی دوا کا استعمال ضروری ہوتا ہے، اس زمانے میں زخم سے خون کا روکنا چونکہ راکھ کے ذریعہ مشہور تھا، اس لئے ایک چٹائی جلا کر اسکی راکھ سے آپ ﷺ کا وہ زخم بھر دیا گیا، جس سے خون رک گیا، کیونکہ راکھ کسی بھی چیز کی ہو، اس میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اگر اسے زخم پر لگا دیا جائے تو خون رک جاتا ہے۔ فتح الباری، کتاب الطب، باب حرق الحصیر لیسد به الدم ۱۰/۲۱۴۔

یہ واقعہ غزوہ احد میں پیش آیا تھا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور زخمی اور خون آلود ہو گیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لا رہے تھے، اور حضرت فاطمہ چہرہ انور سے خون دھوتی تھیں، لیکن جب دیکھا کہ خون رُک نہیں رہا بلکہ پانی کی وجہ سے مزید بڑھ رہا ہے، تو ایک چٹائی کو لے کر جلایا اور اس کی راکھ سے وہ زخم بھر دیا تو خون رُک گیا۔ فتح الباری، کتاب المغازی، باب لیس لک من الامر شیئ ۷/۴۶۴، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۱۸۔

ما بقي أحد اعلم به مني مجھ سے زیادہ اس واقعہ کو کوئی زیادہ جاننے والانہیں، اس وقت چونکہ یہ واقعہ جاننے والے صحابہ باقی نہیں رہے تھے، اس لئے حضرت سہل نے یہ جملہ ارشاد فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے موقع پر اپنی صلاحیت اور علمی قابلیت کا اظہار جائز ہے، بشرطیکہ اس سے غرور وتکبر اور عجب کا اندیشہ نہ ہو، حدیث باب سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......علاج معالجہ کرانا۔ (۲)......دورانِ جنگ ڈھال کا استعمال۔ (۳)......مذکورہ امور توکل کے منافی نہیں۔ (۴)......عورت کا اپنے والد اور ذی رحم محرم رشتہ داروں کی خدمت اور بیماری میں علاج معالجہ میں ہاتھ بٹانا۔

مذکورہ امور شریعت کی رو سے جائز ہیں۔ فتح الباری، کتاب الوضو، باب غسل المرأۃ اباھا الدم......۱/۴۶۸۔

بَابٌ

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: إِذَا دَخَلْتُمْ عَلَی الْمَرِیْضِ فَنَفِّسُوْا لَهُ فِیْ أَجَلِهٖ فَإِنَّ ذٰلِکَ لَا یَرُدُّ شَیْئاً وَیُطَیِّبُ نَفْسَهٗ.

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم کسی مریض کے پاس (عیادت کیلئے) جاؤ، تو تم عمر کے بارے میں اس کے غم کو (گفتگو کے ذریعہ) دور کرو (یعنی تم اس سے اسکی درازیٔ عمر کے بارے میں باتیں کرو) اس لئے کہ (تسلی کی) یہ بات کسی تقدیر کو تو بدل نہیں سکتی البتہ اس (مریض) کے دل کو خوش کر دیتی ہے) اور کسی مسلمان کو خوش کر دینا بھی بہت بڑا کار خیر ہے)

بیمار پرسی کا ایک ادب

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بیمار پرسی کا ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ مریض کی عیادت کے وقت ایسی باتیں کرنی چاہیے جس سے اسکا دل خوش ہو، خاص طور پر زندگی کے بارے میں اسے تسلی دو کہ "کوئی حرج نہیں، بیماری سے ان شاء اللہ تمہارے گناہ معاف ہو رہے ہیں، یا یوں کہے: اللہ تیری عمر دراز کرے، تمہیں شفا اور عافیت عطا فرمائے" اس سے اسکا دل خوش ہو جائیگا۔

"فنفسوا له فی أجله" یہ " تنفیس " سے ہے، جس کے معنی غم کو دور کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ زندگی سے متعلق اس مریض کے غم کو گفتگو کے ذریعہ دور کرو، اور تسلی کا مذکورہ کوئی جملہ کہو، علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ نفسوا له ...... کے معنی یہ ہیں کہ اسے لمبی عمر کی امیدیں دلاؤ کہ تمہاری یہ بیماری عنقریب ختم ہو جائیگی، اور ایک طویل عرصہ تم حیات رہو گے۔

مذکورہ کلمات اور تسلی سے گو کہ اسکی تقدیر کے فیصلے رد نہیں ہو سکتے اگر تقدیر میں موت لکھی ہے تو وہ ضرور آکر رہے گی، لیکن اس گفتگو سے تھوڑی دیر اسے خوشی ضرور حاصل ہوگی اور اس کا دل باغ باغ ہو جائیگا، اور کسی مسلمان کا دل خوش کرنا بھی عظیم نیکی ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۱۹/۶۔

قد فرغت من شرح ابواب الطب مساء الخميس، التاسع عشر من شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ والحمد لله على ذالک .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَبْوَابُ الْفَرَائِضِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یہ ابواب ان احادیث پر مشتمل ہیں جو نبی کریم ﷺ سے فرائض اور میراث کے شرعی حصوں کے بارے میں ہیں۔

علم فرائض کی تعریف:

''فرائض''فریضۃ کی جمع ہے: شریعت کیطرف سے مقرر کردہ حصے

اور اصطلاح میں ان اصول وضوابط کو جاننا جن کے ذریعے وراثت کی شرعی تقسیم کی جا سکے، اسے علم فرائض اور علم المیراث کہا جاتا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ جو شخص مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کیلئے ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ، وَمَنْ تَرَكَ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص مال چھوڑے تو وہ مال اس کے گھر والوں کا ہے اور جو شخص اولاد یا عیال چھوڑے (لیکن اتنا مال نہ چھوڑے جس سے ان کی پرورش ہو سکے) تو میں ان کا مرجع اور پناہ گاہ ہوں (یعنی ان کے اخراجات میرے ذمے ہیں)۔

میت کا ترکہ وارثوں کیلئے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں:

(۱)......اگر کوئی شخص موت کے وقت مال و دولت اور ساز و سامان وغیرہ چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کو ملیگا ان طریقوں کے مطابق جو قرآن وسنت میں بیان کئے گئے ہیں، لہذا اس ترکہ کو تقسیم نہ کرنا اور ناجائز طریقے

سے بعض رشتہ داروں کا اسپر قبضہ کرلینا ناجائز اور حرام ہے، اس لئے وارثوں پر شریعت کیطرف سے یہ حکم عائد ہوتا ہے کہ ترکہ کی شرعی طریقے کے مطابق تقسیم کریں، تاکہ کسی وارث پر کوئی ظلم اور اسکی حق تلفی نہ ہو۔

اس وقت ہمارے مسلم معاشرے میں اس بارے میں بہت ہی لا پرواہی اور کوتاہی پائی جاتی ہے، بہت سے لوگ تو سرے سے وراثت تقسیم ہی نہیں کرتے، یا کئی سالوں کے بعد حصے بانٹے جاتے ہیں، اس میں دیندار لوگ بھی ملوث نظر آتے ہیں، حالانکہ یہ معاملہ تو بندوں کے حقوق میں سے ہے، اس میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے گھر یا خاندان میں ایسا کوئی مسئلہ پیش آجائے تو تجہیز وتکفین کے بعد پہلی فرصت میں میت کے ترکے کو اسکے شرعی وارثوں میں تقسیم کرنا چاہئے، اس میں ٹال مٹول یا تاخیر کسی طور درست نہیں۔

(۲)......لیکن اگر کوئی شخص اپنے پیچھے مال و دولت چھوڑ کر نہ جائے، صرف اسکی محتاج اولاد یا عیال ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ان کا نان نفقہ اور خرچہ میرے ذمے ہے۔

''ضیاع'' (ضاد پر زبر کے ساتھ): وہ اولاد یا عیال جن کے پاس زندگی گذارنے کیلئے کچھ نہ ہو، غریب اور محتاج ہوں، ''اليّ'' یعنی ''مرجعه و مأواه'' یعنی میں ان کا مرجع اور جائے پناہ ہوں، ان کے اخراجات میرے ذمے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت اگر غریب ومحتاج اولاد یا عیال چھوڑ کر جائے تو مسلم حکمران پر لازم ہے کہ بیت المال سے انکے خرچے کا بندوبست کرے، تاکہ یہ لوگ پروقار طریقے سے زندگی گذار سکیں، اس میں کوتاہی کی صورت میں وہ گنہگار ہوگا۔ تکملة فتح الملهم، کتاب الفرائض، باب من ترک مالا فلورثته ۲/۷۴۔

نادار میت کا قرضہ بیت المال سے

صحیح بخاری کی روایت میں اس قدر اضافہ ہے: وَمَنْ تَرَکَ دَیْنًا فَعَلَيَّ قَضَاءُهُ جو شخص اسطرح وفات پائے کہ اسپر قرض ہو لیکن ادائیگی کیلئے کوئی مال نہ چھوڑا ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، میں اسے بیت المال سے ادا کروں گا۔

یہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کے ذریعہ وسعت عطا فرمائی، اور بیت

المال میں اس قدر گنجائش پیدا ہوگئی کہ اس طرح کے بندے کا قرض اس سے ادا کیا جائے، یہی حکم تمام مسلم حکمرانوں کیلئے ہے کہ جب بیت المال میں وسعت موجود ہو تو نادار میت کا قرض اس سے ضرور ادا کیا جائے، یہ اس کے فرائض میں سے ہے، وسعت کے باوجود قرض ادا نہ کیا گیا تو اللہ کے ہاں اس حاکم سے باز پرس ہوسکتی ہے۔ فتح الباری، کتاب الکفالۃ، باب الدین ۶۰۲/۴ تکملۃ ۴۴/۲۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَعْلِيْمِ الْفَرَائِضِ

یہ باب علم میراث کی تعلیم (کی اہمیت) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّي مَقْبُوْضٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم میراث اور قرآن کو سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ میں (عنقریب) اٹھا لیا جاؤں گا (یعنی میرا انتقال ہو جائیگا، اس لئے مجھ سے جو کچھ سیکھنا ہو تو جلد ہی سیکھ لو)۔

مشکل الفاظ کے معنی: -تعلموا: تم سیکھو، فرائض: یہ فریضۃ کی جمع ہے، اس سے علم میراث مراد ہے، بعض نے کہا کہ اس سے وہ تمام احکام مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کئے ہیں۔ علموا: (عین پر زبر اور لام پر تشدید اور زیر) تم سکھاؤ۔ مقبوض: وفات پانے والا ہوں۔

علم فرائض اور اسکے سیکھنے اور سکھانے کی فضیلت

اس حدیث میں علم فرائض کی فضیلت اور اسے سیکھنے اور سکھانے کی ترغیب دی گئی ہے، اور آپ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ علم فرائض کو سیکھنے کا حکم الگ سے دیا، اس سے درحقیقت اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے، اس میں اگر کوتاہی کی گئی تو بندوں کے حقوق پامال ہونگے، جس سے انہیں تکلیف ہوگی، جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

حدیث باب کے علاوہ اور بھی بے شمار روایات میں اس علم کی فضیلت، اسے سیکھنے اور سکھانے کا حکم

دیا گیا ہے، چند روایات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(۱)......ابو بکرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: قرآن مجید اور علم فرائض کو سیکھو اور سکھاؤ، عنقریب ایک ایسا وقت آئیگا جس میں دو آدمی میراث کے مسئلے میں بحث مباحثہ کریں گے، لیکن وہ کسی ایسے آدمی کو نہیں پائیں گے جو ان کے اختلافی مسئلہ میں فیصلہ کر سکے۔ فتح الباری، کتاب الفرائض، باب تعلیم الفرائض ۱۲/۴

(۲)......عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم تو تین ہی ہیں، ان کے علاوہ باقی سب زائد ہیں، ایک آیت محکمہ یعنی علم قرآن، دوسرا سنت قائمہ یعنی علم حدیث، اور تیسرا فریضہ عادلہ یعنی علم فرائض۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی تعلیم الفرائض ۲/۴۳۔

(۳)......حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم فرائض کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ وہ نصف علم ہے، اور میری امت میں سب سے پہلے اسے بھلایا اور چھینا جائیگا۔ سنن ابن ماجۃ، ابواب الفرائض، باب الحث علی تعلیم الفرائض (ص:۱۹۵)

علم فرائض "نصف علم" کیسے ہے، شارحین حدیث نے اسکی مختلف تشریحات ذکر کی ہیں:

(۱)......انسان کی دو حالتیں ہیں، ایک زندگی کی اور دوسری موت کی حالت، دیگر علوم میں زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور اس سے متعلقہ احکام کا ذکر ہوتا ہے، جبکہ علم فرائض میں موت کے بعد کی حالت کا ذکر ہوتا ہے کہ موت کے بعد وارث اس علم پر عمل پیرا ہوتے ہیں، اس لحاظ سے علم فرائض گویا نصف علم ہے۔ فتح الباری، کتاب الفرائض، باب تعلیم الفرائض ۱۲/۴۔

(۲)......بعض نے کہا کہ علم میراث کو نصف علم اس کی عظمتِ شان اور اہمیت کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

(۳)......علم فرائض کی صورتیں اور مسائل چونکہ بہت زیادہ ہیں، اور مختلف پہلو رکھتے ہیں، لہذا مسائل کی تعداد اور مقدار کے اعتبار سے نصف حصہ ایک مسائل کا ہے اور نصف حصہ میراث کے مسائل کا، اس لئے فرائض کو نصف علم قرار دیا گیا۔ حاشیۃ سنن ابن ماجۃ (ص:۱۹۵)

(۴)......شرعی احکام دو چیزوں سے ثابت ہوتے ہیں نصوص یعنی قرآن وسنت سے، اور قیاس واجتہاد سے، اور فرائض کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے تمام مسائل قرآن وسنت سے ثابت ہیں، قیاس کا اس میں کوئی دخل

نہیں، اس خاص وصف کی وجہ سے علم فرائض کو نصف علم کہا گیا ہے۔ فتح الباری ۴/۱۲، تکملۃ فتح الملھم ۳/۲۔

ان تمام احادیث سے علم میراث کی فضیلت اور اہمیت ثابت ہورہی ہے، اس لئے اس علم کو سیکھنے اور سکھلانے کا اہتمام کرنا چاہیے، تاکہ وراثت کی تقسیم بروقت اور شرعی اصولوں کے مطابق کی جاسکے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''اضطراب'' ہے، کیونکہ فضل بن دلہم نے عوف سے روایت نقل کی تو انہوں نے اسے مسند ابی ہریرہ میں شمار کیا، اور جب ابواسامہ نے عوف سے روایت نقل کی تو اس کو مسند ابن مسعود میں شمار کیا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ مِيْرَاثِ الْبَنَاتِ

یہ باب لڑکیوں کی میراث (کے حکم) کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: جَاءَ تِ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدٍ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قُتِلَ أَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ شَهِيْداً، وَإِنَّ عَمَّهُمَا أَخَذَ مَالَهُمَا فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالاً، وَلَا تُنْكَحَانِ إِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ. قَالَ: يَقْضِي اللّٰهُ فِي ذٰلِكَ. فَنَزَلَتْ آيَةُ الْمِيْرَاثِ، فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِلَى عَمِّهِمَا فَقَالَ: أَعْطِ ابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ وَأَعْطِ أُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ.

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سعد بن ربیع کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو جو حضرت سعد سے تھیں، لیکر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول: یہ دونوں سعد بن ربیع کی بیٹیاں ہیں، ان کا باپ جو غزوہ احد میں آپ کے ہمراہ تھا، میدان جنگ میں شہید ہوگیا ہے، اور ان کا مال ان کے چچا نے لے لیا ہے، (یعنی ان کے باپ کا جو ترکہ ان لڑکیوں کے حصے میں آتا وہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق سعد کے بھائی نے لے لیا ہے) اور ان کیلئے کچھ مال بھی نہیں چھوڑا، اور جب تک لڑکیوں کے پاس کسی قدر مال نہ ہو تو عزت و وقار کے ساتھ ان کا کہیں نکاح بھی نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے (یہ سنکر) فرمایا

کہ (کچھ دنوں کیلئے صبر کرو) اللہ تعالیٰ اس بارے میں (وحی کے ذریعہ) فیصلہ فرما دے گا، چنانچہ(کچھ دنوں کے بعد) آیت میراث یعنی یوصیکم اللہ فی اولادکم...... نازل ہوئی تو آپ نے کسی کو ان لڑکیوں کے چچا کے پاس بھیجا (اور اسے بلا کر) فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو (سعد کے ترکہ میں سے) دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دیدو اور جو باقی بچے وہ تمہارا ہے۔

احکام میراث کا نزول

اسلام سے پہلے پوری دنیا میں بچوں اور عورتوں پر طرح طرح کا ظلم وستم رائج تھا، معاشرے میں ان کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور عرب نے تو یہ اصول مقرر کیا ہوا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو گھوڑ سوار ہو، اور دشمنوں سے مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کرے، اس لئے ان کے ہاں صرف نوجوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا، لڑکی مطلقا وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی وراثت کا مستحق نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے اس کمزور طبقے کو حقوق دلائے، ان پر ظلم وستم کے دروازے بند کر کے ان کے حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام بھی کیا، چنانچہ انکے حق میں اس صریح ظلم کے خاتمہ کا آغاز اسطرح ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک صحابی حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اور دو لڑکیاں، ایک نابالغ لڑکا اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں (یا بعض روایات کے مطابق سگے بھائیوں) نے مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کرلیا، اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقا وراثت کی مستحق نہ تھی، اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہوگئیں، اور لڑکا نابالغ ہونے کی وجہ سے محروم کردیا گیا، لہذا پورے مال کے وارث دو چچا زاد بھائی ہوگئے۔

مرحوم کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچا زاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کر رہے ہیں، تو ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کرلیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہوجائے، مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا، تب اوس بن ثابت کی بیوہ نے رسول کریم ﷺ سے عرض حال کیا، اور اپنی اور اپنے بچوں کی بے کسی اور محرومی کی شکایت

کی، اس وقت تک چونکہ قرآن حکیم میں آیتِ میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے نبی کریم ﷺ نے انہیں جواب دینے میں توقف فرمایا، انہیں تسلی دی کہ تم صبر کرو، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرو، کیونکہ آپ کو اطمینان تھا کہ وحی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائیگا، چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی:

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون، وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیبا مفروضا . سورہ نساء آیت نمبر ۷

''مردوں کیلئے بھی حصہ مقرر ہے اس چیز میں سے جسکو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں، اور عورتوں کیلئے بھی حصہ مقرر ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں، خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مقرر ہے''

اس آیت کے نازل ہونے سے اتنا معلوم ہو گیا کہ وراثت میں جسطرح مردوں کا حق ہے، اسی طرح عورتوں اور بچوں کا بھی حق ہے، اس سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا، لیکن چونکہ اس آیت میں حصوں کی تعیین اور تفصیل نہیں تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے حضرت اوس کے ترکہ پر قبضہ کرنے والوں سے فرمایا کہ تم اس میں سے کچھ بھی نہیں لے سکتے جب تک کہ اس بارے میں کوئی واضح حکم نہ آجائے۔

چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصے کے بعد دوسرا واقعہ پیش آیا جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہاں باب میں ذکر فرمایا ہے، جب حضرت سعد بن ربیع غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو زمانہ جاہلیت کے رائج دستور کے مطابق ان کے چچا زاد بھائیوں نے ان کے سارے ترکے پر قبضہ کر لیا، یوں حضرت سعد کی بیوہ اور دونوں بیٹیاں محروم رہ گئیں، تب مرحوم کی بیوہ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت عرض کی تو آپ نے فرمایا: صبر کرو، اللہ تعالیٰ اس بارے میں ضرور فیصلہ فرمائیں گے۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد یہ آیت میراث نازل ہوئی:

یوصیکم الله فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین......الخ ،،

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے''

اب جب تمام وارثوں کے حصوں کا تعین ہوگیا تو آپ ﷺ نے حضرت سعد کے بھائیوں کو بلا کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے پیش نظر اپنے بھائی کے ترکہ میں سے دو تہائی لڑکیوں کو حصہ دیدو، آٹھواں حصہ ان کی ماں کو، اور اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تم لے لو، تقسیم اسطرح ہوگی کہ سعد نے جو کچھ چھوڑا ہے پہلے اس کے چوبیس حصے کرلو، پھر ان چوبیس میں سے آٹھ آٹھ حصے دونوں لڑکیوں کو اور تین حصے ان کی ماں کو دیدو اور باقی پانچ حصے تم لے لو۔ معارف القرآن ۲/۳۰۹، ۳۲۲ - روح المعانی، سورۃ نساء ۴/۲۱۰۔

میراث میں بیٹی کے حصے

بیٹی اپنے والد کی میراث سے کبھی محروم نہیں ہوتی، اسکی تین حالتیں ہیں:

(۱)...... اگر صرف ایک بیٹی ہو اور کوئی بیٹا نہ ہو تو میت کے ترکے میں سے اس کو نصف ملتا ہے، اور اگر میت کا اور کوئی وارث بالکل ہی نہ ہو تو باقی نصف بھی اسی کو مل جاتا ہے۔

(۲)...... اگر دو بیٹیاں ہوں یا دو سے زیادہ ہوں اور کوئی بیٹا نہ ہو، تو ان بیٹیوں کو ترکہ میں دو تہائی ملے گا، یہ بیٹیاں اس دو تہائی کو آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی۔

(۳)...... اگر بیٹیوں کے ساتھ میت کا بیٹا بھی موجود ہو تو اس صورت میں بیٹی کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، بلکہ جس قدر بیٹے کو ملے گا اس سے نصف ہر ایک بیٹی کو ملے گا، خواہ ایک بیٹی ہو یا دو چار ہوں، اس حالت میں بیٹیاں ذوی الفروض نہیں ہونگی بلکہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بالغیر ہونگی، اور اسی اعتبار سے ان کو حصے ملیں گے۔

جمہور علماء کے نزدیک دو لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہے، جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس کے نزدیک دو لڑکیاں بھی ایک لڑکی کیطرح نصف میراث کی حقدار ہوتی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں دو تہائی دو لڑکیوں سے زائد کیلئے بیان کیا گیا ہے، **قال اللہ تعالیٰ: فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک**، اور دو لڑکیوں کا حصہ قرآن میں مذکور نہیں ہے، لہذا دو لڑکیوں کا حکم بھی ایک کیطرح ہوگا، یعنی انہیں بھی نصف ملے گا، جمہور فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ دو لڑکیوں سے زائد کا حکم تو مذکورہ آیت میں ہے، لیکن چونکہ دو کا حکم اس آیت میں واضح نہیں تھا، محض احتمال کے درجے میں تھا اس لئے حدیثِ باب نے اس حکم کو واضح کردیا کہ ''دو تہائی مال'' جسطرح دو سے زائد لڑکیوں کیلئے ہے، اسی طرح دو لڑکیوں کیلئے بھی یہی حکم ہے۔

حدیثِ باب جمہور کے موقف کے مطابق ہے، ممکن ہے یہ روایت عبداللہ بن عباس کو نہ پہونچی ہو، یا ان کے نزدیک یہ روایت صحیح نہ ہو اس لئے انہوں نے ظاہرِ آیت سے یہ اخذ کیا کہ دولڑکیوں کا حکم بھی ایک لڑکی کیطرح ہوگا۔ فتح الباری، کتاب الفرائض، باب میراث البنات ۱۲/۱۵۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۲۴۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيراثِ بِنْتِ الابْنِ مع بِنْتِ الصُّلْبِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں صلبی بیٹی کے ساتھ پوتی کی میراث کا ذکر ہے

عَنْ هُزَيلِ بنِ شُرَحْبِيلَ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إلى أبي موسَى وسُلَيْمَانَ ابنِ رَبِيعَةَ وَسَأَلَهُمَا عَنِ ابْنَةٍ وابْنَةِ ابْنٍ وَأُخْتٍ لِأَبٍ وَأُمٍّ، فَقَالَا: لِلابْنَةِ النِّصْفُ، وَلِلْأُخْتِ مِنَ الأَبِ وَالأُمِّ مَا بَقِيَ. وَقَالَا لَهُ انْطَلِقْ إلَى عَبْدِ اللّٰهِ فَاسْأَلْهُ فَإِنَّهُ سَيُتَابِعُنَا، فَأَتَى عَبْدَ اللّٰهِ فَذَكَرَ لَهُ ذٰلِكَ وَأَخْبَرَهُ بِمَا قَالَا. قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: قَدْ ضَلَلْتُ إذاً وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ، وَلَكِنِّي أَقْضِي فِيهَا كَمَا قَضَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِلابْنَةِ النِّصْفُ وَلابْنَةِ الابْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ، وَلِلْأُخْتِ مَا بَقِيَ.

ہزیل بن شرحبیل کہتے ہیں کہ ایک آدمی ابوموسیٰ اور سلیمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ (مرنے والے کی) ایک بیٹی، اور پوتی اور ایک حقیقی بہن ہے، (اس کے ترکے کو ان کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائیگا) تو ان دونوں نے کہا کہ بیٹی کو آدھا اور باقیماندہ حقیقی بہن کو ملے گا، (پوتی محروم رہے گی) اور ان دونوں نے اس سائل سے کہا کہ تم عبداللہ بن مسعود کے پاس جاؤ اور ان سے بھی یہی مسئلہ پوچھو تو وہ بھی ہمارے اس جواب سے اتفاق کریں گے (یعنی اس مسئلہ کا جو جواب ہم نے دیا ہے، یہی جواب وہ بھی دیں گے) چنانچہ وہ شخص عبد اللہ بن مسعود کے پاس آیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ ذکر کیا اور انہیں وہ جواب بھی بتایا (جو ابو موسیٰ اور سلیمان نے دیا تھا) تو عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ ایسی صورت میں (کہ جو فتوی ان دونوں نے دیا ہے اگر میں بھی وہی دیدوں تو) میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت یافتہ لوگوں

میں سے نہیں ہوں گا، لیکن میں اس بارے میں وہ فیصلہ کروں گا جو نبی کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور دو تہائی پورا کرنے کیلئے پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا، (یعنی میت کے ترکہ میں سے دو یا دو سے زائد بیٹیوں کو دو تہائی ملتا ہے، اب چونکہ بیٹی ایک ہی ہے اور اس کو آدھا حصہ ملا ہے، تو پوتی کو چھٹا حصہ دیکر دو تہائی پورا کر دیا جائیگا) اور جو کچھ باقی بچے (یعنی ایک تہائی) وہ بہن کا ہے۔

پوتی اور بیٹی کی میراث کا مسئلہ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مرحوم کی بیٹی، پوتی اور حقیقی بہن ہو تو اس کے ترکے کو اسطرح تقسیم کیا جائیگا کہ بیٹی کو نصف، پوتی کو چھٹا حصہ اور باقی ماندہ حقیقی بہن کو عصبہ ہونے کی وجہ سے مل جائیگا، یہ مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس سائل کو بتایا، جس نے حضرت ابوموسیٰ اور سلیمان بن ربیعہ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا اور انہوں نے بیٹی اور بہن کو آدھا آدھا دینے کا بتایا تھا اور پوتی کو محروم کیا تھا، جب عبداللہ بن مسعود کو بتایا گیا کہ ان دونوں نے یہ جواب دیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں بھی یہی جواب دوں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوگا، لہذا میں اس مسئلے کا وہی جواب دوں گا جو نبی کریم ﷺ نے اس مسئلے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

ان دونوں حضرات نے قرآن مجید کے ظاہر سے استدلال کیا، کیونکہ بیٹی کے بارے میں قرآن مجید میں ہے: **وان کانت واحدة فلها النصف** ، اور بہن کے بارے میں یہ فیصلہ اس لئے فرمایا کہ قرآن کریم میں آیتِ کلالہ میں ہے: **وان امرء هلک لیس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترک** (اگر کوئی شخص مرجائے جسکی اولاد نہ ہو (یعنی نہ مذکر نہ مؤنث اور نہ ماں باپ ہوں) اور اس کی ایک بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا)

انہوں نے ''ولد'' سے یا تو عربی استعمال کے اعتبار سے مذکر مراد لیا ہے، کیونکہ عربی محاورے میں عموماً ولد سے مذکر مراد لیا جاتا ہے، اور اس دلیل سے کہ قرآن مجید کی آیت " **وهو یرثها ان لم یکن لها ولد** '' میں ولد سے بیٹا ہی مراد ہے، یا ان حضرات نے یہ سمجھا کہ بنت تو نصف لیکر الگ ہو چکی ہے، اور دوسرا

نصف بہن کا ہے، اور باقی مال نہیں اس لئے پوتی محروم ہوگی، نیز پوتی کی وراثت کا ذکر قرآن میں بھی نہیں ہے، یہ حضرات چونکہ شرعی مسئلہ کا حل بتانے میں مخلص تھے، اس لئے سائل سے کہا کہ آپ یہ مسئلہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے بھی جا کر پوچھ لیں، وہ بھی ہماری موافقت کریں گے، اور یوں ہی جواب دیں گے، وہ زیادہ فقیہ اور علم والے ہیں۔

عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کہ یہ مسئلہ ان حضرات نے درست نہیں بتایا، ایسے میں اگر میں ان کی موافقت کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا، بلکہ میرا فیصلہ اس میں وہی ہے جو اس بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ صورت میں بیٹی کو نصف اور پوتی کو چھٹا حصہ تا کہ یہ دونوں حصے دو تہائی کے برابر ہو جائیں، اور باقی ماندہ بہن کو عصبہ ہونے کی وجہ سے مل جائیگا کیونکہ بہن بیٹیوں کی وجہ سے عصبہ بن جاتی ہے، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۲۵، مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۴۴، باب الفرائض، کتاب البیوع۔

ابوموسیٰ اور سلیمان بن ربیعہ نے اپنے اجتہاد سے اس مسئلے کا حکم بتایا تھا، جب انہیں اس کا صحیح حل بتایا گیا تو انہوں نے اپنے مسئلے سے رجوع کر لیا، ابن عربی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کے علم سے پہلے قیاس پر عمل کیا جا سکتا ہے، اور جب خبر اور حدیث آجائے تو پھر اسکی طرف رجوع کیا جائیگا، اور قیاس پر مبنی حکم ختم ہو جاتا ہے جبکہ وہ قرآن وسنت اور اصول شریعت کے خلاف ہو۔

یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ہے، حضرت عثمان نے ابوموسیٰ کو کوفہ کا امیر مقرر کیا تھا، ان سے قبل حضرت عبد اللہ بن مسعود کوفہ کے امیر تھے، بعد میں ابوموسی سے پہلے انہیں معزول کر دیا گیا تھا۔ فتح الباری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ......۱۲/۱۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ الإِخْوَةِ مِنَ الأَبِ وَالأُمِّ

یہ باب حقیقی بہن بھائیوں کی میراث کے (حکم) کے بارے میں ہے

عَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّكُمْ تَقْرَأُونَ هذه الآيَةَ: ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ وَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضَى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ، وَأَنَّ أَعْيَانَ بَنِي الأُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِيْ العَلَّاتِ، الرجُلُ يَرِثُ أَخَاهُ لِأَبِيهِ وَأُمِّهِ دُوْنَ أَخِيْهِ لِأَبِيْهِ.

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ تم اس آیت کو پڑھتے ہو"من بعد وصیۃ توصون بھا او دین" (اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد) جبکہ نبی کریم ﷺ نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنیکا فیصلہ فرمایا ہے، اور یہ (فیصلہ فرمایا) کہ حقیقی بہن بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے بھائی، (یعنی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے بھائیوں کو کچھ نہیں ملتا اور یہ کہ) آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے نہ کہ سوتیلے بھائی کا، (یہ جملہ پہلے جملے کی تاکید کے طور پر ہے)

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ أَعْيَانَ بَنِي الْأُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَّاتِ.

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ حقیقی بہن بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ وہ بھائی جو صرف باپ میں شریک ہوں (یعنی سوتیلے بھائی)

مشکل الفاظ کے معنی: ۔اعیان بنی الام: حقیقی بہن بھائی جنکی ماں اور باپ ایک ہو۔ یتوارثون: ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ بنی العلات: باپ شریک بھائی، سوتیلے بھائی۔

حقیقی بہن بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے

بھائی تین طرح کے ہوتے ہیں اعیانی یعنی حقیقی بہن بھائی، علاتی یعنی باپ شریک بہن بھائی اور اخیافی یعنی ماں شریک بہن بھائی، ان میں وارث بننے کیلئے قوت قرابت کا اعتبار کیا جائیگا، لہذا اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اسکی کوئی اولاد نہ ہو، لیکن مختلف قسم کے اس کے بہن بھائی ہوں تو وراثت ان بہن بھائیوں کو ملے گی جو حقیقی ہیں، کیونکہ ان میں قرابت دوگنی ہے، کہ یہ ماں اور باپ دونوں میں شریک ہیں، سوتیلے بہن بھائی محروم ہونگے، لیکن اگر حقیقی بہن بھائی نہ ہوں تو پھر سوتیلے بھائی وارث ہونگے۔

حدیث باب میں **الرجل یرث اخاہ.........** پہلے جملے کی تشریح وتفسیر ہے۔

آیت میں وصیت کو قرض سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ

انکم تقرأون هذه الاية..........

شرعی حکم یہ ہے کہ میت پر اگر قرض ہو اور وہ کوئی وصیت بھی کر جائے تو پہلے قرض ادا کیا جائیگا، پھر ایک تہائی مال تک اسکی وصیت نافذ ہوگی، پھر بقیہ ترکہ وارثوں کے درمیان شرعی ترتیب کے مطابق تقسیم کیا جائیگا، لیکن قرآن کریم میں تینوں جگہ جہاں جہاں وصیت کا ذکر آیا ہے وہاں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے کیا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا حق قرض سے مقدم ہے اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو ختم کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ حضرات........... یہ آیت تلاوت کرتے ہیں: ''من بعد وصیة توصون بھا او دین'' اس میں گوکہ لفظ وصیت مقدم ہے، لیکن عملی طور پر حضور اقدس ﷺ نے اس کو قرض کے بعد رکھا ہے''

اب سوال یہ ہے کہ جب وصیت عملاً قرض سے مؤخر ہے تو لفظاً اس کو قرض سے پہلے کیوں بیان کیا گیا ہے؟ اسکی وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ وصیت بھی میراث کیطرح چونکہ بغیر کسی عوض کے ہوتی ہے، اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں، اور اس میں کسی کیطرف سے مطالبہ بھی نہیں ہوتا، اس لئے وارثوں کیطرف سے وصیت کو نافذ کرنے میں کوتاہی یا تاخیر کا قوی اندیشہ تھا، جس کا سد باب کرنے کیلئے بطور خاص ہر جگہ وصیت کو قرض پر مقدم کیا گیا، اور قرض اگر موت کے وقت موجود بھی ہو تب بھی اس میں کوتاہی کا احتمال بہت کم ہوتا ہے، کیونکہ قرض کا مطالبہ قرض خواہ کیطرف سے ہوتا ہے اس لئے وارث قرض کی ادائیگی سے انکار نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس میں تاخیر یا ٹال مٹول کر سکتے ہیں، اس وجہ سے قرض کو ذکر میں موخر کیا ہے، اور وصیت کو اہمیت کی بناء پر لفظاً پہلے بیان کیا ہے، اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ''او'' کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اس طرف توجہ دلانے کیلئے کہ جسطرح قرض کی ادائیگی شرعاً ضروری ہے ایسے ہی وصیت کو نافذ کرنا بھی ضروری ہے، اس میں کوتاہی جائز نہیں ہے۔ روح المعانی، سورہ النساء ۲۲۷/۳، معارف القرآن ۳۲۹/۲۔

بَابُ مِيْرَاثِ الْبَنِيْنَ مَعَ الْبَنَاتِ

یہ باب بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کی میراث کے بارے میں ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: جَاءَ نِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَعُودُنِي وَأَنَا مَرِيْضٌ فِي بَنِي سَلِمَةَ، فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ كَيْفَ أَقْسِمُ مَالِي بَيْنَ وَلَدِي؟ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ

شَيْئاً فَنَزَلَتْ: ﴿يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ الآية

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میری عیادت کیلئے میرے ہاں تشریف لائے جبکہ میں بنی سلمہ میں بیمار تھا، اس موقع پر میں نے پوچھا اے اللہ کے نبی: میں اپنا مال اپنے بچوں میں کس طرح تقسیم کروں؟ آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا، پھر یہ آیت: یوصیکم اللہ فی اولادکم.........نازل ہوئی۔

حضرت جابر کے واقعہ میں کونسی آیت نازل ہوئی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ میری بیمار پرسی کیلئے تشریف لائے تو میں نے آپ سے پوچھا کہ میں اپنا مال اپنی اولاد یعنی بہنوں میں کس طرح تقسیم کروں؟ روایت میں ''ولد'' سے حضرت جابر کی نو بہنیں مراد ہیں کیونکہ اس وقت ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، ان کا سوال سنکر نبی کریم ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر وحی کے ذریعہ آیت میراث: یوصیکم اللہ..............نازل ہوئی۔

یہاں دو امر قابل غور ہیں:

(۱)......روایت باب سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میراث یوصیکم اللہ..........کا نزول حضرت جابر کے واقعہ میں ہوا ہے، جبکہ باب ما جاء فی میراث البنات کی روایت میں گذر چکا ہے کہ یہ آیت حضرت سعد بن ربیع کی لڑکیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان دو باتوں میں تعارض ہے؟

(۲)......حضرت جابر کے قصہ سے متعلق بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر آیت میراث یوصیکم اللہ......نازل ہوئی ہے، جیسا کہ روایت باب اور دیگر بعض احادیث میں ہے، جبکہ بعض روایات میں ہے کہ اس واقعہ میں آیت کلالہ: یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ نازل ہوئی ہے، بظاہر اس امر میں بھی تعارض ہے؟

نیز جب حضرت جابر کی اولاد نہیں تھی تو آیت میراث یعنی یوصیکم اللہ کو اس واقعہ سے کیا مناسبت ہے؟

شارحین حدیث نے ان متعارض روایات میں یوں تطبیق دی ہے کہ آیت میراث اور آیت کلالہ یعنی یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ دونوں کا نزول حضرت جابر کے واقعہ میں ہوا ہے، آیت کلالہ تو اس واقعہ میں نازل ہوئی ہی ہے جیسا کہ اگلے باب میں اسکی تصریح ہے، اور آیت میراث یعنی یوصیکم

اللہ......... کا اس واقعہ میں نازل ہونیکا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں جو "وان کان رجل یورث کلالۃ......... ہے، اس حصے کا تعلق حضرت جابر کے واقعے سے ہے کیونکہ اس میں کلالہ کا ذکر ہے، اور آیت میراث کا ابتدائی حصہ حضرت سعد بن ربیع کی لڑکیوں کے بارے میں نازل ہوا ہے، حضرت جابر کے حق میں نہیں ہوا، کیونکہ ان کی اولاد نہیں تھی، اس لئے آیت میراث کا آخری حصہ ہی اس واقعہ سے متعلق ہے۔

لہذا حدیث باب میں جو اس واقعے کے بارے میں آیت میراث کے نزول کا ذکر ہے، اس سے اسکی آخری آیت وان کان رجل یورث کلالۃ مراد ہے۔

آیت میراث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اولاد لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین کے طور پر تقسیم ہوگا۔ فتح الباری، کتاب الفرائض ۱۲/۲۔ وکتاب التفسیر ۳۰۸/۸۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب الفرائض، باب میراث الکلالۃ ۲۲/۲۔

بَابُ مِيرَاثِ الأَخَوَاتِ

یہ باب بہنوں کی میراث کے بارے میں ہے

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُنْكَدِرِ، سَمِعَ جَابِرَ بنَ عَبْدِ اللهِ قَالَ: مَرِضْتُ فَأَتَانِي رَسُولُ اللهِ ﷺ يَعُودُنِي، فَوَجَدَنِي قَدْ أُغْمِيَ عَلَيَّ فَأَتَانِي وَمَعَهُ أَبُوبَكْرٍ وَهُمَا مَاشِيَانِ، فَتَوَضَّأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَصَبَّ عَلَيَّ مِنْ وَضُوئِهِ، فَأَفَقْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ كَيْفَ أَقْضِي فِي مَالِي أَوْ كَيْفَ أَصْنَعُ فِي مَالِي؟ فَلَمْ يُجِبْنِي شَيْئًا، وَكَانَ لَهُ تِسْعُ أَخَوَاتٍ حَتّٰى نَزَلَتْ آيَةُ الْمِيرَاثِ ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلالَةِ﴾ الآية. قَالَ جَابِر: فِيَّ نَزَلَتْ.

محمد بن منکدر نے حضرت جابر سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں بیمار ہوا، تو نبی کریم ﷺ میری عیادت کیلئے تشریف لائے، آپ نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پایا، (اس موقع پر) آپ ﷺ تشریف لائے اور آپکے ساتھ حضرت ابو بکر تھے، اور دونوں پیدل تشریف لائے، پھر آپ ﷺ نے وضو فرمایا، اور اپنے وضو سے بچا ہوا پانی میرے اوپر ڈالا، تو مجھے ہوش

آ گیا، پھر میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کے بارے میں کیسے فیصلہ کروں یا اپنے مال میں (تقسیم) کیسے کروں؟ آپ ﷺ نے (اس وقت) کوئی جواب نہیں دیا، اور حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں، یہاں تک کہ آیت میراث یعنی يستفتونك قل الله يفتيكم في الكلالة نازل ہوئی۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

مشکل الفاظ کی تشریح:۔يعودني: آپ ﷺ میری عیادت کرنے لگے۔ اغمي عليّ: (ہمزے پر پیش کے ساتھ) باب افعال سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے، مجھ پر غشی اور بے ہوشی طاری ہوگئی، علامہ عینی نے غشی اور اغماء یعنی بے ہوشی میں یہ فرق کیا ہے کہ غشی ایک ایسا مرض ہے جو طویل تھکاوٹ کی وجہ سے طاری ہوتا ہے، یہ گویا اغماء سے خفیف ہے، جبکہ علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ غشی اور اغماء دونوں ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔ اور "اغماء" "جنون" اور نوم یعنی نیند میں یہ فرق ہے کہ بے ہوشی میں عقل مغلوب ہو جاتی ہے، اور پاگل پن میں عقل سلب ہو جاتی ہے اور نیند میں عقل مستور یعنی پوشیدہ کر دی جاتی ہے۔ صب عليّ: آپ ﷺ نے میرے اوپر (پانی) ڈالا۔ وضوءه: (واؤ پر زبر کے ساتھ) وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔

حدیث باب میں اس سے مراد وضو کا مستعمل پانی ہے جسے غسالہ کہا جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وضو کا بچا ہوا پانی مراد ہو۔ تکملۃ فتح الملھم ۲/۲۱، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۲۹۔

کلالہ کی تفسیر

"کلالہ" کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے، اور چار قول مشہور ہیں:

(۱)...... جمہور کے نزدیک کلالہ اس میت کو کہا جاتا ہے جس کا باپ اور کوئی بیٹا زندہ موجود نہ ہو، ایسی صورت میں اس کے بھائی وارث ہونگے۔

(۲)...... کلالہ ان وارثوں کو کہتے ہیں جن میں کوئی ولد اور والد نہ ہو، اس صورت میں میت کے بھائی کلالہ ہونگے۔

(۳)...... تیسرا قول یہ ہے کہ کلالہ اسم مصدر ہے اور اس میت کی وراثت کو کہتے ہیں کہ جسکا ولد اور والد نہ ہو۔

(۴)......چوتھا قول یہ ہے کہ کلالہ اس میت کے مال موروث کا نام ہے جس میت کا ولد اور والد دونوں نہ ہوں۔

لیکن قرآن کریم اور حدیث میں کلالہ کا لفظ میت اور وارث دونوں کیلئے استعمال ہوا ہے چنانچہ حدیث باب میں مذکور آیت اور وان کان رجل یورث کلالۃ میں کلالہ کا لفظ میت کیلئے استعمال ہوا ہے اور حضرت جابر کی ایک حدیث :انما یرثنی کلالۃ (میرا وارث کلالہ ہوگا) میں کلالہ سے وارث مراد ہے۔اس لئے جمہور علماء کے نزدیک کلالہ کا لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے تاہم زیادہ تر اس سے وہ میت مراد ہوتا ہے جسکا باپ اور کوئی بیٹا زندہ موجود نہ ہو،البتہ کبھی اسکا اطلاق وارث اور مال موروث پر بھی کر دیا جاتا ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ کلالہ لغوی اعتبار سے کیا ہے اور یہ کس سے ماخوذ ہے،اس میں اہل لغت کے تین قول ہیں:

(۱)......اکثر حضرات کے نزدیک کلالہ مصدر ہے تَكَلَّلَ کا،اور تَكَلَّلَهُ النَّسَبُ کا ترجمہ ہے:تطرّفہ:طرف میں ہونا،یعنی کلالہ کی صورت میں اصول اور فروع کی میراث کا حصہ اطراف میں واقع رشتہ داروں کو ملتا ہے۔

(۲)......اور بعض کہتے ہیں کہ کلالہ "اِكْلِيْل" سے ماخوذ ہے،جس کے معنی ہیں:ہر وہ چیز جو کسی شئی کو تمام اطراف سے گھیر لے،میت کو کلالہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وارثوں نے اسے تمام اطراف سے گھیرا ہوتا ہے۔

(۳)......اور بعض کے نزدیک کلالۃ "كَلَّ الشَّيْئُ" سے ماخوذ ہے،جس کے معنی ہیں:نسب کا دور اور منقطع ہو جانا،میت کو کلالہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا نسب بھی والد اور ولد نہ ہونے کی وجہ سے دور اور منقطع ہو جاتا ہے۔تکملۃ فتح الملھم ۱۹/۲،۲۰،فتح الباری،کتاب التفسیر،باب یستفتونک ۳۴۰/۸تحفۃ الاحوذی ۲۲۹/۶۔

حدیث باب سے چند امور کا ثبوت

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......نبی کریم ﷺ نہایت سادگی اور بے تکلفی سے زندگی گذارتے تھے،یہی وجہ ہے کہ آپ پیدل چل کر بغیر کسی سواری کے حضرت جابر کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے،اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو دنیا میں عیش و عشرت اور پر تکلف نہیں بلکہ سادگی اور بغیر تکلف کے زندگی گذارنی چاہیے،اس سے اسے سکون قلب حاصل ہوگا۔

(۲)...... بزرگوں اور نیک لوگوں سے تبرک لینا اور اس سے شفا حاصل کرنا جائز ہے، جبکہ اسکا عقیدہ توحید درست ہو۔

(۳)......دینی مسئلہ معلوم نہ ہوتو کسی ذی علم سے دریافت کرلیا جائے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ العَصَبَةِ

یہ باب عصبہ کی میراث کے بارے میں ہے

عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ.

عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم متعین حصوں (یعنی نصف، چوتھائی، آٹھواں حصہ......) کو اہل حصص تک پہونچاؤ، پھر جو باقی بچ جائے وہ اس مرد کیلئے ہے جو میت سے قریب تر ہو۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔الحقوا: (ہمزے پر زبر اور حاء کے نیچے زیر) تم پہنچا دو۔ الفرائض: فریضۃ کی جمع ہے: وہ متعین حصے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں مثلاً نصف، چوتھا حصہ، آٹھواں حصہ، دو تہائی، تہائی اور چھٹا حصہ۔ اولیٰ: اقرب، زیادہ قریبی رشتہ دار، یہ ولی (لام کے سکون کے ساتھ) سے ماخوذ ہے بمعنی قرب۔ مـا بقي: جو مال باقی بچ جائے۔ رجل ذکر: مذکر مرد، رجل کے ساتھ ''ذکر'' کی قید لگائی، حالانکہ ہر رجل مذکر ہوتا ہے، یہ قید یا تو محض تاکید کیلئے ہے، یا اس سے خنثی کو خارج کرنا مقصود ہے، یا اس سے مؤنث سے احتراز پیش نظر ہے، کیونکہ عصبہ میں میراث کا سبب مذکر ہوتا ہے نہ کہ مؤنث، چنانچہ عصبہ میں ہر مذکر وارث ہوتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، البتہ میت کے قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ محروم ہو جاتا ہے۔

فتح الباری ۱۲/۱۲، تحفۃ الاحوذی ۶/ ۲۳۰۔

وارثوں کی اقسام

شریعت میں وارثوں کی تین قسمیں ہیں:

(۱)......اصحاب فرائض: یہ وہ لوگ ہیں جن کے حصے تہائی، چوتھائی..........وغیرہ شریعت نے مقرر کئے ہیں جیسے والدین، زوجین وغیرہ۔

(۲)......عصبات: یہ میت کے وہ رشتہ دار ہیں جن کیلئے شرعاً کوئی حصہ مقرر نہ ہو، جیسے بھائی اور چچے..........، ان کا حکم یہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد اگر مال بچ جائے تو ان کو دیا جائیگا اور اگر کچھ نہ بچے تو محروم ہونگے۔

(۳)......ذوالارحام: میت کے وہ رشتہ دار جو نہ عصبہ ہوں اور نہ ذوی الفروض میں سے ہوں، جیسے بھتیجیاں اور چچازاد بہنیں، خالہ اور پھوپھی وغیرہ..........ان کا حکم یہ ہے کہ اگر عصبات میں کوئی زندہ ہو تو یہ وارث نہیں ہونگے۔

حدیث باب میں پہلی دو قسموں کو ذکر کیا گیا ہے، کہ میت کا ترکہ ذوی الفروض کے درمیان ان کے شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائیگا، اور جو بچ جائے اسے عصبات کے درمیان تقسیم کیا جائیگا۔

یہ حدیث اس بات میں اصل ہے کہ عصبات وارث ہوتے ہیں، اسپر جمہور اہل سنت علماء کرام کا اجماع ہے، صرف شیعہ حضرات ان کے وارث بننے سے انکاری ہیں، ان کی یہ بات چونکہ قرآن وسنت اور اصول شریعت کے خلاف ہے اس لئے اسکی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تکملة فتح الملھم، کتاب الفرائض، بــــاب **الحقوا الفرائض بأهلها ۱۴/۲**۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيْرَاثِ الْجَدِّ

یہ باب دادے کی میراث کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ عِمْرَانَ بنِ حُصَينٍ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ ابْنِي مَاتَ فَمَا لِي مِنْ مِيْرَاثِهٖ؟ فَقَالَ: لَکَ السُّدُسُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ فَقَالَ: لَکَ سُدُسٌ آخَرُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ قَالَ: إِنَّ السُّدُسَ الآخَرَ لَکَ طُعْمَةٌ.

حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میرا پوتا مر گیا ہے، اس کے ترکہ میں سے مجھے کتنا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لئے

چھٹا حصہ ہے، جب وہ (یہ جواب سنکر) واپس ہوا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ تمہیں چھٹا حصہ اور ملے گا، پھر جب وہ واپس ہوا تو آپ نے بلایا اور ارشاد فرمایا: یہ دوسرا چھٹا حصہ تمہارا رزق ہے۔

میراث میں دادے کا حصہ

اسپر اجماع ہے کہ دادا اصحاب فرائض میں سے ہے، اور اسے بطور فرض کے چھٹا حصہ ملتا ہے، اور کبھی اس کے ساتھ عصبہ ہونے کی وجہ سے بھی کچھ مل جاتا ہے، اور دادا باپ کی عدم موجودگی میں باپ کے مثل ہوتا ہے، اور اگر باپ موجود ہو تو پھر دادا محروم ہوتا ہے۔

حدیث باب میں حضور اکرم ﷺ نے میت کے ترکہ سے دو تہائی اسکی بیٹیوں کو دیا، ان کی تصریح گو کہ حدیث میں نہیں لیکن ان کو یہ معلوم تھیں اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کیا، باقی ایک تہائی میں سے پہلا چھٹا حصہ اس دادا کو جو سائل تھا، ذوی الفروض میں سے ہونے کی وجہ سے دیا، اور دوسرا چھٹا حصہ اسے عصبہ ہونے کی حیثیت سے دیا، اسطرح اس شخص کو گویا کل ترکہ میں سے پورا ایک تہائی مل گیا، مگر نبی کریم ﷺ نے ایک ہی دفعہ اسے تہائی مال نہیں دیا بلکہ ابتداء اسے پہلا چھٹا حصہ دیا پھر وہ چلا گیا، دوبارہ بلا کر دوسرا چھٹا حصہ دیا، اسطرف توجہ دلانے کیلئے کہ یہ تہائی اسے ذی فرض ہونے کی حیثیت سے نہیں ملا بلکہ پہلا حصہ اسے بطور فرض کے ملا ہے، اور دوسرا حصہ عصبہ ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دوسرے حصے کو "طعمہ" فرمایا، کیونکہ پہلا حصہ تو شرعاً متعین ہے، اس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا، لیکن عصبہ والے حصے میں تغیر و تبدل ہوسکتا ہے، چنانچہ اگر مذکورہ صورت میں میت کے دوسرے اصحاب الفرائض ہوتے تو پھر دادا کو دوسرا چھٹا حصہ نہ ملتا۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب البیوع، باب الفرائض ۶/۲۴۴۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مذکورہ روایت میں صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، جس کے وارثوں میں دو تو بیٹیاں تھیں، اور ایک یہ سائل یعنی دادا تھا، چنانچہ میت کے ترکہ میں سے اس کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی مال دیا گیا، باقی ایک تہائی میں سے آدھا یعنی کل ترکہ کا چھٹا حصہ دادا کو ذی فرض ہونے کی حیثیت سے ملا، اور پھر دوسرا چھٹا حصہ بھی دادا کو عصبہ ہونے کی وجہ سے مل گیا، یوں ایک پورا تہائی مال میت کے دادا کو حاصل ہوجائیگا۔ شرح الطیبی، کتاب الفرائض ۶/۲۰۵

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ الْجَدَّةِ

یہ باب دادی/نانی کی میراث کے (حکم کے) بارے میں ہے

عَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ: جَاءَ تِ الجَدَّةُ أُمُّ الأُمِّ أَوْ أُمُّ الأَبِ إِلى أَبِي بَكْرٍ فَقَالَتْ: إِنَّ ابنَ ابْنِي أَوْ أَنَّ ابْنَ ابْنَتِي مَاتَ، وَقَدْأُخْبِرْتُ أَنَّ لِي فِي الْكِتَابِ حَقًّا، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: مَا أَجِدُ لَكِ فِي الْكِتَابِ مِنْ حَقٍّ، وَمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَضَى لَكِ بِشَيْءٍ، وَسَأَسْأَلُ النَّاسَ. فَشَهِدَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَعْطَاهَا السُّدُسَ. قَالَ وَمَنْ سَمِعَ ذٰلِكَ مَعَكَ؟ قَالَ محمدُ بنُ مَسْلَمَةَ. قَالَ فَأَعْطَاهَا السُّدُسَ ثُمَّ جَاءَ تِ الْجَدَّةُ الأُخْرَى الَّتِي تُخَالِفُهَا إِلَى عُمَرَ، قَالَ سُفْيَانُ: وَزَادَنِي فِيْهِ مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ، وَلَمْ أَحْفَظْهُ عَنِ الزُّهْرِيِّ، وَلَكِنْ حَفِظْتُهُ مِن مَعْمَرٍ أَنَّ عُمَرَ قَالَ: إِنِ اجْتَمَعْتُمَافَهُوَ لَكُمَا وَأَيَّتُكُمَا انْفَرَدَتْ بِهِ فَهُوَ لَهَا.

حضرت قبیصہ بن ذوئیب کہتے ہیں کہ ایک (میت کی) نانی یا دادی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور اس نے کہا: بے شک میرا پوتا یا نواسا مر گیا ہے، اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ کتاب اللہ میں میرا حق بیان کیا گیا ہے، حضرت ابوبکر نے فرمایا: میں کتاب اللہ میں تیرا کوئی حق نہیں پاتا، اور نہ ہی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ نے تیرے (حق کے) لئے کوئی فیصلہ فرمایا ہو، (البتہ) میں لوگوں (یعنی علماء صحابہ) سے پوچھوں گا (پھر صدیق اکبر نے اس بارے میں صحابہ کرام سے دریافت کیا) تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس (دادی یا نانی) کو چھٹا حصہ عطا فرمایا تھا، صدیق اکبر نے فرمایا: اور کس نے آپ کے ساتھ یہ حکم (حضور ﷺ سے) سنا ہے؟ حضرت مغیرہ نے کہا: محمد بن مسلمہ نے (بھی سنا ہے)، راوی کہتے ہیں: پھر صدیق اکبر نے (میت کے ترکہ میں سے) چھٹا حصہ اس (نانی یا دادی) کو دیدیا، پھر حضرت عمر کے پاس دوسری جدہ (یعنی باپ کی ماں) آئی

جو (پہلی جدہ یعنی نانی کے) مقابل تھی، سفیان کہتے ہیں کہ معمر نے زہری سے اس بارے میں مجھے کچھ زائد بیان کیا مگر وہ مجھے زہری سے یاد نہیں، البتہ معمر سے یاد ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عمر نے فرمایا: اگر تم دونوں جمع ہو تو وہ چھٹا حصہ تم دونوں کیلئے مشترک ہوگا، اور اگر تم میں سے کوئی ایک ہے تو وہ چھٹا حصہ اس ایک کیلئے ہوگا۔

عَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ : جَاءَ تِ الْجَدَّةُ اِلٰى اَبِىْ بَكْرٍ فَسَأَلَتْهُ مِيْرَاثَهَا ، قَالَ لَهَا : مَالَكِ فِىْ كِتَابِ اللهِ شَيْئٌ ، وَمَالَكِ فِىْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ شَيْئٌ فَارْجِعِىْ حَتّٰى اَسْأَلَ النَّاسَ ، فَسَأَلَ النَّاسَ ، فَقَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ : حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَعْطَاهَا السُّدُسَ ، فَقَالَ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ؟ فَقَامَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ فَقَالَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ ، فَاَنْفَذَهُ لَهَا اَبُوْبَكْرٍ ، قَالَ : ثُمَّ جَاءَ تِ الْجَدَّةُ الْاُخْرىٰ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَسَأَلَتْهُ مِيْرَاثَهَا ، فَقَالَ : مَالَكِ فِىْ كِتَابِ اللهِ شَيْئٌ وَّلٰكِنْ هُوَ ذٰلِكَ السُّدُسُ ، فَاِنِ اجْتَمَعْتُمَا فِيْهِ بَيْنَكُمَا وَاَيَّتُكُمَا خَلَتْ بِهٖ فَهُوَ لَهَا .

حضرت قبیصہ بن ذؤیب کہتے ہیں کہ ایک (فوت شدہ آدمی کی) جدہ حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور ان سے اپنی میراث دلوائے جانیکا مطالبہ کیا، حضرت ابوبکر نے اس سے فرمایا کہ: کتاب اللہ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر کیا گیا ہے (یعنی مجھے جو حدیثیں یاد ہیں ان میں سے کسی حدیث میں جدہ کے حصے کا کوئی ذکر نہیں ہے) اسلئے اب تو تم واپس چلی جاؤ، میں پھر لوگوں (یعنی علماء صحابہ) سے دریافت کروں گا (شاید ان میں سے کسی کو جدہ کے حصے کے بارے میں آپ ﷺ کا کوئی ارشاد معلوم ہو) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ میں (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا (تو میں نے دیکھا) کہ آپ ﷺ نے ایک جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا، صدیق اکبر نے مغیرہ سے فرمایا: کیا تمہارے ساتھ اور بھی کوئی شخص (اس وقت موجود) تھا؟ (کہ جس نے یہ حکم سنا ہو) تو محمد بن

مسلمہ (مغیرہ کی تائید کیلئے) کھڑے ہوگئے اور وہی کچھ کہا جو حضرت مغیرہ نے کہا تھا، حضرت ابوبکر (کو جب اطمینان ہوگیا کہ میت کے ترکہ میں سے جدہ کا بھی حصہ ہے تو انہوں) نے اس جدہ کو (میت کے ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دیئے جانیکا فیصلہ کردیا، راوی کہتے ہیں: پھر دوسری جدہ (یعنی باپ کی ماں) حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان سے اپنی میراث دلوائے جانیکا مطالبہ کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے لئے کتاب اللہ میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے البتہ وہی چھٹا حصہ تمہارے لئے بھی ہے، لہٰذا اگر تم اس میں دو ہو تو وہ چھٹا حصہ تم دونوں کے درمیان مشترک ہوگا، اور اگر تم میں سے کوئی ایک ہے تو پھر وہ چھٹا حصہ اس ایک کیلئے ہوگا۔

جدہ کی میراث

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ صدیق اکبر کے پاس میت کی نانی آئی اور اس نے میراث کا مطالبہ کیا، تو حضرت ابوبکر کو چونکہ قرآن وسنت میں اس کا حکم معلوم نہیں تھا اس لئے اس سے فرمایا کہ میں دوسرے صحابہ کرام سے دریافت کروں گا، جب پوچھا تو پتہ چلا کہ جدہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ نے آپ ﷺ کا اس بارے میں فیصلہ سنایا، پھر صدیق اکبر نے اس جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا۔

عربی زبان میں لفظ ''جدہ'' دادی اور نانی دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے، حدیث باب میں جو عورت حضرت صدیق اکبر کے پاس آئی تھی، وہ میت کی نانی تھی، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں جو عورت آئی وہ میت کی دادی یعنی باپ کی ماں تھی، جیسا کہ ایک اور روایت میں اسکی وضاحت موجود ہے۔

ان اجتمعتما فهو لكما............

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس جملے سے درحقیقت جدہ کی میراث کا ایک اصول بیان فرمایا کہ میت کے ترکہ میں جدہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے، خواہ ایک ہو یا کئی ہوں، اگر ایک جدہ ہوگی تو وہ اس چھٹے حصے کی تنہا مالک ہوگی، اور اگر کئی ہونگی تو اس چھٹے حصے کو وہ سب آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں گی البتہ قریبی جدہ کی موجودگی کے وقت دور کی جدہ وراثت سے محروم ہوگی، چنانچہ حضرت ابو

بکر رضی اللہ عنہ نے وہ چھٹا حصہ تنہا ایک جدہ یعنی نانی کو دیئے جانیکا حکم دیا کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میت کی دوسری جدہ یعنی دادی بھی موجود ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ میت کی دوسری جدہ بھی ہے تو انہوں نے یہ حکم دیا کہ اس چھٹے حصے میں دونوں جدہ شریک ہونگی، اسی اصول کی روشنی میں ان دونوں عورتوں یعنی دادی اور نانی کو میت کے ترکہ کا چھٹا حصہ دیئے جانیکا حکم دیا گیا۔ الکوکب الدری ۱۰۲/۳، مرقاۃ المفاتیح ۲۴۵/۶۔ شرح الطیبی، کتاب الفرائض ۲۰۶/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ الْجَدَّةِ مَعَ ابْنِهَا

یہ باب دادی کی اپنے بیٹے کی موجودگی میں (پوتے کی) میراث (دلوائے جانیکے ایک خاص واقعہ) کے بارے میں ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ فِي الْجَدَّةِ مَعَ ابْنِهَا: إِنَّهَاأَوَّلُ جَدَّةٍ أَطْعَمَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ سُدُسًا مَعَ ابْنِهَا وَابْنُهَا حَيٌّ.

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انہوں نے اس دادی کے بارے میں جسکا بیٹا موجود ہو، یہ کہا کہ (میراث دلوائی جانے والی) وہ پہلی دادی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں (پوتے کی میراث میں سے) اسے چھٹا حصہ دلوایا تھا، جبکہ اس (دادی) کا بیٹا (یعنی میت کا باپ) موجود تھا۔

کیا دادی اپنے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی وارث ہوگی

مسئلہ یہ ہے کہ اگر میت کا باپ زندہ ہو تو اسکی دادی ترکہ سے محروم ہوتی ہے، یہی جمہور صحابہ اور تابعین وغیرہ کا مسلک ہے، البتہ حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم کے نزدیک دادی اپنے بیٹے یعنی میت کے باپ کی موجودگی میں وارث ہوتی ہے، اس نظریئے کو شریح، حسن بصری اور ابن سیرین نے اختیار کیا ہے۔ مرقاۃ ۲۴۶/۶

حدیث باب جمہور کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میت کے باپ کی موجودگی میں اسکی دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے، اس لئے جمہور کیطرف سے روایت باب کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں:

(۱)......حدیث باب ضعیف ہے، اس لئے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، استدلال کیلئے صحیح حدیث ہونی چاہیے، تحفۃ الاحوذی ۲۳۴/۶۔

(۲)......حدیث باب میں ایک خاص واقعہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے دادی کو اس کے بیٹے یعنی میت کے باپ کی موجودگی میں تبرع اور احسان کے طور پر چھٹا حصہ دلوایا تھا، یہ حصہ میراث کے طور پر نہیں تھا۔

(۳) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اس میت کا باپ کافر یا غلام ہو اس لئے نبی کریم ﷺ نے اسکو میراث نہیں دلوائی، اور دادی کو دلوائی۔

(۴)......بعض نے یہ گمان ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جدہ سے ''نانی'' اور ابنہا سے ''میت کا ماموں'' مراد ہو جو ذوی الارحام میں سے ہے، مطلب یہ ہے کہ میت کے باپ کی موجودگی میں اسکا ماموں محروم ہوگا، نانی محروم نہیں ہوگی، اس کو ترکہ سے حصہ ملے گا، البتہ میت کی دادی محروم ہوگی۔ الکوکب الدری ۱۰۴/۳۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ الْخَالِ

یہ باب ماموں کی میراث (کے حکم) کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بنِ حُنَيْفٍ قَالَ: كَتَبَ مَعِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِلَى أَبِي عُبَيْدَةَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لَا مَوْلَى لَهُ، وَالْخَالُ وَارِثُ مَن لَا وَارِثَ لَهُ.

ابو امامہ بن سہل کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب نے میرے ہاتھ ابو عبیدہ کیطرف یہ لکھ کر بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اس شخص کا منتظم ہوں جسکا کوئی منتظم نہ ہو (یعنی میں اس شخص کا وارث ہوں جسکا کوئی وارث نہ ہو) اور (ذوی الارحام میں سے) ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جسکا (ذوی الفروض وعصبات میں سے) کوئی وارث نہ ہو۔

عَن عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: الْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ماموں اسکا وارث ہوتا ہے جسکا (ذوی الفروض وعصبات میں سے) کوئی وارث نہ ہو۔

وَاخْتَلَفَ فِيْهِ اَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ فَوَرَّثَ بَعْضُهُمُ الْخَالَ وَالْخَالَةَ وَالْعَمَّةَ وَإِلٰى هٰذَا الْحَدِيْثِ ذَهَبَ اَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ فِيْ تَوْرِيْثِ ذَوِي الْاَرْحَامِ وَاَمَّا زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَلَمْ يُوَرِّثْهُمْ وَجَعَلَ الْمِيْرَاثَ فِيْ بَيْتِ الْمَالِ.

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ:اس مسئلے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے(کہ ذوی الارحام وارث ہیں یا نہیں) چنانچہ بعض صحابہ نے ماموں، خالہ اور پھوپھی کو وارث قرار دیا ہے،اس حدیث کی روشنی میں اکثر اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ ذوی الارحام وارث ہوتے ہیں، جبکہ زید بن ثابت نے ان کو وارث قرار نہیں دیا،اور یہ کہا کہ دیگر رشتہ دار نہ ہونے کی صورت میں اس کے مال کو بیت المال میں جمع کیا جائیگا۔

ذوی الارحام کے وارث ہونیکا مسئلہ

''ذوی الارحام'' فقہی اصطلاح میں ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے جو نہ ذوی الفروض میں سے ہوں اور نہ عصبات میں سے ہوں، میت کا ترکہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے گا یعنی قریبی عصبہ کو بعید کے مقابلے میں مقدم رکھا جائیگا،اور اگر عصبات میں سے کوئی موجود نہ ہو تو پھر ذوی الارحام کو دیا جاتا ہے۔

''ذوی الارحام'' کو وارث قرار دیا جائے یا نہیں؟ اس میں حضرات صحابہؓ کے زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے، اکثر صحابہ کرام حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابوعبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل وغیرہ اور تابعین میں سے علقمہ، نخعی، شریح، حسن، ابن سیرین......وغیرہ اور آئمہ میں سے حنفیہ اور حنابلہ اس بات کے قائل ہیں کہ ذوی الارحام وارث ہوتے ہیں۔

البتہ صحابہ میں سے حضرت زید بن ثابت اور تابعین میں سے سعید بن مسیّب اور سعید بن جبیر، اور فقہاء میں سے امام مالک اور امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ذوی الارحام وارث نہیں ہیں، ایسی صورت میں اس میت کا ترکہ بیت المال میں جمع کرادیا جائیگا۔الکوکب الدری ۱۰۳/۳، بذل المجہود ۱۷۵/۱۳، مرقاۃ ۲۳۶/۶۔

جمہور نے اپنے موقف کے اثبات کیلئے درج ذیل آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے:

(۱)......حدیث باب جس میں حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے کو تیر سے قتل کر دیا، اس مقتول کا ماموں کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں تھا، یہ مسئلہ حضرت ابوعبید سے پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا حکم معلوم کرنے کیلئے حضرت عمر فاروقؓ سے رابطہ کیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسکا حکم ابوامامہ بن سہل کے ذریعہ ان کیطرف بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اور اسکا رسول اس شخص کے منتظم ہیں جسکا کوئی منتظم نہ ہو، اور ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جسکا اور کوئی وارث نہ ہو۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۳۵۔

(۲)......اس باب کی دوسری حدیث جو حضرت عائشہ سے منقول ہے اس میں بھی یہی ہے کہ ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جسکا کوئی وارث نہ ہو۔ اور ماموں نہ تو ذوی الفروض میں سے ہے اور نہ عصبہ میں سے، بلکہ ذوی الارحام میں سے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذوی الارحام وارث ہوتے ہیں۔

(۳)......**اولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتب الله** (اور رشتہ دار آپس میں حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں) سورہ انفال آیت نمبر ۷۵، قرآن کی اصطلاح میں ''اولوا الارحام'' کا لفظ مطلقاً تمام رشتہ داروں کیلئے بولا جاتا ہے، خواہ میراث میں ان کے حصے متعین ہوں یا نہ ہوں، جن کے حصے متعین ہوں، ان کو علم میراث کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے، ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ عصبہ رشتہ داروں کے درمیان تقسیم کیا جائیگا، اور اگر عصبات میں سے کوئی زندہ موجود نہ ہو تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا، عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں ان کو علم میراث و فرائض کی خاص اصطلاح میں ''ذوی الارحام'' کہا جاتا ہے، اب یہ لفظ انہی کیلئے مخصوص کر دیا گیا ہے، لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے تمام رشتہ داروں کو شامل ہے، جس میں ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام سب ہی داخل ہیں۔ تفسیر قرطبی، سورہ انفال ۸/۵۹ معارف القرآن سورہ انفال ۴/۳۰۰، مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۲۷۔

(۴)......**للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون** (ماں باپ اور خویش و اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی)

اس میں رجال، نساء اور اقربون کے الفاظ "ذوی الارحام" کو بھی شامل ہیں۔تحفۃ الاحوذی ۶/۲۳۷۔

(۵)......حدیث میں ہے کہ جب ثابت بن دحداح کی وفات ہوئی تو ان کا بھانجے کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار موجود نہیں تھا، تو نبی کریم ﷺ نے ان کی میراث اِن کے بھانجے ابولبابہ بن عبد المنذر کو دیدی۔

مذکورہ آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوی الارحام کو ذوی الفروض اور عصبہ نہ ہونے کی صورت میں میراث سے حصہ دیا جاتا ہے، یہی جمہور کا موقف ہے، اور اسی پر امت کا تعامل چلا آرہا ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ کے دلائل

(۱)......اللہ تعالیٰ نے آیات میراث میں صرف ذوی الفروض اور عصبات کے حصے بیان فرمائے ہیں، ذوی الارحام کا کوئی حصہ ذکر نہیں کیا، اگر ان کا کوئی حصہ ہوتا تو اسے ضرور بیان کیا جاتا اس سے معلوم ہوا کہ ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

(۲)......حضور اکرم ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: میرے پاس جبرئیل آئے اور انہوں نے بتایا کہ پھوپھی اور خالہ کیلئے میراث نہیں ہے۔ بذل المجھود، کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام ۱۳/۱۷۷۔

(۳)......یہ حضرات کہتے ہیں کہ الخال وارث من لا وارث لہ سے ماموں کیلئے وراثت کا ثبوت نہیں بلکہ نفی کرنا مقصود ہے، یہ جملہ بطور محاورے کے ہے، جسطرح عربی زبان میں کہتے ہیں: **الصبر حیلة من لیس له حیلة**، کہ صبر اس کا حیلہ ہوتا ہے جسکا اور کوئی حیلہ اور تدبیر نہ ہو، حالانکہ صبر تو کوئی حیلہ نہیں ہوتا، ایسے ہی یہاں ہے گویا عبارت یوں ہے: **من کان وارثه الخال فلا وارث له** جس کا وارث ماموں ہو تو اس کا کوئی وارث نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ماموں وارث نہیں لہذا ذوی الارحام کو وارث قرار دینے کیلئے اس حدیث سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

ان دلائل کی بنیاد پر یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر میت کے ذوی الفروض اور عصبہ رشتہ داروں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو اس کے ترکہ کو بیت المال میں جمع کرادیا جائیگا۔فتح الباری ۱۲/۳۴، مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۳۶۔

جمہور کیطرف سے ان کے دلائل کا جواب:

(۱)......آیات میراث میں گوکہ ذوی الارحام کا ذکر صراحۃ نہیں ہے، لیکن اس سے ان کے وارث بننے کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ اولوا الارحام والی آیت اور مذکورہ احادیث میں ان کے وارث ہونیکا واضح ثبوت ہے، نیز احکام میراث حالات کے اعتبار سے تغیر وتبدل کے ساتھ بتدریج نازل ہوئے ہیں، ایسے میں کسی حکم کا آیات میراث میں نہ ہونا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ حکم ثابت نہیں ہے۔

(۲)......جمہور اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ حدیث اولوا الارحام والی آیت کریمہ کے نزول سے پہلے کی ہو، یا اسکی مراد یہ ہے کہ پھوپھی اور خالہ اس وقت وارث نہیں ہونگی جب میت کے ذوی الفروض اور عصبہ رشتہ داروں میں کوئی موجود ہو، ورنہ ہونگی۔

(۳)......محاورے کے ذریعہ ماموں کے وارث ہونیکی نفی ثابت کرنا درست نہیں، کیونکہ حدیث کا ابتدائی حصہ اس محاورے کی نفی کررہا ہے، اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ماموں وارث ہوگا، نیز ان کی بات اس وجہ سے بھی درست نہیں کہ نبی کریم ﷺ شریعت کے احکام ومسائل کو عام فہم انداز میں امت کے سامنے پیش فرماتے تھے، انہیں پیچیدہ اور مشکل نہیں کرتے تھے، اس لئے یہ مراد نہیں لیا جاسکتا کہ نبی کریم ﷺ ایک مثبت جملہ ارشاد فرمائیں اور اس سے مقصود نفی ہو، جبکہ حدیث کا ابتدائی حصہ بھی اسکی تائید نہیں کررہا، اس لئے محاورے کے ذریعہ ان حضرات کا اپنے مسلک پر استدلال کرنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ مرقاۃ المفاتیح، ابواب الفرائض ۲۳۶/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الَّذِي يَمُوتُ وَلَيْسَ لَهُ وَارِثٌ

یہ باب اس شخص (کی میراث کے حکم) کے بارے میں ہے جو مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ مَوْلًى لِلنَّبِيِّ ﷺ وَقَعَ مِن عِذْقِ نَخْلَةٍ فَمَاتَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: انْظُرُوا هَلْ لَهُ مِنْ وَارِثٍ؟ قَالُوا: لَا. قَالَ: فَادْفَعُوهُ إِلَى بَعْضِ أَهْلِ الْقَرْيَةِ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا آزاد کردہ غلام کھجور کے درخت کی شاخ

سے گر کر مر گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو کیا اسکا کوئی وارث ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اسکا کوئی وارث نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے گاؤں کے بعض لوگوں کو اسکا ترکہ دیدو۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ مولی: آزاد کردہ غلام۔ وقع: گر گئے۔ عذق: (عین کے نیچے زیر اور ذال کے سکون کے ساتھ) شاخوں والی ٹہنی، اور اگر عین پر زبر ہو تو اس کے معنی ''کھجور کے پھل دار درخت'' کے ہوتے ہیں۔

آزاد کردہ غلام کی میراث کا حکم

اگر آزاد شدہ غلام کے نسبی رشتہ دار نہ ہوں تو اسکا ترکہ اس کے آزاد کرنے والے کو ملتا ہے، اس لحاظ سے جب نبی کریم ﷺ کا آزاد کردہ غلام مر گیا اور اس کا کوئی نسبی وارث نہیں تھا تو اسکی میراث نبی کریم ﷺ کو ملنی چاہیے تھی، لیکن چونکہ انبیاء کسی کے وارث نہیں ہوتے اور نہ کوئی شخص انبیاء کا وارث ہوتا ہے، اس لئے اس آزاد شدہ غلام کی میراث آپ ﷺ نے خود نہیں لی بلکہ بیت المال کے مصرف میں دیدی، اور بیت المال کے مصرف چونکہ فقراء اور مساکین وغیرہ ہوتے ہیں اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کے ترکہ کو اس کے گاؤں کے کسی محتاج اور مستحق شخص کو دیدینے کا حکم دیا، کیونکہ حالات اور موقع کے اعتبار سے آپ نے یہی مصلحت کے موافق اور مناسب سمجھا۔

اور یہ جو حدیث ہے: **انا مولی من لا مولی له، ارث ماله** (میں اس شخص کا منتظم ہوں جسکا کوئی منتظم نہ ہو، میں اس کے مال کا وارث ہوں) اس سے حقیقۃً وارث بننا مراد نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس مال کو صدقہ کردوں گا یا مسلمانوں کی مصالح اور فلاح و بہبود کے امور میں صرف کروں گا، اس لئے اس حدیث سے نبی کریم ﷺ کا وارث بننا لازم نہیں آتا۔ مرقاۃ المفاتیح ۲۳۸/۶۔

کیا انبیاء وارث ہوتے ہیں

اس بات میں تو جمہور کا اتفاق ہے کہ انبیاء کے، مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، اگر کوئی نبی مال چھوڑ کر جائے تو وہ رشتہ داروں میں بطور میراث کے تقسیم نہیں ہوتا بلکہ وہ غرباء اور مساکین پر صدقہ کرنے کا حکم ہے، انبیاء کی وراثت مال میں نہیں، علم میں جاری ہوتی ہے، چنانچہ قرآن میں جہاں بھی انبیاء کے ذکر میں

وراثت کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے وراثت مال نہیں، بلکہ وراثت علم مراد ہے۔

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ انبیاء اپنے عزیز واقارب کے وارث ہوتے ہیں یا نہیں، اس بارے میں دو نقطہ نظر ہیں:

(۱)......شافعیہ، مالکیہ، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہم اللہ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام اپنے عزیز واقارب کے وارث ہو سکتے ہیں، دلیل میں دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں:

☆......حدیث میں لانورث (ہم وارث نہیں بناتے) کے الفاظ تو ثابت ہیں لیکن لانرث کا لفظ (ہم وارث نہیں ہوتے) ثابت نہیں، یہ کسی راوی کا تصرف ہے، اس لئے "لانرث ولانورث" والی حدیث سے اس بات پر استدلال کرنا کہ انبیاء وارث نہیں ہوتے، درست نہیں۔

☆......حضور اکرم ﷺ کے والد حضرت عبداللہ ترکہ میں کچھ غلام اور بکریاں چھوڑ گئے تھے، آپ ﷺ کو یہ چیزیں والد کی میراث سے ملی تھیں

ان دلائل سے استدلال کر کے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے عزیز واقارب کے وارث ہوتے ہیں۔ بذل المجہود کتاب الفرائض، ۱۳/۱۷۹، الکوکب الدری ۳/۱۰۳۔

(۲)......حنفیہ اور دیگر حضرات کے نزدیک حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے عزیز واقارب کے وارث نہیں ہوتے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: نحن معاشر الانبیاء لانرث ولانورث (ہم یعنی انبیاء کی جماعت نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ وارث بناتے ہیں) یہ حدیث صحیح ہے، اسی مسلک پر اکثر حضرات کا اتفاق ہے، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا عمل بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور حضور اکرم ﷺ کو اپنے والد سے میراث چونکہ نبی بننے سے پہلے ملی تھی، اس لئے اس سے استدلال درست نہیں، معارف القرآن سورہ النمل ۶/۲۳۹، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۳۸، مفید الوارثین ص: ۱۳، ط: لاہور۔

بَابٌ

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ رَجُلًا مَاتَ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا إِلَّا عَبْدًا هُوَ أَعْتَقَهُ، فَأَعْطَاهُ النَّبِيُّ ﷺ مِيرَاثَهُ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے زمانے میں مرگیا اوراس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا مگر ایک غلام جسکو اس نے آزاد کردیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس مرحوم آقا کی میراث اس کے (آزاد کردہ) غلام کو دیدی۔

کیا آزاد کردہ غلام اپنے آقا کا وارث ہوسکتا ہے

مسئلہ یہ ہے کہ آزاد کردہ غلام اپنے آزاد کرنے والے آقا کا وارث نہیں ہوسکتا، اگر اسکا کوئی رشتہ دار زندہ نہ ہوتو اسکا ترکہ مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرادیا جائے گا، تاکہ مسلم حکمران مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں اسے صرف کر سکے، چنانچہ حدیث باب میں بھی نبی کریم ﷺ نے مرحوم آقا کے آزاد کردہ غلام کو اسکا ترکہ تبرعً اور احسان کے طور پر اسی وجہ سے دیا کہ وہ مستحق تھا، اس وجہ سے نہیں دیا کہ وہ غلام مرحوم آقا کے ترکہ کا وارث ہے۔

مذکورہ مسلک جمہور علماء کرام کا ہے، البتہ قاضی شریح اور حضرت طاؤس نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے پیش نظر کہا ہے کہ جسطرح آزاد کرنیوالا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے، ایسے ہی آزاد شدہ بھی اپنے آزاد کرنے والے کا وارث ہوسکتا ہے، اس نظریئے کو جمہور نے اختیار نہیں کیا۔

وہ ممالک اور علاقے جہاں اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے بیت المال نہ ہو یا بیت المال کا نظام اسلامی نہ ہو وہاں اس قسم کے مال کو مساجد و مدارس کی ضروریات میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۳۹۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي إِبْطَالِ الْمِيْرَاثِ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْكَافِرِ

یہ باب مسلمان اور کافر کے درمیان میراث کے ابطال کے بارے میں ہے۔

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ.

اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔

عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ.

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دوملت والے باہم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہونگے۔

مسلمان اور کافر کے درمیان میراث کا مسئلہ

اس حدیث کی روشنی میں تمام مسلمانوں کا اسپر اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، اسی طرح مسلمان کافر کا وارث بھی نہیں ہوسکتا، یہی جمہور صحابہ اور تابعین کا مسلک ہے، البتہ حضرت معاذ بن جبل، معاویہ، ابن المسیب اور مسروق وغیرہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے، ان حضرات کا استدلال مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

(۱)...... اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْه (اسلام سربلند اور غالب ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی) شرح مسلم للنووی ۲/۳۳ کتاب الفرائض۔

(۲)...... اَلْإِسْلَامُ يَزِيْدُ وَلَا يَنْقُصُ (اسلام بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا)

جمہور ان احادیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ان میں اسلام کی عظمت اور فضیلت کا ذکر ہے، ان میں میراث کا حکم بیان کرنا مقصود نہیں، جمہور کا استدلال حدیث باب وغیرہ سے ہے۔

لا یتوارث اهل ملتین اس میں "ملتین" سے کفر اور اسلام مراد ہے، اور اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب چونکہ باطل ہیں اسلئے وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں لہذا یہود و نصاری...... وغیرہ ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں۔ فتح الباری ۱۲/۵۸، تکملۃ فتح الملہم ۲/۱۱

مرتد کی میراث کا مسئلہ

اسپر اجماع ہے کہ کافر کیطرح مرتد بھی مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان، مرتد کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام مالک، امام شافعی، ربیعہ اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ مسلمان بھی مرتد کا وارث نہیں ہوتا ان کے نزدیک اس کا مال بیت المال میں جمع کیا جائیگا، جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ مرتد نے اپنے ارتداد کے زمانے میں جو کچھ کمایا ہے، وہ بیت المال میں جمع کیا جائیگا، اور جو

مال اس نے حالتِ اسلام میں کمایا ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا۔تحفۃ الاحوذی ۶/۲۴۱۔

ھکذا رواہ معمر وغیر واحد عن الزھری نحو ھذا: اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ زہری سے روایت کرنے والے معمر اور دیگر راویوں نے عمرو بن عثمان (واؤ کے ساتھ) نقل کیا ہے، مالک سے بھی بعض شاگردوں نے اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن امام مالک کے اکثر شاگردوں نے عمر بن عثمان واؤ کے بغیر روایت کیا ہے، جو کہ وہم ہے، اور یہ وہم مالک کو ہوا ہے، صحیح یہی ہے کہ اس روایت میں عمرو بن عثمان واؤ کے ساتھ ہے، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں اور مشہور و معروف ہیں۔تحفۃ الاحوذی ۶/۲۴۰۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي إِبْطَالِ مِيرَاثِ الْقَاتِلِ

یہ باب قاتل کی میراث کو باطل کرنے کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْقَاتِلُ لَا يَرِثُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قاتل وارث نہیں ہوتا۔

قاتل وارث نہیں ہوتا

اس حدیث کی روشنی میں جمہور یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ قاتل خواہ قصداً قتل کرے یا خطأ، بہر صورت مقتول کا وارث نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے دیت ملے گی، البتہ امام مالک اور نخعی فرماتے ہیں کہ قتل خطا میں قاتل صرف مال کا وارث ہوگا، دیت کا نہیں، لیکن چونکہ حدیث باب مطلق ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں اور صحابہ کرام کا اسی پر عمل رہا ہے، اس لئے جمہور کے نزدیک علی الاطلاق قاتل وارث نہیں ہوگا۔لیکن اگر وارث اپنے مورث کو ظلماً قتل نہ کرے بلکہ اپنا دفاع کرتے ہوئے اسے ماردے تو پھر یہ مقتول کی میراث سے محروم نہیں ہوگا۔مرقاۃ ۶/۲۲۳، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۴۳

بَابُ مَا جَاءَ فِي مِيرَاثِ الْمَرْأَةِ مِن دِيَةِ زَوْجِهَا

یہ باب اس بیان میں ہے کہ عورت اپنے مقتول شوہر کی دیت کی وارث ہوگی

عَن سَعِيدِ بنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ: قَالَ عُمرُ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ وَلَا تَرِثُ الْمَرأَةُ

مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا شَيْئًا، فَأَخْبَرَهُ الضَّحَّاكُ بْنُ سُفيانَ الكِلَابِيُّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَتَبَ إِلَيْهِ: أَنْ وَرِّثِ امْرَأَةَ أَشْيَمَ الضِّبَابِيِّ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا.

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دیت عاقلہ پر واجب ہے، اور عورت اپنے شوہر کی دیت سے کچھ بھی وارث نہیں ہوگی، یہاں تک کہ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کو بتایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کے پاس یہ لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وارث بناؤ۔

مقتول شوہر کی بیوی دیت میں بھی وارث ہوگی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابتداء میں یہ نظریہ تھا کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جائے تو اسکی بیوی کو دیت میں سے بطور میراث کے کچھ نہیں دیا جائیگا، ان کا منشأ یہ تھا کہ دیت ''عاقلہ'' سے وصول کی جاتی ہے، اور عاقلہ میں صرف مرد داخل ہوتے ہیں، خواتین نہیں، لہذا جب دیت دینے میں خواتین شامل نہیں تو لینے میں کیوں شامل ہوں، لیکن پھر جب حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اشیم ضبابی غلطی سے قتل ہو گئے تھے تو آپ نے حکم دیا کہ اسکی دیت میں اسکی بیوی کو بھی وارث بناؤ۔

یہ حدیث سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا، اور بیوی کو شوہر کی دیت میں سے حصہ دار بنانے لگے، چنانچہ اب تمام فقہاء کرام کا اسپر اتفاق ہے کہ دیت میں مقتول کے تمام وارث حقدار ہوتے ہیں خواہ رشتہ دار مرد ہوں یا خواتین، لہذا اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مقتول شوہر کی بیوی دیت میں دیگر رشتہ داروں کیطرح وارث ہوگی، اگر اولاد نہ ہو تو چوتھا حصہ اور اولاد ہو تو آٹھواں حصہ اسے ملے گا۔

عاقلہ میں کون سے لوگ داخل ہیں

مسئلہ یہ ہے کہ قتل خطأ اور قتل شبہ عمد میں دیت عاقلہ پر واجب ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ عاقلہ کون لوگ ہونگے، خاص طور پر ہمارے زمانے میں یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے، جب قبائلی زندگی کا رواج تھا اس وقت تو عاقلہ کا تعین آسان تھا کہ قبیلے کے لوگ آپس میں قریب قریب رہتے تھے، اور ان کے درمیان آپس

میں تعاون وتناصر اور مدد ونصرت کا سلسلہ رہتا تھا، لیکن موجودہ دور میں اور خاص طور پر شہری زندگی میں عاقلہ کس کو قرار دیا جائے،؟

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عاقلہ ہونے کا دارومدار آپس میں مدد ونصرت پر ہے، لہذا جن لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کی مدد کا سلسلہ ہو، وہ اسکی عاقلہ ہے، اور جہاں قبائلی نظام منظّم ہو، اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسکا قبیلہ فلاں ہے تو ایسی صورت میں وہ قبیلہ ہی اسکا عاقلہ ہوگا، اور اگر قبیلہ نہیں ہے، لیکن منظّم برادری ہے تو وہ دیت ادا کرے، اور اگر برادری بھی نہیں ہے تو پھر جیسے آجکل ''ٹریڈ یونین'' ہوتی ہے، اور ان کے درمیان آپس میں مدد ونصرت کا سلسلہ ہوتا ہے، تو وہ اسکی عاقلہ ہو سکتی ہے، اسکی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جو انہوں نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کیا تھا، اس میں ''اہل دیوان'' کو عاقلہ مقرر کیا تھا، اہل دیوان کا مطلب یہ ہے کہ جن کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوں، مثلاً وہ ایک ہی محکمے کے ملازم ہیں، یا مثلاً ایک فوجی یونٹ کے سپاہی ہیں، ان سب کو آپس میں ایک دوسرے کی عاقلہ قرار دیدیا تھا، چاہے قبیلے کے اعتبار سے وہ متحد ہوں یا نہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مدار مدد ونصرت پر ہے، جس گروہ کے درمیان پیشے اور کاروبار وغیرہ کے اعتبار سے باہم تعاون پایا جائیگا، اسکو اسکی عاقلہ کہہ سکتے ہیں، اور اگر اسطرح کا کوئی سلسلہ نہ ہو تو پھر اسکی دیت بیت المال پر واجب ہوگی جبکہ اس میں گنجائش ہو، اس میں گنجائش نہ ہو تو پھر قاتل کے مال میں ہی دیت لازم ہوگی۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب القسامۃ، العاقلۃ من ھم، ۳۷۹/۲

یہ دیت عاقلہ پر اسلئے واجب ہوتی ہے تاکہ وہ اسکو اس قسم کے جرائم کے ارتکاب سے باز رکھے اور اسکی تربیت اسطرح کرے کہ وہ قتل پر آمادہ نہ ہو اور اگر کبھی وہ قتل پر آمادہ ہو جائے تو عاقلہ اسے منع کرے، یہ دیت تین سال میں وصول کی جائیگی، اور ایک سال میں ایک آدمی سے تین درہم سے زیادہ وصول نہیں کیے جائیں گے۔ ھدایۃ، کتاب المعاقل ۶۴۵/۴

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْمِيْرَاثَ لِلْوَرَثَةِ وَالْعَقْلُ عَلَى الْعَصَبَةِ

یہ باب اس بارے میں ہے کہ میراث تو وارثوں کیلئے ہے اور دیت عصبہ پر ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضَى فِي جَنِيْنِ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِي لِحْيَانَ سَقَطَ مَيِّتًا بِغُرَّةٍ عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ، ثُمَّ إِنَّ الْمَرْأَةَ التي قُضِيَ عَلَيْهَا بِغُرَّةٍ تُوُفِّيَتْ، فَقَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ مِيْرَاثَهَا لِبَنِيْهَا وَزَوْجِهَا، وَأَنَّ عَقْلَهَا عَلَى عَصَبَتِهَا.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنولحیان کی عورت کے اس بچے کے بارے میں جو (پیٹ میں) مردہ ہوکر گر گیا تھا، ایک غرہ یعنی ایک غلام یا باندی کا فیصلہ فرمایا، پھر وہ عورت جس پر (یا جس کے لئے) غرہ کا فیصلہ کیا گیا، مر گئی تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسکی میراث اسکے بیٹوں اور شوہر کیلئے ہے، اور اسکی دیت اس کے عصبہ پر لازم ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔جنین: وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں ہو۔ بنی لحیان: (لام کے نیچے زیر) قبیلۂ ہذیل کی شاخ۔ غرۃ: (غین پر پیش، راء پر زبر اور تشدید) ایک غلام یا باندی، اور اب چونکہ غلام باندی کا رواج نہیں ہے، اس لئے اس صورت میں پوری دیت کا بیسواں حصہ یعنی پانچ سو درہم دینے ہونگے۔ عقل: (عین پر زبر اور قاف کے سکون کے ساتھ) دیت۔ قضی علیھا: (ماضی مجہول) جس پر فیصلہ کیا گیا۔

میراث اور دیت کا حکم

اس حدیث میں حضرت حمل بن مالک کی دو بیویوں کا واقعہ ہے، ان میں ایک حاملہ تھی، دوسری نے پتھر...... اس کے پیٹ پر اس قدر زور سے مارا کہ اس کا بچہ پیٹ میں ہی مر کر ساقط ہوگیا، نبی کریم ﷺ نے اس میں "غرہ" کا فیصلہ فرمایا، یعنی غلام یا باندی اس عورت کو دی جائیگی، جس کا بچہ مار دیا گیا تھا، اور یہ غرہ اس مارنے والی عورت کے عصبہ پر واجب ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی پیٹ میں بچہ مار کر گرادے تو اس کے ذمے "غرہ" یعنی ایک غلام یا ایک باندی دینا لازم ہوگا، اور اب چونکہ غلاموں کا رواج نہیں اسلئے اس صورت میں پوری دیت کا بیسواں حصہ یعنی پانچ سو درہم دینے ہونگے۔ پھر وہ زخمی عورت بھی مر گئی، یہ قتل چونکہ قتل خطا یا شبہہ عمد ہے، اس لئے اسکی دیت بھی اس کے رشتہ داروں پر لازم ہوگی، اور وہ دیت مقتول عورت کے ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

إن المرأة التی قضی علیها بالغرة توفیت:

شارحین نے اس عبارت کے دو مطلب بیان کئے ہیں:

(۱)......قاضی عیاض اور امام نووی فرماتے ہیں کہ اس عبارت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ فوت ہونے والی عورت جانیہ یعنی مارنے والی ہے، حالانکہ یہ مراد نہیں، مقصود یہ ہے کہ وہ زخمی عورت مرگئی جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے غرہ کا فیصلہ فرمایا، اس لئے قضی علیھا میں ''علی'' ''لام'' کے معنی میں ہے یعنی قضی لھا، یعنی اس کیلئے فیصلہ کیا گیا۔

البتہ اس صورت میں ضمائر کے مرجع میں انتشار لازم آتا ہے کیونکہ میراثھا لبنیھا وزوجھا وعقلھا میں ضمیر مؤنث کا مرجع مقتولہ ہے اور ''عصبتھا'' کی ضمیر کا مرجع قاتلہ ہے، مطلب یہ ہے کہ مقتولہ کی میراث اس کے وارثوں یعنی شوہر اور اسکی اولاد کیلئے ہے اور اسکی دیت قاتلہ کے عصبہ پر لازم ہے، ''عصبتھا'' میں ضمیر کا مرجع مقتولہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ غرہ اور دیت کا وجوب قاتلہ کے عصبہ پر ہوتا ہے نہ کہ مقتولہ کے عصبہ پر، اس لئے اسکا مرجع ''قاتلہ'' ہی ہے۔ شرح مسلم للنووی ۶۲/۲، تحفۃ الاحوذی ۲۴۴/۶۔

(۲)......بعض حضرات نے ان الفاظ کو اپنے ظاہر پر ہی رکھا ہے، کہ ان المرأۃ التی قضی علیھا بغرۃ سے قاتلہ مراد ہے، اسکی جب وفات ہوگئی تو اسکے عاقلہ نے مطالبہ کیا کہ اسکی وراثت سے ہمیں بھی دیا جائے کیونکہ اسکی طرف سے غرہ اور دیت ہم نے ادا کیا ہے، نبی کریم ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دیت تو عاقلہ پر ہی واجب ہوتی ہے، لیکن قاتلہ کی وراثت اسکے شرعی وارث یعنی شوہر اور اولاد کے لئے ہوگی۔

اس صورت میں میراثھا لبنیھا وزوجھا میں ضمائر کے مرجع میں انتشار بھی لازم نہیں آیا کیوں کہ یہ ضمیریں قاتلہ کی طرف لوٹ رہی ہیں اور نہ ہی ''علیٰ'' کو لام کے معنی میں ماننا پڑتا ہے۔ الکوکب الدری ۱۰۶/۳، تکملۃ فتح الملھم، کتاب القسامۃ، باب دیۃ الجنین ۳۷۸/۲

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يُسْلِمُ عَلٰى يَدِ الرَّجُلِ

یہ باب اس شخص کے حکم کے بارے میں ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَوْهِبٍ. وَقَالَ بَعْضُهُمْ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ تَمِيمٍ

الـدَّارِيِّ قَـالَ: سَـأَلْـتُ رَسُـوْلَ الـلّٰـهِ ﷺ: مَـا السُّنَّةُ فِي الرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الشِّـرْكِ يُسْلِـمُ عَلَى يَدِ رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: هُوَ أَوْلَى النَّاسِ بِمَحْيَاهُ وَمَمَاتِهِ.

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اس مشرک کے بارے میں کیا حکم ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام لایا ہو، (یعنی وہ مسلمان اس نومسلم کا مولی ہوتا ہے یا نہیں؟) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: وہ مسلمان (جس کے ہاتھ پر وہ مشرک اسلام لایا ہے) اسکی زندگی اور موت کے بعد سب سے زیادہ حقدار ہے (یعنی وہ مسلمان اس نو مسلم کا مولی ہوتا ہے)

عَنْ عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَن جَدِّهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ أَوْ أَمَةٍ فَالْوَلَدُ وَلَدُ زِنًا لَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ.

حضرت عمرو اپنے والد شعیب سے اور شعیب اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کرے تو (اسکے نتیجے میں) جو بچہ ہوگا وہ والدالزنا (یعنی حرامی بچہ) کہلائیگا، وہ بچہ نہ کسی کا وارث ہوگا، اور نہ اس کی میراث کسی کو ملے گی۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔ **مـا السنة:** کیا سنت ہے، کیا حکم ہے۔ **یسلم:** اسلام لاتا ہے، اسلام قبول کرتا ہے۔ **علی یدی الرجل:** مسلمان کے ہاتھ پر۔ **ھواولی:** وہ زیادہ حقدار اور لائق ہے۔ **بمحیاہ:** اسکی زندگی میں۔ **عاھر:** زنا کرے۔ **لایورث** (راء پر زبر کے ساتھ): اسکا کوئی وارث نہیں ہوگا۔

حضرت تمیم داری

حضرت تمیم داری ایک جلیل القدر اور مشہور صحابی ہیں، یہ پہلے عیسائی تھے، پھر اللہ نے انہیں ہدایت دی اور سن ۹ ہجری میں اسلام قبول کرلیا، زاہدانہ زندگی اور عبادات میں مشہور تھے، راتوں کو بیدار رہ کر اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کیا کرتے، ایک رکعت میں قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی ایک ہی آیت پڑھتے پڑھتے

صبح کردیتے، اتفاق سے ایک رات تہجد کی نماز نہ پڑھ سکے تو اپنے نفس کو اسطرح سزادی کہ پورے ایک برس تک نہیں سوئے، مدینہ میں رہتے تھے، لیکن جب حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو پھر وفات تک شام میں رہے، حضرت تمیم داری کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ روشن کیا۔

عقد موالات کا حکم

ابتداء میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیتا، تو اس سے یہ عہد بھی کرلیا جاتا تھا کہ تم میرے کفیل ہو، میری وفات کے بعد تم میرے مال کے حقدار ہو، اگر میں نے کوئی جرم کردیا جس کی وجہ سے مجھ پر دیت واجب ہو جائے تو وہ بھی تم نے ادا کرنی ہے، یہ ''عقد موالات'' کہلاتا ہے، نبی کریم ﷺ نے اس عقد کو جاری رکھا، اور ایسا عقد کرنے والوں کو ایک دوسرے کا وارث قرار دیا۔

عقد موالات کا حکم اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے، اس میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

جمہور علماء کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں یہی حکم تھا کہ عقد موالات کرنے والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، کیونکہ ایک دوسری روایت میں ہے: الولاء لمن اعتق، کہ ولاء صرف اس صورت میں ملتی ہے جب کوئی شخص کسی کو آزاد کرے، اس کے علاوہ جو مال ہوگا وہ بیت المال میں جمع کرادیا جائیگا۔ مرقاۃ ۲۴۸/۶

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے اور ساتھ ہی عقد موالات بھی کرتا ہے، تو حدیث باب کی رو سے یہ اب بھی جائز ہے، بشرطیکہ مرنے والے کا کوئی رشتہ دار نہ ہو۔ بذل المجھود، کتاب الفرائض ۲۰۲/۱۳۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ ''وہ سب سے زیادہ حقدار ہے'' کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کرنے والے پر یہ حق سب سے زیادہ ہے کہ وہ اس نو مسلم کی زندگی میں تو امداد و خیر خواہی کرے اور اس کے مرنے کے بعد اسکی نماز جنازہ پڑھے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۴۶/۶

ولد الزنا کا حکم

زنا کی وجہ سے جو بچہ پیدا ہو وہ نہ تو زنا کرنے والے کا وارث ہوتا ہے، اور نہ اس کے کسی رشتہ دار کی میراث اسے ملتی ہے، کیونکہ وراثت نسب کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے، جبکہ ولد الزنا اور زنا کرنے والے کے درمیان نسب کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح زانی اور اس کے رشتہ دار اس بچے کی میراث نہیں پاسکتے، البتہ ولد الزنا کی ماں اسکی وارث ہوتی ہے، اور ایسے ہی وہ اپنی ماں کی میراث کا مستحق ہوتا ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۳۹۔

بَابُ مَنْ يَرِثُ الْوَلَاءَ

یہ باب اس شخص کے بارے میں ہے جو ولاء کا وارث ہوتا ہے

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَرِثُ الْوَلَاءَ مَنْ يَرِثُ الْمَالَ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مال کا وارث ہوتا ہے وہ ولاء کا بھی وارث ہوتا ہے۔

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الْمَرْأَةُ تَحُوْزُ ثَلَاثَةَ مَوَارِيْثَ: عَتِيْقَهَا وَلَقِيْطَهَا وَوَلَدَهَا الَّذِيْ لَاعَنَتْ عَنْهُ.

حضرت واثلہ بن اسقع کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عورت تین قسم کی میراث ایک ساتھ جمع کرسکتی ہے، اپنے آزاد کردہ غلام کی میراث، اپنے لقیط یعنی راستہ سے اٹھائے ہوئے بچے کی میراث، اور اپنے اس بچے کی میراث جسکی وجہ سے اس نے لعان کیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔ولاء: (واؤ پر زبر کے ساتھ) آزاد شدہ غلام کا مال۔ تحوز: عورت جمع کرسکتی ہے۔ مواریث: میراث کی جمع ہے، ترکہ، متروکہ مال۔ عتیق: آزاد کردہ۔ لقیط: راستے سے اٹھایا ہوا بچہ۔ لاعنت عنہ: جس بچے کی وجہ سے اس عورت نے لعان کیا۔

ولاء کی وراثت کا مسئلہ

باب کی پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا آزاد کردہ غلام مرجائے اور اس کا کوئی رشتہ دار ذوی الفروض اور عصبہ میں سے نہ ہو تو پھر آزاد کرنیوالا اسکا عصبہ بنفسہ ہوگا، اور وہی اسکا وارث ہوگا، اور اگر آزاد کنندہ مرجائے تو اس کے ورثہ اس ولاء کے وارث ہونگے، لیکن ان وارثوں کا عصبہ بنفسہ اور مرد ہونا ضروری ہے، خاتون رشتہ دار کو یہ ولاء نہیں ملے گا، کیونکہ عورتیں عصبہ بنفسہ نہیں ہوتیں، ہاں عورت ایسے آزاد شدہ غلام کے مال کی وارث ہوتی ہے جسے اس نے خود آزاد کیا ہو، یا اس کے آزاد کردہ غلام نے آزاد کیا ہو، کسی رشتہ دار کے آزاد کردہ غلام کی میراث وہ نہیں پاسکتی، چنانچہ اگر باپ کا آزاد کردہ یا آزاد کردہ کا آزاد کردہ مرجائے تو اسکا بیٹا اس ولاء کا وارث ہوگا۔ مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۴۸۔

عورت تین آدمیوں کی میراث پاتی ہے

باب کی دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عورت تین طرح کی میراث ایک ساتھ پاسکتی ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)...... ''اپنے آزاد کردہ غلام کی میراث'' یعنی اگر عورت اپنے غلام کو آزاد کرے اور پھر وہ اس حالت میں مرا کہ اسکا کوئی عصبہ بنفسہ رشتہ دار نہیں تھا تو ایسی صورت میں مرد کیطرح آزاد کرنے والی یہ عورت اس کے ولاء کی وارث ہوگی۔

(۲)...... اگر کوئی عورت راستے سے کسی بچے کو اٹھا کر پرورش کرے، اسکی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرے تو اسکی موت کے بعد یہ عورت اسکی وارث ہوگی، حضرت اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے، لیکن جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ جو عورت کسی بچے کو اٹھالے اور اسے پالے پوسے تو وہ اسکی وارث نہیں ہوگی، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے لا ولاء الا ولاء العتاقۃ (ولاء صرف آزاد کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے) کے ذریعہ ''ولاء'' صرف آزاد کرنے والے کیلئے مختص کی ہے، لقیط کو اٹھانے والے کیلئے ''ولاء'' کا نہیں فرمایا کیونکہ لقیط آزاد ہوتا ہے، اور آزاد کی کوئی ولاء نہیں ہوتی، چنانچہ ان حضرات کے نزدیک حدیث باب کا یہ جزء منسوخ ہے۔

البتہ قاضی عیاض نے اسکا ایک مطلب بیان کیا ہے، اسکی رو سے اسے منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ لقیط کا چھوڑا ہوا مال واسباب بیت المال کا حق ہے، لیکن جس عورت نے لقیط کو اٹھایا اور اسکی پرورش کی، وہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں اس مال کی زیادہ حقدار ہے جو اس لقیط نے چھوڑا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ وہ مال اس عورت پر صرف کیا جائے۔

(۳)...... جس بچے کے نسب کا شوہر انکار کردے اور اسپر لعان کرے تو اس کا نسب باپ سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ وہ بچہ اور باپ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، کیونکہ وراثت کا تعلق نسب سے ہوتا ہے، جو یہاں ثابت نہیں، البتہ اس بچے کا نسب چونکہ ماں سے ثابت ہوتا ہے اسلئے وہ بچہ اور ماں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح ۲۳۸/۶، تحفۃ الاحوذی ۲۴۹/۶، الکوکب الدری ۱۰۹/۳

فرغت من شرح ابواب الفرائض فی شهر محرم الحرام ١٤٢٧ھ لیلۃ السبت، المطابق ٢٤ من فبرائر ۲۰۰۶ء

فلله الحمد والشكر، والله اسئال ان یوفقنی لشرح باقی الابواب بمنه وفضله۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابواب الوصایا عن رسول اللہ ﷺ

نبی کریم ﷺ سے وصیتوں سے متعلق احادیث پر مشتمل ابواب

بابُ مَا جاءَ فِي الوَصِيَّةِ بِا لثُّلُثِ

یہ باب تہائی مال میں وصیت کے بارے میں ہے

عَنْ عَامِرِ بنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عن أَبِيهِ قال: مَرِضْتُ عَامَ الفَتْحِ مَرَضاً أَشْفَيْتُ مِنْهُ على المَوْتِ، فَأَتَانِي رسولُ اللهِ ﷺ يَعُودُنِي، فَقُلْتُ: يَا رسولَ اللّٰهِ إنَّ لِي مَالًا كَثِيراً وَلَيْسَ يَرِثُنِي إلَّا ابْنَتِي فَأُوصِي بِمَالِي كُلِّهِ؟ قَالَ: لَا، قُلْتُ فَثُلُثَيْ مَالِي؟ قَالَ لَا، قُلْتُ فَالشَّطْرُ؟ قَالَ: لَا، قُلْتُ: فَالثُّلُثُ؟ قالَ: الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ إنَّكَ أنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خيرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ، إنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً إلَّا أُجِرْتَ فِيهَا، حَتَّى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا إلَى فِي امْرَأَتِكَ. قالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أُخَلَّفُ عن هِجْرَتِي؟ قالَ: إنَّكَ لَنْ تُخَلَّفَ بَعْدِي فَتَعْمَلَ عَمَلاً تُرِيدُ بِهِ وَجْهَ اللّٰهِ إلَّا ازْدَدْتَ بِهِ رِفْعَةً، وَدَرَجَةً، وَلَعَلَّكَ إنْ تُخَلَّفْ حَتَّى يَنْتَفِعَ بِكَ أقوامٌ ويُضَرَّ بِكَ آخَرُونَ، اللّٰهُمَّ امْضِ لِأَصْحَابِي هِجْرَتَهُمْ وَلَا تَرُدَّهُمْ على أعقَابِهِمْ لكِنَّ البَائِسَ سَعدُ ابنُ خَوْلَةَ؛ يَرْثِي لَهُ رَسولُ اللهِ ﷺ أنْ مَاتَ بِمَكَّةَ.

حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال اتنا سخت بیمار ہوا کہ موت کے کنارے پر پہنچ گیا، چنانچہ رسول کریم ﷺ میری عیادت کیلئے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول: بیشک میرے پاس بہت مال ہے اور میرا (اصحاب فروض

میں سے) بیٹی کے علاوہ اور کوئی وارث بھی نہیں تو کیا میں سارے مال (کے صدقہ کرنے) کی وصیت کر جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، پھر میں نے عرض کیا کہ کیا دو تہائی مال کے بارے میں وصیت کردوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، پھر میں نے عرض کیا کہ کیا آدھے مال کی وصیت کردوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، پھر میں نے عرض کیا کہ کیا تہائی مال کے بارے میں وصیت کردوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتے ہو، اور تہائی بھی بہت ہے، (اور یاد رکھو) بے شک (اگر) تم اپنے وارثوں کو مالدار و خوشحال چھوڑو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو تنگدست چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں، یقینی بات ہے کہ تم اپنے مال کا جو بھی حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے جذبے سے خرچ کرو گے تو تمہیں اسپر اجر و ثواب ملے گا، یہاں تک کہ تمہیں اس لقمے کا بھی ثواب ملیگا جو تم اپنی بیوی کے منہ تک لے جاؤ گے، سعد کہتے ہیں: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا میں اپنی ہجرت (کے ثواب) سے پیچھے چھوڑ دیا جاؤں گا (یعنی میری ہجرت قبول نہیں ہوگی اگر میری وفات مدینہ کے بجائے مرض کیوجہ سے مکہ مکرمہ میں ہوگئی تو)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک تم میرے بعد زندہ نہیں رہو گے کہ ایسا کوئی عمل کرو جس سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہو مگر یہ کہ تم اس عمل کے ذریعہ بلندی اور درجے کو بڑھاؤ گے، اور ایسا لگتا ہے کہ تم میرے بعد زندہ رہو گے یہاں تک کہ کچھ قومیں تم سے فائدہ اٹھائیں گی، اور کچھ دوسرے لوگوں کو تمہارے ذریعہ نقصان پہونچے گا، (پھر آپ ﷺ دعا کرنے لگے) اے اللہ: میرے صحابہ کی ہجرت کو پایہ تکمیل تک پہونچادے، اور ان کو ایڑیوں کے بل نہ لوٹا، لیکن سعد بن خولہ خستہ حال ہیں، حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ان پر ترس کھاتے تھے کہ ان کی وفات (ہجرت کے بعد مدینہ کے بجائے) مکہ مکرمہ میں ہوگئی۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ حَدَّثَهُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قال: إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةَ بِطَاعَةِ اللهِ سِتِّينَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمُ الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَيَجِبُ لَهُمَا النَّارُ ثُمَّ قَرَأَ عَلَيَّ أَبُو هُرَيْرَةَ: ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ

دَیْنٍ غَیْرَ مُضَارٍّ وَصِیَّةً مِنَ اللّٰہِ﴾ .إلٰی قَوْلِہٖ. ﴿ذلک الفَوْزُ العَظِیْمُ﴾

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے شہر بن حوشب کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک مرد و عورت ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، مگر (جب) ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وصیت کے ذریعہ وہ (وارثوں کو) نقصان پہونچاتے ہیں، جسکی وجہ سے ان کیلئے دوزخ لازم ہوجاتی ہے، (شہر بن حوشب کہتے ہیں کہ) پھر حضرت ابو ہریرہ نے میرے سامنے یہ آیت پڑھی ''من بعد وصیة یوصی بھا او دین غیر مضار ''(یعنی وارث اپنا اپنا حصہ لیں) وصیت پوری کرنے کے بعد جسکی وصیت کی جائے یا قرض کے بعد بشرطیکہ (وصیت کرنے والا) کسی کو ضرر نہ پہونچائے'' حضرت ابو ہریرہ نے یہ آیت وذلک الفوز العظیم (اور بڑی کامیابی ہے) تک تلاوت کی۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ وصایا: ''وصیۃ'' کی جمع ہے، وہ خاص عہد جس پر عمل در آمد وصیت کرنے والے کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ اشفیت منہ: میں مرض کی وجہ سے (موت کے) قریب ہوگیا، کنارے پہونچ گیا۔ ولیس یرثنی: میرا (اصحاب فروض میں سے) کوئی وارث نہیں۔ فأوصی: کیا میں (سارا مال صدقہ کرنے کی) وصیت کردوں۔ شطر: (شین پر زبر اور طاء کے سکون کے ساتھ) نصف، ترکیبی اعتبار سے اسپر تینوں اعراب آسکتے ہیں، ''پیش'' اس وجہ سے کہ یہ مبتدا ہے اور اسکی خبر محذوف ہے یعنی الشطر کافٍ کیا نصف مال صدقہ کرنے کی وصیت کردینا کافی ہے؟ ''زیر'' اسلئے کہ اسکا عطف ''مالی'' پر، اور ''زبر'' اس وجہ سے کہ اسکا عطف ''بمالی'' پر کیا جائے۔ قال: الثلث، آپ نے فرمایا: ہاں تہائی مال کی وصیت کرسکتے ہو، اس میں ''الثلث'' پر ترکیبی لحاظ سے نصب اور رفع دونوں اعراب پڑھ سکتے ہیں، نصب مفعول بہ ہونے کی وجہ سے یعنی اعط الثلث تم تہائی مال کی وصیت کردو، اور رفع اس وجہ سے کہ یہ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت ہوگی: الثلث کافٍ، یا فعل محذوف کا فاعل ہونیکی وجہ سے مرفوع ہے یعنی یکفیک الثلث، تہائی مال کی وصیت تمہارے لئے کافی ہے۔ تذر: تو چھوڑ دے۔

انک ان تذر: اس میں ''ان'' حرف شرط اور حرف ناصب دونوں ہوسکتا ہے، اگر اسے حرف شرط

قرار دیا جائے تو تذر شرط ہونے کی وجہ سے حالت جزم میں ہوگا، اور اسکی جزاء تقدیر عبارت کے بعد یوں ہوگی **فھو خیر من ان تذرھم** ، اور اگر ان مصدریہ ہو تو پھر "تذر" منصوب ہوگا، یہ صورت بہتر ہے، کیونکہ اس صورت میں محذوف عبارت نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اور تقدیر عبارت سے احتراز بہرحال بہتر ہے۔ **عالة**: عائل کی جمع ہے محتاج وفقیر، کثیر العیال۔ **یتکففون**: مانگنے کیلئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ **اخلف عن ھجرتی**: (اخلف، ہمزے پر پیش اور لام پر زبر کے ساتھ، مضارع مجہول کا صیغہ ہے) کیا مجھے ہجرت کے ثواب سے پیچھے چھوڑ دیا جائیگا (یعنی اگر میری وفات ہجرت کے بعد مدینہ کے بجائے مکہ میں مرض کیوجہ سے ہوگئی تو کیا میری ہجرت قبول نہیں ہوگی؟)۔ **أجرت**: (ہمزے پر پیش اور جیم کے نیچے زیر) ماضی مجہول کا صیغہ ہے: تجھے اجر وثواب دیا جائیگا۔ **أمض**: باب افعال کا صیغہ امر ہے: تو مکمل کردے، پایہ تکمیل تک پہونچادے۔ **ولا تردھم علی اعقابھم**: اور تو ان کو ایڑیوں کے بل نہ لوٹا، یعنی ان کی ہجرت کے ثواب میں کوئی کمی نہ کر۔ **لعلک**: شاید کہ آپ، ایسا لگتا ہے کہ آپ، "لعل" اگرچہ عموما امید کے معنی میں ہوتا ہے لیکن جب اس کا قائل اللہ تعالیٰ ہو یا رسول کریم ﷺ تو پھر یہ "یقین" اور امر واقع کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں یہی مراد ہے۔ **بائس**: قابل رحم، خستہ حال، ضرر والا۔ **یرثی له**: آپ ﷺ سعد بن خولہ پر رحم اور ترس کھاتے تھے۔ **یضاران**: وہ دونوں ضرر اور نقصان پہونچاتے ہیں۔

وصیت کا جواز ایک تہائی مال تک

حدیث باب سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وصیت کرنا چاہے تو وہ ایک تہائی مال تک کرسکتا ہے، اس سے زیادہ کی درست نہیں کیونکہ اس میں وارثوں کی حق تلفی لازم آتی ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص سارا مال فقراء اور مساکین کو صدقہ کرنے کی وصیت کرنا چاہتے تھے، اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے صرف ایک تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت دی اور فرمایا کہ تہائی بھی بہت ہے، اس لئے وصیت ایک تہائی کے اندر ہی ہونی چاہیے، اور اگر وارث تنگدست اور غریب ہوں تو پھر وصیت نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا بالاتفاق ناجائز ہے، ہاں اگر کوئی تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنا چاہے اور وارث اسکی اجازت بھی دیں تو پھر یہ وصیت نافذ ہوگی بشرطیکہ وارثوں میں کوئی پاگل اور نابالغ نہ ہو، لیکن اگر

وصیت کرنے والے کا کوئی وارث نہ ہو نہ ذوی الفروض اور عصبات میں سے اور نہ ذوی الارحام میں سے، تو پھر اسکی وصیت علی الاطلاق جائز ہے اگر چہ وہ تہائی سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو، البتہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک ایسی صورت میں بھی تہائی سے زیادہ کی وصیت نافذ نہیں ہوگی بلکہ تہائی مال تک وصیت نافذ کرنے کے بعد بقیہ مال بیت المال میں جمع کرادیا جائیگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسی روایات منقول ہیں جن میں وارث نہ ہونے کی صورت میں تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب وارث نہ ہوں تو تہائی سے زیادہ کی بھی وصیت کی جاسکتی ہے، اور حدیث باب میں گو کہ تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ کرنے کا ذکر ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب وصیت کرنے والے کے وارث موجود ہوں، اور جس کا کوئی وارث نہ ہو، آیا اسکی وصیت تہائی سے زیادہ میں نافذ نہیں ہوگی؟ اس کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے، لہذا حدیث باب سے یہ استدلال کرنا کہ تہائی سے زیادہ کی وصیت علی الاطلاق ناجائز اور باطل ہے، درست نہیں ہے۔ تکملۃ فتح الملہم ۲/۱۰۰۔۱۰۳۔

حضرت سعد کا یہ واقعہ کب پیش آیا، حجۃ الوداع میں یا فتح مکہ کے موقع پر، جمہور کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیش آیا، صرف ابن عیینہ کی روایت میں فتح مکہ کا ذکر ہے، جسے محدثین نے ان کا ''وہم'' قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت سعد کی بیماری کا واقعہ دومرتبہ پیش آیا ہو، ایک مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر اور دوسری بار حجۃ الوداع کے زمانے میں، پہلی مرتبہ حضرت سعد کا کوئی وارث نہیں تھا، اور حجۃ الوداع کے موقع پر ان کی لڑکی وارث تھی، اسطرح دونوں طرح کی روایات میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ فتح الباری، کتاب الوصایا ۵/۴۵۷۔

''ولیس یرثنی الا ابنتی'' اس جملے کے ظاہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد کا کوئی وارث نہیں تھا حالانکہ بیٹی کے علاوہ اور عصبہ رشتہ داران کے موجود تھے، اس لئے شارحین حدیث نے اس کے مختلف معنی بیان کئے ہیں:

(۱)...... معنی یہ ہیں کہ اصحاب فروض میں سے میرا کوئی وارث نہیں۔

(۲)...... خاص وارث، یا لڑکا یا عورتوں میں سے لڑکی کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں۔

(۳)...... یا اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا بیٹی کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، اور بیٹی کو بھی مال کی ضرورت نہیں کیونکہ شرعاً اس کا خرچ اس کے شوہر پر ہے، تو ایسی صورت میں کیا میں سارے مال کی وصیت کردوں؟

(۴)...... بعض نے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں کہ میرے وارثوں میں ایسا وارث جس کے بارے میں مجھے فقر کا اندیشہ ہے وہ صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ فتح الباری ۵/۴۶۲، الکوکب الدری ۳/۱۱۰

والثلث کثیر (تہائی بہت ہے) اس کے تین معنیٰ بیان کیے گئے ہیں:

(۱)...... وصیت کا انتہائی درجہ تہائی ہے، اس سے زائد درست نہیں، اور اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ تہائی سے بھی کم میں وصیت کی جائے۔

(۲)...... یا معنیٰ یہ ہیں کہ تہائی مال کی وصیت یا اسے صدقہ کرنا کامل ترین درجہ ہے، جس کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے۔

(۳)...... تہائی بھی کثیر ہے قلیل نہیں ہے،

شافعیہ نے تیسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، جبکہ حنفیہ کے نزدیک پہلا معنیٰ راجح ہے۔ فتح الباری ۵/۴۶۰، تکملۃ فتح الملھم ۲/۱۰۲۔

یا رسول اللہ أخلف عن ھجرتی (اے اللہ کے رسول! کیا میں ہجرت کے ثواب کامل) سے پیچھے چھوڑ دیا جاؤں گا؟ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ صحابہ کرام مدینہ منورہ ہجرت کے بعد کسی اور جگہ رہائش اور وفات کو پسند نہیں کرتے تھے، اسے ہجرت کے ثواب میں نقص اور کمی شمار کرتے تھے، حضرت سعد سفر حج میں چونکہ مکہ مکرمہ میں شدید بیمار ہو گئے تھے، اس لئے پوچھنے لگے کہ کیا میں آپکی معیت میں مہاجرین کے ساتھ مدینہ منورہ نہیں جاؤں گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہیں وفات ہو جائے، یوں میری ہجرت میں نقص واقع ہو جائیگا، نبی کریم ﷺ نے انہیں تسلی دی کہ اگر تم مرض کی وجہ سے مدینہ منورہ نہ جاسکو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم اس کے بعد جو بھی نیک عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرو گے اس سے تمہارے درجات بلند ہونگے، اور آپ کے زعم کے مطابق ہجرت کے ثواب میں جو کمی واقع ہوگی وہ یوں پوری ہو جائیگی۔

حتی ینتفع بک اقوام ویضر بک الاخرون نبی کریم ﷺ نے انہیں پیشین گوئی دی کہ تم

میرے بعد زندہ رہو گے، کچھ لوگوں کو تم سے فائدہ جبکہ بعض دوسروں کو نقصان ہوگا، نفع مسلمانوں کو ہوگا کہ تمہارے ذریعہ کفار ومشرکین کے علاقے عراق وغیرہ فتح ہونگے، غنیمتیں حاصل ہونگی، اور کافروں کو تمہاری وجہ سے ضرر پہونچے گا، وہ مسلمانوں کے سرنگوں اور ماتحت ہوجائیں گے اور ان کی سرزمین پر اہل اسلام کا تسلط ہو جائیگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا ان کے ذریعہ عراق وغیرہ فتح ہوئے، بہت سے لوگوں کو اسطرح بھی فائدہ ہوا کہ وہ پہلے مرتد ہوگئے تھے، انہوں نے اپنے ارتداد سے توبہ کی اور راہ راست پر آگئے، اور جو ارتداد سے باز نہ آئے، انہیں قتل کردیا، انہیں گویا حضرت سعد کے ذریعہ ضرر پہونچا، حاصل یہ کہ "نفع" میں وہ تمام فوائد داخل ہیں جو سعد کے ذریعہ مسلمانوں کو پہونچے اور "ضرر" میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جن کی وجہ سے کافر مشرکین اور مرتد لوگوں کو ضرر لاحق ہوا۔ فتح الباری ۵/۴۶۲، تکملۃ فتح الملہم ۲/۱۰۶۔

اللهم أمض......... نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کیلئے دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ ان کی ہجرت کو پایہ تکمیل تک پہونچادے اور ان کے اجر وثواب میں کمی نہ فرما۔

ولكن البائس سعد بن خولة، خستہ حال اور ضرر والا تو سعد بن خولہ ہے، کیونکہ ان کی وفات مدینہ کے بجائے مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے، انہوں نے ہجرت کی تھی یا نہیں، اس میں دو قول ہیں:

(۱)......عیسی بن دینار کہتے ہیں کہ سعد بن خولہ نے ہجرت نہیں کی تھی، مکہ میں ہی رہے، اور یہیں ان کی وفات ہوئی، اس لحاظ سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بطور مذمت کے ہوگا۔

(۲)......اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ سعد بن خولہ نے مدینہ منورہ کیطرف ہجرت کی تھی، غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے، مگر پھر مکہ مکرمہ واپس چلے گئے تھے اور پھر وہیں پر فوت ہوئے، اس اعتبار سے یہ جملہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے بطور رحم کے ہوگا، کہ آپ ﷺ ان پر ترس کھا رہے ہیں کہ ان کی وفات مدینہ کے بجائے مکہ میں ہوئی ہے، اور ان کے خیال کے مطابق ان کی وفات مدینہ میں نہ ہوسکی۔

تحفۃ الاحوذی ۶/۲۵۳، تکملۃ فتح الملہم ۲/۱۰۷۔

يرثى له رسول الله ﷺ ان مات بمكة

اس جملے کے قائل کے بارے میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اسکے قائل حضرت سعد بن ابی

وقاص ہی ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ امام زہری ہیں۔

تکملۃ فتح الملہم ۲/۱۰۸، فتح الباری ۵/۴۵۹۔

وارثوں کو نقصان پہونچانا جائز نہیں

باب کی دوسری حدیث سے حقوق العباد کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، کہ جو لوگ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذار دیتے ہیں، لیکن بندوں اور رشتہ داروں کے حقوق کا لحاظ نہیں کرتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو جاتے ہیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ خواہ وہ مرد ہوں یا خواتین، ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں مگر زندگی کے آخری لمحات میں غیر شرعی طریقے سے ایسی کوئی وصیت کر جاتے ہیں، جس سے ان کے وارثوں کو ضرر و نقصان پہونچتا ہے، تو وہ اسطرح طویل عرصہ عبادت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب اور جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس حق تلفی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی اور اسکی مقرر کردہ ہدایات سے تجاوز لازم آتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بطور تائید کے مذکورہ بالا آیت پڑھی، کیونکہ اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کر کے اپنے وارثوں کو ضرر پہونچانا جائز نہیں ہے۔

وصیت میں ضرر پہونچانے کے معنی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کے بارے میں ”غیر مضار“ کا لفظ استعمال فرمایا، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسی وصیت کی جائے جس میں وارثوں کا نقصان نہ ہو، اس نقصان کی مختلف صورتیں ہیں، تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کی جائے، کسی ایک وارث کیلئے سارے مال کی وصیت کر جائے، تمام مال ایک ہی وارث کو ہبہ کردے اور دیگر وارثوں کو محروم کر دیا جائے، وصیت کر کے پھر اس سے انکاری ہو جائے، اور ایسے لوگوں کیلئے وصیت کی جائے جو اس کے اہل نہ ہوں، یہ تمام صورتیں ایسی ہیں جن میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرلیا جائے تو آدمی جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، اور اسکی ساری زندگی کے اعمال صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں، اس لئے اسطرح کی وصیت سے احتراز کرنا شرعاً انتہائی ضروری ہے، تا کہ اس وعید سے بچا جا سکے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۵۴۔

احادیث باب سے چند امور کا ثبوت

اس باب کی احادیث سے مندرجہ ذیل امور اور نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں:

(۱)......رشتہ داروں سے حسن سلوک کیا جائے، اور دوسروں پر خرچ کرنے کے مقابلے میں اپنے اقرباء پر خرچ کرنا بہتر ہے۔

(۲)......اہل وعیال پر خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی نیت کی جائے۔

(۳)......امر مباح میں اللہ کی رضا کی نیت کی جائے تو وہ بھی عبادت بن جاتا ہے، چنانچہ بیوی کے منہ میں اگر ثواب کے ارادے سے لقمہ ڈالا جائے تو اس میں بھی ثواب ملتا ہے۔

(۴)......وارثوں کو وراثت سے محروم کرنا جائز نہیں۔

(۵)......ایسی وصیت کرنا جس سے رشتہ داروں کو نقصان ہو، جائز نہیں۔

(۶)......میت پر افسوس اور غم واندوہ کا اظہار کرنا جائز ہے جبکہ شرعی حدود کے اندر ہو، زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق نوحہ کرنا، اور گریبان وغیرہ پھاڑنا جائز نہیں ہے۔

بابُ ما جاءَ فِي الحثّ عَلَى الوَصِيَّةِ

یہ باب وصیت پر ابھارنے کے بارے میں ہے

عن ابنِ عُمَرَ قال: قالَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ: ما حَقُّ امرِئٍ مُسْلِمٍ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ وَلَهُ مَا يُوصِي فِيهِ إلاَّ وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ.

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان مرد کو یہ حق نہیں کہ وہ دو راتیں گذارے جبکہ اس کے پاس قابل وصیت کوئی چیز ہو مگر یہ کہ اسکی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:۔ما: لیس کے معنیٰ میں ہے۔یبیت لیلتین "امرئ" کی دوسری صفت ہے اور "وله مـا یوصی فیه" جملہ حالیہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اس شخص کے پاس ایسی چیز موجود ہے جسکی وہ وصیت کرسکتا ہے، اور یبیت سے پہلے "أن" مقدر ہے، عبارت ہے أن یبیت، اور یہ "حق امرئ" کی خبر ہے۔ مرقاة المفاتیح ۶/۲۵۱

وصیت کا حکم

حدیثِ باب میں وصیت کی ترغیب دی گئی ہے کہ جس آدمی کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس میں وصیت کی جاسکتی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ضرور وصیت کرے، وصیت کے بغیر دو راتیں بھی اسپر نہ گذرنے پائیں، دو راتوں سے مراد "قلیل عرصہ" ہے، یعنی تھوڑا عرصہ بھی وصیت کے بغیر نہیں گذرنا چاہیے، کیونکہ انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، نہ معلوم کس لحہ زندگی کا سلسلہ ختم ہو جائے، ایسے میں اگر وصیت لکھی ہوئی نہ ہوئی تو لوگوں کے حقوق پامال ہوسکتے ہیں۔

جمہور علماء کرام کے نزدیک غیر وارث رشتہ دار کیلئے وصیت کرنا مستحب ہے، ضروری نہیں، جبکہ داؤد ظاہری، اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان رشتہ داروں کیلئے وصیت کرنا واجب ہے جو شرعا وارث نہ ہوں، ان کا استدلال مندرجہ ذیل امور سے ہے:

(۱)...... كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ (تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو والدین اور دیگر اقارب کیلئے معقول طور پر کچھ کچھ بتلا جاوے یعنی وصیت کر جائے) سورۃ بقرہ آیت ۱۸۰

(۲)...... دوسرا استدلال حدیث باب سے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وصیت لکھے بغیر دو راتیں بھی اسپر گزریں۔

(۳)...... حدیث میں لفظ "حق" وجوب کے معنی میں ہے۔

جمہور یہ کہتے ہیں کہ میراث کے احکام نازل ہونے سے پہلے وصیت واجب تھی، پھر جب آیتِ میراث یعنی للرجال نصیب مما ترک الوالدان و الاقربون ...... نازل ہوئی تو پھر یہ آیت منسوخ ہوگئی، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت وصیت میں والدین کیلئے وصیت کا ذکر ہے، حالانکہ والدین کیلئے بالاجماع وصیت جائز نہیں، کیونکہ یہ دونوں وارث ہیں، اور وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں، ان کیلئے وصیت کرنے کی اجازت ایک تہائی مال تک ہے۔

اور حدیثِ باب کے بارے میں جمہور یہ کہتے ہیں کہ اس سے وصیت کا وجوب ثابت نہیں

ہوتا، کیونکہ صحیح مسلم کے طریق میں الفاظ اسطرح ہیں: له شيء يريد ان يوصي فيه" (اس کے پاس ایسی چیز ہو جس میں وصیت کرنیکا ارادہ ہو) اس میں وصیت کو ارادے کے ساتھ مقید کیا ہے، یعنی اگر وصیت کرنیکا ارادہ ہو، اگر وصیت کا حکم وجوبی ہوتا تو پھر اسے ارادے کے ساتھ مقید نہ کیا جاتا، اس لئے حدیث کے ظاہر سے جمہور کے موقف کی ہی تائید ہوتی ہے۔

البتہ اگر کسی پر قرض ہو، یا اس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں، یا اس کے ذمے کچھ ادائیگیاں ہیں جنہیں زندگی میں ادا کرنے پر وہ قادر نہیں یا اس کے پاس مسجد، مدرسہ اور کسی ادارے کے مختلف فنڈ ز ہیں تو ایسی صورت میں سب حضرات کے نزدیک اسپر وصیت کرنا واجب ہے، تا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

"مکتوبة عنده" اس سے استدلال کر کے امام احمد فرماتے ہیں کہ وصیت میں صرف تحریر کافی ہے، اسپر گواہ بنانا شرط نہیں، جبکہ جمہور کے نزدیک قضاءً وصیت کے ثبوت کیلئے شرعی شہادت ضروری ہے، ان کا استدلال قرآن مجید کی آیت "شهادة بينكم اذا حضر احدكم الموت حين الوصية" سے ہے۔

حدیث باب سے اس بات پر استدلال کرنا کہ شہادت شرط نہیں، درست نہیں، کیونکہ اس میں شہادت کے شرط ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں، لہذا حدیث کے معنی یہ ہیں کہ وصیت اپنی معروف شرائط کے مطابق لکھی ہوئی ہونی چاہیے، اور وصیت پر گواہ بنانا بھی ان معروف شرائط میں سے ہے، اس لئے حدیث باب سے جمہور کی تائید ہی ہوتی ہے۔ تکملة فتح الملهم ۲/۹۴-۹۶۔

لفظ "حق" سے وجوب پر استدلال کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ "حق" لغت میں ثابت شدہ شی کو کہا جاتا ہے، اور شریعت میں اس کے معنی ہوتے ہیں "جس سے کوئی حکم ثابت ہو" یہ حکم عام ہے خواہ واجب ہو یا مستحب یا مباح، اور یہاں مستحب ہونیکا قرینہ موجود ہے کہ مسلم کے طریق میں وصیت کو وصیت کرنے والے کے ارادے پر معلق کیا گیا ہے، اگر حق واجب ہوتا تو وصیت کرنے والے کے ارادے کے ساتھ اس کو مقید نہ کیا جاتا۔ اعلاء السنن ۲۹۲/۱۸۔

بابُ مَا جَاءَ أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم لَمْ يُوصِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وصیت نہیں کی۔

عن طَلْحَةَ بنِ مُصَرِّفٍ قَالَ: قُلْتُ لابْنِ أبِي أوْفَى: أوْصَى رَسُولُ اللّهِ ﷺ؟ قَالَ: لا، قُلْتُ: وَكَيْفَ كُتِبَتِ الْوَصِيَّةُ وَكَيْفَ أمَرَ النَّاسَ؟ قال: بِكِتَابِ اللّٰهِ تعالىٰ.

طلحہ بن مصرف کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفی سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ نے وصیت فرمائی؟ انہوں نے کہا: نہیں، میں نے عرض کیا: پھر وصیت کیسے فرض کی گئی اور آپ نے لوگوں کو وصیت کرنیکا حکم کیسے دیا؟ (جبکہ آپ نے خود وصیت نہیں کی) انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے کتاب اللہ (پرعمل کرنے اور اسے مضبوطی سے تھامنے) کی وصیت فرمائی ہے۔

آپ ﷺ نے مال ومتاع کی وصیت نہیں کی

طلحہ بن مصرف کے سوال کا منشأ، مقصد اور سبب کیا تھا، اس میں شارحین حدیث کے دو قول ہیں:

(۱)...... ممکن ہے ان کا مقصد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے مال و متاع اور ساز و سامان کی کسی کیلئے وصیت کی ہے؟ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے فرمایا کہ آپ نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی، آپ کے پاس جو مال ہوتا وہ صدقہ کردیا کرتے تھے۔

(۲)...... یا سوال کا منشأ یہ ہے کہ شیعہ نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ حضور ﷺ نے خلافت علی کی وصیت فرمائی تھی لیکن حضرت صدیق اکبر وغیرہ نے ظلماً انہیں خلافت نہیں دی، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے خلافت علی کی کوئی وصیت نہیں فرمائی، اسکی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ کے پاس حضرت علی کے وصی ہونیکا ذکر کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ انہیں کب وصیت کی گئی ہے۔ گویا انہوں نے اسطرح کی وصیت کی نفی فرمائی ہے۔

اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے سوال کے منشا اور اس موقع کی مناسبت سے مال و متاع اور خلافت علی کی وصیت کی نفی کی ہے، مطلق وصیت جو امور دین سے متعلق ہے، مثلاً صدیق اکبر کو خلیفہ بنانے کی وصیت، جزیرہ عرب سے مشرکین کو نکالنے، نماز اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت و تاکید، آنے والے وفود کو انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کرنے کی وصیت اور حضرت اسامہ کے لشکر کو بھیجنے کی

وصیت.........جن کا ذکر دیگر احادیث میں ہے، اسطرح کی کسی بھی وصیت کی نفی کرنا مقصود نہیں۔

کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت و تاکید

طلحہ بن مصرف نے کہا کہ جب نبی کریم ﷺ نے کوئی وصیت نہیں فرمائی تو پھر امت پر اسے فرض کیسے قرار دیا، یہاں انہوں نے ''کتب'' کا لفظ استعمال کیا جو فرض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، حالانکہ جمہور علماء کرام کے نزدیک عام حالات میں وصیت کرنا محض مستحب ہے، فرض نہیں، ہوسکتا ہے کہ طلحہ بن مصرف کے نزدیک وصیت کا وجوب منسوخ نہ ہو یا انہوں نے تاکید کے طور پر لفظ ''کتب'' استعمال کیا ہے، اس سے ان کی مراد وصیت کا وجوب نہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے امت کو اس بات کی تاکید اور وصیت فرمائی کہ وہ کتاب اللہ پر عمل کریں، اس سے درحقیقت اس حدیث کیطرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامنے کی وصیت فرمائی ہے، کہ اسپر عمل کرنے سے تم راہ راست پر رہو گے اور گمراہی کا شکار نہ ہوسکو گے، اور کتاب اللہ پر عمل چونکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے بغیر ممکن نہیں، اسلئے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت میں سنت پر عمل کرنا بھی داخل ہے، لہذا دینی امور سے متعلق آپکی وہ تمام جزوی وصیتیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، کتاب اللہ میں داخل ہیں، اگرچہ ابن ابی اوفی نے انہیں اس حدیث میں الگ سے ذکر نہیں کیا۔ تکملۃ فتح الملھم ۱۲۸/۲۔ تحفۃ الاحوذی ۲۵۷/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ

یہ باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن میں ہے کہ وارث کیلئے وصیت نہیں ہے

عن أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ ﷺ يقولُ فِي خُطْبَتِهِ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ: إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وتَعَالىٰ قد أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ. الْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ وَحِسَابُهُمْ على اللهِ تعالىٰ، وَمَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ أَوِ انْتَمَى إِلَى غَيْرِ مَوَالِيهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ

التَّابِعَةُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا، قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: وَلَا الطَّعَامَ؟ قَالَ ذَاكَ أَفْضَلُ أَمْوَالِنَا. وَقَالَ: العَارِيَّةُ مُؤَدَّاةٌ، وَالمِنْحَةُ مَرْدُودَةٌ، وَالدَّيْنُ مَقْضِيٌّ، وَالزَّعِيمُ غَارِمٌ.

حضرت ابوامامہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اسکا حق دیدیا ہے، لہذا کسی وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں اور بچہ صاحب فراش کیلئے ہے، اور زانی کیلئے پتھر ہے، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر (موقوف) ہے، اور جو شخص اپنے کو غیر باپ کیطرف منسوب کرے یا جو غلام اپنے کو غیر موالی کی طرف منسوب کرے اسپر اللہ تعالیٰ کی قیامت تک مسلسل لعنت ہو، کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے اسکی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے، اور پوچھا گیا اے اللہ کے رسول: اور کھانا بھی خرچ نہ کرے آپ نے فرمایا: یہ تو ہمارے اموال میں سب سے افضل ہے، اور فرمایا: عاریت (یعنی مانگی ہوئی چیز) واپس کی جائے اور منحہ کو لوٹایا جائے، اور قرض کو ادا کیا جائے اور قرض کا ضامن اسکی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ خَارِجَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَطَبَ عَلَى نَاقَتِهِ وَأَنَا تَحْتَ جِرَانِهَا وَهِيَ تَقْصَعُ بِجِرَّتِهَا، وَإِنَّ لُعَابَهَا يَسِيلُ بَيْنَ كَتِفَيَّ، فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ، وَالْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ.

عمرو بن خارجہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی اونٹنی پر خطبہ دیا، اور میں اسکی گردن کے نیچے تھا، وہ جگالی کر رہی تھی جس سے اسکا لعاب میرے کندھوں کے درمیان بہ رہا تھا، (اس موقع پر) میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اسکا حق دیدیا ہے، لہذا کسی وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں، اور بچہ صاحب فراش کا ہے اور زانی کیلئے پتھر ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: ـ فراش: عورت، یہاں حدیث میں اس سے "صاحب فراش" مراد ہے۔ عاھر: زنا کرنے والا۔ ادعی: اپنا نسب منسوب کیا۔ انتمی: منسوب ہونا۔ العارية: استعمال کیلئے مانگی ہوئی

چیز۔مؤداة:ادا کیا جائے، واپس کیا جائے۔منحة:(میم کے نیچے زیر اورنون کے سکون کے ساتھ)عارضی استعمال کیلئے دودھ والا جانور، پھلدار درخت یا زراعت کیلئے کسی کو زمین دینا۔مقضی:ادا کیا جائے۔زعیم: ضامن، کفیل۔غـــارم:ادائیگی کا ذمہ دار۔جـــران:(جیم کے نیچے زیر)اونٹ وغیرہ کی گردن کا اندرونی حصہ۔جـــرة:(جیم کے نیچے زیر اور راء پر تشدید کے ساتھ)اونٹ کے منہ کا وہ لقمہ جسے وہ چارہ ملنے تک چباتا رہتا ہے، جگالی۔تقصع بجرتها:وہ چارہ کو چبانے کیلئے منہ میں واپس لے جاتی ہے، یعنی جگالی کرتی ہے۔

وارث کیلئے وصیت جائز نہیں

نبی کریمﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں چند احکام ذکر فرمائے، جنکی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)......میراث کے احکام سے پہلے وصیت کرنا واجب تھا، پھر جب آیت میراث نازل ہوگئی اور وارثوں کے حصے متعین کردیئے گئے، تو اب کسی وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں، اور اگر کوئی میت اپنے کسی وارث کیلئے وصیت کردے کہ اسے مثلاً دوسرے وارثوں سے زیادہ حصہ دیا جائے تو شرعاً اس وصیت کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ اگر تمام وارث عاقل اور بالغ ہوں اور خوشدلی سے اس وصیت پر عملدرآمد کرلیں تو یہ جائز ہے، ایسی صورت میں یہ وصیت نافذ ہوگی۔

(۲)......مرد وعورت زنا کرلیں، جس سے بچہ پیدا ہو جائے تو اس بچے کا نسب صاحب فراش یعنی عورت کے مالک سے ثابت ہوگا خواہ اسکا شوہر ہو، یا باندی ہونے کی صورت میں اسکا آقا ہو اور یا وہ شخص ہو جس نے شبہہ کی وجہ سے اس عورت سے جماع کرلیا تھا اور اگر یہ عورت کسی کی بیوی نہ ہو تو پھر یہ بچہ عورت کے پاس ہی رہے گا۔

وللعاهر الحجر، ''حجر'' کے دو معنی ہیں:

☆......''ذلت ورسوائی اور محرومی'' مطلب یہ ہے کہ والد الزنا کا نسب نہ تو زانی سے ثابت ہوگا اور نہ اس کی میراث سے اسے کچھ ملے گا لہذا اس کیلئے ذلت ورسوائی اور محرومی ہی ہے، اکثر محدثین نے اس معنی کو راجح قرار دیا ہے۔

☆......یا اس سے رجم یعنی سنگسار کرنا مراد ہے کہ زنا کرنے والا اگر شادی شدہ ہو تو اسے سنگسار کیا جائیگا۔تکملۃ فتح الملھم ،کتاب الرضاع، باب الولد للفراش ۱؍۷۰۔

وحسابھم علی اللہ، ان کا حساب اللہ پر ہے، یعنی ہم دنیا میں اسپر شرعی حد قائم کریں گے، آخرت میں اس کے ساتھ کیا ہوگا، اس کا علم اللہ ہی کو ہے وہ چاہے تو معاف کردے یا سزا دے۔

بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کسی شخص نے دنیا میں ایسا کوئی سنگین جرم کیا جو قابل حد ہے اور اسپر حد جاری نہیں ہوئی تو اسکا حساب اللہ پر ہے، چاہے تو درگذر کردے اور چاہے تو عذاب میں مبتلا کردے۔

(۳)......جو شخص قصداً اپنا نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کیطرف منسوب کرے، یا وہ غلام جسے اس کے مولیٰ نے آزاد کیا وہ اس آزادی کو دوسرے کیطرف منسوب کرے تو یہ جائز نہیں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت قیامت تک برستی رہے گی۔

(۴)......شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کچھ خرچ نہیں کرسکتی خواہ وہ مال و دولت ہو یا کھانے کی کوئی چیز، اجازت ہو تو خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۵)...... مانگی ہوئی چیز کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر اسکی تعدی اور زیادتی سے ہلاک ہو جائے تو پھر اسکی قیمت ادا کرنی ہوگی، تعدی کے بغیر اگر ہلاک ہو جائے تو پھر اسپر ضمان لازم نہیں۔ ھدایۃ ۲۷۹/۳۔

(۶)......منحہ کو بھی لوٹانا ضروری ہے منحہ سے وہ دودھ والا جانور بکری، اونٹنی اور گائے مراد ہے جو عارضی طور پر استفادے کیلئے کسی کو دیدیا جائے، یا پھلدار درخت استعمال کیلئے دیا جائے یا کچھ عرصے کیلئے زمین کاشتکاری کیلئے کسی کو دیدی جائے، جس قدر مدت آپس کے معاہدے میں طے ہو جائے، اس کے بعد اس منحہ کو، اور اگر وہ ہلاک ہو جائے تو اسکی قیمت دینا ضروری ہے۔

(۷)......قرض کو ادا کرنا شرعاً واجب ہے، ادائیگی پر قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرنا جائز نہیں ہے۔

(۸)......اگر کوئی شخص کسی چیز کی ذمہ داری لے لے تو پھر اسے چاہیے کہ وہ اس ذمہ داری کو نبھائے، اس میں کوتاہی کرنا کفالت کے خلاف ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۶۰/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ يُبْدَأُ بِالدَّيْنِ قَبْلَ الوَصِيَّةِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ وصیت سے پہلے قرض ادا کرنے سے آغاز کیا جائیگا۔

عن عَلِیٍّ: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَضَی بِالدَّینِ قَبْلَ الوَصِیَّةِ وأَنْتُمْ تَقْرَأُ وَنَهَا قَبْلَ الدَّینِ.

حضرت علی سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرض کی ادائیگی کا حکم وصیت سے پہلے فرمایا ہے، حالانکہ تم قرآن مجید میں "وصیت" (کے لفظ) کو "دین" (کے لفظ) سے پہلے تلاوت کرتے ہو۔

قرض کو وصیت سے پہلے ادا کیا جائے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی میت وصیت کر جائے اور اسپر قرض بھی ہوتو وصیت پر عمل سے پہلے قرض ادا کیا جائیگا، اگرچہ قرآن مجید میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہے، اسکی مزید تفصیل ابواب الفرائض باب ما جاء فی میراث الإخوة من الأب والأم کے تحت گذر چکی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی الرَّجُلِ یَتَصَدَّقُ أَوْ یُعْتِقُ عِنْدَ المَوْتِ

یہ باب اس شخص کے حکم کے بارے میں ہے جو موت کے وقت صدقہ کرے یا غلام آزاد کرے۔

عن أَبِی حَبِیبَةَ الطَّائِیِّ قَالَ: أَوصَی إِلَیَّ أَخِی بِطَائِفَةٍ مِنْ مَالِهِ، فَلَقِیتُ أَبَا الدَّرْدَاءِ، فَقُلْتُ: إِنَّ أَخِی أَوْصَی إِلَیَّ بِطَائِفَةٍ مِنْ مَالِهِ فَأَیْنَ تَرَی لِی وَضْعَهُ فِی الفُقَرَاءِ أَو المَسَاکِینِ أَو المُجَاهِدِینَ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَمَّا أَنَا فَلَوْ کُنْتُ، لَمْ أَعْدِلْ بالمجاهِدِینَ، سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یَقُولُ: مَثَلُ الَّذِی یُعْتِقُ عِنْدَ المَوْتِ کَمَثَلِ الَّذِیْ یُهْدِی إِذَا شَبِعَ.

ابوحبیبہ طائی کہتے ہیں کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے کچھ حصے کی مجھے وصیت کی (کہ میں اسکی طرف سے خرچ کردوں) اتنے میں میری ملاقات ابوالدرداء سے ہوگئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے کچھ حصے کی مجھے وصیت کی ہے تو میرے لئے آپکی کیا رائے ہے کہ میں اسے کہاں خرچ کروں، فقراء پر یا مساکین پر یا راہ خدا کے سربکف مجاہدین پر؟ انہوں نے فرمایا: میں تو مجاہدین کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا، (مقصد یہ ہے کہ اگر میں وصیت کرتا تو صرف مجاہدین کیلئے ہی کرتا) میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس

شخص کی مثال جوموت کے وقت آزاد کرے اس شخص کی مانند ہے جو(کوئی شی) ہدیہ کرے جبکہ اپنا پیٹ بھرلے۔

موت کے وقت صدقہ کرنیکا حکم

ابوحبیبہ طائی نے حضرت ابوالدرداء سے پوچھا کہ میں اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق کچھ مال صدقہ کرنا چاہتا ہوں، آپ مجھے اسکا صحیح مصرف بتائیں کہ میں اسے کہاں خرچ کروں فقراء پر، مساکین پر یا مجاہدین پر، ابوالدرداء نے فرمایا کہ میں تو مجاہدین کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا یعنی اگر میں وصیت کرتا تو صرف مجاہدین کیلئے ہی کرتا کیوں کہ ان کا مقام اونچا ہے، سوال کا جواب دینے کے بعد حضرت ابوالدرداء نے حدیث سنائی جس سے ابوحبیبہ طائی کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہارے بھائی نے چونکہ موت کے وقت صدقہ کرنیکی وصیت کی ہے اسلئے اس کا اجروثواب بھی کم ہوگا یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کا پیٹ جب بھر جائے تو اس وقت کہے کہ یہ فلاں کو دیدو، کیوں کہ کامل ثواب اس وقت ملتا ہے جب انسان صحت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے اور اس وقت جبکہ خود اسے اس چیز کی ضرورت ہو پھر بھی صدقہ کردے، اس لئے موت کے وقت صدقہ کرنا کوئی زیادہ فضیلت کی بات نہیں ہے۔

تحفۃ الاحوذی ۶/۲۶۴۔

حدیث باب سے چندامور کا ثبوت

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱)......میت کیطرف سے اسکی وصیت کے مطابق صدقہ کیا جائے تو اسے ثواب پہونچتا ہے، اس لئے ایصالِ ثواب کی نفی کرنا درست نہیں ہے۔

(۲)......موت سے پہلے صحت کے زمانے میں صدقہ کیا جائے تا کہ مکمل ثواب حاصل ہو۔

(۳)......کسی مسئلے کا حکم معلوم نہ ہو تو کسی ماہر عالم سے دریافت کیا جائے، جو لوگوں کی صحیح طریقے سے راہنمائی کرتا ہو۔

باب

عَنْ عُرْوَةَ أن عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّ بَرِيْرَةَ جَاءَ تْ تَسْتَعِينُ عَائِشَةَ فِي كِتَابَتِهَا وَلَمْ تَكُنْ قَضَتْ مِنْ كِتَابَتِهَا شَيْئاً،فَقَالَتْ لَهَا عَائِشَةُ: ارْجِعِي إِلى أَهْلِكِ فإِنْ أَحَبُّوا أَنْ أَقْضِيَ عَنْكِ كِتَابَتَكِ ويَكُونَ وَلاؤُكِ لِي فَعَلْتُ،فَذَكَرَتْ ذَلِكَ بَرِيْرَةُ لأَهْلِهَا فَأَبَوْا وقالُوا إِنْ شَاءَ تْ أَنْ تَحْتَسِبَ عَلَيْكِ وَيَكُونَ لَنَا وَلَاؤُكِ فَلْتَفْعَلْ فَذَكَرْتُ ذلك لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ . اِبْتَاعِيْ فَأَعْتِقِيْ فَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطًا لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ؟ مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطًا لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَلَيْسَ لَهُ وإِنِ اشْتَرَطَ مِائَةَ مَرَّةٍ.

عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے انہیں بتایا کہ بریرہ ان (یعنی حضرت عائشہ) کے پاس آئیں اپنے بدل کتابت کی ادائیگی میں مدد لینے کیلئے، اور بریرہ نے ابھی تک اپنا بدل کتابت کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا، حضرت عائشہ نے ان سے کہا: تم اپنے موالی کے پاس جاؤ (ان سے مشورہ کرو) اگر وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں تمہارا بدل کتابت ادا کردوں اور تمہاری ولاء میرے لئے ہو تو میں ایسا کرنے کیلئے تیار ہوں، بریرہ نے اپنے موالی کے سامنے اسکا ذکر کیا تو انہوں نے انکار کردیا اور کہنے لگے:

اگر عائشہ چاہیں تو تمہارا بدل کتابت ادا کر کے اللہ سے اجر کی امید رکھیں اور تمہاری ولاء ہمارے لئے ہو تو پھر وہ ایسا کرلیں، حضرت عائشہ نے یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے ذکر کیا تو آپ نے ان سے فرمایا: اسے خرید لو پھر آزاد کردو کیونکہ ولاء اسی کیلئے ہوتی ہے جو آزاد کرے پھر نبی کریم ﷺ خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوگئے اور فرمایا: ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ جو شخص ایسی شرط لگائے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو یہ اس کیلئے جائز نہیں اگرچہ وہ سو مرتبہ شرط لگائے۔

حضرت بریرہ کی آزادی کا واقعہ

اس حدیث میں حضرت بریرہ کی آزادی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے مولی نے انہیں مکاتبہ بنادیا تھا، لیکن وہ بدل کتابت کا بندوبست نہ کرسکیں، حضرت عائشہ سے درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں، حضرت عائشہ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ اپنے موالی سے گفتگو کرو کہ میں بدل کتابت ادا کرتی ہوں لیکن اسکی ولاء پھر میری ہوگی، اگر وہ اس پر رضامند ہوں تو میں ایسا کرنے کیلئے تیار ہوں، لیکن ان کے موالی نے ولاء چھوڑنے سے انکار کردیا، حضرت عائشہؓ نے یہ قصہ نبی کریم ﷺ کو بتایا، آپ نے فرمایا: تم اسے خرید کر آزاد کردو، کیونکہ شرعاً ولاء اسی کو ملتی ہے جو آزاد کرے، پھر نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہوکر خطبہ دیا اور فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو معاملات میں ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں، مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی شرط لگانا جائز نہیں جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، اگرچہ سومرتبہ وہ شرط لگائی جائے، پھر بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

بدل کتابت کی ادائیگی میں ولاء کی شرط لگانے کا مسئلہ

صحیح مسلم میں اس حدیث کا ایک طریق ھشام بن عروہ سے ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں:

"اشتریها و أعتقیها و اشترطی لهم الولاء، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: تم بریرہ کو خرید کر آزاد کردو، اور ولاء کی شرط فروخت کرنے والوں کیلئے ہی لگادو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فروخت کرنے والے کیلئے ولاء کی شرط کی اجازت دی ہے، پھر آپ نے اس خریداری کو درست قرار دیا اور ولاء شرط کے خلاف حضرت عائشہؓ کو ہی دلادی اور فرمایا کہ ولاء اسکو حاصل ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے، اس سے استدلال کرکے ابن ابی لیلی کہتے ہیں کہ شرط فاسد سے بیع فاسد نہیں ہوتی، بس صرف شرط ہی لغو قرار پاتی ہے، جبکہ جمہور علماء کرام کے نزدیک شرط فاسد سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، لیکن حدیث کا یہ طریق بظاہر جمہور کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں ولاء کی شرط فروخت کرنے والے کیلئے لگائی گئی ہے اور اس کے باوجود اس عقد کو جائز قرار دیا گیا، اس اشکال کو حل کرنے کیلئے مختلف توجیہات اور جوابات دیئے گئے ہیں، جنکی

تفصیل یہ ہے:

(۱)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اشترطی لھم الولاء کا مطلب یہ ہے کہ تم فروخت کرنے والے کو ولاء کی شرط اپنے لئے لگانے دو، اسپر ان سے کوئی بحث نہ کرو، بس تم خرید کر آزاد کر دو اس شرط لگانے کا ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، وہ شرط لگائیں یا نفی کریں اس سے اصل معاملے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ شرعاً ولاء آزاد کرنے والے کیلئے ہوتی ہے، اس میں رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ فتح الباری، کتاب المکاتب، باب استعانة المکاتب ۲۳۹/۵۔

(۲)......امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ ایک خاص واقعہ ہے جس میں فروخت کرنے والے کیلئے ولاء کی شرط کی اجازت دی گئی ہے، اور پھر اس شرط کے مطابق عمل نہیں کیا گیا، اور اسے باطل قرار دیا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ جاہلیت کی یہ رسم کہ ولاء فروخت کرنے والے کیلئے ہوگی، مؤثر طریقے سے ختم کی جاسکے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے جاہلیت کی ایک رسم ختم کرنے کیلئے صحابہ کرام کو حج کے مہینوں میں حج کا احرام پہنے کی اجازت دی، پھر انہیں حکم دیا کہ حج کا احرام فسخ کر کے اسے عمرہ بنالیں، آپ ﷺ نے ایسا اس لئے کیا تا کہ زمانہ جاہلیت کا یہ دستور کہ ''حج کے مہینوں میں عمرہ درست نہیں'' عمل کے ذریعہ توڑا جاسکے۔ شرح صحیح مسلم للنووی، کتاب العتق، باب، بیان ان الولاء لمن اعتق ۴۹۳/۱۔ تکملة فتح الملھم ۲۸۰/۱

(۳)......سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ خرید و فروخت کے معاملات ہر قسم کی شرط سے فاسد نہیں ہوتے، بلکہ ایسی شرط سے فاسد ہوتے ہیں جسکا پورا کرنا انسان کے اختیار میں ہو، اور ایسی شرط جسے پورا کرنا عقلاً یا شرعاً آدمی کے بس میں ہی نہ ہو، وہ اگر کسی معاملے میں لگائی جائے، تو اس سے اس معاملے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس سے وہ بیع فاسد نہیں ہوگی، مثلاً کوئی شخص یہ عہد لے کہ ''میں آپکو یہ کپڑا اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ آپ پر نماز فرض نہیں یا آپکی وراثت سے تمہارے بیٹے کو کچھ نہیں ملے گا'' ان شرطوں کو پورا کرنا چونکہ انسان کی طاقت میں نہیں، اسلئے یہ لغو ہونگی اور خرید و فروخت کا معاملہ درست ہو جائیگا، لہذا ہر وہ شرط جسکا پورا کرنا عقلاً یا شرعاً ممکن نہ ہو، جو خلاف شرع امر پر مشتمل ہو، جو سود تک پہونچا دے، جو آپس کے نزاع اور لڑائی جھگڑے کا باعث بنے، وہ لغو اور باطل ہوگی، اور اسکی وجہ سے اصل معاملے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اور شرعاً ولاء چونکہ آزاد کرنے والے کا حق ہوتا ہے، اس لئے اس حدیث میں ولاء کی جو شرط فروخت کرنے والے کیلئے لگائی ہے، یہ شرط بھی لغو ہوگی کیونکہ اس کا پورا کرنا خریدار کے بس میں نہیں ہے، لہٰذا اصل عقد درست ہو جائے گا اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد "واشترطی لھم الولاء" کے معنی یہ ہونگے کہ اس شرط کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے، تم شرط لگاؤ یا نہ لگاؤ، اصل شرعی حکم میں کوئی فرق نہیں واقع ہوگا، کیونکہ ولاء بہر حال آزاد کرنے والے کیلئے ہوگی۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب العتق، قصۃ عتق بریرۃ ۱/۲۸۱۔

مکاتب کی بیع کا مسئلہ

وہ غلام جس کو مولیٰ نے مکاتب بنا دیا ہو یعنی یہ کہا ہو کہ تم اپنا بدل کتابت ادا کردو تو تم آزاد ہو، اس ''عبد مکاتب'' کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

امام احمد بن حنبل اور ایک قول میں امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ مکاتب غلام کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے، مولیٰ چاہے تو اسے فروخت کر سکتا ہے، وہ خریداری کے بعد بھی مکاتب ہی رہے گا اگر وہ اپنا بدل کتابت خریدار کو ادا کردے تو آزاد ہو جائے گا اور اس کی ولاء خریدار کو ملے گی، اور اگر وہ بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر خریدار کا غلام برقرار رہے گا، ان حضرات کا استدلال حضرت بریرہ کے اس واقعے سے ہے، کہ وہ مکاتبہ تھیں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم اسے خرید کر آزاد کردو، اس سے معلوم ہوا کہ مکاتب غلام کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ مکاتب کی خرید و فروخت اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ کتابت کا معاملہ فسخ نہ کر دیا جائے، یعنی جب وہ بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہو جائے۔

حنفیہ اور شافعیہ حدیث باب کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ حضرت بریرہ اپنا بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہو گئی تھیں، اسلئے انہوں نے اپنی آزادی کے بارے میں حضرت عائشہ سے مدد طلب کی، حضرت عائشہ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا، نیز حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر عبد مکاتب بیع پر راضی ہو جائے تو پھر عقد درست ہو جاتا ہے، اور حضرت بریرہؓ بھی چونکہ اس بیع پر راضی تھیں اس لئے حضرت عائشہ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا، اس لئے اس حدیث سے مکاتب کی بیع پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ فتح الباری ۵/۲۴۳ تکملۃ فتح

الملھم ۲۸۳/۱

"ان اقضی عنک کتابتک" اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ خریدے بغیر ہی بدل کتابت ادا کر کے اسکی ولاء کا مطالبہ کر رہی تھیں، ایسا ہرگز مراد نہیں کیونکہ حضرت عائشہ تو محض تبرع واحسان کر کے انہیں آزادی دلانا چاہتی تھیں، اسلئے دوسری روایات کو سامنے رکھ کر اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عائشہ انہیں خریدنا چاہتی تھیں تا کہ پھر انہیں اللہ کی رضاء کیلئے آزاد کیا جاسکے، اسکی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت بریرہ نے حضرت عائشہ سے گذارش کی: اشتریني فأعتقیني آپ مجھے خرید کر آزاد کردیں۔

"من اشترط شرطا لیس فی کتاب الله" اس سے وہ تمام شرائط مراد ہیں جو کتاب اللہ کے خلاف ہوں، ان کا قرآن کریم، سنت رسول، اجماع اور قیاس سے کوئی ثبوت نہ ہو، لہذا وہ شرائط جو ان چار اصول میں سے کسی سے ماخوذ ہوں، صراحت کے ساتھ یا ضمناً، وہ کتاب اللہ کے معارض نہیں ہونگی، اور معاملات میں ان کا اعتبار کیا جائیگا۔ تکملۃ فتح الملھم ۲۸۲/۱، ۲۸۳

فائدہ: حضرت بریرۃ کے اس واقعے سے علماء کرام نے بہت سے مسائل اور احکام ثابت کئے ہیں، جنکی تفصیل حدیث کی بڑی کتابوں میں ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۶۶/۶۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أَبْوَابُ الْوَلاءِ وَالْهِبَةِ

نبی کریم ﷺ سے ہبہ اور ولاء سے متعلق احادیث پر مشتمل ابواب

بابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْوَلاءَ لِمَنْ أَعْتَقَ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ ولاء اس شخص کیلئے ہے جو آزاد کرے

عن عائشةَ: أَنَّهَا أَرَادَتْ أَنْ تَشْتَرِيَ بَرِيرَةَ فَاشْتَرَطُوا الْوَلَاءَ، فقالَ النبيُّ ﷺ: الْوَلاءُ لِمَنْ أَعْطَى الثَّمَنَ أَوْ لِمَنْ وَلِيَ النِّعْمَةَ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بریرہ کو خریدنے کا ارادہ کیا، تو ان کے موالی نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگادی، اسپر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ولاء اس شخص کیلئے ہے جو غلام کی قیمت دے یا جو آزادی کی نعمت کا ذمہ دار ہو (یعنی آزاد کرے)

ولاء کا حکم

ولاء (واؤ پر زبر) اس ترکے کو کہتے ہیں جو آزاد کرنے والے کو آزاد کردہ غلام کے مرنے کے بعد ملتا ہے، اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ولاء کا حکم بیان فرمایا کہ ولاء اس شخص کو ملتا ہے جو غلام کو خریدے یا جو غلام کو آزاد کرے، اسکی مزید بحث گذشتہ باب میں گذر چکی ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۶۷

بَابُ النَّهيِ عَنْ بَيْعِ الْوَلاءِ وَهِبَتِهِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں ولاء کو فروخت کرنے اور اسکو ہبہ کرنے کی ممانعت کا ذکر ہے

أخبرنا عبدُ اللهِ بْنُ دِينَارٍ سَمِعَ عبدَ اللهِ بنَ عُمَرَ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ نَهى عَنْ بَيْعِ الْوَلاءِ وَهِبَتِهِ.

عبداللہ بن دینار نے عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے ولاء کو فروخت اور

اسکو ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حق ولاء کو بیچنے اور ہبہ کرنیکا حکم

اس حدیث سے استدلال کر کے جمہور علماء کرام فرماتے ہیں کہ شریعت میں بعض ایسے حقوق ہیں، جن کی خرید وفروخت اور ہبہ ناجائز اور حرام ہے، ان میں انسان اسطرح کا کوئی تصرف نہیں کرسکتا، جیسے حق شفعہ، حق ولاء، حق نسب اور حق قصاص وغیرہ ہیں جبکہ بعض حضرات کے نزدیک حق ولاء کی بیع اور ہبہ جائز ہے، امام نووی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ان تک حدیث باب نہ پہونچی ہو، اس لئے انہوں نے یہ موقف اختیار کیا، ورنہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ حق ولاء وغیرہ کی بیع اور ہبہ جائز نہیں ہے۔ تکملۃ فتح الملھم ۳۶۱/۱

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر سے یہ روایت عبداللہ بن دینار نے نقل کی ہے، اور پھر ان سے روایت کرنے والے سفیان بن عیینہ، شعبہ، سفیان ثوری اور مالک بن انس ہیں، شعبہ فرماتے ہیں کہ جس وقت عبداللہ بن دینار یہ روایت بیان کرتے تو اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کا سر چوم لوں، کیونکہ یہ روایت صرف ابن دینار ہی ابن عمر سے نقل کرتے ہیں، ان کے علاوہ کسی اور نے یہ روایت عبداللہ بن عمر سے نقل نہیں کی، اسی وجہ سے امام مسلم فرماتے ہیں: **الناس كلهم عيال على عبد الله بن دينار في هذا الحديث**، تمام لوگ اس حدیث کی روایت میں عبداللہ بن دینار کے عیال ہیں مقصد یہ ہے کہ اس روایت کے نقل کرنے میں عبداللہ بن دینار اگرچہ متفرد ہیں لیکن پھر بھی یہ روایت صحیح ہے، کیونکہ یہ ثقہ ہیں، لہذا ان کا تفرد حدیث کے حجت ہونے پر اثر انداز نہیں ہوگا، پھر یہ روایت عبداللہ بن دینار سے ۳۵ طرق سے منقول ہے۔ صحیح مسلم ۴۹۵/۱

بَابُ مَا جَاءَ فِي مَنْ تَوَلّٰى غَيْرَ مَوَالِيهِ أَوِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ

یہ باب اس شخص (کے حکم) کے بیان میں ہے جو اپنے موالی کے علاوہ کسی اور کو اپنا مولی بتائے یا جو اپنے نسب کو غیر باپ کیطرف منسوب کرے۔

عَنْ إِبراهِيمَ التَّيْمِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ : خَطَبَنَا عَلِيٌّ فَقَالَ : مَنْ زَعَمَ اَنَّ عِنْدَنَا شَيْئاً نَقْرَؤُهُ اِلَّا كِتَابَ اللهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةَ ، صَحِيْفَةٌ فِيهَا أَسْنَانُ الْإِبِلِ

وَأَشْيَاءُ مِنَ الْجِرَاحَاتِ فَقَدْ كَذَبَ، وقال فيها: قال رسولُ اللهِ ﷺ الْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدَثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لا يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا، وَمَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ أَوْ تَوَلَّى غَيْرَ مَوَالِيهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ ولا عَدْلٌ، وَذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ وَاحِدَةٌ يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ.

ابراہیم تیمی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا کہ جو شخص یہ گمان کرے کہ ہمارے پاس، کتاب اللہ اور اس صحیفہ کے علاوہ جس میں اونٹوں کی عمریں اور زخموں کے بارے میں کچھ احکام درج ہیں، کوئی اور چیز ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں تو یقیناً اس نے جھوٹ بولا، اور حضرت علی نے فرمایا کہ صحیفہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مدینہ جبل عیر سے ثور تک حرم ہے، جو شخص مدینہ میں کسی نئی چیز یعنی بدعت کا ایجاد کرے گا یا جو شخص کسی بدعتی (اور مجرم) کو پناہ دے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو اس کے کسی فرض کو قبول کریں گے اور نہ نفل کو، (یا معنی یہ ہیں کہ اسکی توبہ اور فدیہ کو قبول نہیں کریں گے) اور جو شخص اپنا نسب غیر باپ کیطرف منسوب کرے یا جو غلام اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی اور کیطرف منسوب کرکے (اپنی آزادی کو) بتائے، تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی، نہ تو اس کا کوئی فرض قبول ہوگا نہ نفل، اور تمام مسلمانوں کا عہد وامان ایک ہی ہے، ایک ادنیٰ درجے کا مسلمان بھی اسکا ذمہ دار ہوسکتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنیٰ:۔ تولّی: ذمہ دار بنائے، آزادی کی نسبت کرے۔ موالی: مولی کی جمع ہے، آزاد کرنے والے۔ اسنان: ''سن، کی جمع ہے، عمر، اسنان الابل اونٹوں کی عمریں۔ اشیاء: شی کی جمع ہے، یہاں اس سے ''احکام'' مراد ہیں۔ جراحات: جراحة کی جمع ہے، زخم۔ أحدث: ایجاد کرے، حدثا: (حاء اور دال پر زبر کے ساتھ) نئی چیز۔ اٰوی: ٹھکانہ دے۔ محدثا: یہ لفظ دال پر زبر اور زیر کے ساتھ یعنی اسم فاعل اور مفعول دونوں طرح پڑھا گیا ہے، دال کے کسرے کے ساتھ اس کے دو معنی ہیں:

(۱)......مجرم، (۲)......ملا علی قاری کے نزدیک بدعتی شخص، مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مجرم کو پناہ دے، تاکہ اسپر اس جرم کی شرعی سزا جاری نہ ہوسکے، یا جو کسی بدعتی کو ٹھکانہ دے، اور محدثا جبکہ دال پر زبر کے ساتھ یعنی اسم مفعول کا صیغہ ہو تو اس کے معنی ''بدعت'' کے ہونگے، مراد یہ ہے کہ جس شخص نے بدعت کو روکا نہیں، اسپر راضی رہا، اس نے گویا بدعت کو ٹھکانہ دیا، ملا علی قاری رحمہ اللہ نے محدثا (دال کے کسرے کے ساتھ) صحیح قرار دیا ہے۔ لـعـنـة: دور کرنا، دھتکارنا۔ صـرف و عـدل: ان کے دو معنی منقول ہیں: (۱)......جمہور کے نزدیک ''صرف'' سے فرض اور عدل سے نفل مراد ہے۔ (۲)......اصمعی کہتے ہیں کہ صرف سے توبہ اور عدل سے فدیہ مراد ہے، دونوں معنی میں کوئی تعارض نہیں، لہذا دونوں جمع بھی ہوسکتے ہیں، ذمة: (ذال کے نیچے زیر اور میم کی تشدید کے ساتھ) عہد وامان۔ یسعی: ذمہ دار ہوسکتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۷۰/۶

اپنے نسب کو غلط منسوب کرنے پر وعید

حدیث باب میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ہے، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......عبداللہ بن سبا کے پیروکار اور شیعہ نے لوگوں میں یہ عقیدہ پھیلایا ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایسی وصیت لکھوائی ہے جو صرف حضرت علی کو ہی معلوم ہے، کسی اور کو نہیں، اس میں حضرت علی کی خلافت کا بھی ذکر ہے، اور روافض کے دیگر (باطل) نظریات کا بھی اس میں ذکر ہے، نبی کریم ﷺ نے بطور راز کے یہ چیزیں حضرت علی کو لکھوائی تھیں، .... چونکہ یہ مفروضہ پھیلا ہوا تھا، اس لئے حضرت علیؓ سے متعدد مقامات پر لوگوں نے اس بارے میں پوچھا، اور بعض دفعہ حضرت علیؓ خود ہی اپنے خطاب میں اس شبہے کا ازالہ فرماتے۔

چنانچہ حدیث باب میں بھی حضرت علیؓ نے اپنے خطبے میں اسی وہم کو دور کیا کہ ہمارے پاس صرف دو چیزیں ہیں کتاب اللہ اور یہ صحیفہ جس میں اونٹ کی عمر سے متعلق تفصیلات ہیں اور زخموں کے بارے میں شرعی احکام ہیں دیت وغیرہ کے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، لہذا خصوصی وصیت کو میری طرف منسوب کر کے بیان کرنا سراسر جھوٹ ہے، اس کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲)......عیر اور ثور دونوں مدینہ منورہ کے پہاڑ ہیں، عبید بن سلام کہتے ہیں کہ ''ثور'' راوی سے غلطی سے لکھا گیا ہے، اصل میں لفظ ''احد'' تھا، کیونکہ جبل ثور مدینہ میں نہیں، مکہ میں ہے، لیکن محققین کی رائے یہ ہے کہ مدینہ

منورہ میں بھی احد کے پیچھے شمالی جانب میں ثور نامی چھوٹا سا پہاڑ موجود ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہاں راوی کو وہم ہوا ہے، درست نہیں ہے۔

اس روایت سے استدلال کر کے ائمہ ثلثہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ کیلئے بھی ایسا ہی حرم ہے جسطرح کہ مکہ معظمہ کیلئے ہے، وہ تمام احکام جو حرم مکہ کے ہیں، وہی اس کے بھی ہیں، البتہ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک حرم مدینہ میں شکار کرنے یا درخت کاٹنے سے کوئی ضمان واجب نہ ہوگا، اگرچہ ان کے نزدیک بھی ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ حرم مدینہ حرم مکہ کیطرح نہیں اور نہ ہی اس کے وہ احکام ہیں جو حرم مکہ کے ہیں، ان کا بنیادی استدلال اس حدیث سے ہے **یا ابا عمیر ما فعل النغیر** اے ابوعمیر نغیر یعنی بلبل کا کیا ہوا، یہ صحابی مدینہ میں ہی تھے اور اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا، اگر حرم مدینہ کے وہی احکام ہوتے جو حرم مکہ کے ہیں تو آپ ضرور انہیں منع فرمادیتے، ائمہ ثلثہ حدیث نغیر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ مدینہ کی حرمت سے پہلے کا ہو یا یہ جانور حرم کا نہ ہو بلکہ حل کا ہو، لیکن یہ تاویلیں چونکہ محض احتمال پر مبنی ہیں، دلیل سے ان کا ثبوت نہیں، اس لئے یہ احناف کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہیں، اور حنفیہ حدیث باب کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تعظیم کی وجہ سے مدینہ کو حرم کہا ہے ورنہ مکہ والی قیودات اور شرائط مراد نہیں۔ اعلاء السنن، باب حرمۃ المدینۃ ۱۰/۴۸۸

(۳)...... مدینہ منورہ میں بدعت ایجاد کرنا یا کسی بدعتی کو پناہ دینا گناہ کبیرہ ہے، اسپر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت نازل ہوتی ہے، بدعت کا ایجاد خواہ کسی بھی جگہ ہو، ناجائز اور حرام ہے، اس حدیث میں خاص طور پر مدینہ منورہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مدینہ تمام عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں اگر کوئی بدعت کا ایجاد ہو جائے تو فوراً ہی وہ پوری دنیا میں پھیل جائیگی، اور لوگ اسے دین سمجھ کر کرتے رہیں گے، اس لئے مدینہ منورہ میں بدعت کا ایجاد اور زیادہ برا اور قبیح ہے۔

(۴)...... جو شخص اپنا نسب غیر باپ کیطرف منسوب کرے، یا جو غلام اپنی آزادی کو آزاد کرنے والے آقا کے علاوہ کسی اور کیطرف منسوب کرے تو یہ دونوں شخص ملعون ہیں، کیونکہ اسطرح کرنے میں دھوکہ دہی، اور

نعمت کی ناشکری ہے، اس سے وراثت کے احکام اور ولاء کا معاملہ خراب ہو جاتا ہے، اور قطع رحمی لازم آتی ہے، اس لئے اسطرح کرنا جائز نہیں۔

(۵)......تمام مسلمان عہد وامان کے حق میں برابر ہیں، لہذا اگر کوئی مرتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ مسلمان بھی کسی کو امان دیدے تو وہ تمام مسلمانوں پر نافذ ہوگا، سب کو اسکی پابندی کرنی ہوگی۔تحفۃ الاحوذی ۲۷۰/۶۔عمدۃ القاری، کتاب الحج، باب حرم المدینۃ، ۲۲۹/۹، ط: کوئٹہ رشیدیہ

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَنْتَفِي مِنْ وَلَدِهِ

یہ باب اس شخص کے حکم کے بارے میں ہے جو (تعریض وکنایہ سے) اپنے بچے کے نسب سے بری الذمہ ہوجائے (یعنی اسکے نسب کی نفی کردے)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قالَ: جَاءَ رَجُلٌ مِنْ فَزَارَةَ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فقالَ: يَا رسولَ اللّٰهِ، إِنَّ امْرَأَتِي وَلَدَتْ غُلَامًا أَسْوَدَ، فقال له النبيُّ صلى الله عليه وسلم: هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ؟ قالَ: نَعَمْ، قال: فَمَا أَلْوَانُهَا: قال: حُمْرٌ، قال: فَهَلْ فِيهَا أَوْرَقُ؟ قال: نَعَمْ إِنَّ فِيهَا لَوُرْقًا، قَالَ: أَنّٰى أَتَاهَا ذٰلِكَ؟ قال: لَعَلَّ عِرْقًا نَزَعَهَا، قال: فَهٰذَا لَعَلَّ عِرْقًا نَزَعَهُ.

حضرت ابوھریرۃؓ فرماتے ہیں کہ قبیلہ فزارہ کا ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یارسول اللہ: بے شک میری بیوی نے سیاہ رنگ کا بچہ جنا ہے (یہ تعریض تھی کہ میں تو سفید ہوں اور لڑکا سیاہ ہے، تو وہ میرا بیٹا کس طرح ہوسکتا ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، آپ نے پوچھا: وہ کس رنگ کے ہیں؟ اس نے کہا: سرخ رنگ کے ہیں، آپ نے پوچھا: کیا ان میں کوئی سفید مائل بہ سیاہی خاکی رنگ بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: ایسا کیونکر ہوا؟ اس نے کہا: شاید کسی رگ نے اس کو کھینچا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو ہوسکتا ہے کہ تیرے اس بیٹے کو بھی کسی رگ نے کھینچا ہو۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:۔ینتفی من ولدہ: اپنے بچے سے بری الذمہ ہوجائے یعنی تعریض وکنایہ سے

اسکے نسب کی نفی کرے۔ حمر: (حاء پر پیش اور میم کے سکون کے ساتھ) سرخ رنگ۔ أورق: وہ اونٹ جس کا رنگ سفید سیاہی مائل ہو، اسکی جمع ورق (واؤ پر پیش اور راء کے سکون کے ساتھ) ہے۔ أنـى اتـاهـا ذلک: اس رنگ کا اونٹ کہاں سے آیا، یہ کیونکر ہوا۔ عـرقـا: (عین کے نیچے زیر اور راء کے سکون کے ساتھ) رگ۔ نزعها: اس کو کھینچا ہو۔

تعریض وکنایہ سے بچے کے نسب کی نفی کرنیکا حکم

اگر کوئی شخص صراحتاً اپنے بچے کے نسب کا انکار نہ کرے بلکہ تعریضاً انکار کرے، تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات ذکر کرتا ہے جس سے اشارۃً دوسری کوئی بات معلوم ہوتی ہو، مثلاً یوں کہے کہ ''میرا رنگ تو سفید ہے، یہ بچہ کالے رنگ کا کیوں پیدا ہوا'' اس جملے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ بچہ میرا نہیں ہے، چنانچہ حدیث باب میں ایک ''رجل'' نے اسی قسم کا سوال کیا، اس آدمی کا نام ضمضم بن قتادہ تھا، اس نے آکر کہا: إن امرأتي ولدت غلاماً اسود یہ گویا تعریض کر رہا تھا، چنانچہ صحیح مسلم میں اس روایت کے بعض طرق میں اس جملے کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں يُعَرِّض بأن ينفيه یعنی وہ اس لڑکے کی اپنے سے نفی کرنا چاہ رہا تھا کہ میں تو سفید ہوں اور لڑکا کالا ہے، یہ میرا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے اس کے فہم ومزاج اور ماحول کے مطابق سوال کیا کہ یہ بتاؤ کہ اونٹ مختلف رنگ کے کیوں ہوتے ہیں، سرخ اونٹ کا بچہ بسا اوقات سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس نے کہا لعل عرقا نزعه یعنی کوئی رگ اسکو کھینچ لیتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کی اوپر کی نسلوں میں کوئی اونٹ اس رنگ کا رہا ہوگا جسکی وجہ سے بعد میں کوئی اونٹ کا بچہ اسکا رنگ اختیار کر لیتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تو پھر انسانی نسلوں میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ تیرے یا تیری بیوی کے آباء واجداد میں کوئی کالے رنگ والا گذرا ہو اور اس اصل نے یہ رنگ جذب کر لیا ہو جسکی وجہ سے تیرا بیٹا کالے رنگ کا پیدا ہو گیا، اس مثال سے اسکے شبہے کا ازالہ کیا گیا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ محض رنگ کے فرق کی وجہ سے کسی بچے کے نسب سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ایسا ہو سکتا ہے کہ والدین کے رنگ کچھ ہوں اور بچے کا رنگ ان سے مختلف ہو، اس سے نسب کے ثبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس تعریض پر لعان واجب ہوتا ہے یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، حضرات حنفیہ، شافعیہ اور جمہور علماء کے نزدیک تعریض پر نہ حد قذف جاری ہوگی، اور نہ ہی زوجین کے درمیان لعان کرایا جائیگا البتہ تعزیراً اس کو سزا دی جاسکتی ہے، حضرات مالکیہ کے نزدیک تعریض کی وجہ سے لعان اور حد دونوں جاری ہونگے بشرطیکہ تعریض سے قذف اور تہمت کے معنی سمجھ آتے ہوں، اور حدیث باب میں سائل تہمت نہیں لگا رہا، بلکہ اسے شک ہوا جسے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا، آپ نے جب اونٹ کی مثال سے اسے سمجھایا تو اس کا شک دور ہوگیا اور اسکو یہ یقین ہوگیا کہ یہ میرا ہی فرزند ہے۔ فتح الباری، کتاب الطلاق، باب اذا عرض بنفی الولد۔ ۵۵۲/۹، تحفۃ الاحوذی ۲۷۲/۶

بَابُ ما جاءَ فی الْقَافَةِ

یہ باب قیافہ شناسوں (کے قول کے ذریعہ نسب کے ثبوت کے) حکم کے بارے میں ہے۔

عن عائشة أَنَّ النبیَّ ﷺ دَخلَ عَلَیْهَا مَسْرُورًا تبرُقُ أَسَارِیْرُ وَجْهِهٖ فقال: أَلَمْ تَرَیْ أَنَّ مُجَزِّزاً نَظَرَ آنِفًا إِلٰی زَیْدِ بْنِ حَارِثَةَ وأُسَامَةَ بنِ زَیْدٍ فقال: هذه الأَقْدَامُ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ.

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (ایک دن) بہت خوش خوش میرے ہاں تشریف لائے، آپکے چہرے (اور پیشانی) کے خطوط (بجلی کیطرح) چمک رہے تھے، اور فرمایا اے عائشہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ (مشہور قیافہ شناس) مجزز مدلجی نے ابھی ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ کو (لیٹے ہوئے) دیکھا اور کہا کہ یہ پاؤں ایک دوسرے کے مطابق ہیں (یعنی یہ پاؤں جن دو آدمیوں کے ہیں وہ آپس میں باپ بیٹے ہیں)

عن عائشةؓ وزَادَ فِیْهِ: اَلَمْ تَرَیْ اَنَّ مُجَزِّزاً مَرَّ عَلٰی زَیْدِ بْنِ حَارِثَةَ وَأُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ وَقَدْ غَطَّیَا رُؤُوْسَهُمَا وَبَدَتْ اَقْدَامُهُمَا، فَقَالَ: اِنَّ هٰذِهِ الْاَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔

اسی روایت کے ایک دوسرے طریق میں یوں اضافہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے

فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ مجزز مدلجی زید بن حارثہ اور اسامہ کے پاس سے گذرا (وہ دونوں اسطرح لیٹے ہوئے تھے کہ) انہوں نے (چادر سے) اپنے سر ڈھانپے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں کھلے تھے، تو اس نے کہا کہ ان دونوں کے پاؤں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ قافہ: قائف کی جمع ہے، قیافہ شناس، وہ شخص جو ہاتھ پاؤں کے خطوط اور نشانات دیکھ کر یہ بتادے کہ یہ فلاں کا بیٹا یا بھائی یا فلاں خاندان کا ہے۔ تبرق: بجلی کیطرح چمک رہے تھے، جگمگا رہے تھے۔ أساریر: یہ اسرار اور اسرۃ کی جمع ہے، پیشانی اور چہرے کے خطوط۔ الم تری: کیا تمہیں معلوم نہیں، اصل میں یہ ”ترین“ تھا، ”لم“ حرف جازم کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا۔ بعضها من بعض: بعض قدم بعض سے ہیں یعنی ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ غطیا: ان دونوںؓ نے ڈھانپا ہوا تھا۔ بدت: ان کے پاؤں ظاہر اور کھلے تھے۔

قیافہ شناس کے قول سے ثبوتِ نسب کا حکم

امام نووی فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن حارثہ بہت گورے اور خوبصورت آدمی تھے، جبکہ ان کے صاحبزادے اسامہ بن زید کالے اور سیاہ تھے، اور اپنی ماں کے ہم شکل تھے، ان کی ماں ایک حبشی عورت تھی، جنکا نام برکہ اور کنیت ام ایمن ہے یہ ایک لونڈی تھیں، نبی کریم ﷺ کو اپنے والد حضرت عبداللہ کیطرف سے ملی تھیں، آپ نے انہیں آزاد کر دیا تھا یہ وہی ام ایمن ہیں جن کا نبی کریم ﷺ کی خدمت اور بچپن میں پرورش میں اہم کردار ہے، حضرت زید سے قبل ان کی شادی عبید حبشی سے ہوئی، ان سے ان کا ”ایمن“ نامی بچہ پیدا ہوا، اسی سے ان کی کنیت ام ایمن مشہور ہوگئی پھر ان کی شادی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے ہوگئی، باپ بیٹے کی رنگت میں فرق کی وجہ سے منافقین حضرت اسامہ کے نسب میں عیب لگاتے تھے، اور دلیل یہ دیتے کہ ایسے حسین اور خوبصورت باپ کا بیٹا اسقدر کالا کیسے ہوسکتا ہے، نبی کریم ﷺ ان کی اس طعنہ زنی پر بہت رنجیدہ اور افسردہ تھے، کہ اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ مجزز مدلجی جو عرب کا مشہور قیافہ شناس تھا، جسکی بات کو اہل عرب سند کے طور پر لیتے تھے، یہ اپنے اس فن میں بہت ماہر تھا، آدمی کی شکل وصورت اور ہاتھ پاؤں دیکھ کر حالات واوصاف اور خصوصیات کا اندازہ کر لیا کرتا تھا، ایک دن مسجد نبوی میں آیا اور دیکھا کہ حضرت زید اور

اسامہ لیٹے ہوئے ہیں ان کے پاؤں دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ پاؤں جن دوآدمیوں کے ہیں ان کوآپس میں باپ بیٹا ہونا چاہیے، اس بات سے نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوئے کہ اسکی اس بات سے حضرت اسامہ کے نسب پر طعنہ زنی اور عیب جوئی بند ہو جائے گی کیونکہ اس وقت اہل عرب کے ہاں قیافہ شناس کا قول معتبر ہوا کرتا تھا، اور اس کے فیصلے کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا۔ تحفۃ الاحوذی ۲۷۳/۶۔ فتح الباری، کتاب الفرائض، باب القائف ۶۵/۱۲

شرعی احکام اور کسی کے نسب کے ثابت کرنے میں قیافہ شناس کا قول معتبر ہوتا ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، آئمہ ثلثہ حدیث باب سے استدلال کر کے یہ کہتے ہیں کہ شرعی احکام اور اثباتِ نسب میں قیافہ شناس کا قول حجت ہے اور سند کا درجہ رکھتا ہے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ مجزز مدلجی کی بات سے خوش ہوئے اور اسکی حوصلہ شکنی نہیں کی، اگر اسکا قول حجت نہ ہوتا تو آپ ﷺ ضرور اسے رد فرمادیتے اور اسپر ناگواری کا اظہار فرماتے، اسپر استنباط کرتے ہوئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر ایک باندی دو آدمیوں میں مشترک ہو، اسکا بچہ پیدا ہو جائے، اور دونوں ہی اس کے نسب کا دعوی کردیں یعنی ہر ایک یہ کہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس صورت میں ان دونوں کو قیافہ شناس کیطرف رجوع کرنا چاہیے، بچے کے نسب کے بارے میں وہ جو فیصلہ کرے، اسے قبول کر لینا چاہیے، کیونکہ شرعاً قیافہ شناس کا قول حجت ہے۔

جبکہ احناف یہ کہتے ہیں کہ قیافہ شناس کا قول شرعی احکام اور اثبات نسب میں معتبر نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **و لا تقف ما لیس لک به علم** (آپ اس چیز کے درپے نہ ہوں جسکا علم آپکو نہیں) اور نسب کے ثبوت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوسکتا اس لئے قیافہ شناس کا قول اس میں شرعاً حجت نہیں ہوگا۔

حدیث باب سے ائمہ ثلثہ کا استدلال درست نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ مجزز مدلجی کی گفتگو سے اس وجہ سے خوش نہیں ہوئے کہ حضرت اسامہ کا نسب زید سے اب ثابت ہوا ہے، کیونکہ نسب تو پہلے سے ثابت تھا، بلکہ اس وجہ سے خوش ہوئے کہ ایک ایسے شخص نے بھی اس نسب کی تصدیق اور تائید کردی جسکی بات کو اہل عرب اور منافقین حجت سمجھتے ہیں اور اسے معتبر قرار دیتے ہیں، اسکی مثال ایسی ہے جیسے چند عادل آدمی چاند

دیکھنے کی شہادت دیدیں، ساتھ ہی نجومی بھی ان کی تائید کردے تو اس سے اس نجومی کے قول کا حجت ہونا لازم نہیں آتا، اور نہ ہی اس سے کسی طرح کا کوئی حکم ثابت ہوگا، ہاں اس سے صرف اس شہادت کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے، اسی طرح حدیث باب میں مجزز مدلجی کی گفتگو سے حضرت اسامہ کے نسب کی تائید ہوتی ہے، اس سے ان کے نسب کو ثابت نہیں کیا جارہا، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اسکی بات کو رد نہیں کیا بلکہ خوش ہوئے کہ اب اہل عرب اور منافقین حضرت اسامہ کے نسب کے بارے میں اپنے عقیدے کے مطابق بھی طعنہ زنی کی ہمت نہیں کرسکیں گے۔

اور مشترک باندی کے بچے کے نسب کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ وہ بچہ شرعی حکم کے اعتبار سے دونوں کا ہوگا اور وہ باندی دونوں کی ام ولد ہوگی۔ عمدة القاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ ۱۶/۱۰۹۔ مرقاة المفاتیح، کتاب النکاح، باب اللعان ۶/۳۷۴۔

بابُ مَا جاءَ فِي حَثِّ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى الْهَدِيَّةِ

یہ باب اس حدیث پر مشتمل ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے ہدیہ کرنے پر برانگیختہ کیا ہے۔

عن أبي هُرَيْـرَةَ عن النبيِّ ﷺ قالَ: تَهَادَوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ، وَلا تَحْقِرَنَّ جارَةٌ لِجارَتِهَا وَلَوْ شِقَّ فِرْسِنِ شَاةٍ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، کیونکہ تحفہ سینے کی کدورت، جلن اور کینہ کو دور کرتا ہے، اور (یاد رکھو) کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے واسطے کسی معمولی چیز کے تحفے) کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ بکری کے کھر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔

مشکل الفاظ کے معنی:۔ تھادوا: (دال پر زبر کے ساتھ) تم آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو۔ تذھب: ختم کرتا ہے، دور کرتا ہے۔ وحر: (واؤ پر زبر اور حاء پر زبر اور سکون کے ساتھ): جلن، کدورت، کینہ، غیظ و غضب۔ لاتحقرن: ہرگز وہ حقیر نہ سمجھے۔ جارة: پڑوسن۔ شق: (شین کے نیچے زیر اور قاف کی تشدید کے ساتھ) ٹکڑا، حصہ، جزء۔ فرسن: (فاء اور سین کے نیچے زیر اور راء کے سکون کے ساتھ) بکری یا اونٹ کا

کھر، (ج) فراسن۔ ولو شق فرسن شاة: اصل عبارت یوں ہے: ولو کانت شق.........کانت میں ''ھی'' ضمیر ''ھدیہ'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

ایک دوسرے کو ھدیہ دینے کی ترغیب کا ذکر

حدیثِ باب میں ہدیہ دینے کی ترغیب اور اس کے چند فوائد کو بیان کیا گیا ہے، ہدیہ دینے کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سے دل کی کدورتیں، غیظ وغضب، جلن اور بغض وعداوت کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں، دلوں میں نفرت کے بجائے محبت والفت کی بہاریں قائم ہو جاتی ہیں، اس لئے اس سنت پر بڑے اہتمام سے عمل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ آجکل تقریباً ہر خاندان اور سوسائٹی میں محبتوں کے بجائے دشمنیاں اور نفرتیں بہت زیادہ ہیں، اس سنت پر عمل کیا جائے، تاکہ نفرت اور بے رخی کی یہ آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔

لا تحتقرن......... ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی پڑوسن محبت وجذبے سے دوسری پڑوسن کو کوئی معمولی سی چیز تحفہ دے، تو اس کو کمتر اور حقیر سمجھ کر رد نہ کیا جائے، خواہ وہ معمولی چیز بکری کے کھر کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، کھر کا ذکر بطور مبالغہ کے کیا گیا ہے کہ بھلے وہ چیز کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو تو بھی اسے دل وجان سے قبول کیا جائے، واپس نہ کیا جائے، کیونکہ اس نے انس و پیار اور محبت سے وہ چیز دی ہے، اور بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس ہدیہ دینے کی کوئی بڑی چیز نہ ہو، قلیل یا معمولی قسم کی کوئی چیز ہو تو اسے بھی وہ ہدیہ میں دیدیا کرے، یہ سمجھکر کہ یہ تو حقیر چیز ہے اس کو ہدیہ کرنیکا کیا فائدہ اور پھر اس وجہ سے اسے ہدیہ میں نہ دینا سنت کے خلاف ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۷۵/۶۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب البیوع باب فی الھبۃ والھدیۃ ۲۱۵/۶۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الرُّجُوعِ فِي الْهِبَةِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ ہبہ میں رجوع کرنا ناپسندیدہ ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قالَ: مَثَلُ الَّذِي يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ

فِيهَا كَالْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فَرَجَعَ فِي قَيْئِهِ.

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی کو عطیہ دیکر واپس لے لیتا ہے اسکی مثال اس کتے کی سی ہے جس نے (پیٹ بھر کر) کھایا اور جب اسکا پیٹ بھر گیا تو قے کرڈالی اور پھر اس قے کو چاٹنے لگا۔

عَن ابنِ عُمَرَ و ابنِ عَبَّاسٍ يَرْفَعَانِ الْحديث قالا: لا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا إِلاَّ الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ، وَمَثَلُ الَّذِي يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ حتى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عاد فِي قَيْئِهِ.

ابن عمر اور ابن عباس سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کیلئے یہ حلال نہیں ہے (یعنی مناسب نہیں) کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز دے اور پھر اس کو واپس لے لے، البتہ باپ اپنی اس چیز کو واپس لے سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے کو عطیہ میں دی ہو، باقی ترجمہ پہلی حدیث کی طرح ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی: ۔شبع: (شین پر زبر اور باء کی زیر کے ساتھ) سیراب ہوگیا، پیٹ بھر لیا۔ رجع فی قیئه: اپنی قے میں لوٹا یعنی اس قے کو چاٹنے لگا۔ یعطی العطیة: ہبہ اور عطیہ دیتا ہے۔

ہبہ میں رجوع کرنیکا حکم

اگر کوئی شخص دوسرے کو کوئی چیز ہبہ کردے اور پھر اسے واپس کرنا چاہے تو کیا ہبہ میں رجوع جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

ائمہ ثلثہ یعنی امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک ''رجوع فی الھبہ'' ناجائز اور حرام ہے، ہبہ کرنے والا کسی طرح رجوع نہیں کرسکتا، نہ قضاء اور نہ دیانۃ البتہ اگر والد نے کوئی چیز بیٹے کو ہبہ کی ہو اور اب وہ واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے، ان حضرات کا استدلال باب کی احادیث سے ہے، جن میں ''لا یحل'' اور **العائد فی هبته کالکلب**.......... کے الفاظ سے ہے، اور والد کا استثناء ابوداؤد شریف میں عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے، اس لئے باپ بیٹے کو جو ہبہ کرے اس میں رجوع جائز ہے، باقی کسی اور کیلئے

جائز نہیں۔

جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر واہب نے اپنے محرم رشتہ دار کے علاوہ کسی اور کو ہبہ کیا ہوتو اسے واپس لینا نامناسب اور مروت کے خلاف ہے، تاہم اگر وہ لینا چاہے تو قضاء لے سکتا ہے، لیکن جو ہبہ کسی محرم رشتہ دار مثلاً بھائی، بہن، بیٹا، ماں اور خالہ وغیرہ کو کیا ہوتو اسے شرعاً واپس کرنے کی گنجائش نہیں۔

حنفیہ کا استدلال اس حدیث سے ہے: **الواهب احق بهبته مالم يشب منها** ، واہب اپنے ہبہ کا زیادہ حقدار ہے جب تک کہ اسے اسکا معاوضہ نہ دیا جائے۔

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث باب میں "**لا يحل**" **لا ينبغي** کے معنی میں ہے کہ "مناسب نہیں" اس سے عدم جواز مراد نہیں۔ إعلاء السنن، باب کراهة الرجوع فی الھبة ۱۶/۱۰۰۔

اور **العائد في هبته**............ جس سے آئمہ ثلثہ نے استدلال کیا ہے، حنفیہ نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

(۱)...... نبی کریم ﷺ نے رجوع فی الھبہ کو قے چاٹنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، عرف میں اس سے اس عمل کی قباحت وشناعت اور برائی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، معنی یہ ہیں کہ کسی کو کوئی چیز دیکر واپس کرنا بے مروتی اور ناپسندیدہ بات ہے، مکروہ ہے، یہ مطلب نہیں کہ رجوع کرنا حرام ہے، اس لئے اگر واہب کو ضرورت ہوتو وہ واپس کرسکتا ہے۔

(۲)...... اس حدیث میں دیانت کا حکم بیان کیا جارہا ہے کہ واہب کیلئے دیانۃً جائز نہیں کہ وہ اپنے ہبہ کو واپس لے، اس حدیث میں قضا کا حکم نہیں بیان کیا گیا، قضا کا حکم اس حدیث میں ہے **الواهب احق بهبته مالم يشب منها** ، اس طرح ان دونوں روایات میں تطبیق بھی ہوجاتی ہے کہ واہب کے لئے واپس لینا جائز نہیں لیکن اگر قاضی واپسی کا فیصلہ کردے تو پھر رجوع فی الھبہ جائز ہے۔

الا الوالد من ولده ائمہ ثلثہ کہتے ہیں کہ باپ بیٹے کو ہبہ کرے تو وہ واپس لے سکتا ہے، حنفیہ کہتے ہیں کہ واپس نہیں لے سکتا اس لئے کہ وہ محرم رشتہ داروں میں سے ہے، اور عبداللہ بن عمر کی روایت جس میں یہ استثناء ہے، اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ انت و مالک لابیک (تم اور تمہارا مال والد کیلئے ہے) کے

قبیل سے ہے کہ اس چیز کی واپسی اس وجہ سے نہیں کہ ہبہ میں رجوع جائز ہے، بلکہ باپ ہونے کیوجہ سے والد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا مال ضرورت کے وقت لے سکتا ہے، ہبہ نہ کیا ہو تو بھی لے سکتا ہے، اور جب ہبہ کیا ہو تو وہ بطریق اولیٰ لے سکے گا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حقیقت میں رجوع فی الھبہ نہیں ہے، اور اس استثناء کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ذی محرم رشتہ دار کو ہدیہ دیکر واپس نہیں کیا جاسکتا، اس سے یہ شبہہ ہوسکتا تھا کہ والد اگر کوئی چیز بیٹے کو ہدیہ کرے تو پھر اس کا واپس لینا ممنوع اور مکروہ ہوگا، اس استثناء سے اس شبہہ کو ختم کیا گیا کہ یہ رجوع فی الھبہ کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ انت و مالک لابیک کی وجہ سے والد کیلئے وہ شی واپس کرنا جائز ہے۔ تحفۃ ۶/۲۷۷، تکملۃ فتح الملھم، کتاب الھبۃ، مسئلۃ الرجوع فی الھبۃ ۲/۵۷

سات مواقع میں رجوع فی الھبہ جائز نہیں

محرم رشتہ دار کے علاوہ کسی اور کو کوئی چیز ہبہ کی جائے تو اس میں قاضی کے فیصلے یا باہمی رضامندی سے رجوع ہوسکتا ہے لیکن سات مواقع ایسے ہیں کہ ان میں رجوع فی الھبہ جائز نہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:

(۱)......موہوبہ شی میں ایسی کوئی زیادتی اور اضافہ ہو جو اس کے ساتھ متصل ہو، جیسے موہوبہ زمین میں کوئی عمارت یا درخت وغیرہ لگا دیئے جائیں۔

(۲)......ہبہ کرنے والا یا جس کو ہبہ کیا گیا، یعنی واہب یا موہوب لہ میں سے کوئی مرجائے۔

(۳)......موہوب لہ نے بدلے میں واہب کو کوئی چیز دیدی ہو۔

(۴)......وہ چیز موہوب لہ کی ملکیت سے نکل چکی ہو۔

(۵)......ان دونوں میں میاں بیوی کا تعلق ہو۔

(۶)......وہ دونوں آپس میں محرم رشتہ دار ہوں۔

(۷)......موہوبہ چیز ہلاک ہو جائے۔ ھدایۃ، باب ما یصح رجوعه و مالا یصح ۳/۲۸۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَبْوَابُ الْقَدْرِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ ابواب ان احادیث پر مشتمل ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں منقول ہیں

قضاء وقدر کے معنیٰ

قدر (قاف پر زبر اور دال پر زبر اور سکون کے ساتھ) یا تقدیر کے معنیٰ لغت میں اندازہ لگانے اور تخمینہ کرنے کے ہیں، اور شریعت میں تقدیر سے وہ تمام فیصلے اور اندازے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کرنے سے پہلے اپنے علم ازلی کی روشنی میں ہر چیز کے بارے میں قائم فرمالئے تھے کہ یہ چیز فلاں وقت میں ان ان اوصاف کے ساتھ پیدا کی جائیگی، پھر ہر چیز کو اس کے وقت میں مخصوص صفات کے ساتھ پیدا کرنے کو قضاء کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے قضاء وقدر کے ایک ہی معنیٰ بیان کئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔

تقدیر پر ایمان لانے کا حکم

تقدیر پر ایمان لانا فرض اور ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ بندوں کے تمام اعمال خواہ وہ نیک ہوں یا بد، ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اور انسانوں کی پیدائش سے پہلے ہی لوح محفوظ میں یہ لکھ دیئے گئے ہیں، بندہ سے جو عمل بھی سرزد ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم واندازہ، قضاء وقدر، مشیت اور ارادے کے مطابق ہوتا ہے، لیکن اللہ نے انسان کو عقل و دانش کی نعمت دے کر اس کے سامنے نیکی اور بدی دونوں راستے واضح کردیئے ہیں، اور ان پر چلنے کا ہر قسم کا اختیار بھی دیدیا ہے، اور ساتھ ہی بتادیا کہ اگر نیکی کے راستے کو اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا، جس پر طرح طرح کے جزاء وانعام سے نوازے جاؤگے اور اگر برائی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا باعث ہوگا، جسکی وجہ سے سزا اور عذاب کے مستحق ہوجاؤگے۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان باب الایمان بالقدر، ۱/۲۵۲

تقدیر کی اقسام

تقدیر کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......تقدیر مبرم: وہ قطعی فیصلہ جو اللہ تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں فرمادیں، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

(۲)......تقدیر معلق: وہ امر جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مبرم اور قطعی ہو، لیکن فرشتوں کی نظر میں معلق ہو مثلاً اگر والدین سے اچھا سلوک کرے گا تو یہ ہوگا، اچھا سلوک نہیں کرے گا تو یہ فیصلہ ہوگا۔

بَابُ مَاجَاءَ مِنَ التَّشْدِيْدِ فِيْ الْخَوْضِ فِي الْقَدْرِ

یہ باب تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ اور گفتگو کرنے کی (ممانعت کی) شدت کے بارے میں ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِيْ الْقَدْرِ، فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّمَا فُقِئَ فِيْ وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ، فَقَالَ أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ؟ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ هٰذَا الْأَمْرِ، عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَلَّا تَنَازَعُوْا فِيْهِ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ تشریف لائے ہم آپس میں قضاء وقدر کے مسئلہ پر نزاع اور بحث کر رہے تھے، (ہماری یہ حالت دیکھ کر) آپ ناراض ہوئے اور چہرہ انور (غصہ کی وجہ سے) سرخ ہوگیا (اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ) گویا انار آپ کے رخساروں پر نچوڑ دیا گیا ہو، آپ نے فرمایا: کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں اسی لئے تمہاری طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں؟ (یاد رکھو) بے شک تم سے پہلے لوگ اس وقت ہلاک ہوئے جب انہوں نے اس معاملے میں آپس میں بحث، مباحثہ اور نزاع کو مشغلہ بنالیا تھا، لہذا میں تمہیں اس بات کی قسم دیتا ہوں کہ اس مسئلہ پر تم بحث اور نزاع نہ کیا کرو۔

مشکل الفاظ کے معنی:- الخوض فی القدر: تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ اور گفتگو میں مشغول ہونا۔ نتنازع فی القدر: ہم تقدیر کے بارے میں لڑائی جھگڑا یعنی بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ فقی: نچوڑا گیا۔

وجنتيه: آپ کے رخسار۔ الرمان: انار۔ عزمت عليكم: میں تم کو قسم دیتا ہوں۔

تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ سے اجتناب کیا جائے

صحابہ کرامؓ آپس میں تقدیر کے مسئلے پر بحث کر رہے تھے، بعض صحابہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ جب سب کچھ تقدیر میں لکھا جاچکا ہے تو پھر ثواب وعذاب کا ترتب کیوں ہوتا ہے، اور کچھ حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ اس میں اللہ کی کیا مصلحت وحکمت ہے کہ بعض انسانوں کو جنت کیلئے پیدا کیا اور بعض انسانوں کو دوزخ کیلئے پیدا کیا ہے، کچھ صحابہ نے اسکا جواب دیا کہ یہ اس لئے ہے کہ انسانوں کو ہر قسم کا عمل کرنے کا اختیار دیدیا ہے، کچھ نے کہا کہ یہ اختیار کس نے دیا، اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے، صحابہ کو ان باتوں میں مشغول پانے کی وجہ سے آپ کا چہرہ انور غیظ وغضب کی وجہ سے سرخ ہوگیا، یوں گویا کہ آپکے رخساروں پر انار نچوڑا گیا ہے، اس لئے صحابہ کرامؓ کو بتادیا گیا کہ مسئلہ تقدیر اللہ کا ایک راز ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا، اس میں عقل کی بنیاد پر بحث ومباحثہ کرنا درحقیقت گمراہی کا راستہ اختیار کرنا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا کہ تمہیں تقدیر کے بارے میں بتاؤں اور تم اس میں الجھتے رہو، میری بعثت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام تم تک پہونچاؤں، اور دین وشریعت کے فرائض واعمال کے کرنے کا تمہیں حکم دوں، تم لوگ تقدیر کے مسئلے میں مت پڑو، اس کے بارے میں تمہارا اتنا ہی اعتقاد کافی ہے کہ یہ خدا کا ایک راز ہے جس کی حقیقت ومصلحت وہی جانتا ہے لہذا اس کو اسکی مرضی پر ہی چھوڑ دو۔

منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے قضاء وقدر کے بارے میں سوال کیا، حضرت علیؓ نے فرمایا: **طريق مظلم لا تسلكه** یہ ایک تاریک اور دشوار گذار راستہ ہے اسپر نہ چلو، اس شخص نے پھر یہی سوال کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا: **بحر عميق لا تلجه**، یہ ایک سمندر ہے اس میں نہ اترو، اس نے پھر یہی سوال کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا: **سر الله قد خفي عليك فلا تفتشه** یہ اللہ کا ایک راز ہے جو تم سے پوشیدہ ہے اس لئے اسکی تحقیق وجستجو میں مت پڑو۔

لہذا مؤمن کی فلاح وسعادت اور کامیابی اس میں ہے کہ تقدیر پر مکمل ایمان واعتقاد رکھے، کہ اللہ تعالیٰ نے قضاء وقدر سے متعلق جو امور بھی طے فرمائے ہیں وہ عین حکمت ومصلحت کے مطابق ہیں، خواہ ان کی

حقیقتیں اور مصلحتیں ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، اور انسان کو تقدیر کے فیصلوں پر مجبور محض نہیں بنایا بلکہ انسان کو خیر اور شر، نیکی اور بدی، ہر طرح کا عمل کرنے کا مکمل اختیار دیدیا ہے، اور ساتھ ہی انجام بھی بتادیا کہ جو اچھے اعمال اور تقویٰ کے مطابق زندگی گذارے گا تو وہ اللہ کی جنت اور اسکی نعمتوں کا مستحق ہوگا، جو محض اسکا فضل وکرم ہوگا، اور جو کفر وضلالت اور برے اعمال کا راستہ اختیار کرے گا تو وہ دوزخ میں ڈالا جائیگا جو عین عدل ہوگا۔ مرقاۃ، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر ۱/۲۵۶، ۲۹۹، تحفۃ الاحوذی ۶/۲۷۹۔

ھلک من کان قبلکم، اس ہلاکت سے غالباً گمراہی مراد ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں ہلاکت کا لفظ گمراہی کے معنیٰ میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اس بناء پر آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ گذشتہ امتوں میں اعتقادی گمراہیاں اس وقت آئیں جب انہوں نے مسئلہ تقدیر کو بحث ومباحثہ کا موضوع بنایا۔

حدیث باب سے چند امور کا ثبوت

(۱)......کوئی استاذ یا شیخ ومربی اصلاح وتربیت کی غرض سے طلبہ اور متعلقین پر کبھی غصہ کرلے تو یہ جائز ہے، نبی کریم ﷺ کو بھی سخت غصہ غالباً اسی وجہ سے آیا تھا کہ صحابہ کرامؓ آپکی تربیت میں تھے، اور آپ سے براہ راست دین حاصل کررہے تھے، ان کو غلطی پر دیکھا تو آپکو دلی رنج اور افسوس ہوا۔

(۲)......تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ کرنا درست نہیں۔

(۳)......اس حدیث میں تقدیر کی حقیقت ومصلحت...... کے بارے میں نزاع اور بحث ومباحثہ سے منع کیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص تقدیر پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے صرف اطمینان قلبی کے لئے اس مسئلہ کے بارے میں کسی اہل علم سے سوال کرے تو یہ درست ہے، اسکی ممانعت نہیں ہے۔ معارف الحدیث، ۱/۱۷۵۔

باب

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اِحْتَجَّ آدَمُ وَمُوْسٰی فَقَالَ مُوْسٰی یا آدَمُ أَنْتَ الَّذی خَلَقَکَ اللّٰهُ بِیَدِهٖ وَنَفَخَ فِیْکَ مِنْ رُوْحِهٖ، أَغْوَیْتَ النَّاسَ وَأَخْرَجْتَهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ، قَالَ فَقَالَ آدمُ: أَنْتَ مُوسیٰ الذی اصْطَفَاکَ اللّٰهُ

بِكَلَامِهٖ، أَتَلُومُنِيْ عَلٰى عَمَلٍ عَمِلْتُهُ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ، قَالَ: فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (عالم ارواح میں) آدم و موسیٰ علیہما السلام نے (اپنے پروردگار کے سامنے) مناظرہ کیا، حضرت موسیٰ نے کہا: اے آدم آپ وہی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ (یعنی قدرت) سے پیدا کیا، اور آپ میں اپنی روح پھونکی تھی (پھر) آپ نے لوگوں کو گمراہ کیا اور ان کو جنت سے نکالا، راوی کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے کہا: تم وہی موسیٰ تو ہو جسے اللہ نے اپنے ساتھ ہمکلامی کیلئے منتخب فرمایا تھا، کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کرتے ہیں جس کو میں نے کیا، اور جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش سے بھی پہلے میرے لئے لکھ دیا تھا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: آدم موسیٰ پر (اس دلیل سے) غالب آگئے۔

آدم و موسیٰ کے درمیان یہ مناظرہ کہاں ہوا

اس میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں:

(۱)......بعض کہتے ہیں کہ یہ مباحثہ دنیا میں ہوا۔

(۲)......بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ گفتگو ان حضرات کے درمیان قیامت کے دن ہوگی۔

(۳)......اکثر حضرات کے نزدیک یہ مناظرہ عالم بالا میں ان کی روحوں کے درمیان ہوا تھا، اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں ''عند ربھما'' (اپنے رب کے پاس) کے الفاظ ہیں۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ علیہما الکلام ۵/۴۸۶، مرقاۃ ۱/۲۶۲

خلقک اللہ بیدہ، اس میں ''ید'' سے قدرت مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے آپکو پیدا فرمایا، یہ خاص انداز حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں محض اکرام واعزاز اور شرف کیوجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں والدین کے واسطے کے بغیر براہ راست اپنی قدرت سے پیدا فرمایا ہے، لفظ ''ید'' متشابہات میں سے ہے، جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس کے حقیقی معنیٰ پر ہمارا ایمان ہے، اگرچہ اسکی کیفیت اور

حقیقت کا ہمیں علم نہیں، اسکی مزید تفصیل باب ما جاء ان القلوب بين اصبيعى الرحمن میں آجائیگی۔

"أغويت الناس" آپ نے لوگوں کو گمراہ کیا، اس میں حضرت آدم کی طرف گمراہی کی نسبت سبب کے اعتبار سے ہے کہ ممانعت کے باوجود آپ نے درخت کا دانا کھایا، جو جنت سے نکل جانے کا باعث ہوا، اگر جنت میں ہوتے تو سب نیک اور متقی ہوتے، مگر جب دنیا میں آگئے، تو خواہشات اور شیطان کے مکر میں آگئے، یوں لوگوں کے دو گروہ ہوگئے، آدھے جنت کیلئے اور آدھے جہنم کیلئے، تو سبب بننے کی وجہ سے گمراہی کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔

اتلومنى على عملٍ عملته كتبه الله عليّ کتبہ اللہ سے مراد قدرہ اللہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں لکھدی ہے، کیا اسپر آپ مجھے ملامت کرتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے عمل میں دو چیزیں جمع ہیں ایک ان کا کسب یعنی اپنے اختیار سے عمل کرنا، اور دوسری تقدیر یعنی اللہ تعالیٰ کیطرف سے یہ فیصلہ کہ اگر حضرت آدم نے اس درخت کا دانا کھالیا تو ان کی وہ غلطی گو کہ توبہ کے بعد معاف کردی جائیگی، لیکن اس کے ردعمل میں انہیں جنت سے نکال کر دنیا میں خلیفہ بنا کر ضرور بھیجا جائیگا، یہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے طے شدہ تھا، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ کے جواب میں اپنے عمل کا ذکر نہیں کیا، صرف تقدیر کا ذکر کیا، کیونکہ عملی کوتاہی توبہ سے معاف کردی جاتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی خطا کو معاف کردیا، ان کی توبہ کو قبول کرلیا، اور تقدیر میں لکھی ہوئی چیز چونکہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اس میں کسی انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، اس لئے اسکی وجہ سے کسی انسان کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔

آج اگر کوئی شخص گناہ کے بعد یہ کہے کہ یہ میری تقدیر میں لکھا ہوا تھا، اسلئے اسپر مجھے نہ تو ملامت کی جائے اور نہ ہی سزا دی جائے، تو اس کا یہ کہنا درست نہیں ایک تو اس وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ معاملہ اس دنیا کا نہیں جو کہ دار التکلیف ہے، دوسرا اس لئے کہ آدمی اس دنیا میں کوئی بھی کام اپنے اختیار سے کرتا ہے، اسپر کسی بھی طرح کا کوئی جبر نہیں ہوتا، وہ اپنا اختیار استعمال کر کے اچھا یا برا کام کرتا ہے، لہٰذا اگر وہ برائی کرے گا تو اس پر اسے جزاء وسزا ضرور ہوگی، اور اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب ہے، اسے علم ہے کہ کون آدمی

اپنا ارادہ کس کام میں استعمال کریگا، اس لئے اللہ تعالیٰ پہلے سے بتا دیتا ہے کہ یہ آدمی نیک بخت ہے یا بد بخت، جنتی ہے یا جہنمی، اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مجبور کیا ہے، اس سے جبریہ پر رد ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے، ان کا نظریہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ فتح الباری، کتاب القدر، باب تحاج آدم وموسیٰ ٦٢٢/١١، ٦٢٥، تکملۃ فتح الملہم ٤٨٧/٥

قبل ان یخلق السموات والارض اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ سارا واقعہ آسمان وزمین کی تخلیق سے بھی پہلے تقدیر میں لکھا جا چکا تھا جبکہ صحیح بخاری کی روایت میں ہے: **قدره الله علىّ قبل ان يخلقني بأربعين سنة**، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق سے چالیس سال قبل لکھا گیا ہے، بظاہر دونوں میں تعارض ہے؟

اس تعارض کو دو طرح سے دور کیا گیا ہے:

(۱)......اصل واقعہ تو آسمان وزمین کی پیدائش سے بھی پہلے تقدیر میں لکھا جا چکا تھا، لیکن فرشتوں کو یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق سے چالیس سال پہلے بتایا گیا ہے۔ فتح الباری ٦٢٢/١١، کتاب القدر

(۲)......ابن جوزی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم اپنی تمام مخلوقات کو ازل سے محیط ہے، کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، لیکن اس علم ازلی کے اعتبار سے تمام مخلوق کی تقدیریں مختلف اوقات میں لکھی گئی ہیں، اس لئے جس روایت میں **قبل ان یخلق السموات والارض** کے الفاظ ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے ہی حاصل تھا، اور جس روایت میں حضرت آدم کی تخلیق سے چالیس سال پہلے کا ذکر ہے، اس سے تورات میں لکھنا مراد ہے، چونکہ تقدیریں مختلف اوقات میں لکھی گئی ہیں، اس لئے دونوں روایتوں میں تعارض نہیں۔ تکملۃ فتح الملہم، ٤٨٩/٥

فحجَّ اٰدم موسى، حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تائید فرمائی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ الشَّقَاءِ وَالسَّعَادَةِ

یہ باب بد بختی اور نیک بختی کے بیان میں ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ عُمَرَ یا رسولَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ مَا نَعْمَلُ فِيْهِ أَمْرٌ مُبْتَدَعٌ أَوْ مُبْتَدَأٌ أَوْ فِيْمَا قَدْ فُرِغَ مِنْهُ؟ قَالَ: فيما قَدْ فُرِغَ مِنْهُ يا ابنَ الْخَطَّابِ وَكُلٌّ مُيَسَّرٌ. أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَإِنَّهُ يَعْمَلُ لِلسَّعَادَةِ، وَ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاءِ فَإِنَّهُ يَعْمَلُ لِلشَّقَاءِ.

حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول (یہ بتا دیجئے) جو عمل ہم کرتے ہیں کیا وہ نیا اور جدید ہوتا ہے (کہ وقوع کے بعد اللہ تعالیٰ کے علم میں آتا ہے) یا وہ ایسا ہے جس سے فراغت ہو چکی ہے (یعنی تقدیر میں پہلے سے لکھا جا چکا ہے)؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے عمر بن الخطاب اس سے فراغت ہو چکی ہے، (لیکن) ہر ایک کیلئے معاملہ آسان کر دیا گیا ہے، لہذا جو شخص اہلِ سعادت میں سے ہوگا وہ سعادت والے کام کریگا، اور جو بدبختوں میں سے ہوگا تو وہ بدبختی والے کام کریگا۔

عَنْ عَلِيٍّ قالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ مَعَ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ وهو يَنْكُتُ فِيْ الأَرْضِ إِذْ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلى السَّمَاءِ ثُمَّ قَالَ: مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا قَدْ عُلِمَ. قَالَ وَكِيْعٌ إِلَّا قَدْ كُتِبَ. مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ. قَالُوا: أَفَلا نَتَّكِلُ يا رسولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: لَا اعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ.

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ زمین کرید رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ نے آسمان کیطرف سر اٹھایا، پھر ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا جان لیا گیا ہے، وکیع کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہر ایک کا ٹھکانا لکھدیا گیا ہے کہ وہ جہنم ہے یا جنت ہے، صحابہ نے عرض کیا: جب یہ بات ہے تو کیا ہم (تقدیر پر ہی) بھروسہ نہ کرلیں (اور محنت و عمل کو چھوڑ دیں) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، عمل ضرور کرو، کیونکہ ہر شخص کیلئے وہی عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- امر مبتدع: نیا اور جدید امر کہ جس کا علم اللہ تعالیٰ کو بندے کے عمل کے بعد ہوا

ہو۔ قد فرغ: (فاء پر پیش اور راء کے نیچے زیر، ماضی مجہول) اس سے فراغت ہو چکی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی اسکی تقدیر میں لکھدیا ہے۔ ینکت فی الارض: زمین کرید رہے تھے، ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی معاملے کے بارے میں پوری گہرائی کے ساتھ غور وفکر کیا جائے۔ افلا نتکل: کیا ہم اس لکھی ہوئی تقدیر پر ہی بھروسہ نہ کرلیں، اور اعمال کرنا ترک کردیں۔

سعادت وشقاوت کا معیار

مذکورہ احادیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ہر انسان کی تقدیر پہلے سے لکھی جا چکی ہے، کہ وہ کس قسم کے کام کریگا، اہل جنت میں سے ہوگا یا اہل جہنم میں سے، اس چیز کا علم صرف اللہ جل شانہ کے پاس ہے اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ تقدیر لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان سے جبراً کوئی کام کرائے گا، بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ علم غیب کی بنیاد پر ہر انسان کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ وہ کیسے کام کریگا، اس کے اعمال جنت میں لے جانیکا ذریعہ ہونگے یا جہنم میں لے جانیکا، جیسے کوئی استاذ کسی شاگرد کے بارے میں پہلے ہی بتادے کہ یہ کامیاب ہوگا یا ناکام، استاذ کا یہ بتانا اس کے پاس یا فیل ہونیکی دلیل نہیں ہوتا، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا محض علم کسی انسان کیلئے جنت یا جہنم میں لے جانیکا باعث نہیں ہوگا، بلکہ جنت یا جہنم میں لے جانیکا باعث انسان کے اعمال ہیں، اپنے اختیار سے انسان جیسے اعمال کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اسی طرح وہ افعال پیدا کردیں گے، اگر نیک کام میں مصروف رہا تو یہ اس کیلئے جنت میں جانیکا ذریعہ ثابت ہونگے ورنہ جہنم میں جانیکا باعث بنیں گے۔ تکملۃ فتح الملہم ۵/۴۷۹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم جو عمل کرتے ہیں یہ ابھی پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے وقوع کے بعد اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے یا تقدیر میں پہلے سے لکھے جا چکے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سب کچھ پہلے سے لکھا جا چکا ہے، چنانچہ جو شخص اللہ کے علم میں نیک بخت ہوگا تو اسے انہی اعمال کی توفیق ہوگی جو سعادت کا باعث ہونگے، اور جو اللہ کے علم میں بدبخت ہونگے وہ شقاوت والے کام کریں گے، عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ ہر انسان کو انہی اعمال کی توفیق دی جاتی ہے جو اس کی تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں، یہ کہنا کہ جب تقدیر پہلے سے لکھی جا چکی ہے تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے، درست نہیں ہے اس لئے کہ

انسان اپنے کام اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کرتا ہے، تقدیر کی طرف سے اسپر کوئی جبر نہیں ہوتا، اوراختیاری اعمال پر ہی جزاء وسزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اعمال بھی جنت میں لے جانیکے حقیقی اسباب نہیں ہیں صرف ظاہری اسباب ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص محض اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت میں نہیں جائیگا بلکہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوگا، تاہم ہر مسلمان اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اعمال صالحہ میں مشغول رہے کہ ان کی برکت سے ان شاء اللہ اسے جنت میں داخل کردیا جائیگا۔

کتب مقعده من النار، ایک روایت میں ہے کہ ہر آدمی کیلئے دوٹھکانے ہیں ایک جنت اور ایک جہنم اور بعض روایات میں ہے کہ جنتی آدمی کو اسکا جہنم کا ٹھکانہ دیکھایا جائیگا کہ اگر جنت والے اعمال نہ کرتا تو یہ جگہ ہوتی، ایسے ہی جہنمی شخص کو جنت کا ٹھکانہ دیکھایا جائیگا کہ تم اگر نیک عمل کرتے تو تمہارا یہ ٹھکانا ہوتا، یہ ٹھکانے اگرچہ ہر شخص کے دو ہونگے لیکن انتہاء بہر حال کسی ایک ٹھکانے پر ہی ہوگی۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۲۸۴

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْاَعْمَالَ بِالْخَوَاتِيْمِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ اعمال کا دارومدار انجام اور خاتمے پر ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ: إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ إِلَيْهِ الْمَلَكَ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعٍ يَكْتُبُ رِزْقَهُ وَأَجَلَهُ وَعَمَلَهُ وَ شَقِيٌّ أَوْ سَعِيْدٌ، فَوَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ ثُمَّ يَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ثُمَّ يَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا اور آپ

صادق ومصدوق ہیں بیشک تم میں سے ہر شخص کی خلقت کواسکی ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع کیا جاتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون ہو جاتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا ہو جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسکی طرف فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے، اور اسے چار چیزیں لکھنے کا حکم کیا جاتا ہے، وہ اس کے رزق، اسکی موت (کا وقت) اسکا عمل اور اسکا بد بخت یا نیک بخت ہونا لکھتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں بیشک تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کا عمل کر رہا ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے یعنی غالب آجاتا ہے، کہ اہل نار کے عمل پر اسکا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے، اور بیشک تم میں سے ہر ایک دوزخیوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے، کہ تقدیر کا لکھا ہوا اسپر غالب آجاتا ہے، (اور وہ جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے) اور اسکا خاتمہ جنتیوں والے اعمال پر کر دیا جاتا ہے چنانچہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- علقة: (عین، لام اور قاف پر زبر کے ساتھ) جما ہوا گاڑھا خون جس سے رحم مادر میں بچہ بنتا ہے۔ مضغة: (میم پر پیش اور ضاد کے سکون کے ساتھ) گوشت کا ٹکڑا۔ ذراع: ہاتھ کے برابر فاصلہ، حدیث میں اس سے زیادہ قرب اور نزدیکی مراد ہے۔

حسن خاتمہ کی فکر کی جائے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دو چیزوں کا ذکر فرمایا:

(۱)......ابتدا میں انسانی پیدائش کے مختلف مراحل اور درجات کو بیان فرمایا۔

(۲)......انسان جب رحم مادر میں ہوتا ہے اور اسپر تین چلّے گذر جاتے ہیں اور روح پھونکنے کا وقت آتا ہے تو اللہ کا مقرر کردہ فرشتہ اس کے متعلق چار باتیں لکھتا ہے اسکی مدت عمر، اس کے اعمال، اس کا رزق اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا۔

اس روایت سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تقدیر کی اس تحریر میں کوئی تبدیلی اور ردوبدل نہیں ہوتا، یہ فیصلہ اتنا اٹل ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اس تحریر میں دوزخیوں میں لکھا ہوتا ہے بسا اوقات ایک مدت تک اہل جنت والے کام کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت کے بہت قریب ہو جاتا ہے لیکن پھر ایک دم اس کے رویے میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور وہ دوزخ میں لے جانے والے برے اعمال کرنے لگتا ہے، اور اسی حال میں مرکر بالآخر وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے، اور اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جو فرشتہ کی تحریر میں اہل جنت میں لکھا ہوتا ہے، وہ ایک عرصے تک دوزخیوں کی سی زندگی گذارتا رہتا ہے اور دوزخ کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان گویا ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا لیکن پھر ایک دم وہ سنبھل جاتا ہے، راہ راست پر آجاتا ہے اور ایسے اعمال صالحہ کرنے لگتا ہے جو جنت میں لے جانیکا باعث بنتے ہیں، چنانچہ اسی حال میں مرکر وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔

اس حدیث سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ کسی انسان کو کفر وشرک یا بداعمالیوں کی وجہ سے حقیر وذلیل اور اس پر قطعی دوزخی ہونیکا حکم نہیں لگانا چاہیے، کیا معلوم زندگی کے باقی ایام میں وہ صحیح راستے پر آجائے اور اللہ کے ہاں کامیاب ہو جائے، ایسے ہی اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو اعمال صالحہ اور دینی خدمات کرنے کی توفیق عطا فرما رکھی ہے تو اسے بھی فخر وغرور اور تکبر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مسلسل اس فکر میں رہے کہ حسن خاتمہ ہو جائے اور دنیا سے جاتے وقت زبان پر کلمہ نصیب ہو جائے۔

"وهو الصادق المصدوق" یہ جملہ معترضہ ہے، صادق سے مراد یہ ہے کہ آپ قول وفعل میں سچے ہیں، نبوت سے پہلے بھی آپ سچائی اور امانت ودیانت میں مشہور تھے، اور مصدوق کے معنی ہیں کہ آپ کو سچا قرار دیا گیا ہے کہ آپ جو تعلیمات بذریعہ وحی لائے ہیں وہ تمام صحیح ہیں۔

يجمع خلقه في بطن أمه، علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس "خلق" سے منی مراد ہے کہ تعلقات مخصوصہ کی وجہ سے منی چونکہ منتشر ہو جاتی ہے، اس لئے اس کو رحم مادر میں چالیس دن میں اللہ تعالیٰ جمع کرتا ہے۔

ثم يرسل الملك فينفخ فيه الروح، اس فرشتہ سے ممکن ہے وہ فرشتہ مراد ہو جو رحم پر مقرر کیا

جاتا ہے، اس معنیٰ کے لحاظ سے فرشتے کو بھیجنے سے مراد اسے حکم کرنا ہوگا، یا یہ معنیٰ ہیں کہ اسے لوح محفوظ بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اسکی تقدیر دیکھ کر آئے اور اس کے مطابق تحریر کرے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فرشتہ رحم پر مقرر فرشتے کے علاوہ اور کوئی فرشتہ ہو۔ تکملۃ فتح الملہم ۴۷/۵

ایک اشکال اور اسکا جواب

ویکتب رزقه، یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہر چیز کی تقدیر آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھدی تھی، تو پھر نومولود کی روح ڈالنے کے وقت دوبارہ یہ چیزیں لکھنے کے کیا معنیٰ ہیں؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ تقدیر کے مختلف مراتب اور درجات ہیں، جنکا خلاصہ یہ ہے:

(۱)......ازل میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہ تھا، زمین وآسمان، ہوا، پانی، عرش وکرسی میں سے کوئی چیز بھی پیدا نہ کی گئی تھی، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیدا ہونے والی ساری کائنات اور مخلوقات کا پورا پورا علم تھا کہ اس ترتیب سے انہیں پیدا کیا جائیگا، یہ تقدیر کا پہلا درجہ ہے۔

(۲)......پھر ایک وقت آیا جبکہ پانی اور عرش پیدا کئے جاچکے تھے مگر زمین وآسمان ابھی پیدا نہ ہوئے تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں پہلی ازلی تقدیر کے مطابق لکھ دیں، یہ تقدیر کا دوسرا درجہ ہے۔

(۳)......اولاد آدم کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے عالم ارواح میں نکالنے کے بعد لکھا گیا کہ کون بد بخت ہوگا اور کون نیک بخت، کون فرمانبردار ہوگا اور کون نافرمان، یہ تیسرا درجہ ہے۔

(۴)......پھر انسان کی تخلیق کے وقت جب اس میں روح ڈالنے کا موقع آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فرشتہ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کر کے اس کے بارے میں ایک تحریر لکھتا ہے جس میں اسکی مدت حیات......وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے، یہ تقدیر کا چوتھا درجہ ہے۔

(۵)......تقدیر کا پانچواں درجہ یہ ہے کہ انسان جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے ارادے سے کرتا ہے، کیونکہ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتابت تقدیر کے مختلف درجات ہیں، جس سے مذکورہ اشکال ختم ہو جاتا ہے۔

يسبق عليه الكتاب اسپر تقدیر کا لکھا ہوا غالب آجاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اپنے اختیار اور ارادے سے اہل جنت یا اہل جہنم کا عمل شروع کر دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو چونکہ پہلے سے علم ہے کہ یہ شخص اپنا اختیار کس طرح کے کاموں میں استعمال کرے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ تقدیر میں پہلے سے ہی لکھدیتا ہے کہ یہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل جہنم میں سے، اس لکھنے سے مجبور کرنا مراد نہیں ہے۔ تکملۃ فتح الملھم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ادم ۵/۲/۷۴

بَابُ مَاجَاءَ كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْمِلَّةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُشَرِّكَانِهِ، قِيْلَ يا رسولَ اللّٰهِ: فَمَنْ هَلَكَ قَبْلَ ذٰلِكَ؟ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ بِهٖ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ ملت اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسکو یہودی یا عیسائی یا مشرک بنا دیتے ہیں، پوچھا گیا یا رسول اللہ جو اس (یہودی بننے) سے پہلے ہی مر جائیں (تو ان کا کیا حکم ہوگا) آپ نے فرمایا: اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے

مشکل الفاظ کے معنیٰ:- یھودانہ: والدین اسکو یہودی بنا دیتے ہیں۔ ینصرانہ: والدین اسکو عیسائی بنا دیتے ہیں۔

فطرت سے کیا مراد ہے

حدیثِ باب میں "ملت" سے مراد فطرت ہے، اور فطرت کی مراد میں شارحین کے مختلف اقوال ہیں، دو قول زیادہ مشہور ہیں:

(۱)......امام احمد، امام بخاری اور ابن عبد البر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ فطرت سے "اسلام" مراد ہے، مطلب یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی تخلیق کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے، اگر اس کو گردوپیش اور ماحول خراب نہ کرے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا مگر عادۃ ہوتا یہ ہے کہ والدین اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا۔

(۲)......علامہ طیبی، شاہ ولی اللہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نزدیک فطرت سے مراد استعداد ہے یعنی ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر یہ استعداد اور صلاحیت رکھی ہے کہ وہ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر سکے، اپنے خالق و مالک کو پہچان سکے، وہ اگر کافر بھی ہو تو بھی فطرۃً اس کے اندر اسلام قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد موجود ہوتی ہے، مگر گھر اور خاندان کا ماحول خصوصاً والدین اس استعداد کو ظاہر نہیں ہونے دیتے اس لئے وہ یہودی، نصرانی اور مجوسی ہو جاتے ہیں اگر اسے درست ماحول میسر آتا تو اس استعداد کی بناء پر ضرور وہ اسلام قبول کر لیتا۔

ان حضرات کے نزدیک حدیث میں فطرت سے یہی استعداد اور صلاحیت مراد ہے، جسکو استعمال کر کے انسان اسلام قبول کر سکتا ہے، یہی قول زیادہ صحیح اور راجح ہے اس لئے کہ پہلے قول پر متعدد اشکالات ہیں۔

پہلا اشکال یہ ہے کہ فطرت سے اسلام مراد لینے سے قرآن کریم اور حدیث میں تعارض واقع ہو جاتا ہے اس لئے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت (اسلام) کو کوئی نہیں بدل سکتا اور حدیث باب میں ہے کہ والدین کا ماحول اس کو بدل دیتا ہے، فطرت سے استعداد، مراد لی جائے تو پھر تعارض لازم نہیں آتا کیونکہ استعداد کو نہیں بدلا جا سکتا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا اس لئے خضر علیہ السلام نے اسے قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہے، فطرت سے استعداد مراد لی جائے تو کوئی اشکال نہیں ہوگا کیونکہ کافر ہونے کے باوجود استعداد موجود ہوتی ہے۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھدیا گیا ہے جسکی تبدیلی پر بھی اسکو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا پھر اسپر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری

عمل پر ملتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کے مطابق فقہاء امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائیگا، اسکی تجہیز و تکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائیگی، فطرت سے اسلام، مراد لینے کی صورت میں چونکہ مذکورہ اشکالات پیش آتے ہیں اس لئے دوسرے معنی ہی راجح ہیں کیونکہ اس معنی کے اعتبار سے کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔ معارف القرآن، سورۃ روم ۲۶/۶ ۷

الله اعلم بما كانوا عاملين اسکے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱)......اللہ کو علم ہے کہ اگر وہ بچپن میں نہ مرتے اور زندہ رہتے تو بڑے ہو کر کیا عمل کرتے، لہذا اب ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا وہ اس کے مطابق ہوگا، اگر اللہ کے علم میں یہ ہے کہ یہ زندہ ہوتا تو کفر کی زندگی گذارتا تو اسے عذاب ہوگا اور اگر اللہ کے علم میں یہ ہے کہ مسلمان ہو کر زندگی گذارتا تو اسے جنت میں داخل کیا جائیگا۔

(۲)......دوسرا قول یہ ہے کہ اس بارے میں توقف اور خاموشی اختیار کی جائے، نہ تو ان پر دوزخی ہونیکا حکم لگایا جائے اور نہ جنتی ہونیکا، جمہور علماء کے نزدیک یہی قول مختار اور راجح ہے۔

جبکہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب کہ ابھی تک مشرکوں کی اولاد کے بارے میں وحی کے ذریعہ کچھ معلوم نہیں ہوا تھا، بعد میں ان کے بارے میں حکم نازل ہو گیا تھا۔

اطفال مشرکین کا حکم

اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ مشرکین و کفار کے نابالغ بچے اگر مر جائیں تو وہ جنت میں جائیں گے یا جہنم میں، اس میں تین مذاہب مشہور ہیں، بعض کہتے ہیں کہ والدین کے تابع ہو کر جہنم میں جائیں گے اور بعض کے نزدیک اس میں توقف اور سکوت کرنا اولیٰ ہے لیکن جمہور علماء کرام کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اطفال مشرکین اہل جنت میں سے ہونگے۔

ان کا استدلال مندرجہ ذیل روایات سے ہے:

(۱)......صحیح بخاری میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے جس میں ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں دیکھا اور آپکے آس پاس لوگوں کے بچے ہیں، جنکی وفات فطرت پر ہوئی تھی، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد بھی جنت میں جائے گی؟ آپ نے فرمایا: مشرکین کی اولاد بھی جنت میں جائیگی۔

(۲)......حضرت انس سے مرفوعا روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ نابالغ بچوں کو عذاب نہ دیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمالیا کہ میں ان کو عذاب نہیں دوں گا۔

(۳)......امام احمد نے حضرت خنساء کے طریق سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ جنت میں کون جائیں گے؟ آپ نے فرمایا: نبی، شہید اور نابالغ بچے جنت میں ہونگے۔تحفۃ الاحوذی ۲۸۸/۶

(۴)......قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلاً، ہم کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے یہاں تک کہ ہم وہاں رسول بھیج دیں، وہ لوگ رسول کی بات نہ مانیں تو پھر ان پر عذاب اتارا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ عقلمند اور بالغ لوگوں کو دعوت کے بغیر عذاب نہیں دیتا تو جو بچہ ہو ہی بے سمجھ اور بے شعور تو اسے بطریق اولی عذاب نہیں ہوگا۔تکملۃ فتح الملہم کتاب القدر، حکم اطفال المشرکین ۵۰۱/۵

بَابُ مَا جَاءَ لَا يَرُدُّ الْقَدْرَ إِلَّا الدُّعَاءُ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ تقدیر کو صرف دعا ہی رد کر سکتی ہے

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيْدُ فِيْ الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ.

حضرت سلمان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قضاء وقدر کو صرف دعا ہی بدل سکتی ہے اور عمر میں اضافہ صرف نیکی ہی کرتی ہے۔

کیا تقدیر دعا سے بدل سکتی ہے

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں:

(۱)......دعا سے تقدیر کا فیصلہ تبدیل ہوسکتا ہے، تقدیر کی دو قسمیں ہیں تقدیر مبرم اور تقدیر معلق، تقدیر مبرم میں تو کوئی ردوبدل اور تبدیلی نہیں ہوسکتی البتہ تقدیر معلق میں تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے اعتبار سے ہے، اللہ کے علم میں تو اٹل ہے، یہ ذہن میں رہے کہ دعا سے کسی چیز کا رد ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کیطرف سے تقدیر میں طے ہوتا ہے جیسے مریض کو دوا کھلائی جائے تو وہ موت سے بچ جاتا ہے تو اس کا موت سے بچ جانا بھی تقدیر کا حصہ ہے، اسی طرح یہاں بھی تقدیر میں تھا کہ دعا کرے گا تو یہ ملے گا یہ آفت اور مصیبت دور ہوگی۔

(۲)......نیکی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔

اس اضافے سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

(۱)......یا تو حقیقی اضافہ مراد ہے کہ اسکی تقدیر میں یوں لکھا ہوتا ہے کہ اگر یہ نیکی کرے گا حج وعمرہ یا جہاد کریگا تو اسکی عمر ساٹھ سال ہوگی، نیکی نہیں کریگا تو اسکی عمر چالیس سال ہوگی، اب اگر وہ نیکی کرے تو فرشتوں کے سامنے اسکی عمر کے بیس سال بڑھ جاتے ہیں۔

(۲)......بعض نے یہ کہا ہے کہ اس اضافے سے حقیقی اضافہ نہیں بلکہ اسکی عمر میں برکت مراد ہے کہ اس کے اوقات ضائع نہیں جاتے، فضول کاموں میں صرف نہیں ہوتے حتیٰ کہ تھوڑے سے وقت میں وہ بڑے بڑے کام سرانجام دیتا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۲۸۹/۶

بَابُ مَاجَاءَ أَنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ إِصْبَعَي الرَّحْمٰنِ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے

عَنْ اَنَسٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُكْثِرُ أَنْ يَّقُوْلَ: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ، فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ آمَنَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا؟ قَالَ نَعَمْ إِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ شَاءَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگتے: یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک (اے دلوں کو پھیرنے والے: میرے دل کو اپنے دین پر ثابت

کردیجئے) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی: ہم آپکی نبوت ورسالت پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو آپ لیکر آئے ہیں (یعنی کتاب وسنت پر) تو کیا آپکو ہمارے بارے میں اندیشہ ہے (کہ ہم دین سے پھر جائیں گے)؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں (مجھے اندیشہ رہتا ہے) کیونکہ دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ انہیں جیسے چاہتا ہے بدل دیتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- یکثر ان یقول: اکثر یہ دعا فرماتے۔ یا مقلب القلوب: اے دلوں کو پھیرنے والے بدلنے والے۔ ثبت: ثابت رکھیے، استقامت عطا فرمادیجئے۔ امنا بک: ہم آپ پر یعنی آپکی نبوت ورسالت پر ایمان لائے۔ ولما جئت بہ: اور اس پر جو آپ لیکر آئے یعنی قرآن وسنت پر اصابع: اصبع کی جمع ہے انگلیاں۔

دین پر ثابت قدمی کی دعا

حدیث باب میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے دین پر ثابت قدم رہنے کی دعا فرماتے **یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ**، اس سے درحقیقت امت کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ مسلمان کو ہر وقت دین پر ثابت قدم رہنے کی فکر اور دعا کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ انسان کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ انہیں طاعت کیطرف، گناہ کیطرف، دینی بیداری یا غفلت کیطرف، غرض یہ کہ جدھر چاہے، پھیر سکتا ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپکی نبوت ورسالت اور کتاب وسنت پر ایمان لے آئے ہیں تو اب بھی آپکو ہمارے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ ہم دین سے پھر جائیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا جی ہاں مجھے اندیشہ رہتا ہے کیونکہ ہمارے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جسطرح چاہے انہیں پھیر سکتا ہے۔

صفات متشابہ کا حکم

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے ''اصابع'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ درحقیقت صفات متشابہ میں سے ہے، متشابہات دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جن کے لغوی ہی معلوم نہیں جیسے بعض سورتوں کے شروع میں

حروف مقطعات ہیں، جیسے الٓمٓ ، حٰمٓ .... اس قسم کے حروف کے متعلق صحابہ وتابعین اور جمہور سلف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خاص رموز ہیں، ان کے معنی غالباً رسول کریم ﷺ کو بتلائے گئے ہیں مگر آپ نے عام امت کو صرف ان علوم و معارف سے آگاہ فرمایا جن کو ان کے ذہن برداشت کرسکیں، اور جن کے معلوم نہ ہونے سے امت کے کاموں میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے، حروف مقطعہ کے رموز ایسے نہیں جن پر امت کا کوئی کام موقوف ہو یا ان کے نہ جاننے سے ان کا کوئی حرج ہو، اس لئے رسول کریم ﷺ نے بھی ان کے معانی کو امت کیلئے غیر ضروری سمجھ کر بیان نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اسکی تفتیش میں نہ پڑنا چاہیے، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر انکے معنی جاننے میں ہماری کوئی مصلحت ہوتی تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ فرماتے۔ معارف القرآن ۴۹۹/۴

دوسرے متشابہات وہ ہیں جن کے لغوی معنی تو معلوم ہیں لیکن اس کی کیفیت کا علم نہیں جیسے قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے ید، ساق، وجہ، استواء اور قدم وغیرہ کا ذکر ہے، جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ برحق ہیں، اور ان سے اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے وہ صحیح ہے اگرچہ اسکی کیفیت اور حقیقت کا ہمیں علم نہیں، اور جن متاخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنی بیان فرمائے ہیں کہ "ید" سے قدرت "وجہ" سے ذات اور اصبعین سے قدرت کیطرف اشارہ ہے، ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجے میں ہیں کہ شاید یہ معنی ہوں اس معنی کو وہ یقینی نہیں فرماتے، اور ظاہر ہے کہ محض احتمالات کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کرسکتے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد کردیا جائے۔ تکملۃ فتح الملہم ۴۹۶/۵

بَابُ مَاجَاءَ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَاباً لِأَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَهْلِ النَّارِ

یہ باب اس بارے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل جہنم کو لکھ دیا ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَمْرٍو قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَفِيْ يَدِهِ كِتَابَانِ، فَقَالَ أَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ؟ فَقُلْنَا: لَا يَا رسولَ اللّٰهِ إِلَّا أَنْ تُخْبِرَنَا، فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى: هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ

الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا، ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهِ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلا يُزَادُفِيْهِمْ وَلَايُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا. فَقَالَ أَصْحَابُهُ: فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ؟ فَقَالَ: سَدِّدُوا وَقَارِبُوْا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَىَّ عَمَلٍ، وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَىَّ عَمَلٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ: فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ، فَرِيْقٌ فِيْ الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِيْ السَّعِيْرِ.

حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے، آپکے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں، اور (صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا: تم جانتے ہو کہ یہ دونوں کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ہمیں کیا معلوم، آپ ہی بتادیجئے (کہ یہ کیا کتابیں ہیں) آپ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو آپ کے داہنے ہاتھ میں تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ جس میں اہل جنت، ان کے باپ اوران کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں، پھر آخر میں ان کی جمع بندی بھی کردی گئی ہے لہذا ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اس کے بعد بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک ایسی کتاب ہے جسپر اہل دوزخ، ان کے باپ اوران کے قبیلوں کے نام درج ہیں پھر آخر میں جمع بندی کردی گئی ہے، لہذا اب نہ تو اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی، (یہ سنکر) صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ: اگر یہ چیز پہلے سے ہی طے ہوچکی ہے (کہ جنت و دوزخ میں جانیکا مدار تقدیر کی تحریر پر ہے) تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے فرمایا: اپنے اعمال میں درستگی اور استقامت طلب کرتے رہو اور میانہ روی اختیار کرو (یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو) اس لئے کہ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ (زندگی میں) اس نے کیسے ہی (نیک یا بد) عمل کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے خواہ اسکے اعمال جیسے بھی رہے ہوں، پھر نبی

کریمﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے دونوں کتابوں کو اپنے پیچھے کیطرف پھینک دیا، اور فرمایا: تمہارا پروردگار بندوں کے بارے میں یہ پہلے سے طے کر چکا ہے کہ ایک جماعت جنت میں جائے گی اور ایک جماعت جہنم میں۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَرَادَ بِعَبْدٍ خَيْراً اسْتَعْمَلَهُ، فَقِيلَ: كَيْفَ يَسْتَعْمِلُهُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: يُوَفِّقُهُ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو استعمال فرماتے ہیں پوچھا گیا یا رسول اللہ اسے کیسے استعمال کرتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دیدیتے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:- **اجمل** (ہمزے پر پیش اور میم کے نیچے زیر) **علی اخرھم:** یہ اجمل الحساب سے ہے جس طرح حساب کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ پہلے وہ تفصیلاً لکھتے ہیں پھر آخر میں اس کا ٹوٹل اور میزان لگایا جاتا ہے اسی طرح اہل جنت اور اہل جہنم کو پہلے تفصیلاً ان کے آباء واجداد اور قبیلوں کے ناموں کے ساتھ لکھا گیا، اور پھر ان کا ٹوٹل اور میزان کر دیا گیا تو جس طرح میزان اور ٹوٹل میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اسی طرح اہل جنت اور اہل جہنم میں بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ **فـرغ:** (فاء پر پیش اور راء کے نیچے زیر) مجہول کا صیغہ ہے: اس سے فارغ ہو چکے، یہ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ **سددوا:** اپنے اعمال کے ذریعے درستگی اور استقامت کو طلب کرو۔ **قاربوا:** ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرو، اللہ کا قرب حاصل کرو۔ **نبذھما:** ان کو پھینک دیا۔ **ثم قال رسول الله بيديه:** یہ "قال" "اشار" کے معنی میں ہے: آپ نے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ **یستعملهٗ:** اس کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔

ما هذان الكتابان کے معنیٰ

نبی کریمﷺ باہر تشریف لائے تو آپکے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں ایک میں اہل جنت کے اسماء درج تھے اور ایک میں اہل جہنم کے، پھر انہیں پھینک دیا، ان کتابوں سے کیا مراد ہے، کیا واقعۃً دو کتابیں تھیں یا محض

مثال کے طور پر ذکر فرمایا، اس میں شارحین حدیث کے دوقول ہیں:

(۱)......حقیقت میں دو کتابیں تھیں مگر صحابہ کے مشاہدے اور نظر میں نہیں آرہی تھیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ معلوم ہے میرے ہاتھوں میں کیا ہے۔

(۲)......بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ دو کتابیں بطور مثال کے ہیں، حقیقت میں آپکے ہاتھوں میں کوئی کتاب نہیں تھی، لیکن چونکہ آپکو ایک پوشیدہ امر کا مشاہدہ اور یقینی علم حاصل ہو چکا تھا، اس لئے صحابہ کرام کو ذہن نشین کرانے کیلئے بطور مثال کے محسوس کے انداز میں پیش فرمایا۔

"فـنـبـذهـمـا" بعض حضرات کے نزدیک "هما" ضمیر "یدین" کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ کتابوں کا پھینک دینا نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ اگر کتابیں حقیقۃً مراد ہوں تو پھر اس کے معنی نبذهما علی الارض کے نہیں جس سے اہانت لازم آئے بلکہ اس کے معنی نبذهما الی عالم الغیب یعنی عالم غیب کی طرف پہونچا دینا مراد ہے اور اگر کتابوں سے محض مثال پیش کرنا مقصود ہو تو پھر "نبـذیدین" یعنی دونوں ہاتھوں کا پھینک دینا مراد ہوگا۔تحفۃ الاحوذی ۶/۲۹۳۔

بَابُ مَا جَاءَ لَا عَدْوٰی وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ

یہ باب عدوی، ہامہ اور صفر کی نفی میں ہے

عَنِ ابنِ مَسعودٍ قَالَ: قَامَ فِينَا رَسولُ اللّٰهِ ﷺ فقال: لَا يُعْدِي شَيٌّ شَيْئاً . فَقَالَ أَعْرَابِيٌّ: يا رسولَ اللّٰهِ، الْبَعِيْرُ أَجْرَبُ الْحَشَفَةِ نُدْبِنُهُ فَيُجْرِبُ الْإِبِلَ كُلَّهَا؟ فقال رسولُ اللّٰهِ ﷺ: فَمَنْ أَجْرَبَ الْأَوَّلَ؟ لا عَدْوَى ولا صَفَرَ، خَلَقَ اللّٰهُ كلَّ نَفْسٍ فَكَتَبَ حَيَاتَهَا وَرِزْقَهَا وَمَصَائِبَهَا.

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان (خطبہ دینے کیلئے) کھڑے ہوئے، اور فرمایا: کوئی بیماری کسی کو کوئی بیماری نہیں لگاتی، اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ اونٹ جس کے مخصوص عضو پر خارش ہو، ہم اس کو باڑ میں داخل کرتے ہیں تو وہ

سب اونٹوں کو خارشی بنا دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: (یہ بتایئے کہ) پہلے اونٹ کو کس نے خارشی کیا تھا؟ (اس لئے) نہ تو بیماری کا متعدی ہونا ہے اور نہ صفر ہے، ہر نفس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور اسکی زندگی، رزق اور مصائب کو لکھدیا (اس لئے اس تحریر و تقدیر میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا)

مشکل الفاظ کے معنی:- **عدوی:** ایک دوسرے کی طرف بیماری کا بڑھنا، لگ جانا۔ **لا یعدی:** بیماری نہیں لگاتا۔ **اجرب الحشفة:** وہ اونٹ جس کے مخصوص عضو پر خارش ہو یعنی خارشی اونٹ، حشفہ کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ عموماً یہ بیماری اسی عضو سے شروع ہوتی ہے۔ **ندبنه:** (نون پر پیش اور دال کے سکون کے ساتھ، صیغہ جمع متکلم) ہم اس اونٹ کو باڑ میں یعنی اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں داخل کرتے ہیں۔ بعض نسخوں میں "**بذنبه**" ہے، یعنی وہ اپنی دم ہلاتا ہے، جس سے دوسرے اونٹوں کو خارشی بنا دیتا ہے۔

عدوی کے بارے میں جاہلانہ تصور

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے کچھ توہمات اور جاہلانہ نظریات کی نفی فرمائی ہے، چنانچہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ایک کی بیماری دوسرے کیطرف متعدی ہوجاتی ہے، دوسرے کی بیماری کا سبب قطعی طور پر پہلی بیماری ہے، گویا بیماری کو وہ مؤثر حقیقی سمجھتے تھے، اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیماری متعدی نہیں ہوتی، اسپر اعرابی نے پوچھا کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک خارشی اونٹ جب دوسرے اونٹوں کے ساتھ ملتا ہے، تو سب کو خارشی بنا دیتا ہے، اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیماری ایک سے دوسرے کی طرف متجاوز ہوجاتی ہے، دوسرے کو لگ جاتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیماری اپنی ذات میں ایسی کوئی تاثیر نہیں رکھتی کہ وہ از خود دوسرے کو لگ جائے، اگر بیماری ہی سبب اصلی ہوتی تو سوال یہ ہے کہ پھر پہلے اونٹ کو کس نے خارش میں مبتلا کیا، اس لئے بیماری سبب نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہی کیطرف سے صحت و مرض کے فیصلے ہوتے ہیں، اس نے ہر نفس کی زندگی، رزق اور اسپر آنے والی مشکلات وغیرہ کو لکھدیا ہے، اسی کے مطابق یہ واقعات پیش آتے ہیں، اسکی مزید تفصیل **ابواب الاطعمة، باب ما جاء فی الأکل مع المجذوم** میں گذر چکی ہے، اسے ضرور دیکھ لیا جائے۔

ہامہ کے معنیٰ

''ھامۃ'' کی تین تفسیریں بیان کی گئی ہیں جسکی تفصیل ''ابواب الطب، باب ما جاء ان العین حق والغسل لھا'' میں گذر چکی ہے۔

صفر کے بارے میں فاسد نظریات

اسکی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، جنکی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اہل عرب بعض اوقات ماہ محرم کو اپنے وقت سے مؤخر کر کے ماہ صفر کو محرم قرار دیدیتے اور اسے ''محترم مہینوں'' میں شمار کر لیتے، اسلام نے اس رسم کو باطل قرار دیا، چنانچہ قرآن مجید میں انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲)......امام بخاری نے طب میں اسکی تفسیر یہ کی ہے کہ عرب کے ہاں ''صفر'' سے پیٹ کی ایک بیماری مراد ہے۔

(۳)......رؤبہ بن عجاج کہتے ہیں کہ ''صفر'' ایک سانپ ہے جو پیٹ میں ہوتا ہے، بھوک کے وقت کاٹتا ہے اور کبھی اس قدر شدت سے کاٹتا ہے کہ آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔

(۴)......بعض کے نزدیک ''صفر'' پیٹ کے اندر ایک قسم کا کیڑا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے اور کبھی انسان کے بدن میں درد پیدا کر کے ہلاک بھی کر دیتا ہے۔

(۵)......بعض نے کہا کہ اس سے ماہ صفر مراد ہے کہ عرب زمانہ جاہلیت میں اسے منحوس سمجھتے تھے، اس میں شادی بیاہ سے بھی اجتناب کرتے تھے جیسا کہ آجکل بھی بعض لوگ یہی ذہنیت رکھتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ولا صفر سے ان تمام فاسد اعتقادات اور خیالات کی تردید فرمادی کہ شرعاً ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تکملۃ فتح الملہم، کتاب الطب، باب لا عدوی ولا طیرۃ ۳۷۲/۴، تحفۃ الاحوذی ۲۹۶/۶

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْإِيمَانَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ

یہ باب اس بیان میں ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بری

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: لا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ

بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ، حَتَّى يَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ، وَأَنَّ مَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ.

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ تقدیر پر ایمان لائے خواہ وہ تقدیر اچھی ہو یا بری ہو، اور یہاں تک کہ اسے یقین ہو کہ جو کچھ (مصیبت یا نعمت......) اسے پہنچی ہے وہ اس سے ہٹنے اور ٹلنے والی نہ تھی اور بیشک جو خیر وشر اس سے رک گئی، وہ درحقیقت اس کو پہونچنے والی ہی نہیں تھی۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قال رسولُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ: يَشْهَدُ أَنْ لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ، وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ، وَيُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ، وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے، گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اور موت پر ایمان لائے، اور موت کے بعد (میدان حشر میں) دوبارہ اٹھنے پر ایمان لائے، اور تقدیر پر ایمان لائے۔

تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے

اس باب کی احادیث میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ آدمی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسکا یہ عقیدہ نہ ہو کہ مجھے جو کچھ خیر یا شر، مصیبت یا نعمت...... پہونچتی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کیطرف سے تقدیر میں طے شدہ ہے، اور جو خیر اسے حاصل نہ ہوسکی یا جو آفت ومصیبت اس کو نہیں پہونچی، وہ حقیقت میں اسکی تقدیر میں ہی نہیں تھی۔

اس سے دراصل یہ درس دینا مقصود ہے کہ مؤمن کو اللہ تعالیٰ پر توکل اور قناعت اختیار کرنی چاہیے، اور مصائب ومشکلات پر جزع فزع اور گلے شکوے کے بجائے صبر واستقامت سے کام لینا چاہیے یہی ایمان کامل کی علامت ہے۔

باب کی دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے چار چیزوں کا ذکر فرمایا شہادت، ایمان بالموت، ایمان بالبعث اور ایمان بالقدر کا، اور فرمایا ان پر ایمان لائے بغیر آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں لایؤمن سے کمال ایمان کی نفی مراد نہیں بلکہ اصل ایمان کی نفی مراد ہے کہ جو ان امور پر ایمان نہ لائے تو وہ سرے سے مؤمن ہی نہ ہوگا۔ تحفۃ الاحوذی ۲۹۸/۶

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ النَّفْسَ تَمُوْتُ حَيْثُ مَا كُتِبَ لَهَا

یہ باب اس بیان میں ہے کہ انسانی جان کی موت اسی جگہ پر واقع ہوتی ہے جو اس کیلئے (تقدیر میں) لکھدی گئی ہو۔

عَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً.

حضرت مطر بن عکامس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی موت کے بارے میں فیصلہ فرماتے ہیں کہ وہ (فلاں) جگہ پر واقع ہوگی تو اس زمین کیطرف اسے لیجانے کی کوئی ضرورت بھی پیدا فرمادیتے ہیں۔

موت کا مقام طے شدہ ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کی موت کی جگہ متعین ہے، تقدیر میں پہلے سے طے شدہ ہے، جب موت کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسا کوئی سبب یا اسکی ایسی کوئی ضرورت پیدا فرمادیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اس جگہ پر دیوانہ وار پہونچ جاتا ہے، پھر وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ لَا تَرُدُّ الرُّقٰى وَالدَّوَاءُ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئاً

یہ باب اس بارے میں ہے کہ جھاڑ پھونک اور دوا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو رد نہیں کرسکتے

عَنِ ابْنِ أَبِىْ خِزَامَةَ عَنْ أَبِيْهِ: أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِىَّ ﷺ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوَى بِهِ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئاً؟ قَالَ:

هِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ.

مذکورہ حدیث، اس کا ترجمہ اور مزید تفصیل ابواب الطب باب ماجاء فی الرقی والادویۃ میں گذر چکی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ الْقَدَرِیَّۃ

یہ باب فرقہ قدریہ (کی مذمت اور حکم) کے بارے میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ: صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِیْ لَیْسَ لَھُمَا فِی الْإِسْلَامِ نَصِیْبٌ: الْمُرْجِئَۃُ وَالْقَدَرِیَّۃُ.

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں دوفرقے ایسے ہیں جنہیں اسلام کا کچھ بھی حصہ نصیب نہیں اور وہ "مرجئہ" اور "قدریہ" ہیں۔

مرجئہ اور قدریہ

"مرجئہ" یہ لفظ "ارجاء" سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ مؤخر کرنے کے ہیں ان کے نزدیک ایمان صرف قول یعنی اقرار باللسان کا نام ہے عمل کی حاجت نہیں، گویا عمل کو مؤخر کرنے کی وجہ سے انہیں "مرجئہ" کہا جاتا ہے۔

مرجئہ کہتے ہیں کہ تمام افعال اللہ تعالیٰ ہی کے فیصلے سے ہوتے ہیں، بندے کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، اور افعال کی نسبت بندوں کیطرف ایسی ہے جیسے ان کی نسبت جمادات اور پتھروں کی طرف کی جائے کہ جس طرح جمادات اور پتھروں میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، اسی طرح انسان بھی کسی اختیار کا مالک نہیں، گویا انسان مجبور محض ہے، اس کے لئے نہ طاعت مفید ہے اور نہ نافرمانی اور معصیت۔

قدریہ (قاف اور دال پر زبر کے ساتھ) یہ وہ فرقہ ہے جو سرے سے تقدیر کا ہی انکاری ہے، ان کا کہنا ہے کہ بندے کے اعمال میں تقدیر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، بلکہ بندہ خود اپنے اعمال کا خالق اور اپنے افعال میں خودمختار ہے، وہ جو کچھ عمل کرتا ہے، اپنی قدرت واختیار کی بنیاد پر کرتا ہے۔ گویا مرجیہ نے بندوں کے اعمال کے بارے میں افراط اور قدریہ نے تفریط سے کام لیا ہے۔

ان کو قدریہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تقدیر کے بارے میں زیادہ بحث مباحثہ کیا کرتے تھے،

ان دونوں کے مقابلے میں اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم، ارادہ اور علم سے ہوتا ہے، اسی طرح بندوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں خواہ وہ نیک ہوں یا بد، یہ بھی تقدیر میں طے شدہ ہیں لیکن انسان کو عقل و دانش، فہم وفراست اور اچھے برے کی تمیز دیکر اسے دوراستے دکھادیئے، ایک اچھا راستہ جسپر چل کر وہ کامیاب ہوسکتا ہے اور دوسرا برا راستہ جسپر چلنا سراسر تباہی اور ہلاکت ہے۔

لیس لهما فی الاسلام نصیب جمہور کے نزدیک یہ دونوں فرقے اگرچہ فسق وضلالت اور گمراہی کے اعتبار سے بہت آگے ہیں، لیکن یہ دونوں کافر نہیں، بلکہ فاسق اور گمراہ ہیں، کیونکہ کسی بھی گمراہ فرقے کی تکفیر اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ اس سے صریح کفر سرزد نہ ہو، اور یہاں تو اس بحث سے ان کا مقصود کفر نہیں بلکہ حق تک رسائی ہے، لہذا اس حدیث کے بارے میں یہی کہا جائیگا کہ اس سے ان فرقوں کی زجر وملامت کو بیان کرنا مقصود ہے، تاکہ لوگ ان کے مکر وفریب اور عقائد سے محفوظ رہیں۔ تحفۃ الاحوذی ۳۰۲/۶

باب

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الشِّخِّيرِ عن أَبِيْهِ عَنْ النَّبِیِّ ﷺ :قَالَ: مُثِّلَ ابْنُ آدَمَ وَإِلَى جَنْبِهٖ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ مَنِيَّةً، إِنْ أَخْطَأَتْهُ الْمَنَايَا وَقَعَ فِيْ الْهَرَمِ حَتّٰى يَمُوْتَ.

عبداللہ بن شخیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کو پیدا کیا گیا اور اس کے پہلو میں ننانوے مہلک آفات یعنی موت کے اسباب ہوتے ہیں، اگر یہ اسباب موت اس سے تجاوز کر جائیں (یعنی اسے لاحق نہ ہوں) تب بھی بالآخر وہ بڑھاپے میں مبتلا ہوگا حتیٰ کہ وہ مرجائیگا۔

مشکل الفاظ کی وضاحت:- مثل: (میم پر پیش اور ثاء پر تشدید اور زیر، مجہول کا صیغہ ہے) پیدا کیا گیا، صورت دیا گیا۔ جنبه: اس کے پہلو، اس کے قریب۔ منية: مہلک آفت ومصیبت یعنی موت کے اسباب، اسکی جمع منایا ہے۔ اَخطأته: وہ اسباب اس سے متجاوز ہوجائیں یعنی بیماری، بھوک، جلنا، ڈوب جانا......ان میں سے کوئی سبب بھی اسے نہ پہونچے۔ الهرم: بڑھاپا۔

مصائب پر صبر کیا جائے

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس پر آنے والی مصائب ومشکلات کو بھی پیدا کیا جاتا ہے، حدیث میں ننانوے مصیبتوں کا ذکر کثرت کیلئے ہے اس سے تحدید مقصود نہیں، معنیٰ یہ ہیں کہ بہت سی آفتیں مختلف صورتوں میں اسے پیش آتی رہیں گی، یہ مصائب وآفات درحقیقت موت کے اسباب ہیں، کبھی فلاں بیماری، کبھی فلاں مرض، کبھی بھوک، کبھی کیا...... اور اگر بالفرض اسے دنیا میں کوئی مصیبت نہ بھی پہونچے تو بالآخر بڑھاپا اس پر ضرور طاری ہوگا جس کا انجام موت ہی ہے، عربی میں محاورہ ہے: **البرایا اھداف البلایا** لوگوں پر مصائب لازم ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں عموماً ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی میں ضرور مبتلا رہتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ اور کافر کیلئے جنت ہے، اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذارتا رہے اور اس کے فیصلوں پر راضی رہے۔

تحفۃ الاحوذی ۶/۳۰۴

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرِّضَاءِ بِالْقَضَاءِ

یہ باب اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنے (کی فضیلت) کے بارے میں ہے

عَنْ سَعْدٍ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ آدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهُ، وَمَنْ شَقَاوَةِ بْنِ آدَمَ تَرْكُهُ اسْتِخَارَةَ اللّٰهِ، وَمِنْ شِقَاوَةِ ابْنِ آدَمَ سُخْطُهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهُ.

حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کی سعادت و نیک بختی ہے کہ وہ اس فیصلے پر راضی رہے جو اللہ نے اس کیلئے کیا ہے، اور انسان کی بدبختی ہے کہ وہ اللہ سے مشورہ اور خیر طلب کرنا چھوڑ دے، اور انسان کی بدبختی ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے سے ناراض ہو۔

رضاء بالقضاء کا حکم

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بندے کے حق میں چونکہ سراسر اسکی بھلائی اور فائدے کے مطابق ہوتا ہے، اس

لئے اسپر خوش رہنا چاہیے خواہ اسکی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، زبان پر گلے شکوے اور ناشائستہ گفتگو سے اجتناب کرنا چاہیے، اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے رضا بالقضاء کو سعادت کی علامت قرار دیا ہے، علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ سعادتمندی دو وجہ سے ہے ایک تو یہ کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر پر راضی ہوگا تو پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اپنے معمولات ادا کر سکے گا، اس کے برعکس اگر رضا بالقضاء نہ ہو تو ایسا آدمی ہر وقت متفکر اور پریشان رہتا ہے، ایسے میں وہ کوئی کام یکسوئی سے نہیں کرسکتا، دوسرا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ناراضگی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں، یوں وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوجائیگا، اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ خیر وشر، نفع اور نقصان سب کچھ اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہے، طبیعت کے خلاف بات پیش آجائے تو اسپر صبر کرے اور جو بات منشاء کے مطابق ہو اسپر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرلیا کرے۔

ومن شقاوة ابن آدم تركه استخارة الله یہ جملہ درمیان میں ذکر فرما کر اسطرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو شخص اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کردے تو اسے بھی اللہ سے مشورہ اور خیر کو ضرور طلب کرتے رہنا چاہیے۔

استخارہ مباح امور میں ہوتا ہے، بہتر یہ ہے کہ کم از کم تین دن تک اسے کیا جائے اگر خواب میں کوئی اشارہ ہوجاتا ہے تو بہت اچھا ورنہ استخارے کے بعد جسپر دل مطمئن ہوجائے اس کام کو کرلیا جائے، اسمیں انشاء اللہ خیر ہوگی، استخارے میں خواب دیکھنا لازمی نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۳۰۵/۶

بابٌ

عَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابنَ عُمَرَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: إِنَّ فُلَاناً يُقْرِئُ عَلَيْكَ السَّلَامَ، فَقَالَ: إِنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّهُ قَدْ أَحْدَثَ، فَإِنْ كَانَ قَدْ أَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّيْ السَّلَامَ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ: فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوْ فِيْ أُمَّتِيْ الشَّكُّ مِنْهُ خَسْفٌ أَوْ مَسْخٌ أَوْ قَذْفٌ فِيْ أَهْلِ الْقَدَرِ.

نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ فلاں شخص

نے آپکو سلام کہا ہے حضرت ابن عمر نے فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص نے دین میں کوئی نئی بات نکالی ہے لہذا اگر واقعی اس نے دین میں کوئی نئی بات پیدا کی ہے تو میری طرف سے (جواب میں) اسے سلام نہ پہنچاؤ، اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے: اس امت میں یا فرمایا میری امت میں (امام ترمذی کے شیخ محمد بن بشار کو شک ہے) زمین میں دھنس جانا یا صورت کا مسخ ہو جانا یا سنگباری (کا عذاب ہوگا) اہل قدر پر (یعنی ان لوگوں پر جو تقدیر کا انکار کرنے والے ہیں)

عَنْ عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ سُلَيْمٍ قَالَ: قَدِمْتُ مَكَّةَ فَلَقِيْتُ عَطَاءَ بْنَ أَبِيْ رَبَاحٍ فَقُلْتُ لَهُ: يَا أَبَا مُحمدٍ، إِنَّ أَهْلَ الْبَصْرَةِ يَقُوْلُوْنَ فِيْ الْقَدَرِ، قال: يَا بُنَيَّ، أَتَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، قالَ: فَاقْرَإِ الزُّخْرُفَ، قال: فَقَرَأْتُ: ﴿حم وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ، إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، وَإِنَّهُ فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ قال: أَتَدْرِي مَا أُمُّ الْكِتَابِ؟ قُلْتُ: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قال: فَإِنَّهُ كِتَابٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَاءَ وَقَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْأَرْضَ، فِيْهِ أَنَّ فِرْعَوْنَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَفِيْهِ ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِيْ لَهَبٍ وَتَبَّ﴾

قَالَ عَطَاءٌ: فَلَقِيْتُ الْوَلِيْدَ بْنَ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ صَاحِبَ رسولِ اللّٰهِ ﷺ، فَسَأَلْتُهُ: مَا كَانَتْ وَصِيَّةُ أَبِيْكَ عِنْدَ الْمَوْتِ؟ قال: دَعَانِيْ فَقَالَ يَا بُنَيَّ اتَّقِ اللّٰهَ وَاعْلَمْ أَنَّكَ لَنْ تَتَّقِيَ اللّٰهَ حَتَّى تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ كُلِّهِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ، فَإِنْ مُتَّ عَلَى غَيْرِ هَذَا دَخَلْتَ النَّارَ. إِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ. فقال: اكْتُبْ. قال: مَا أَكْتُبُ؟ قال: اكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ.

عبدالواحد بن سلیم کہتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ آیا تو عطاء بن ابی رباح سے ملاقات کی، میں نے

ان سے پوچھا کہ اے ابو محمد بیشک اہل بصرہ تقدیر کے بارے میں کچھ کہتے ہیں (یعنی تقدیر کا انکار کرتے ہیں) حضرت عطاء نے فرمایا: اے میرے بیٹے! کیا تو قرآن کی تلاوت کرتا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں میں قرآن پڑھتا ہوں، فرمایا: سورۃ زخرف پڑھو، میں نے حم والکتاب المبین، انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون، وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم، پڑھا، فرمایا: کیا تجھے معلوم ہے کہ ''ام الکتاب'' کیا ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اسکا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا: یہی وہ کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے لکھا ہے، اسی میں (یہ بھی) ہے کہ فرعون اہل جہنم میں سے ہوگا اور اس میں ''تبت یدا ابی لھب وتب'' بھی ہے۔

حضرت عطا فرماتے ہیں کہ میں نے صحابی رسول حضرت ولید بن عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے باپ نے موت کے وقت کیا وصیت کی تھی؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میرے باپ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ اے میرے بیٹے: اللہ کا خوف کر اور جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ سے ہرگز نہیں ڈر سکتے یہاں تک کہ تم اللہ تعالیٰ پر اور ہر قسم کی تقدیر پر ایمان لے آؤ خواہ وہ تقدیر خیر ہو یا شر، اور اگر تم اس (عقیدے) کے بغیر مر گئے تو جہنم میں داخل ہوگے، بیشک میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے پہلی وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا وہ قلم ہے، پھر اسے حکم دیا کہ لکھ، قلم نے پوچھا: کیا لکھوں؟ فرمایا: تقدیر کو، جو کچھ کہ ہو چکا اور جو قیامت تک ہوگا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍ ويقولُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يقولُ: قَدَّرَ اللّٰهُ المَقَادِيرَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمٰوٰاتِ وَالأَرضينَ بخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ.

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تقدیروں کو مقدر کر دیا تھا۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قال: جَاءَ مُشْرِكُو قُرَيْشٍ إِلَى رسولِ اللّٰهِ ﷺ يُخَاصِمُوْنَ فِي الْقَدَرِ فَنَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرٍ، إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مشرکین قریش نبی کریم ﷺ کے پاس مسئلہ تقدیر پر بحث ومباحثہ اور جھگڑنے کیلئے آئے تو یہ آیت نازل ہوئی: یوم یسحبون فی النار علی وجوھھم ذوقوا مس سقر، انا کل شئ خلقناہ بقدر (جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں گھسیٹے جاویں گے تو ان سے کہا جائیگا کہ دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو، ہم نے ہر چیز کو (خاص) انداز سے پیدا کیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:- أحدث: نئی چیز کا ایجاد کیا، بدعت نکال لی۔ خسف: (خا پر زبر اور سین پر جزم) زمین میں دھنس جانا۔ مسخ: صورت کا تبدیل ہوجانا، بگڑ جانا۔ قذف: سنگ باری، پتھر برسانا۔ قدر: (قاف اور دال پر زبر) تقدیر الٰہی، اللہ کا فیصلہ جو بندوں کیلئے کر دیا گیا ہو۔ المقادیر: مقدار کی جمع ہے: تقدیر الٰہی، وہ شئ جس سے کسی چیز کا اندازہ لگایا جائے۔ یخاصمون: بحث ومباحثہ اور جھگڑنے لگے۔ یسحبون: انہیں کھینچا اور گھسیٹا جائیگا۔ ذوقوا: تم مزہ چکھو۔ مسّ سقر: عذاب جہنم کا لگنا، اسکا اثر۔

منکرین تقدیر کے بارے میں عذاب کی وعید

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں، جن میں ان لوگوں کے بارے میں مختلف قسم کے عذاب کی وعیدیں منقول ہیں جو تقدیر الٰہی کا انکار اور اسکی تکذیب کرتے ہیں۔

حضرت نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر کو ایک ایسے شخص کا سلام پہونچایا گیا جو تقدیر سے انکاری تھا، آپ نے فرمایا کہ اس شخص نے چونکہ دین میں ایک نئی بات یعنی بدعت کا اضافہ کیا ہے یہاں بدعت سے مراد تقدیر کا انکار ہے، اس لئے میری طرف سے سلام کا جواب نہ دیا جائے، کیونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں سے سلام کلام نہ کریں، اور تعلقات قائم نہ کریں جو دین میں بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں اور اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ فاسق وفاجر اور بدعتی آدمی کے سلام کا جواب دینا نہ واجب ہے اور نہ ہی سنت ہے بلکہ اصلاح کی غرض سے ان سے بائیکاٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔

فی هذه الامة او فی امتی. الشک منه. خسف او مسخ...... اس میں ''الشک منہ''

سے مراد یہ ہے کہ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ان الفاظ میں شک شیخ محمد بن بشار کیطرف سے ہے کہ انہوں نے یوں ہی اسے روایت کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ تقدیر کی تکذیب اور اسکا انکار کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ شدید عذاب آسکتے ہیں زمین میں دھنس جانیکا، شکل وصورت تبدیل ہو جانے اور سنگباری کا، اس حدیث میں لفظ ''او'' کے ساتھ یہ عذاب ذکر کئے گئے ہیں، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ راوی کیطرف سے شک ہے کہ یہ عذاب ہوگا یا یہ...... علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ لفظ او سے مختلف عذابوں کیطرف اشارہ ہو، کہ منکرین تقدیر پر مختلف قسم کے یہ عذاب آسکتے ہیں۔

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ مذکورہ عذاب تو اللہ تعالیٰ نے اس امت سے نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے ختم کردیئے ہیں، پھر اس حدیث میں ان کو کیسے ثابت کیا گیا ہے؟

شارحین حدیث نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں:

(۱)...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں بطور شرط کے یہ سزائیں ذکر کی گئی ہیں، معنیٰ یہ ہیں کہ اگر خسف ومسخ جیسے دردناک عذاب اس امت پر ہوتے تو وہ منکرین تقدیر پر ہوتے، لیکن چونکہ آپکی دعا سے یہ عذاب اس امت سے ختم کردیئے گئے ہیں، اس لئے ان پر یہ عذاب نہیں آتے۔

(۲)...... مذکورہ عذاب پوری امت پر عمومی طور پر نہیں آئیں گے لیکن بعض لوگوں پر ان کی سرکشی وغیرہ کی وجہ سے یہ عذاب آسکتے ہیں۔

(۳)...... علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے زجر وتوبیخ اور ڈرانا مقصود ہے تاکہ لوگ تقدیر کے بارے میں افراط وتفریط سے دوچار نہ ہوں۔

(۴)...... قرب قیامت میں جب اس امت میں سرکشی وبغاوت حد سے بڑھ جائیگی اور لوگ تقدیر کی تکذیب کرنا شروع کردیں گے تو اس وقت ان پر یہ عذاب نازل ہونگے، اور یہ علامات قیامت میں سے ہے۔

باب کی دوسری روایت میں ان اہل بصرہ کا ذکر ہے جو تقدیر کا انکار اور اسکی تکذیب کرتے تھے، حضرت عطا بن ابی رباح نے سورۃ زخرف کی آیات سے اسپر رد فرمایا کہ تقدیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ ام الکتاب یعنی

لوح محفوظ میں آسمان وزمین کی تخلیق سے بھی پہلے لکھی جا چکی ہے، حضرت ولید بن عبادہ نے اپنے والد کی وصیت ذکر فرمائی جس میں ہے کہ اگر آدمی کا تقدیر پر ایمان نہ ہو اور اسی میں وہ مر جائے تو اسے جہنم میں داخل کیا جائیگا۔

سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا گیا

إن اول ما خلق الله القلم ، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مخلوق اول" یعنی سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا گیا، اس بارے میں روایات حدیث میں اختلاف ہے بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا گیا، بعض میں اولیت کی نسبت عرش کیطرف ہے جبکہ حدیث باب وغیرہ میں اولیت کی نسبت قلم کیطرف کی گئی ہے۔

ان تمام روایات میں تطبیق اسطرح دی گئی ہے کہ سب سے پہلے پیدا ہونیکا شرف پانی کو حاصل ہے، چنانچہ حضرت ابورزین عقیلی سے مرفوع روایت منقول ہے: إن الماء خلق قبل العرش (بے شک پانی کو عرش سے پہلے پیدا کیا گیا) اور امام سدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں متعدد اسانید سے روایت نقل کی ہے: **إن اللــه لـم يـخـلـق شيئا مما خلق قبل الماء** (اللہ تعالیٰ نے پانی سے پہلے کسی مخلوق کو پیدا نہیں کیا، گویا سب سے پہلے پانی کو پیدا فرمایا)، ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیت حقیقیہ پانی کو حاصل ہے، پھر اس کے بعد عرش کو پیدا کیا گیا جیسا کہ **وكـان عـرشـه عـلـى الماء** سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے وکان عرشہ علی الماء کے بارے میں پوچھا گیا کہ عرش پانی پر تھا تو پانی کس چیز پر تھا؟ ابن عباس نے جواب دیا کہ پانی ہوا پر تھا اور قلم کیلیے اولیت کی نسبت حقیقی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے، معنیٰ یہ ہیں کہ پانی، عرش اور ہوا کے علاوہ دیگر مخلوقات کی بنسبت قلم کو پہلے پیدا کیا گیا ہے۔

پھر اسمیں اختلاف ہے کہ عرش اور قلم میں سے پہلے کس کو پیدا کیا گیا ہے، ابن جریر اور ان کے پیروکار کہتے ہیں کہ قلم کو پہلے پیدا کیا گیا ہے جبکہ جمہور کے نزدیک عرش کو قلم سے پہلے پیدا کیا گیا ہے، دلائل کے اعتبار سے یہی قول راجح ہے۔ فتح الباری، کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی قول اللہ تعالیٰ وھو الذی یبدأ الخلق ثم یعیدہ ۳۵۵/۶، تحفۃ الاحوذی ۳۰۷/۶۔

کتابتِ تقدیر کے معنیٰ

کتابتِ تقدیر کے یہ معنیٰ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ سے تقدیریں لکھدی تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو لوح محفوظ پر جاری کر کے تمام پیش آنے والے حالات وواقعات ثبت فرما دیئے جیسے کوئی کاتب اپنے ذہن کے خاکے اور نقش کو کاغذ پر لکھ دیتا ہے، تاہم اس کتابت کی حقیقت، نوعیت اور کیفیت کیا تھی، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں کسی چیز کے طے کر دینے اور معین ومقرر کر دینے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کی تقدیریں معین کیں، اور جو کچھ ہونا ہے اس کو مقرر فرمایا۔ تحفۃ الاحوذی ۳۰۹/۶، حجۃ اللہ البالغہ ۲۲/۱، باب الایمان بالقدر۔

اکتب القدر ما کان وما هو کائن الی الأبد ، بعض نے کہا ہے کہ ''ما کان'' کے معنیٰ ہیں عرش، پانی، ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یا تو اس سے قلم کو پیدا کرنے سے پہلے کی مخلوقات یا امر کتابت سے پہلے کی مخلوق مراد ہے۔

''الـــی الابــد'' اس سے ''طویل زمانہ'' مراد ہے، چنانچہ ابن عباس کی روایت میں الی ان تقوم الساعۃ (قیامت تک) کی تصریح ہے۔ الکوکب الدری ۱۲۱/۳

قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنة ، امام نووی فرماتے ہیں کہ اصل تقدیر چونکہ ازلی ہے، اسکی کوئی ابتدا نہیں، لہذا وقت کی تحدید اصلی تقدیر کے اعتبار سے نہیں بلکہ لوح محفوظ میں لکھنے کے اعتبار سے ہے۔

بعض حضرات اشکال کرتے ہیں کہ جب آسمان وزمین اس وقت موجود نہیں تھے تو گویا زمانہ کا وجود بھی نہیں تھا، کیونکہ زمانہ نام ہے حرکت فلک کا، جب حرکت ہی نہیں تو زمانہ بھی نہ ہوا پھر روایت میں خمسین الف سنۃ کیسے درست ہے؟

اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)......اس سے تحدید مقصود نہیں بلکہ طویل مدت مراد ہے اسلئے کہ عربی زبان میں پچاس ہزار سال سے طویل زمانہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔

(۲)......وقت کی یہ تحدید عرش کی حرکت کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے نہ کہ آسمان کی حرکت کے اعتبار سے اور عرش اس وقت موجود تھا۔ مرقاۃ ۱/۱۴۶

(۳)......" خمسين الف سنة" کا عدد تخمینی ہے یعنی اگر اس وقت آسمان موجود ہوتا تو اسکی حرکت کی مقدار پچاس ہزار سال کے بقدر ہوتی۔ شرح الطیبی ۱/۲۱۵

تقدیر کے بارے میں قریش کا مباحثہ

قریش مکہ حضور ﷺ سے مسئلہ تقدیر میں مباحثہ کرنے لگے تو اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمام کائنات کی ایک ایک چیز کو اپنی تقدیر ازلی کے مطابق بنایا ہے یعنی کائنات میں پیدا ہونے والی ہر چیز، اسکی مقدار، زمان ومکان اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کا پیمانہ عالم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا تھا، چنانچہ جو کچھ عالم میں پیدا ہوتا ہے وہ اسی تقدیر ازلی کے مطابق ہی ہوتا ہے۔
اس لئے تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ یا اس کا انکار کسی طرح درست نہیں، کیونکہ تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے اس کا منکر کافر ہے اور جو لوگ یا فرقے کسی تاویل کے ذریعہ اس کا انکار کرتے ہیں وہ فاسق ہیں۔ اس آیت میں " قدر" سے مراد تقدیر ہے، اس میں تقدیر کو ثابت کیا جارہا ہے۔ تحفۃ الاحوذی ۶/۳۰۹، معارف القرآن ۸/۲۳۸

قد وقع الفراغ من شرح ابواب القدر بفضل الله تعالیٰ وحسن توفيقه صباح الاثنين، الرابع عشر من شهر ذيقعده ۱۴۲۸ھ من الهجرة النبوية.
والحمد لله بنعمته تتم الصالحات وصلى الله على النبي الامي محمد وعلى اله وصحبه و من تبعهم بإحسان الى يوم الدين، هذا واسئال الله سبحانه وتعالیٰ ان يوفقني لإتمام باقي الشرح كما يحبه ويرضاه انه سميع قريب مجيب الدعوات وهو على كل شئ قدير، وبالإيجابة جدير، ولا حول ولا قوة الا بالله العلى العظيم. ويليه ان شاء الله تعالیٰ فى المجلد الثانى شرح ابواب الفتن.

مراجع ومصادر معارف ترمذی (جلداوّل)

قرآن مجید

روح المعانی	علامہ محمود آلوسی	مکتبہ امدادیہ ملتان
تفسیر ابن کثیر	حافظ ابن کثیر	قدیمی کتب خانہ
تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
تفسیر عثمانی	مولانا شبیر احمد عثمانی	طبعۃ الملک فہد
معارف القرآن	مفتی محمد شفیع صاحب	ادارہ المعارف کراچی
صحیح بخاری	محمد بن اسماعیل بخاری	قدیمی کتب خانہ کراچی
صحیح مسلم	امام مسلم	// // //
سنن ترمذی	ابوعیسیٰ ترمذی	ایچ ایم سعید کراچی
سنن ابی داؤد	سلیمان بن اشعث	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
سنن نسائی	حافظ احمد بن شعیب	قدیمی کتب خانہ کراچی
سنن ابن ماجہ	ابوعبداللہ بن ماجہ	// // //
مشکاۃ المصابیح	حسین بن مسعود بغوی	// // //
الموطا	امام محمد بن حسن	نور محمد کتب خانہ کراچی
شرح معانی الآثار	امام طحاوی	ایچ ایم سعید کراچی
مسند احمد	احمد بن حنبل	دارالنشر بیروت
مصنف عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام	ادارۃ القرآن کراچی
المستدرک علی الصحیحین	محمد بن عبداللہ الحاکم	بیروت

مجمع الزوائد	علی بن ابی بکر الہیثمی	دار الفکر بیروت
کنز العمال	علی المتقی الہندی	ادارہ تالیفات ملتان
عمدۃ القاری	علامہ بدر الدین عینی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی	دار الکتب العلمیہ بیروت
تحفۃ الاحوذی	عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم مبارکپوری	〃 〃 〃
عارضۃ الاحوذی	ابن العربی مالکی	دار احیاء التراث العربی بیروت
شرح الطیبی	حسین بن محمد الطیبی	ادارۃ القرآن کراچی
مرقاۃ المفاتیح	ملا علی قاری	مکتبہ حقانیہ پشاور
الکوکب الدری	رشید احمد گنگوہی	ادارۃ القرآن کراچی
العرف الشذی علی جامع الترمذی	مولانا انور شاہ کشمیری	ایچ ایم سعید کراچی
ارشاد الساری	احمد بن حجر القسطلانی	مصر
معارف السنن	محمد یوسف بنوری	مکتبہ بنوریہ کراچی
بذل المجہود	خلیل احمد سہانپوری	دار الکتب العلمیہ بیروت
کشف الباری	مولانا سلیم اللہ خان	مکتبہ فاروقیہ کراچی
التعلیق الصبیح	محمد ادریس کاندہلوی	مکتبہ عثمانیہ لاہور
تکملہ فتح الملہم	محمد تقی العثمانی	مکتبہ دار العلوم کراچی
درس ترمذی	محمد تقی العثمانی	〃 〃 〃
شمائل ترمذی	شیخ الحدیث محمد زکریا	مکتبہ رحمانیہ لاہور
اشعۃ اللمعات فارسی	شیخ عبد الحق دہلوی	مکتبہ نوریہ سکھر
الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ	حافظ ابن حجر العسقلانی	دار الفکر بیروت
زاد المعاد	ابن قیم الجوزی	موسسۃ الرسالہ بیروت

تیسیر مصطلح الحدیث	محمود الطحان	مکتبہ رحمانیہ لاہور
تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی	دار الفکر بیروت
تاریخ الخمیس	حسین بن محمد المالکی	مؤسسة شعبان بیروت
ہدایہ	علی بن ابی بکر مرغینانی	مکتبہ شرکت علمیہ ملتان
المبسوط	شمس الدین السرخسی	دار الفکر بیروت
ردمحتار	ابن عابدین شامی	ایچ ایم سعید کراچی
فتح القدیر	علامہ ابن الھمام	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
فتاوی ہندیہ	جماعة من العلماء	// // //
المغنی	ابن قدامہ	مکتبہ تجاریہ بیروت
فتاویٰ ابن تیمیہ	احمد بن تیمیہ	طبعة الملک فھد
امداد الفتاویٰ	اشرف علی التھانوی	مکتبہ دار العلوم کراچی
احسن الفتاویٰ	رشید احمد لدھیانوی	مکتبہ لدھیانوی کراچی
حیات الحیوان	علامہ دمیری	دار الاشاعت
اصلاحی خطبات	محمد تقی عثمانی	میمن پبلشرز کراچی
حصن حصین	محمد بن محمد جزری	مکتبہ مدنیہ لاہور
جدید فقہی مسائل	خالد سیف اللہ رحمانی	المصباح لاہور
لسان العرب	ابن منظور الافریقی	نشر ادب الحوزہ، ایران
مختار الصحاح	محمد بن ابی بکر الرازی	دار الفکر بیروت

قطبی کی بہترین اردو شرح

تیسیر قطبی

مُفتی مُحمّد طارِق

استاذ حدیث جامعہ فریدیہ اسلام آباد

مکتبہ شیخ الہند

خان پلازہ کوہاٹی بازار نزد جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

0333-5375336

اسلامی عبادات

مفتی محمد طارق

استاذ حدیث جامعہ فریدیہ اسلام آباد

مکتبہ شیخ الہند

خان پلازہ کوہاٹی بازار نزد جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

0333-5375336